نبی رحمت ﷺ
جدید ایڈیشن
اہم ترمیمات و اضافوں کے بعد
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
مجلس نشریات اسلام ۱-کے-۳ ناظم آباد کراچی

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ

(الانبیاء ۱۰۷)

فہرست عناوین

"نبئ رحمتؐ"

دیباچہ طبع سوم

الحمد للّٰہ رب العٰلمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین

وخاتم النبیین، محمد وآلہ وصحبہ اجمعین، ومن تبعہم

باحسان الی یوم الدین

امّا بعد! مؤلفِ "نبیِ رحمت" کا قلب و قلم اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے شکر میں سجدہ ریز ہیں، اور اس کے ثنا خواں، کہ "السیرۃ النبویۃ" عربی کا ساتواں اور نبیِ رحمت (اردو کا تیسرا) ایڈیشن پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے عربی میں "السیرۃ النبویۃ" ۱۳۹۷ھ (۱۹۷۷ء) میں شائع ہوئی تھی، اور اس کا ساتواں ایڈیشن ۱۴۰۷ھ (۱۹۸۷ء) میں دار الشروق (جدّہ) سے نکلا ہے۔

عام ناظرین کے علاوہ موضوع سے خصوصی و مبصّرانہ واقفیت اور اشتغال رکھنے والے افراد، تعلیم و تربیت کے ماہرین، اور علمی اداروں کی طرف سے کتاب کی جو قدر افزائی ہوئی اس پر مؤلف اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، عربی سیرت کا اردو، ہندی، انگریزی، ترکی اور انڈونیشی زبان میں بھی ترجمہ اور ان زبانوں کے وسیع حلقے میں اس کی اشاعت ہوئی، اور عربی سیرت نے خاص طور پر متعدد مؤقر عرب جامعات

(یونیورسٹیز) کے نصاب میں جگہ پائی، اس عرصہ میں مؤلف کو سیرت نبوی اور اس کے تاریخی و جغرافی، تمدنی و اجتماعی پہلوؤں سے متعلق نئی کتابوں، اور عربی، اردو، انگریزی کے جدید مواد سے استفادہ کا موقعہ ملا اور اس نے اُن کی روشنی میں کتاب میں جابجا قیمتی اضافے کئے، کہیں کہیں واقعات کے پس منظر پر مزید روشنی ڈالی، اور تقابلی مطالعہ کے نتائج پیش کئے، نیز سیرت کے واقعات کے بعض وہ تاریخی، علمی، اور دعوتی پہلو اُجاگر کئے جو پہلے ایڈیشن میں رہ گئے تھے۔

مؤلف سیرت نے ابتدا ہی سے مجرّد وقائع نگار اور ضابطہ کے ایک مؤرخ کی حیثیت سے صرف واقعات و معلومات کی بے جان و خشک فہرست مرتّب کر دینے پر اکتفا نہیں کی، بلکہ واقعاتِ سیرت، اور اقدامات و ارشاداتِ نبوی سے ان دُور رس و حکیمانہ نتائج اور ان بلیغ و عمیق اشارات کی طرف بھی متوجہ کرنے کی کوشش کی جو سیر الانبیاءؑ اور خصوصاً سید المرسلین صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت و دعوت کے مطالعہ، نفسیاتِ انسانی، علم الاخلاق، و علم الاجتماع میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، اور جن سے ہر زمانہ اور ہر مقام میں دعوت و تربیت کے کام، قوموں اور نسلوں کی رہنمائی اور زندگی کے پیچ در پیچ مسائل و مشکلات کی عقدہ کشائی میں بیش قیمت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالےٰ کی توفیق سے یہ ایڈیشن سیرت کے قدیم بنیادی مواد کے ساتھ موضوعِ سیرت سے متعلق نئے معلومات، تاریخی تفحّص، اور علمی تحقیق پر مشتمل ہے، اسی کے ساتھ اس میں ایمانی و دینی جذبات کی تسکین، اور ذات نبوی سے قلبی و روحانی ربط و تعلق کی تقویت کا سامان بھی ہے، جو سیرت نبوی کی کتاب کی اصل سوغات، اور زندگی کی

اصل قیمت ولذّت ہے ؎

در خرمنِ کائنات کردیم نگاہ

یک دانہ محبّت است باقی ہمہ کاہ

یہ باتیں بغیر کسی مبالغہ ورنگ آمیزی کے پیش کی گئی ہیں کہ سیرت کو ان کی ضرورت نہیں اس کا جمال جہاں آرا قلب و دماغ کو موہنے اور متاثر کرنے کی ذاتی صلاحیت رکھتا ہے ؎

تکلّف سے بری ہے حُسنِ ذاتی

قبائے گُل میں گُل بوٹا کہاں ہے

اخیر میں مؤلّف ایک بار پھر اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اس کو اس کی مہلت و توفیق دی اور اس کے لئے وہ اسباب فراہم کئے کہ وہ اپنی کتاب میں کچھ اضافے کرسکا، اسی طرح وہ "دارالشروق" اور اس کے فاضل و محترم مالک مُحبِّ گرامی قدر شیخ محسن احمد بارودم کے حسن توجہ کا بھی ممنون ہے، اور اللہ سے ان دونوں کے لئے دائمی توفیق اور حسن قبول کی دعا کرتا ہے۔

والسّلام

ابوالحسن علی ندوی

ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۸ شعبان ۱۴۰۷ھ

۲۸ اپریل ۱۹۸۷ء

دیباچہ طبع دوم

الحمد للّٰہ رب العٰلمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین

وخاتم النبیین محمد واٰلہ وصحبہ اجمعین

ناچیز مصنف کی زبان وقلم اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس انعام کے شکر اور اس کی حمد سے قاصر ہیں کہ سیرت نبوی کے سلسلہ کی اس کی ایک کوشش (جس کو اپنی نسبتِ عالی کی بنا پر حقیر و ناچیز لکھنے کی کسی طرح ہمت نہیں ہوتی) علمی و دینی حلقوں میں ناقابلِ اعتناء نہیں ٹھہری، کتاب اصلاً عربی زبان میں لکھی گئی تھی، جو سیرت کی مفصل و مبسوط، قدیم وجدید، عالمانہ اور محققانہ ہر طرح کی تصنیفات سے مالا مال ہے، اس کتاب کا اختتام ۵ رذی قعدہ ۱۳۹۶ھ (۲۹ راکتوبر ۱۹۷۶ء) کو ہوا تھا، لیکن چار برس کی مختصر مدت نہیں گزرنے پائی تھی کہ اس کے تین ایڈیشن قاہرہ اور بیروت سے شائع ہوئے، ہر ایڈیشن کئی کئی ہزار کا تھا، اور دیکھتے دیکھتے وہ عالمِ عربی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا، مصنف کے لئے سب سے بڑی سعادت اور شکر و فخر کی بات یہ ہے کہ یہ کتاب اس سرزمین میں مقبول ہوئی، جہاں اس حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ گزرا تھا، اور ان تعلیم گاہوں اور تعلیمی مرکزوں میں داخل نصاب ہوئی جو مہبط وحی،

اور مولد و مرقدِ رسول سے قریبی نسبت رکھتے تھے۔ ؏

بریں مژدہ گر جان فشانم رواست

عربی سے اردو میں ترجمہ کی خدمت مصنف کے لختِ جگر اور قرۃ عین برادر زادۂ عزیز سید محمد الحسنی مدیر "البعث الاسلامی" نے بڑے شوق، اور پورے آداب کے ساتھ انجام دی، یہ ان کے ترجمہ کے سلسلہ کی آخری کڑی تھی، اس کی طباعت کے بعد وہ زیادہ دن اس دنیا میں نہیں رہے، اور ان پر ہندوستان میں سیرت نبوی کے مصنف عظیم علامہ شبلی نعمانی کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم

خدا کا شکر ہے، یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

کتاب کے ترجمہ پر مصنف نے اس وقت نظر ڈالی جب اس میں (نزول الماء کی شکایت کی وجہ سے) قلمی مسودات کے پڑھنے اور کتابت وطباعت کی غلطیوں کو پکڑنے کی پوری صلاحیت نہ تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں کچھ فروگذاشتیں ایسی رہ گئیں جن کو خود مصنف یا غور اور ہمدردی کے ساتھ ایک ایک لفظ پڑھنے والا ناقد ہی پکڑ سکتا تھا، مصنف اپنی بڑھی ہوئی مصروفیات اور پے درپے طویل سفروں کی وجہ سے اس پر نظر ثانی کرنے کے لئے جلد وقت نہیں نکال سکا، اب الحمد للہ اس کو اس کی توفیق اور فرصت ہوئی، اس نے اردو ترجمہ کو لفظاً لفظاً پڑھا، جہاں ضرورت پیش آئی اصل کتاب اور عربی مآخذ سے مقابلہ کیا، اور کتاب کو طبع ثانی کے لئے پورے طور پر تیار کر دیا، بعض مقامات پر (خصوصاً حواشی میں) چند مفید اور ضروری اضافے بھی کئے، متعدد اہلِ علم قارئین نے بعض مقامات پر توجہ بھی دلائی جو نظر ثانی کے محتاج تھے،

مصنف ان سب دوستوں کا بھی شکر گزار ہے، اور وہ خدا کے یہاں اجر و ثواب کے بھی مستحق ہیں، جنھوں نے بعض اہم غلطیوں اور فروگزاشتوں کی نشاندہی کی، اس سلسلہ میں مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی استاذ تفسیر و حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء خاص طور پر قابل ذکر و شکر ہیں۔

اب کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن انسانی و امکانی سعی کے مطابق زیادہ صحیح اور مکمل شکل میں قارئین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس سعی کو قبول فرمائے اور کتاب کو لکھنے والے، ترجمہ کرنے والے، پڑھنے والے اور اس کی طباعت و اشاعت میں کسی قسم کا حصہ لینے والوں کے لئے نجات اور ترقی درجات کا ذریعہ بنائے۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی

۲۲ محرم الحرام ۱۴۰۱ھ

یکم دسمبر ۱۹۸۰ء

پیش لفظ

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین

وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین، ومن تبعھم

باحسان الیٰ یوم الدین

وہ پہلا مکتب اور مدرسہ جہاں سب سے پہلے مصنفِ کتاب کا داخلہ ہوا وہ سیرتِ نبوی کا مدرسہ ہے، اس مبارک مدرسہ میں اس کا داخلہ اس ابتدائی عمر میں ہوا جس میں بچے عام طور پر مکتب اور مدرسہ میں داخل نہیں کئے جاتے، یہ اس کے گھرانے اور خاندانی ماحول اور فضا کا نتیجہ تھا جو وہاں قائم تھی، سیرت کو اس ثقافت اور کلچر کے ایک اہم اور بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل تھی، جس سے بہرہ مند اور آراستہ ہونا گھر کے بچوں اور لڑکوں کے لئے اس عہد میں ضروری خیال کیا جاتا تھا، اس میں اس بچے کی چھوٹی موٹی لائبریری کو بھی بڑا دخل ہے، جو نظم و نثر دونوں طرح کی کتابوں پر مشتمل تھی، اور برابر گردش میں رہتی تھی، اس کے بعد اس میں سب سے بڑا حصہ اس کے برادرِ اکبر ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحب رحمہ اللہ کی حکیمانہ تربیت اور رہنمائی کا ہے اس کا فائدہ یہ تھا کہ اس نے بہت کم سنی اور نو عمری میں اردو میں سیرت کی وہ بہترین

کتابیں پڑھ لیں جس میں عربی زبان کے بعد سیرت کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور عہدِ آخر میں اس پر سب سے بڑا کام ہوا ہے۔[1]

جب عربی زبان و ادب کا کچھ ذوق پیدا ہوا تو اس نے اپنی ساری توجہ سیرت کے عربی مآخذ پر مرکوز کر دی ان میں سرفہرست دو کتابیں تھیں، ایک ابن ہشام کی کتاب "السیرۃ النبویۃ" دوسرے امام ابن القیم کی کتاب "زاد المعاد" اس نے ان کتابوں کو صرف علمی یا روایتی طریقہ سے پڑھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انھیں کتابوں میں اپنی زندگی کے شب و روز بسر کئے، یہی وہ وقت تھا جب اس کا دل ایمان و یقین کی حلاوت سے آشنا ہوا، اور جذبۂ شوق و محبت کو نئی غذا ملی اور اس کی از سرِ نو آبیاری ہوئی، اس لئے کہ سیرت کے موثر واقعات تربیت و رہنمائی کا سب سے طاقتور ذریعہ اور انسان کے قلب و دماغ کے لئے (قرآن مجید کے بعد) سب سے زیادہ اثر انگیز اور حیات آفریں سرچشمہ ہیں، ان دونوں کتابوں کے بعد عربی اور انگریزی میں سیرت کی جو قدیم و جدید کتابیں اس کی دسترس میں تھیں، وہ بھی برابر مطالعہ میں آتی رہیں، یہی وجہ ہے کہ سیرت اس کی کتابوں اور تحریروں کی ہمیشہ سے بڑی بنیاد رہی، اسی کے دم قدم سے اس کا سارا سوز و ساز اور آب و رنگ تھا اور اسی کے نقش قدم کے طفیل اس کے نقوشِ قلم میں تازگی تھی، اپنے مقاصد و مطالب کی وضاحت کے لئے اس کو قوی سے قوی تر دلائل اور بلیغ سے بلیغ مثالیں سیرت کے جمال و کمال ہی سے

---

[1] جس کی دلچسپ کہانی مصنف نے اپنی عربی کتاب "الطریق الی المدینہ" میں "الکتاب الذی لا أنسیٰ فضلہ" کے عنوان سے سنائی ہے، اور اس میں خاص طور پر قاضی محمد سلیمان صاحب منصورپوری مرحوم کی مقبول کتاب "رحمۃ للعالمین" کے مطالعہ کے گہرے اثرات کا ذکر کیا ہے۔

ملتی تھیں، اور سیرت ہی سے اس کی طبع میں روانی و جولانی پیدا ہوتی تھی اور اس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی تھیں، اس کی کوئی قابلِ ذکر تحریر ایسی نہیں جس پر اس جمالِ محمدی کا کوئی پرتو اور سیرتِ نبوی کے گہرے مطالعہ اور فکر و تدبّر کا کوئی عکس نہ ہو۔

سیرت کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں اور بعثتِ محمدی کی عظمت اور اس کے محیّر العقول اثرات و نتائج پر اس کے یہ مقالات و خطبات "کاروانِ مدینہ"[1] میں یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

مصنّف نے اس طویل عرصہ میں بہت سی کتابیں لکھیں لیکن خاص سیرت کے موضوع پر کوئی مستقل کتاب اس کے قلم سے نہ نکل سکی، حالانکہ اس کو اس بات کا احساس تھا کہ اس موضوع پر ایک ایسی کتاب کی شدید ضرورت ہے جو ایک طرف عصری اور علمی اسلوب میں لکھی گئی ہو اور اس میں قدیم و جدید دونوں قسم کے مآخذ سے پورا استفادہ کیا گیا ہو، دوسری طرف سیرت کے اوّلین اور اصل (ORIGINAL) مآخذ پر اس کی بنیاد ہو، اور قرآن و حدیث سے اس میں سرِ مو انحراف نہ کیا گیا ہو، وہ موسوعی (ENCYCLOPAEDIC) طرز پر نہ لکھی گئی ہو جس میں سارے معلومات بغیر کسی نقد و تمحیص کے بھر دیئے جاتے ہیں اور ہر طرح کا ضروری و غیر ضروری مواد پیش کر دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، یہ وہ طرزِ تصنیف اور اسلوبِ تحریر ہے جس کے دورِ آخر کے اکثر مصنّفین اور بعض متقدّمین بھی عادی رہے ہیں، یہ طرز بہت سے ایسے غیر ضروری اشکالات و سوالات پیدا کرتا ہے جن سے سیرتِ نبوی بَری و بے داغ ہے، اور جس میں بادیہ پیمائی اور

---

[1] کتاب کے تین عربی ایڈیشن مدینہ منورہ، لکھنؤ اور دمشق سے اور اردو میں دو ایڈیشن لکھنؤ اور کراچی سے شائع ہو چکے ہیں، عربی میں اس کا نام "الطریق إلی المدینة" ہے۔

آشفتہ سری کی مسلمانوں کو کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ تحقیق و تنقیح کا قلم (تجدّد پسند آنہ رجحانات اور مستشرقین کی تشکیک کا کوئی اثر قبول کئے بغیر) اپنا کام کرچکا ہے اس کے ساتھ وہ ان دینی مُسلّمات و حقائق کے ساتھ ہم آہنگ ہو جن کی روشنی و رہبری کے بغیر آسمانی کتابوں انبیاء کی سیرت معجزات اور غیبی واقعات و حقائق کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہے اور جو اس اصول پر کاربند اور اس عقیدہ کا حامل ہو کہ یہ ایک نبی کی سیرت ہے جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے دنیا میں مبعوث کیا گیا ہے اور جس کو ہر دم و ہر لحظہ خدا کی نُصرت و تائید حاصل تھی نہ کہ کسی بڑے قومی لیڈر اور ملی رہنما کے حالاتِ زندگی، یہ وہ سیرت ہے جو ہر منصف مزاج تعلیم یافتہ شخص (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) کے سامنے کسی تحفّظ (RESERVATION) استثناء اور کسی تاویل کا سہارا لئے بغیر پیش کی جاسکے، چنانچہ مصنّف نے اس کتاب میں خود ان واقعات و حالات اور سیرت کے اصل و بنیادی مواد پر زیادہ اعتماد کیا ہے اور اس کو اس کا موقع دیا ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے بولے اور پڑھنے والے کے دماغ و دل اور ذہن و نظر میں اپنا راستہ خود بنائے ان منہ سے بولتی ہوئی صداقتوں اور زندہ حقیقتوں کو فلسفہ کا رنگ دینے، واقعات کی تاویل کرنے اور اس کے لئے طویل و عریض مضمون باندھنے کی اس میں زیادہ کوشش نہیں کی گئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ سیرت اپنے حُسن و جمال، اپنی موزونیت و لطافت اور اپنی اثر انگیزی و دل آویزی کے لئے کسی بڑے آدمی کی سفارش کسی حکیم کے علم و دانش اور کسی ادیب اور صاحبِ قلم کے اندازِ نگارش یا رنگینیِ بیان کی محتاج نہیں، اس کے لئے زیادہ سے زیادہ ایک مصنّف کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ حسنِ بیان، حسنِ ترتیب اور حسنِ انتخاب ہے۔

پھر اس میں عقل و جذبات دونوں کی بیک وقت اور شانہ بشانہ جلوہ گری اور

کارفرمائی ہونی چاہیئے، ایسا نہ ہو کہ عالمانہ بحث اور معروضی نقد و جائزہ جذبۂ محبت اور ذوق و شوق کی کیفیت کو سرد و افسردہ کردے جو سیرت کے جمالِ جہاں آرا سے لطف اندوز ہونے اور اپنے دیدۂ و دل کو اس سے روشن اور منوّر کرنے کی ایک ناگزیر ضرورت اور اس سے صحیح و کامل استفادہ اور اس کے مسائل، احکام اور واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے اور صحیح نتائج تک پہونچنے کی لازمی شرط ہے، اگر سیرت کی کوئی کتاب اس جذباتی اور ایمانی عنصر سے خالی ہے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ چوبِ خشک کا مصنوعی ڈھانچہ ہے جس میں زندگی کی حرارت اور نمی موجود نہیں، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ یہ جذباتی و ایمانی عنصر عقلِ سلیم کے تقاضوں پر غالب نہ آجائے جن کی اہمیت عصرِ حاضر نے خاص طور پر بڑھا دی ہے، نہ وہ منطق کے صحیح معقول اور قابلِ فہم اصولوں کے منافی ہو، نہ عقیدہ اور تقلید پر مبنی ایسا خراجِ عقیدت اور خراجِ تحسین ہو جس کو صرف قوی الایمان پشتینی مسلمان اور وہ علماءِ راسخین قبول و تسلیم کرسکیں جن کی بیرونی دنیا اور جدید ثقافت سے کوئی رسم و راہ نہیں، یہ عقیدت و محبت بلاشبہہ ایک عطیۂ خداوندی اور نعمتِ خداداد ہے لیکن یہ بات ہمیں کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ بہرحال اس نبیؐ کی سیرت ہے جس کو رحمۃ للعالمین بنا کر دنیا کے تمام انسانوں اور نوعِ انسانی کے تمام طبقوں کی طرف بھیجا گیا ہے، اس لئے اس کو اس طبقہ کے افراد کے لئے ممنوع یا مُہر بند نہیں کیا جاسکتا، جن کو حالات نے اس اسلامی و ایمانی ماحول میں نشو و نما حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا، اور تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ وہ غیر اسلامی ماحول ہی میں پیدا ہوں، وہیں ان کی نشو و نما ہو، پھر لطفِ الٰہی ان کی مساعدت کرے، اور سیرتِ محمدی کا کوئی معطر و جاں نواز جھونکا اپنی دل آرائی و مسیحائی کے ذریعہ ان کو اس جگہ سے اٹھا کر

اسلام کے سایۂ رحمت اور ایمان کی بارگاہ میں پہنچا دے، واقعہ یہ ہے کہ ان غیر مسلموں کا حق سیرت پر ان مسلمانوں سے ہرگز کم نہیں جو پہلے ہی سے اسلام و ایمان کے سایۂ رحمت میں ہیں، اس لئے کہ دوا و علاج کی تندرست سے زیادہ ایک بیمار کو ضرورت ہے، دریا کے اس پار رہنے والے کو پل کی جتنی حاجت ہوگی اتنی حاجت پل کے اسی طرف رہنے والے کو کیوں کر ہو سکتی ہے؟

مصنّف سیرت نگاری کے وقت اس ماحول اور اس عہد کو بھی کسی طرح نظر انداز اور فراموش نہیں کر سکتا جس میں نبوّت محمدی کا آفتاب پہلی بار طلوع ہوا، اس لئے اس عہد کی عالم گیر جاہلیت کی پوری تصویر کشی بھی ضروری ہے جو چھٹی صدی مسیحی میں ہمیں ساری دنیا پر محیط نظر آتی ہے، اس میں یہ بھی دکھانا ہوگا کہ اس زمانہ میں فساد، اخلاقی بگاڑ اور انسان کی بے چینی و اضطراب کس درجہ پر پہونچ چکا تھا، اس کی اخلاقی، سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کیا تھی؟ تخریب و فساد کے کیا کیا اسباب و عوامل اس وقت کی دنیا میں کارفرما تھے، اور کیسی کیسی ظالمانہ حکومتیں، مسخ شدہ مذاہب، انتہا پسندانہ و خیالی فلسفے، تباہ کن تحریکیں اور دعوتیں اپنا کام کر رہی تھیں، جب مصنّف نے اپنی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین[1]" کی تمہید اور مقدمہ کے طور پر عہد جاہلیت کی ذرا تفصیل کے ساتھ تصویر کھینچنے کی کوشش کی تو اس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑا جو اسے آج تک یاد ہے، اس کو اس کے لئے ان تمام مغربی ماخذ کا جائزہ لینا پڑا جن میں ظہور اسلام کے وقت کے متمدّن ملکوں اور اقوام عالم کی تاریخ بیان کی گئی تھی، اس لئے ان تمام ضخیم کتابوں

[1] جس کے اردو ترجمہ کا نام "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ہے۔

سے ان منتشر حالات کو اس طرح جمع کیا جیسے چیونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے اکٹھا کئے جائیں۔[1]

یہ تمہید جو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے، اور سیرت کا مطالعہ کرنے والے کے لئے روشنی کا کام کرتی ہے، اور اس کے سامنے بعثتِ محمدی کی عظمت و وسعت اور منصبِ نبوّت کی نزاکت و اہمیت اور اس کے عظیم الشّان نتائج کی مکمّل تصویر پیش کرتی ہے، عہدِ حاضر کے سیرت نگار کے لئے بہت ضروری ہے، اور اس کا کام اس وقت تک مکمل قرار نہیں دیا جائے گا جب تک اس میں بحث و تحقیق کا یہ انداز اختیار نہ کیا گیا ہو، اور آغازِ اسلام کے وقت عہدِ جاہلیت کا نقشہ اور اس کے فساد و اضطراب، اخلاقی پستی اور خود فراموشی و خودکشی کی زندہ و متحرک تصویر پوری امانت داری کے ساتھ بےکم و کاست پیش نہ کی گئی ہو۔

یہی اس ماحول اور اس شہر کا نقشہ تھا جہاں اسلام کی پہلی کرن چمکی، جہاں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی اور دعوتِ حق کے قافلہ نے پہلا قدم آگے بڑھایا، جہاں آپ کی عمر مبارک کے ۵۳ سال گذرے اور جہاں تیرہ[13] سال دعوتِ اسلام کے سخت و جاں گداز مرحلوں میں بسر ہوئے، سیرت کا مطالعہ کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عقل و شعور اور تہذیب و تمدّن کی جو سطح تھی، اس سے باخبر ہو، نیز اس ملک کے اجتماعی اور سیاسی اور دینی و مذہبی حالات اس کے اقتصادی و سیاسی ڈھانچہ اور حربی اور عسکری طاقت کی نوعیت سے بھی واقف ہو تاکہ اس ملک کے باشندوں کے صحیح رجحانات، ان کے مزاج و اُفتادِ طبع، ان کے ذہن و نفسیات کو اچھی طرح سمجھ سکے، اور اس کو ان دشواریوں اور رکاوٹوں کا پورا

---

[1] ملاحظہ فرمائیں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" باب "بعثت سے پہلے" شائع کردہ "مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام، لکھنؤ۔"

اندازہ ہو سکے جو اسلام کی ترقی و پیش قدمی کی راہ میں حائل ہو رہی تھیں۔

یہی بات بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی یثرب کے بارہ میں کہی جا سکتی ہے جہاں اسلام مکّہ سے منتقل ہوا، جہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے ہجرت فرمائی اور تقدیر الٰہی نے اس کو اسلام کا اوّلین مرکز قرار دیا، اس لئے اس کے پس منظر کو سمجھے بغیر اسلام کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا پورا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، ان حالات کو جانے بغیر ہم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ اسلام نے ان افراد کی کیا اور کس طرح تربیت کی، ان کو کیسے حیاتِ نو بخشی، مختلف مسائل کو کس طرح حل کیا، متضاد و متحارب عناصر کو کس طرح شیر و شکر کیا، اس سلسلہ میں نبوّتِ محمّدی کا کارنامہ کیا تھا؟ اس نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور روٹھے ہوئے انسانوں کو ملانے، اور ان کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تطہیر کا فریضہ کس طرح انجام دیا، یہ بات صرف اسی وقت سمجھی جا سکتی ہے جب آدمی کے سامنے اس عجیب و غریب اور پیچیدہ ماحول کی پوری تصویر ہو جس کا سامنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو کرنا پڑا، بہت سے واقعات اور فیصلے جو حدیث و سیرت کے مطالعہ میں آدمی کی نظر سے گزرتے ہیں، اس وقت تک سمجھے ہی نہیں جا سکتے جب تک مدینہ کی اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی حالت، وہاں کی زمین کی خاصیت، اس کے جغرافیہ، اس کے گرد و نواح، وہاں کی انفرادی اور علاقائی طاقتوں، ان کے باہمی تعلقات و روابط، معاہدوں اور عہد ناموں، اور ہجرت سے قبل کے معاملات اور قومی و ملکی دستور اور رسم و رواج کا قاری کو علم نہ ہو، اگر کوئی شخص ان تمام باتوں سے بالکل ناواقف ہو کر سیرت کی کتابوں میں اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس کی مثال ایک سرنگ میں چلنے والے کی سی ہو گی جس کو اپنے دائیں بائیں اور آغاز و منزل کسی چیز کی خبر نہ ہو۔

یہی اصول اس وقت کی معاصر متمدن حکومتوں اور پڑوسی ریاستوں پر بھی منطبق ہوتا ہے اس لئے کہ ناظرین کے سامنے دعوتِ اسلامی کے اس اقدام کی اہمیت اور اس کی حوصلہ مندی اور خطر پسندی کی کوئی صاف و واضح تصویر اس وقت تک آ ہی نہیں سکتی جب تک اس کو ان حکومتوں کے حجم اور قوت شوکت کا اندازہ نہ ہو جن کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام دی اور ان کے نام فرامین جاری کئے، اور ان کی تہذیب و ثقافت، عسکری قوت، فارغ البالی اور مرفہ الحالی نیز ان کے سلاطین کی مطلق العنانی رعب و دبدبہ اور شان و شوکت کا صحیح علم نہ ہو، جدید معلومات نے ان حکومتوں اور قوموں کی تاریخ، اور ان کے معاشرہ پر خاصی روشنی ڈال دی ہے اور بہت سے ان حالات اور حقائق کا پردہ چاک کر دیا ہے جو عہدِ قدیم میں لوگوں کے سامنے نہیں آئے تھے یا زیادہ صاف اور واضح نہ ہو سکے تھے، اس زمانہ کے سیرت نگار کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ اپنے کام میں ان تمام معلومات سے پوری مدد لے اور تاریخ و جغرافیہ اور تقابلی مطالعہ (COMPARATIVE STUDIES) کے میدان میں جو جدید ترین UP-TO-DATE مباحث و معلومات اب تک سامنے آئے ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھائے۔

مصنف کو ان تمام باتوں کا احساس تھا اور سیرت نگاروں کی ناقابلِ فراموش خدمات اور مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں ان کے قلم سے نکلنے والی تحریروں کی قیمت و افادیت کا پورا اعتراف بھی۔ اس نے اپنی سعادت سمجھ کر یہ کوشش کی کہ وہ بھی سیرتِ نبوی پر ایک نئی کتاب لکھ کر اس محبوب جلیل القدر موضوع کے مصنفین کی نورانی فہرست میں شامل ہو جائے۔

لیکن تنگیٔ وقت اور ضعفِ بصارت کی وجہ سے مصنف کی تفصیل و اطمینان

کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی، اس لئے کہ اس کو اس کا خوب تجربہ تھا کہ کسی بڑے آدمی کی سیرت (نبی اور سید الاولین والآخرین واشرف المرسلین کا معاملہ تو اس سے کہیں برتر و بالا ہے) مصنفین کے لئے سب سے مشکل اور نازک موضوع ہے مصنف کو مشہور و اہم شخصیات کے سوانح حیات اور متقدمین و متاخرین کے حالات زندگی اور کارنامے لکھنے اور بیان کرنے کا شاید اپنے بہت سے معاصرین اور رفقاء سے زیادہ اتفاق ہوا ہے، اس نے آغازِ نوجوانی بلکہ لڑکپن ہی سے جب سے قلم پکڑنا سیکھا، اہلِ حق مصلحینِ اُمت اور اصحابِ دعوت و عزیمت کے حالات و تراجم پر لکھنا شروع کر دیا، اور اپنے قلم سے سیر و تراجم کے موضوع پر کئی ہزار صفحے سیاہ اور اپنے نصیب کو روشن کیا، اور بچپن ہی سے ان اسلاف کرام اور ائمۂ رشد و ہدایت کے ساتھ زندگی گذاری، اور خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں بہت کچھ پڑھنے کا موقع ملا، اور بہت کچھ لکھنے کی توفیق ہوئی ان سب وجوہ کی بنا پر اس کو اس موضوع کی نزاکت اور اس ذمہ داری کی اہمیت کا اندازہ تھا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی مصنف پر کوئی خاص رجحان یا ذوق ایسا غالب آتا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کو (کبھی شعوری اور غیر شعوری طور پر) اپنے اس ذوق و رجحان کے تابع کر دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی یہ تصنیف اور تحریر صرف اس رجحان اور ذوق کی نمایندگی کرتی ہے جو اس وقت مصنف پر حاوی تھا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کی تصویر کشی کے ارادہ سے قلم اٹھاتا ہے لیکن بجائے اس کے خود اپنی تصویر اُتار دیتا ہے، وہ اس کے حالات و سوانح پر معروضی اور بے لاگ طریقہ سے روشنی ڈالنا چاہتا ہے لیکن اس کو اپنے ذاتی میلانات و تجربات اور اپنے نقطۂ نظر کی عینک سے دیکھنے اور ان حالات و واقعات کو اپنے مخصوص پیمانوں سے ناپنے لگتا ہے۔

جس کا علم النفس اور اخلاقیات کے کوچہ سے کبھی گذر ہوا ہے، معاصر شخصیتوں کے مطالعہ و مشاہدہ کا اسے کبھی موقع ملا ہے اور اس نے ایک طویل عرصہ ان کی رفاقت وصحبت میں گذارا ہے، وہ بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ نفس انسانی کی تہ تک پہونچنا، اور اس کے وسیع آفاق اور فضائے محیط کا علم، پھر اس کی جامع اور نازک تصویر کشی علوم ادبیہ اور اسالیب بیانیہ کی سب سے دشوار، نازک اور بہت جلد متاثر ہونے والی صنف ہے، اور اس کا تھوڑا بہت حق وہی ادا کر سکتا ہے جو نفس انسانی کے احساسات و جذبات، اس کے سوز و ساز، سرور و شوق، اس کی روح کی تپش اور دل کے گداز سے بہت کچھ واقف ہو، اور یہ محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو کہ اس کی راتیں کیسے کٹتی ہیں، اور اس کے دن کس طرح گذرتے ہیں، وہ اپنے گھر میں کیا نظر آتا ہے، اور اپنے رفقاء و دوستوں سے کس طرح پیش آتا ہے، اس نے اس کو صلح و جنگ میں بھی دیکھا ہو، اور اشتغال اور سکون، تنگی و راحت، اور ضعف و قوت میں بھی، اس لئے کہ انسان کے اندر بہت سے ایسے جذبات و احساسات اور اس کے جمال و کمال کے بہت سے ایسے نادیدہ و ناشنیدہ پہلو بھی ہیں جن کے لئے انسانی لغت میں ابھی تک الفاظ وضع نہیں کئے جا سکے، اور جن کی منظر کشی و ترجمانی کے لئے لغت کا بڑے سے بڑا ذخیرہ کفایت نہیں کرتا۔ ع

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

سیرت نبوی دوسرے افراد بنی آدم میں (بشمول انبیاء و غیر انبیاء) اپنی نزاکت و لطافت، وسعت و جامعیت، زندگی کی نازک سے نازک تفصیلات اور دقیق سے دقیق معانی و مطالب اور دل کی دھڑکنوں اور پیشانی کی سلوٹوں اور نفس انسانی کی مختلف حالتوں کے احاطہ و استیعاب اور اس کی مکمل تشریح و ترجمانی میں سب سے

ممتاز اور بلند مقام رکھتی ہے ایسا دراصل علم حدیث کی وجہ سے ممکن ہوسکا جس کی کوئی نظیر دوسرے انبیاء یا تاریخ انسانی کی عظیم شخصیتوں میں کہیں نہیں ملتی ہیرت و شمائل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں، دن ورات کے مختلف حصوں میں آپ کے اوراد واذکار اور خدا کے حضور آپ کی آہِ سحرگاہی اور گریۂ نیم شبی اور اس امت اور پوری انسانیت کے لئے آپ کی بیقراری و دل سوزی کے جو عجیب نمونے آپ کے ادعیۂ مسنونہ کے وسیع ذخیرہ[۱] میں ہمیں نظر آتے ہیں، اس کو بھی اس میں بڑا دخل ہے اسی طرح آپ کے اقوالِ ماثورہ اور جوامع الکلم اور آپ کے باکمال وصف نگاروں اور اہلِ بیت کرام نے آپ کے جو شمائل و خصائل عادات و معمولات اور روز مرّہ کی زندگی کے واقعات بیان کئے ہیں، ادبیاتِ عالم اور تاریخ وانساب کے وسیع لٹریچر نے اس سے زیادہ نازک تصویر کشی اور منظر نگاری اور انسانی خدوخال اور اس کی اخلاقی بلندیوں اور لطافتوں کی اس سے عمیق اور عظیم ترجمانی اب تک ریکارڈ نہیں کی[۲]، اس لحاظ سے سیرت کے موضوع پر کتاب کی تصنیف میں کسی طرح کی دشواری اور ابہام مفروضات قائم کرنے اور قیاس سے کام لینے کی بالکل ضرورت نہیں جو مصلحین و قائدین کے تذکرے میں بہت پیش آتی ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت ان سب سے زیادہ مکمل بھی ہے

---

۱ اس کی تفصیل کے لئے مصنف کا مقالہ "سیرت محمدی دعاؤں کے آئینہ میں" ملاحظہ فرمائیں جس میں سیرت سے ان دعاؤں کا تعلق، انسانی زندگی کے حقائق اور انسانی نفسیات و اخلاقیات سے آپ کی گہری واقفیت اور اس کے باریک سے باریک اور نازک سے نازک پہلوؤں کی کامل رعایت کا اندازہ ہوتا ہے یہ مقالہ ایک مستقل رسالہ کی شکل میں کئی بار شائع ہوچکا ہے۔ ۲ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں مصنف کی کتاب "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" مضمون "محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت و حیات قیامت تک کے انسانوں کے لئے قابل تقلید نمونہ و اسوہ اور اس کے لئے غیبی انتظامات" ساتواں خطبہ ص ۲۰۵ - ۲۱۲

اور حسین بھی، اس کی بنیاد قرآن مجید کے وہ صریح نصوص، تاریخ کی ناقابلِ تردید شہادتیں
آپ کا جمالِ صوری و معنوی شمائل و خصائل، عادات و عبادات اور اخلاق و معاملات
کی وہ واضح، روشن اور متعین تفصیلات و جزئیات ہیں جن سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا،
بایں ہمہ وہ حقیقت اور امر واقعہ سے بھی اتنی قریب ہیں جس سے زیادہ تصور ناممکن ہے۔

لیکن ان تمام باتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور مصلحین
عالم کے سوانح و حالاتِ زندگی بلکہ خود دوسرے انبیاء کرام کی سیرت میں اس قدر فرق
و تفاوت اور سیرتِ محمدی کی اس گیرائی اور ہمہ گیری اور جہاں آرائی کے باوجود، جو کمالِ
نبوت اور کمالِ آدمیت کی سدرۃ المنتہیٰ اور معراج ہے، ہم اس کا اعتراف کرنے پر
مجبور ہوتے ہیں کہ آپ کی زندگی اور مکارم اخلاق کی صحیح تصویر اور آپ کے ان معجزات کا
استیعاب و تفصیل جن کی جلوہ ریزی آپ کی پوری سیرت و دعوت اور انفرادی و اجتماعی
زندگی میں نظر آتی ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اللہ کے بندوں کے ساتھ آپ کا معاملہ،
آپ کا حسنِ صورت و سیرت و کمال ظاہر و باطن، آپ کی محبت و شفقت اور دل داری
و دلنوازی، آپ کی دعائیں اور خدا سے عرضِ حال، بنی نوع انسان اور انسانیت کے
مستقبل کے لئے آپ کی بے قراری و دل سوزی، آپ کی فصاحت و بلاغت، علم و حکمت
اور کمال و جامعیت کی ان روشن و جاں نواز نشانیوں اور زندہ و لافانی معجزوں کا
مفصل و مکمل بیان قریب قریب ناممکن ہے، سیر و شمائل کی کتابوں نے اس سلسلہ میں
جو کچھ پیش کیا ہے وہ (ان کے کمال دیدہ وری و عرق ریزی کے اعتراف کے ساتھ)
آپ کے جمالِ سیرت و کمالِ نبوّت کا صرف ایک ہلکا سا عکس ہے جو اللہ تعالیٰ نے
آپ ہی کے ساتھ مخصوص فرمایا تھا، زیادہ سے زیادہ اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ

یہ ان کی سعی محمود ہے کہ انھوں نے اس قدر ضبط و اتقان اور غایت درجہ اہتمام کے ساتھ ان حالات کو قلم بند کیا، اور اس کی بہترین جزا اللہ تعالےٰ ان کو عطا فرمائے گا، یہ ایسی مشترک، عالم گیر اور غیر مختتم دولت ہے جس میں ہر فرد بشر، ہر انسانی نسل، اور انسانوں کا ہر گروہ اور ہر طبقہ ہدایت و روشنی اور اتباع و پیروی میں اپنا حصّۂ رسدی پا سکتا اور اپنے طالع خفتہ کو بیدار کر سکتا ہے :-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ	تم کو پیغمبر خدا کی پیروی کرنی بہتر ہے
اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ	یعنی اس شخص کو جس کو خدا سے ملنے
يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ	اور روز قیامت کے آنے کی امید ہو
ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (سورۃ الاحزاب ۲۱)	اور وہ خدا کا کثرت سے ذکر کرتا ہو۔

شاید یہی اسباب و وجوہ تھے جن کی وجہ سے سیرت نبوی کے موضوع پر کسی نئی تالیف کی مجھے اب تک ہمّت نہ ہو سکی، اور میں اس عظیم الشّان کام کو اپنی حیثیت سے بہت بلند سمجھتا رہا، میرے بعض فاضل اور محترم دوستوں[1] نے مجھے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش بھی کی کہ عربی زبان میں سیرتِ نبوی پر ایک ایسی کتاب تیار کروں جس میں نئی نسل کے ذہن اور ذوق اور اس کے فہم اور نفسیات کی موجودہ سطح کا خیال رکھا گیا ہو، نیز ان نئے تقاضوں اور ضرورتوں اور اس طرزِ تحقیق اور طرزِ کلام کی اس میں پوری رعایت ہو جو موجودہ دور میں رائج ہے، اس لئے کہ ہر زمانہ کا ایک خاص اسلوب بیان اور زبان ہوتی ہے جس کا لحاظ ضروری ہوتا ہے، دواؤں

---

[1] بالخصوص مصنف کے فاضل و محترم دوست شیخ محمد محمود الصوّاف رکنِ مجلس تاسیسی رابطۂ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ و مشیر وزارتِ تعلیم حکومت سعودیہ۔

اور غذاؤں کی بھی خاص خوراکیں اور ایک خاص ترتیب ہوتی ہے جو حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، لیکن یہ سب کچھ (جیسا کہ اوپر اشارے کیے جا چکے ہیں) سیرت کو اپنی خواہشات واغراض اور ان علمی نظریات کا تابع بنائے بغیر ہونا چاہیے جو صبح وشام بدلتے رہتے ہیں، اور اس کو ان شبہات واعتراضات کی ہر آمیزش اور آلودگی سے پاک وصاف ہونا چاہیے جو اکثر مذہبی تعصب، کم علمی وناواقفیت یا سیاسی مفادات واغراض سے پیدا ہوتے ہیں۔

آخر میں اللہ تعالےٰ نے مجھے اس معاملہ میں شرح صدر نصیب فرمایا اور میں پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ اس کام میں مشغول ہو گیا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ میرے سارے لمحات اور سانسیں اسی ماحول میں گذرنے لگیں، میں نے اس سلسلہ میں نہ صرف سیرت وحدیث کی کتابیں پڑھنا شروع کیں بلکہ قدیم اور جدید لٹریچر میں جو بھی کام کی چیز مجھے ملی میں نے اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اس کے بعد میں نے اس موضوع پر جو سب سے زیادہ مستند کتابیں لکھی گئی ہیں، اس پر اعتماد کرتے ہوئے اس مبارک کام کا آغاز کیا، عہد حاضر میں اس موضوع پر جو کچھ کام ہوا ہے اور مغربی زبانوں کے اہم مآخذ سے بھی (جن سے سیرت کے بہت سے پہلوؤں کی وضاحت ہوتی ہے اور اس عہد پر اور ان حکومتوں اور سلطنتوں نیز اس زمانہ کے معاشرہ اور سوسائٹی پر روشنی پڑتی ہے) استفادہ کی کوشش کی گئی[1]، اور اس کی کوشش کی کہ کتاب علمی اور تربیتی ودعوتی دونوں پہلوؤں کی جامع ہو، اور ان میں سے کوئی ایک پہلو دوسرے پہلو پر غالب نہ آجائے، نیز اس میں وہ زندہ، منہ سے بولتے ہوئے

---

[1] عربی و دیگر زبانوں کے مآخذ کا انڈکس کتاب کے آخر میں ملاحظہ کریں۔

اور زندگی و حرارت سے بھرے ہوئے اقتباسات زیادہ سے زیادہ پیش کئے جائیں جن سے اسوۂ نبوی کے اتباع اور پیروی کا جذبہ پڑھنے والے میں خود بخود پیدا ہوتا ہے، اور جن کی نظیر کسی انسان کی سیرت کسی عظیم سے عظیم شخصیت کے سوانح کسی نسل اور قوم کی تاریخ اور کسی دعوت و تحریک اور دین و مذہب کے نقشہ میں نہیں ملتی، یہ سب کسی رنگ آمیزی، داستان طرازی اور تزئین و آرائش کے بغیر قاری کے سامنے رکھدیا جائے کر جمالِ فطرت اور حسنِ حقیقت کو ظاہری رنگ و روغن، اور مہکتے ہوئے تازہ پھولوں کو مصنوعی رنگ و بو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ع

روئے دل آرام را حاجتِ مشاطہ نیست

شوال ۱۳۹۵ھ سے شوال ۱۳۹۶ھ (اکتوبر ۱۹۷۵ء تا اکتوبر ۱۹۷۶ء) تک مجھے اس موضوع کے سوا (بعض اضطراری حالات کو چھوڑ کر) کسی اور چیز سے سروکار نہیں رہا، درمیان میں کچھ وقفے کسی بیماری کے حملہ اور مشرق و مغرب کے بعض طویل دوروں کے نذر ہوئے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے غرۂ شوال ۱۳۹۶ھ میں یہ کتاب تکمیل کو پہونچی اور اب قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

اس موقع پر اپنے ان دو فاضل دوستوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جن سے مجھے اس کتاب کی تالیف میں بڑی مدد ملی، ایک مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ حدیث و تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء جن سے احادیث کی تخریج اور تلاش و جستجو نیز کتب سیرت کے بعض مقامات کی تحقیق میں مجھے قیمتی مدد ملی، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے دوسرے سید محی الدین صاحب جنھوں نے مغربی ماٰخذ کے مطالعہ تاریخ عالم نیز مختلف دائرۃ المعارف (ENCYCLOPAEDIAS) کی چھان بین میں میری بیش قیمت

مدد کی مصنف ان کے اس گرانقدر تعاون کا معترف اور ان کی محنت وسعی اور اخلاص کے لئے شکر گذار ہے۔

اپنی معذوری کی بنا پر عرصہ سے معمول ہے کہ مضامین اور کتابیں میں املا کراتا ہوں اس لئے اس کتاب میں بھی مجھے اپنے بعض عزیز طلبہ سے مدد لینی پڑی بالخصوص عزیزان محمد معاذ اندوری ندوی اور علی احمد گجراتی اور عزیزی مولوی نور عالم امینی ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء نے تحریر و کتابت کے اس فرض کو انجام دیا' اللہ تعالیٰ ان کو اس کا صلہ عطا فرمائے۔

سیرت کی اس کتاب کے لئے نقشوں کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ ان سے بہت سی ایسی حقیقتیں آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہیں جو بعض اوقات طویل عبارتوں سے بھی سمجھ میں نہیں آتیں، یہ نقشے تاریخی معلومات اور اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں تیار کئے گئے ہیں' اور کوشش کی گئی ہے کہ وہ فنی و علمی حیثیت سے ہر طرح مکمل اور عہد جدید کے مطابق ہوں' اس سلسلہ میں ہمارے عزیز دوست محمد حسن صاحب انصاری (ایم' اے جغرافیہ) جناب پروفیسر محمد شفیع صاحب پرو وائس چانسلر و صدر شعبۂ جغرافیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و کارکنان شعبۂ جغرافیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بڑی دلچسپی لی' خدا انھیں جزائے خیر دے کہ انھوں نے اس کام کو سیرت نبوی کی ایک خدمت سمجھ کر انجام دیا' عزیزی مولوی محمد رابع ندوی مصنف "جغرافیۂ جزیرۃ العرب" و صدر شعبۂ ادب عربی دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیمتی مشورے بھی اس کام میں شامل رہے' اللہ تعالیٰ ان سب دوستوں اور عزیزوں کو جزائے خیر دے اور ان کی سعی کو مشکور فرمائے۔

مصنف کی دوسری اہم تصنیفات و مضامین کی طرح عربی سے اردو میں کتاب کے

ترجمہ کی خدمت مصنّف کے برادر زادہ عزیز سید محمد الحسنی سلّمہٗ مدیر "البعث الاسلامی" نے اپنی ایک بڑی سعادت سمجھ کر انجام دی' اس کام کے لئے وہ ہر طرح سے موزوں' اور اس کے لئے وہ دل و جان سے حاضر تھے' اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی محمود کو قبول فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے نفع پہونچائے' اس عمل کو اپنی قبولیت سے نوازے اور اس کو آخرت کا ذخیرہ اور سیرت پاک کے مطالعہ اور اس سے استفادہ اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا ذریعہ و وسیلہ بنائے' اگر یہ کتاب کسی صاحبِ ایمان کے دل میں شوق و محبّت کی ایک چنگاری بھی بھڑکا دیتی ہے' اور کسی غیر مسلم کے دل میں اس کو پڑھ کر اس نبیِّ رحمتؐ کی سیرتِ مطہّرہ کی طرف کوئی کششِ آپؐ کی محبّت کی کوئی لہر اور اسلام کے سمجھنے کا جذبہ بیدار کر دیتی ہے' اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خدا کے یہاں قبول' اور مصنّف کے لئے ذریعۂ مغفرت اور وسیلۂ شفاعت ہو تو وہ سمجھے گا کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی' اور اس کو یہ کہنے کا حق ہوگا۔ ع

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

ابوالحسن علی حسنی ندوی

دائرۂ حضرت شاہ علم اللہؒ رائے بریلی

روز جمعہ
۵/۱۱/۱۳۹۶ھ
۲۹/۱۰/۱۹۷۶ء

عہدِ جاہلیّت

مذاہب اور اہل مذاہب پر ایک اجمالی نظر چھٹی صدی عیسوی میں

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کے بڑے مذاہب' قدیم مذہبی صحیفے اور ان کے احکام و قوانین (جنھوں نے مذہب' اخلاق اور علم کے میدان میں مختلف موقعوں پر اپنا مخصوص کردار ادا کیا تھا) بازیچۂ اطفال بن چکے تھے' اور تحریف کے علم برداروں' منافقوں اور ناخدا ترس و بے ضمیر مذہبی رہنماؤں کی ذاتی اغراض کا نشانہ اور حوادثِ زمانہ کا اس طرح شکار ہو چکے تھے کہ ان کی اصل شکل و صورت کا پہچاننا مشکل بلکہ ناممکن تھا، اگر ان مذاہب کے اوّلین بانی و علم بردار اور ان کے انبیاء کرام دوبارہ واپس آکر اس حالت کو دیکھتے تو ان مذاہب کو خود نہ پہچان سکتے اور ان کا انتساب اپنی طرف کرنے پر ہرگز تیار نہ ہوتے[1]

---

[1] ان قدیم قوموں (جو بڑے مشہور مذاہب کی علم بردار رہی ہیں) کے مذہبی صحیفے جس بے دردی و بے رحمی کے ساتھ تحریف کا شکار ہوئے بلکہ جس طرح ان کی صورت و حقیقت مسخ کی گئی اور بعض اوقات ان کو مکمل طور پر تباہ و برباد کیا گیا، اس کی تفصیل مستند تاریخی شواہد و دستاویزات اور خود ان کے علماء و مذہبی رہنماؤں کے اعترافات کی روشنی میں عہد عتیق اور عہد جدید کے اسفار سے لے کر ایران کی مذہبی کتاب "اوستا" اور ہندوستان کے ویدوں تک، مصنف کی کتاب "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" کے ساتویں خطبہ (ختم نبوت) ص ۲۲۸-۲۴۲ میں ملاحظہ فرمائیں، شائع کردہ "مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام۔ لکھنؤ"

یہودی مذہب چند بے جان رسموں اور روایات کا نام تھا جن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ تھی، علاوہ بریں یہودیت بجائے خود ایک نسلی مذہب ہے جس کے پاس دنیا کے لئے کوئی پیغام، اقوامِ عالم کے لئے کوئی دعوت اور انسانیت کے لئے چارہ سازی و مسیحائی کا کوئی سامان نہیں ہے۔

یہ مذہب اپنے عقیدۂ توحید میں بھی (جو مختلف مذاہب اور قوموں میں اس کا امتیازی شعار رہا ہے جس میں اس کی عزت و شرف اور زمانۂ قدیم میں بنی اسرائیل کی دوسری قوموں پر فضیلت کا راز پنہاں ہے، اور جس کی وصیت حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام نے اپنے بیٹوں کو کی تھی) ثابت قدم نہ رہ سکا، یہودیوں نے اپنی پڑوسی قوموں کے اثر سے یا غالب و فاتح قوموں کے دباؤ سے ان کے بہت سے عقائد قبول کر لئے اور ان کی بہت سی عادتیں اور مشرکانہ بت پرستانہ اور جاہلی روایات اختیار کر لیں، اس کا اعتراف بعض منصف مزاج یہودی مورخین خود کرتے ہیں" جیوش انسائیکلوپیڈیا" کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"بت پرستی کے خلاف نبیوں کا غیظ و غضب یہ ظاہر کرتا ہے کہ دیوتاؤں کی پرستش اسرائیلی عوام کے دلوں میں گھر کر چکی تھی، اور بابل کی جلاوطنی سے واپس آنے کے وقت تک پوری طرح اس کا استیصال نہیں ہوا تھا، وہم پرستی اور سحر کے ذریعہ بہت سے مشرکانہ خیالات اور رسوم دوبارہ عوام نے قبول کر لئے تھے، تالمود سے بھی اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ بت پرستی میں یہود کے لئے بڑی جاذبیت اور کشش تھی"[1]

بابل کی تالمود[2] (جو یہودیوں میں حد درجہ مقدس سمجھی جاتی ہے اور بعض اوقات توریت

---

[1] JEWISH ENCYCLOPEDIA. VOL. XII P. P. 568-69

[2] تالمود کے معنی ہیں یہودیوں کے مذہب اور آداب کی تعلیم کی کتاب، یہ دراصل علماء یہود کی کتاب شریعت "المشنا" کے شروح و حواشی کا مجموعہ ہے جو مختلف زمانوں میں رائج رہا ہے۔

پر بھی اس کو ترجیح دی گئی ہے اور جو چھٹی صدی عیسوی میں یہودیوں میں مقبول و رائج تھی) کم عقلی، بدزبانی، خدا کے حضور جسارت و گستاخی، حقائق و مسلّمات اور دین و عقل کے ساتھ تمسخر کے ایسے عجیب و غریب نمونوں سے بھری ہوئی ہے، جن کو دیکھ کر اس صدی میں یہودی معاشرہ کی ذہنی پستی اور مذہبی ذوق کے بگاڑ کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔[1]

عیسائیت اپنے دورِ اول ہی میں انتہا پسندوں کی تحریف، جاہلوں کی تاویل اور رومی نصرانیوں کی بت پرستی کا شکار ہو گئی تھی، حضرت مسیحؑ کی سادہ و پاکیزہ تعلیمات اس تمام ملبہ کے نیچے دفن تھیں، توحید اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کا نور گھرے بادلوں کے اندر چھپ چکا تھا۔

چوتھی صدی کے آخر میں عیسائی سوسائٹی میں تثلیث کا عقیدہ کس طرح سرایت کر گیا تھا، اس کے متعلق ایک عیسائی فاضل لکھتا ہے:۔

"یہ عقیدہ کہ خدائے واحد تین اقانیم سے مرکب ہے، عیسائی دنیا کی پوری زندگی اور افکار میں چوتھی صدی کے آخر ہی میں سرایت کر چکا تھا اور طویل عرصہ تک سرکاری اور تسلیم شدہ عقیدہ کی حیثیت سے جس کو پوری مسیحی دنیا مانتی تھی باقی رہا، یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں اس عقیدہ کے تغیّر اور اس شکل تک پہونچنے کا راز فاش ہوا۔"[2]

ایک معاصر عیسائی مؤرّخ نے عیسائی سوسائٹی میں بت پرستی کے آغاز اور

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "یہودی تالمود کی روشنی میں" از ڈاکٹر روہلنگ، اور اسی سے اس کا عربی ترجمہ "الکنز المرصود فی قواعد التلمود" از ڈاکٹر یوسف حنا۔ [2] ماخوذ از NEW CATHOLIC ENCYCLOPEDIA, VOL. 14, 1967 مقالہ "تثلیث مقدس" ج ۱۴ ص ۲۹۵ باختصار۔

اس کی نوبہ تو تشکلوں اور دوسری مشرک و بُت پرست قوموں کی (ان کے مذہبی و قومی شعائر، عادات و اطوار اور تہواروں اور تقریبوں میں) اندھی تقلید، مرعوبیت یا جہالت کی بنیاد پر ان کی ہو بہو نقل کرنے کا جذبہ اور اس معاملہ میں عیسائیوں کی جدّت طرازی اور تفنّنِ طبع کا خوب ذکر کیا ہے، وہ اپنی کتاب "مسیحیت علم جدید کی روشنی میں" (THE HISTORY OF CHRISTIANITY IN THE LIGHT OF MODERN KNOWLEDGE) میں لکھتا ہے :۔

"بُت پرستی ختم تو ہوئی مگر تباہ نہیں ہوئی بلکہ جذب کر لی گئی تقریباً سب ہی کچھ جو بت پرستی میں تھا عیسائیت کے نام سے چلتا رہا، جن لوگوں کو اپنے دیوتاؤں اور مشاہیر سے ہاتھ دھونے پڑے تھے انھوں نے غیر شعوری طور پر بہت آسانی سے کسی شہید کو پرانے دیوتاؤں کے اوصاف سے متّصف کر کے کسی مقامی مجسّمہ کو اس کا نام دے دیا، اور اس طرح کافرانہ مسلک اور دیومالا ان مقامی شہداء کے نام پر منتقل ہو گئی اور خدائی اوصاف سے متّصف اولیاء کے عقیدے کی بنیاد پڑ گئی، ان اولیاء نے ایک جانب تو آرایوسین کے عقائد کی بنا پر انسان اور خدا کے درمیان نشان ایزدی رکھنے والے انسانوں کی شکل اختیار کر لی اور دوسری جانب یہ قرون وسطیٰ کے تقدّس اور پارسائی کے نشان بن گئے، بت پرستانہ تیوہار قبول کر کے ان کے نام بدل دیئے گئے یہاں تک کہ ۴۰۰ء تک پہنچتے پہنچتے سورج دیوتا کے قدیم تیوہار نے مسیح کے یوم پیدائش کی شکل اختیار کر لی"[1]

---

[1] REV. JAMES HOUSTON BAXTER IN THE HISTORY OF CHRISTIANITY IN THE LIGHT OF MODERN KNOWLEDGE (GLASGOW. 1929) p. 407

چھٹی صدی عیسوی جس وقت شروع ہوئی اس وقت شام وعراق کے عیسائیو اور مصر کے عیسائیوں کی جنگ پورے شباب پر تھی، یہ جنگ حضرت مسیح کی حقیقت و ماہیت کے موضوع پر ہو رہی تھی، اور اس کی وجہ سے مدارس، کلیسا اور گھر سب متحارب کیمپ میں تبدیل ہو گئے تھے جو ایک دوسرے کی تکفیر میں مشغول اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دو مذہبوں یا دو مخالف قوموں کی جنگ ہے[1]، اس کی وجہ سے عیسائیوں کو اس کی فرصت نہ تھی کہ عالم گیر فساد کے انسداد اور اصلاحِ حال کی کوشش کرتے اور انسانیت کو فلاح و نجات کا پیغام دیتے۔

مجوسی (ایران کے پارسی) قدیم زمانہ سے عناصرِ اربعہ (جس میں سب سے بڑا عنصر آگ تھا) کی عبادت کرتے تھے اور انھوں نے اس کے لئے مخصوص آتش کدے اور مخصوص عبادت گاہیں تعمیر کی تھیں، آتش پرستی ملک کے طول و عرض میں عام تھی، اس کے لئے بہت منظم اور دقیق قوانین و احکام مقرر تھے جن پر عمل در آمد لازمی تھا، آگ کی پرستش اور سورج کی تقدیس کے سوا ہر عقیدہ و مذہب ہاں مٹ چکا تھا، مذہب ان کے نزدیک چند رسموں یا چند قدیم روایات سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا، جن کو وہ مخصوص مقامات میں ادا کرتے تھے، عبادت گاہوں سے باہر وہ بالکل آزاد تھے، جہاں وہ اپنی مرضی اور خواہشِ نفس کے مطابق زندگی گذارتے تھے، ایک مجوسی اور ایک بے دین، بے ضمیر و بے کردار شخص میں کوئی فرق باقی نہ رہ گیا تھا[2]۔

"ایران بعہدِ ساسانیان" کے مصنف آرتھر کرسٹین سین نے اس زمانہ کے

---

[1] دیکھئے ALFRED J. BUTLER کی کتاب "ARABS' CONQUEST OF EGYPT AND THE LAST THIRTY YEARS OF ROMAN DOMINION" (OXFORD 1902). P. P. 44-45

[2] ایران بعہد ساسانیان ص ۱۵۵

مذہبی فرائض اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"سرکاری ملازمین کے لئے لازمی تھا کہ وہ دن میں چار بار سورج کی پوجا کریں چاند کی آگ کی اور پانی کی پوجا اس کے علاوہ بھی سونے جاگنے، نہانے جنیو پہننے، کھانے پینے، چھینکنے، حجامت بنوانے اور ناخن ترشوانے قضاء حاجت اور شمع جلانے ہر کام کے لئے دعائیں تھیں اور ان کا کرنا ان پر ضروری تھا ان کو اس کا بھی حکم تھا کہ آگ کسی وقت بجھنے نہ پائے اور آگ پانی ایک دوسرے سے نہ ملیں، دھات کو زنگ نہ لگے اس لئے کہ معدنیات بھی ان کی نگاہ میں مقدس تھیں[1]

اہل ایران آگ کی طرف رخ کرکے عبادت کرتے تھے، ایران کے آخری بادشاہ یزدگرد نے ایک مرتبہ سورج کی قسم کھاتے ہوئے یہ جملہ کہا تھا کہ " میں سورج کی قسم کھاتا ہوں جو سب سے بڑا معبود ہے" اس نے ان عیسائیوں کو جنھوں نے عیسائیت سے توبہ کرلی تھی، اس کا پابند کیا تھا کہ وہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے سورج کی پوجا کریں[2]، اہل ایران ہر زمانہ میں ثنویت کا شکار رہے، حتی کہ یہ ان کی علامت اور پہچان بن گئی، وہ دو خداؤں کے قائل تھے، ایک روشنی یا خیر کا خدا جس کو وہ آہورمزدا یا یزداں کہتے تھے، دوسرا ظلمت یا شر کا خدا جس کا نام انھوں نے اہرمن تجویز کیا تھا، ان کا عقیدہ تھا کہ ان دونوں خداؤں میں باہمی کش مکش اور طاقت آزمائی برابر جاری ہے[3]"

---

[1] ایران بعہد ساسانیان (ترجمہ اردو از فرنچ) بقلم پروفیسر محمد اقبال اورنٹیل کالج لاہور ص ۱۵۵

[2] ایضاً ص ۱۸۶-۱۸۷ [3] ایران بعہد ساسانیان باب (مذہب زردشت بسرکاری مذہب) ص ۱۸۳-۲۳۳

ایرانی مذہب کے ان موّرخین نے ان کے معبودوں کے متعلق جو کہانیاں لکھی ہیں اور پورا علم الاصنام MYTHOLOGY تیار کر دیا ہے وہ اپنی بوالعجبی عجائب پسندی اور تفصیلات و جزئیات میں یونانی یا ہندوستانی دیومالا سے کسی طرح کم نہیں۔[۱]"

بودھ مذہب جو ہندوستان اور وسطِ ایشیاء میں پھیلا ہوا تھا وہ بھی ایک ایسے بت پرستانہ مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا کہ بُت اس کے جلو میں چلتے تھے، جہاں اس کے قافلہ کا پڑاؤ ہوتا وہاں گوتم بدھ کی مورتی نصب کی جاتی اور دیکھتے دیکھتے ایک معبد تیار ہو جاتا۔[۲] اہلِ علم واصحابِ نظر کو اس مذہب اور اس کے بانی کے بارے میں ابھی تک یہ شبہ ہے کہ آسمان و زمین اور خود انسان کے خالق خدا کے وجود پر بھی ان کا عقیدہ و ایمان تھا یا نہیں، ان کو حیرت ہے کہ ایمان و عقیدہ کے بغیر یہ عظیم مذہب کیسے قائم رہ سکا۔[۳]

جہاں تک ہندو مذہب کا تعلق ہے وہ دیوی دیوتاؤں کی کثرت میں دوسرے مذاہب سے بہت آگے ہے چھٹی صدی میں بت پرستی اس میں پورے شباب پر تھی، معبودوں کی تعداد اس صدی میں (۳۳) کروڑ تک بتائی جاتی ہے، غرض ہر عظیم یا ہیبت ناک یا نفع پہونچانے والی شئے معبود تھی، بت تراشی اور مجسّمہ سازی کا فن بھی نقطۂ عروج پر تھا اور اس میں طرح طرح کی جدّت طرازیاں کی جاتی تھیں۔[۴]"

---

[۱] دیکھئے "ایران بعہدِ ساسانیان" صفحہ ۲۰۴-۲۰۹ [۲] دیکھئے کتاب "ہندوستانی تمدن" اردو از ایشور اٹوپا صفحہ ۲۰۹ پروفیسر تہذیب ہند حیدرآباد یونیورسٹی، نیز کتاب DISCOVERY OF INDIA "از پنڈت جواہر لال نہرو صفحہ ۲۰۱-۲۰۲ [۳] دیکھئے بودھ مذہب پر مقالہ "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا"

[۴] دیکھئے آر سی دت کی کتاب ANCIENT INDIA ج ۳ صفحہ ۲۷۶ اور

L. S. S. O'MALLEY : POPULAR HINDUISM—THE RELIGION OF THE MASSES. (CAMBRIDGE, 1935) P. P. 6-7

ایک ہندو فاضل (C. V. VAIDYA) اپنی کتاب "ہسٹری آف میڈیول ہندو انڈیا (HISTORY OF MEDIAEVAL HINDU INDIA) میں راجہ ہرش (۶۰۶-۶۴۸ء) کے بارے میں لکھتے ہیں، یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جس کے بعد ہی جزیرۃ العرب میں اسلام کا ظہور ہوا:-

"اس زمانہ میں ہندو مذہب اور بدھ مت دونوں ہی یکساں طور پر بُت پرست تھے، بلکہ شاید بدھ مت بت پرستی میں ہندو مذہب سے بھی آگے بڑھ گیا تھا، یہ مذہب حقیقتاً خدا کے انکار سے شروع ہوا لیکن آخر کار اس نے بدھ کو ہی سب سے بڑا خدا بنا لیا، بعد میں اور دوسرے خداؤں مثلاً BODHISATVAS کا اضافہ ہوتا گیا اور خصوصاً مہایانا مذہب (اسکول) میں بت پرستی نے حتمی طور پر قدم جمالئے، ہندوستان میں اسے اس قدر عروج حاصل ہوا کہ بعض مشرقی زبانوں میں بدھ کا نام ہی بت کے ہم معنیٰ ہوگیا"[1]

اس میں شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ بت پرستی اس زمانہ میں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی، بحرِ اوقیانوس سے بحرالکاہل تک دنیا بت پرستی میں غرق تھی، عیسائیت، سامی مذاہب، بدھ مت گویا بتوں کی تعظیم و تکریم میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے[2]

---

[1] VOL. I, POONA, 1924, P. 101 فارسی اور اردو ادب میں بت کا لفظ جس کثرت سے استعمال کیا گیا ہے، اس کی تصدیق ہوتی ہے یوں بھی بدھ اور بت صوتی حیثیت سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔

[2] C. V. VAIDYA : HISTORY OF MEDIAEVAL HINDU INDIA VOL. I. (POONA 1924) P. 101

ایک اور ہندو فاضل اپنی کتاب POPULAR HINDUISM-THE RELIGION OF THE MASSES میں لکھتے ہیں:۔

"خدا سازی کا عمل یہیں پر ختم نہیں ہو گیا بلکہ مختلف زمانوں میں اس خدائی اکاڈمی یا کونسل میں اتنی بڑی تعداد کا اضافہ ہو گیا کہ اس کا شمار مشکل ہے' ان میں بہت سے ہندوستان کے قدیم باشندوں کے معبود تھے' جن کو ہندو مذہب کے دیوتاؤں اور خداؤں کے ساتھ شامل کر لیا گیا تھا' ان کی کل تعداد تینتیس ۳۳ ملین (۳۳ کروڑ) بتائی جاتی ہے[1]"

جہاں تک ان عربوں کا تعلق ہے جو عہدِ قدیم میں دینِ ابراہیمی کے حامل تھے' اور جن کی سرزمین میں خدا کا سب سے پہلا گھر تعمیر ہوا وہ نبوّت اور انبیاء کرام سے بُعدِ زمانی اور جزیرہ نمائے عرب میں محصور رہنے کی وجہ سے بہت گھٹیا درجہ کی بُت پرستی میں مبتلا تھے' جس کی نظیر ہندوستان کے بت پرستوں اور مشرکوں کے سوا اور کہیں نہیں ملتی' وہ شرک میں بھی بہت آگے تھے' اور خدا کو چھوڑ کر بہت سے معبود انھوں نے تجویز کر لئے تھے' اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ خود ساختہ معبود کائنات کے نظم و انتظام میں خدا کے ساتھ شریک ہیں' اور نفع نقصان پہونچانے اور زندہ رکھنے اور مارنے کی ذاتی صلاحیت اور قدرت رکھتے ہیں' چنانچہ پوری عرب قوم بتوں کی پرستش میں ڈوب چکی تھی' ہر قبیلہ اور علاقہ کا علیحدہ معبود تھا' بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہر گھر صنم خانہ تھا[2]۔

خود کعبہ کے اندر اور اس کے صحن میں' جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف

---

[1] L. S. S. O'MALLEY C. I. E. I. C. S., POPULAR HINDUISM—THE RELIGION OF THE MASSES (CAMBRIDGE, 1935) PP. 6-7

[2] دیکھئے کتاب الاصنام لابن الکلبی، ص ۳۳

اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے تعمیر کیا تھا) تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت تھے[1]، وہ بتوں اور معبودوں کی عبادت سے آگے بڑھ کر ہر قسم کے پتھروں کو پوجنے لگے تھے، اور فرشتوں اور جنوں اور ستاروں کو بھی اپنا معبود سمجھتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں، جن خدا کے شریک ہیں، اس وجہ سے وہ ان کی طاقت اور اثر کے قائل تھے اور ان کی عبادت کرنا ضروری سمجھتے تھے۔[2]

دنیا کے ملکوں اور قوموں پر ایک عمومی نظر

یہ ان مذاہب کا حال تھا جو اپنے اپنے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے کے لئے آئے تھے، جہاں تک ان متمدن ممالک کا تعلق ہے جہاں عظیم الشان حکومتیں قائم تھیں، علوم و فنون کا بازار گرم تھا اور جو تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت اور علوم و فنون کا مرکز سمجھے جاتے تھے، وہاں مذاہب کی شکل بالکل مسخ ہو چکی تھی اور انھوں نے اپنی اصل حقیقت اور قدر و قیمت اور قوت و افادیت کھو دی تھی، اور مصلحین اور معلمینِ اخلاق دور دور نظر نہ آتے تھے۔

مشرقی رومی سلطنت

مشرق کی رومن شہنشاہی[3] میں ٹیکسوں کی اتنی بھرمار تھی کہ اہل ملک اپنی حکومت پر

---

[1] صحیح بخاری (کتاب المغازی) باب فتح مکہ [2] کتاب الاصنام ص ۳۴

[3] مشرقی رومی سلطنت کا ذکر تاریخ میں بازنطینی سلطنت کے نام سے آتا ہے، عرب اس کو روم کہتے ہیں جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس کی قلمرو میں حسب ذیل ممالک شامل تھے، یونان، بلقان ایشیائے کوچک، سیریا و فلسطین، پورا بحر روم کا علاقہ اور کل شمالی افریقہ۔ اس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا، اس سلطنت کا آغاز ۳۹۵ء میں ہوا، اور اختتام ۱۴۵۳ء میں جب قسطنطنیہ پر عثمانی ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔

ہر غیر ملکی حکومت کو ترجیح دینے لگے تھے بار بار انقلابات اور بغاوتیں ہوتی تھیں، صرف ۵۳۲ء کے ایک فساد میں قسطنطنیہ کے تیس[۳] ہزار آدمی قتل کئے گئے[۱]، ان کا سب سے بڑا شغلہ اور دلچسپی کسی نہ کسی ذریعہ سے مال حاصل کرنا پھر عیش و عشرت میں اس کو خرچ کرنا تھا، تفریح و تعیش میں وہ اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ اس کی سرحدیں درندگی و بربریت سے مل گئی تھیں[۲]۔

"CIVILIZATION PAST AND PRESENT" کے مصنفین نے بازنطینی سوسائٹی کے اس عجیب تضاد اور اخلاقی فساد، تفریح طبع اور تعیش کے عشق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"بازنطینیوں کی سماجی زندگی میں زبردست تضاد پایا جاتا تھا، مذہبی رجحان ان کے ذہنوں میں گہرے طور پر پیوست ہو چکا تھا، ترکِ دنیا اور رہبانیت سلطنت کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھی اور معمولی درجہ کا شہری بھی عمیق مذہبی مباحث میں گہری دلچسپی لیتا تھا، اور اسی کے ساتھ سبھی لوگوں کی روزمرّہ کی زندگی پر اسرار پسندی اور باطنیت کی چھاپ لگی ہوئی تھی لیکن اس کے برعکس یہی لوگ ہر قسم کے کھیل تماشوں کے غیر معمولی شائق بھی تھے، زبردست سرکس کے میدان تھے جس میں اسّی ہزار تماش بینوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی جہاں رتھوں کی دوڑ کے زوردار مقابلے ہوا کرتے تھے، عوام کو "نیلے" اور "ہرے" دو گروہوں میں بانٹ دیا گیا تھا، بازنطینیوں

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، مقالہ "JUSTINIAN"

[۲] ملاحظہ ہو EDWARD GIBBON: DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE

ہیں حُسن سے پیار بھی تھا، اور ظلم و خباثت کا رُجحان بھی ان کے کھیل تماشے اکثر خونریز اور اذیت رساں ہوتے تھے' ان کی اذیتیں ہولناک اور ان کے خواص کی زندگی عیش و طرب، سازش، تکلفات اور برائیوں سے مرکب تھی"[۱]

مصر (جو دولت مند بازنطینی سلطنت کی ایک ریاست تھی) زبردست مذہبی مظالم اور بدترین سیاسی استبداد کا شکار تھا، اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ بازنطینی سلطنت کی خوش حالی کا بڑا ذریعہ اور سرچشمہ بھی تھا، اس کی مثال اس گائے کی سی تھی جس کو اچھی طرح دوہا جائے اور چارہ کم سے کم دیا جائے[۲]۔

شام جو بازنطینی شہنشاہی کی دوسری ریاست تھی، اہلِ روما کی توسیع پسندی اور ہوسِ ملک گیری کا شکار تھا، جہاں صرف طاقت کے سہارے غیر ملکیوں کی طرح حکومت کی جاتی تھی، اور محکوم رعیت کو کبھی شفقت و محبت سے واسطہ نہ پڑتا تھا، افلاس کا حال یہ تھا کہ اکثر شامی اپنا قرض ادا کرنے کے لئے اپنے بچوں کو فروخت کر دیتے تھے مختلف نوع کے مظالم اور حق تلفیوں، غلام بنانے اور بیگار لینے کا عام رواج تھا۔[۳]

ایرانی شہنشاہی

مذہب زردشت، جس نے مزدائیت کی جگہ لی، ایران کا قدیم مذہب ہے زردشت جو اس مذہب کا بانی تھا، ساتویں صدی قبل مسیح میں ظاہر ہوا، ایرانی شہنشاہی

---

[۱] T. WALTER WALL BANK AND ALASTAIR, M. TAYLOR, CIVILIZATION, PAST AND PRESENT (1954). P. 261-62.

[۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الفرڈ بٹلر کی کتاب THE ARAB CONQUEST OF EGYPT. اور HISTORIANS, HISTORY OF THE WORLD, VOL. VII

[۳] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "خطط الشام" از کرد علی ج ا ص ۱۰۱

مشرق کی رومن شہنشاہی سے (رومۃ الکبریٰ سے علیحدگی کے بعد) اپنے رقبہ، ذرائع آمدنی اور شان و شوکت میں زیادہ بڑی تھی، اس کی بنیاد ۲۲۴ء میں اردشیر کے ہاتھوں پڑی، اپنے عروج کے زمانہ میں اسیریہ، خوزستان، میڈیا، فارس، آذربائیجان، طبرستان، سرخس، مرجان، کرمان، مرو، بلخ، سغد، سیستان، ہرات، خراسان، خوارزم، عراق اور یمن سب اس کی قلمرو میں شامل تھے، کسی زمانہ میں گذرگاہ دریائے سندھ کے درمیانی اضلاع اور اس کے دہانے کے آس پاس کے صوبے یعنی کچھ، کاٹھیاواڑ، مالوہ ان کے پرے کے علاقے بھی اس کے زیرنگیں تھے۔

طیسفون (المدائن) جو اس شہنشاہی کا پایۂ تخت اور شہروں کا ایک مجموعہ تھا، جیسا کہ اس کے عربی نام سے اندازہ ہوتا ہے، پانچویں صدی میں اور اس کے بعد کے زمانہ میں اپنے تمدن و ترقی اور تعیّش و اسراف کے آخری نقطہ پر تھا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے "ایران بعہدِ ساسانیان" از پروفیسر آرتھر کرسٹن سین)

مذہب زرتشتی اول روز سے نور و ظلمت اور خیر و شر کی کش مکش اور بھلائی کے خدا اور بُرائی کے خدا کے درمیان مسلسل معرکہ آرائی کے تصور پر قائم تھا، تیسری صدی عیسوی میں "مانی"[1] اس مذہب کے ریفارمر اور مُصلح کی حیثیت سے سامنے آیا، اس کے بعد شاہ پور (اردشیر بانی دولت ساسانیان م ۲۴۱ء کے بعد کا حکمراں) پہلے اس مذہب کا پیرو و داعی، اور پھر اس کا مخالف ہوگیا، اس لئے کہ مانی دنیا سے شر و فساد کا مادّہ ختم کرنے کے لئے تجرّد کی زندگی کا داعی تھا، اس کی دعوت یہ تھی کہ نور و ظلمت کا امتزاج بجائے خود

---

[1] "مانی" کی تعلیمات اور دعوت و فلسفہ کو سمجھنے کے لئے "ایران بعہدِ ساسانیان" کا چوتھا باب بعنوان "پیغمبر مانی اور اس کا مذہب" ملاحظہ کریں ص ۲۳۳-۲۶۹

ایک ایسا شر اور ایسی برائی ہے جس سے انسان کو چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے' اس نے فنائیت اور عدم سے جلد ہم آغوش ہونے ظلمت پر نور کے غلبہ کے لئے نسل انسانی کے سلسلہ کو ختم کرنے اور ازدواجی تعلقات کو ختم کرنے کا راستہ اختیار کیا، اس نے کئی سال جلاوطنی میں گزارے' پھر ایران واپس آیا، اور بہرام اوّل کے عہد میں مارا گیا، لیکن اس کی تعلیمات اس کی موت کے بعد بھی زندہ رہیں' اور ایرانی طرزِ فکر اور ایرانی سوسائٹی کو طویل عرصہ تک متاثر کرتی رہیں۔

پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں "مزدک" ظاہر ہوا، اور اس نے مال و دولت اور عورت میں مکمل مساوات اور اشتراک کی کھلی ہوئی دعوت دی اور یہ چیزیں تمام انسانوں کے لئے بلا کسی قید و لحاظ کے جائز کر دی گئیں' اس کی دعوت نے جلد ہی قوت پکڑ لی، حالت یہ ہو گئی کہ لوگ جس کے گھر میں چاہتے بے تکلف گھس جاتے اور اس کے مال و اسباب اور عورتوں پر زبردستی قبضہ کر لیتے، ایک قدیم ایرانی دستاویز میں جو نامۂ تنسر کے نام سے موسوم ہے' ان حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے جو مزدکیت کے عروج اور تسلط و اقتدار کے زمانہ میں نظر آتے ہیں:۔

"ناموس ادب کا پردہ اُٹھ گیا، ایسے لوگ پیدا ہو گئے جن میں نہ شرافت تھی نہ عمل، نہ ان کے پاس موروثی جاگیر تھی' اور نہ انھیں خاندان اور قوم کا غم تھا، نہ ان میں صنعت تھی نہ حرفت، نہ انھیں کسی قسم کی فکر دامن گیر تھی اور نہ ان کا کوئی پیشہ تھا، چغلی اور شرارت میں مستعد اور دروغ بیانی اور تہمت میں مشاق تھے' یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا، اور اسی کو وہ تحصیل مال و جاہ کا وسیلہ بناتے تھے"[1]

---

[1] از نامۂ تنسر طبع مینوی صـ ۱۳

آرتھر کرسٹن سین اپنی کتاب "ایران بعہد ساسانیان" میں لکھتا ہے:۔

"نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف کسانوں کی بغاوتیں برپا ہوگئیں، لوٹ مار کرنے والے امراء کے محلوں میں گھس جاتے تھے، مال و اسباب لوٹ لیتے تھے، عورتوں کو پکڑ لے جاتے تھے اور جاگیروں پر قبضہ کر لیتے تھے، زمینیں رفتہ رفتہ غیر آباد ہوگئیں، اس لئے کہ یہ نئے جاگیردار زراعت سے بالکل ناواقف تھے۔"[1]

ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ایران میں انتہا پسندانہ دعوتوں اور تحریکوں کو قبول کرنے کی عجیب و غریب صلاحیت تھی، اور وہ ہمیشہ شدید عمل و ردِ عمل کے اثر میں رہا اور فلسفۂ لذتیت[2]، اور آخری درجہ کی رہبانیت اور نفس کشی کے درمیان ہمیشہ ہچکولے کھاتا رہا، کبھی وہ خاندانی و موروثی جاگیردارانہ نظام یا مذہبی اجارہ داری کے دباؤ میں رہا، کبھی بے قید اشتراکیت اور مطلق العنان انارکی و لاقانونیت کے مہیب سایہ میں، اس کی وجہ سے اس میں وہ توازن، اعتدال اور سکون و سنجیدگی کبھی پیدا نہ ہو سکی جو فطری و صحت مند معاشرہ کے لئے ضروری ہے۔

اس شہنشاہی میں (خاص طور پر ساسانی عہدِ اقتدار میں چھٹی صدی تک) حالت بہت بگڑ چکی تھی، پورا ملک ان سلاطین کے رحم و کرم پر تھا جو موروثی طور پر تخت و تاج کے مالک بنتے تھے، اور اپنے کو عام انسانوں سے بالاتر سمجھتے تھے، بادشاہ آسمانی خداؤں کی نسل سے تسلیم کیا جاتا تھا، خسرو دوم پرویز اپنے نام کے ساتھ حسبِ ذیل القاب لکھتا ہے:۔

"خداؤں میں انسانِ غیر فانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی، اس کے نام کا

---

[1] از نامۂ تنسر طبع مینوی ص ۴۷ [2] یونانی فلسفی (EPICURUS) کا نکالا ہوا فلسفہ و مذہب تھا اس کا کہنا تھا کہ لذت ہی سب کچھ ہے، اور وہی سب سے بڑی چیز ہے۔

بول بالا، آفتاب کے ساتھ طلوع کرنے والا، شب کی آنکھوں کا اجالا"![1]

ملک کی تمام دولت اور آمدنی کے وسائل ان بادشاہوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے، دولت جمع کرنے تحائف و نوادر اور قیمتی اشیاء اکٹھا کرنے کے جنون معیارِ زندگی کی بلندی اور جدت طرازی، زندگی سے لطف اندوز ہونے اور تفریح و تعیش کے شوق، دولت مند بننے اور دنیا کے مزے اڑانے کی ریس اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ اس پر خیال آرائی اور شاعری کا شبہ ہونے لگتا ہے اور اس کا تصور صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے قدیم ایران کی تاریخ اور شعر و ادب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو، اور شہر مدائن ایوانِ کسریٰ بہار کسریٰ[2] (وہ قالین جس پر موسم بہار میں شاہانِ ایران شراب نوشی کیا کرتے تھے) تاج کسریٰ اور ایرانی بادشاہوں سے وابستہ خدم و حشم، بیویوں اور لونڈیوں، خدمت گار لڑکوں باورچیوں اور خانساماؤں، پرندوں اور درندوں کے سدھانے والے اور سامانِ شکار اور ظروف و برتنوں کی ان افسانوی تفصیلات و جزئیات[3] سے واقف و باخبر ہو، اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں ایران کا آخری تاجدار یزدگرد اپنے دار الحکومت مدائن سے فرار ہوا تو اس حالت میں بھی اس کے ساتھ ایک ہزار باورچی ایک ہزار مغنی، ایک ہزار چیتوں کے منتظم اور ایک ہزار شکروں کی دیکھ بھال کرنے والے اور خدم و حشم اور مصاحبین کی ایک بڑی تعداد تھی، اتنے بڑے لاؤ لشکر کے باوجود بھی وہ اس تعداد کو کم اور خود کو ایک انتہائی معمولی اور حقیر پناہ گزیں سمجھتا تھا، وہ محسوس کرتا تھا کہ مصاحبین و ملازمین کی تعداد اور تعیش و تفریح کے سامان کی کمی کے باعث اس کی حالت انتہائی قابل رحم ہے۔[4]

---

[1] ایران بعہدِ ساسانیان ص ۳۳۹ [2] اس کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۷۵
[3] دیکھئے شاہین مکاریوس کی تاریخ ایران، عربی طبع ۱۸۹۸ء ص ۹۵ [4] ایضاً

دوسری طرف غریب عوام سخت مفلوک الحال اور مصیبت زدہ تھے اور اپنی قسمت کو روتے تھے، ان کو جسم و جان کا رشتہ باقی رکھنے کے لئے بھی سخت جدّوجہد کرنی پڑتی تھی مختلف قسم کے ٹیکسوں طرح طرح کی بندشوں اور بیڑیوں نے ان کی زندگی کو عذابِ جان بنا دیا تھا، اور وہ مویشیوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے، اس مصیبت سے تنگ آکر اور ان ٹیکسوں اور لازمی فوجی بھرتی سے عاجز ہو کر بہت سے کسانوں نے اپنے کھیتوں کو خیرباد کہہ دیا اور راہبوں کی خانقاہوں اور معبدوں میں پناہ لی[۱]، وہ مشرقی ساسانی سلطنت اور مغربی بازنطینی سلطنت کی طویل و خون آشام جنگوں میں (جو تاریخ کے مختلف وقفوں میں ہوتی رہیں) اور جن میں نہ عوام کی کوئی مصلحت اور نہ ان کو اس سے کوئی دلچسپی تھی) حقیر ایندھن کی طرح کام آتے رہے۔

ہندوستان

ہندوستان جو عہد قدیم میں ریاضیات، فلکیات اور طب و فلسفہ میں دنیا میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا، اس کے متعلق مورخین کی عام رائے یہ ہے کہ اس کا مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی طور پر سب سے تاریک اور بدترین دور چھٹی صدی عیسوی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے[۲]، بے حیائی اور عیاشی سے ان کی عبادت گاہیں بھی پاک نہ تھیں اور ان کاموں میں کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا، اس لئے کہ مذہب نے ان کو تقدس اور عبادت کا رنگ دے دیا تھا[۳]، عورت کی کوئی قیمت اور عزت و عصمت باقی نہ رہی تھی

---

۱ دیکھئے "ایران بعہدِ ساسانیان" کا پانچواں باب، ۲ دیکھئے "ANCIENT INDIA." ج ۳ مؤلفہ آر، سی، دت ۳ ملاحظہ ہو ستیارتھ پرکاش از دیانند سرسوتی ص ۳۴۴

شوہر اپنی بیوی کو جوئے میں ہار جاتا تھا[1]، اگر اس کا شوہر مر جاتا تھا تو وہ زندہ در گور کی مانند ہوتی تھی، نہ شادی کر سکتی تھی، نہ اس کو کوئی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا، شوہر کے انتقال پر عورت کے ستی ہو جانے کا اعلیٰ اور خوش حال خاندانوں میں رواج تھا، اور اس کا مقصد اظہارِ وفاداری اور ننگ و عار سے گلو خلاصی تھا، یہ بدترین رسم انگریزی اقتدار کے بعد ہی ختم کی جا سکی[2]۔

ہندوستان اپنے پڑوسیوں اور دنیا کے دوسرے ملکوں کی برادری میں طبقاتی عدم مساوات اور انسانوں کے درمیان فرق و امتیاز میں بہت آگے تھا، یہ ایک سخت اور بے رحمانہ نظام تھا جس میں نرمی اور لچک کی کوئی گنجائش نہ تھی، اس امتیازی سلوک کو مذہب اور عقیدہ کی سند اور پشت پناہی حاصل تھی اور آرین حملہ آوروں کی مصلحت اور مذہب اور تقدس کے اجارہ دار برہمنوں کے مفاد کا بھی یہی تقاضا تھا، یہ نظام ان پیشوں کی بنیاد پر قائم تھا، جو مختلف برادریوں اور ذاتوں میں نسلی طور پر چلے آرہے تھے، اس کے پیچھے اس ملکی، سیاسی اور مذہبی قانون کی طاقت تھی جس کو ان ہندو قانون سازوں نے وضع کیا تھا جو مذہبی حیثیت کے بھی مالک تھے، یہ قانون بلا کم و کاست پورے معاشرہ پر نافذ تھا، اور اس کو زندگی کا دستور العمل سمجھا جاتا تھا، اس نے ہندوستان کے باشندوں کو چار طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

۱۔ مذہب کے اجارہ دار اور پروہت جن کو برہمن کہا جاتا تھا۔

۲۔ سپاہی اور فوج میں بھرتی ہونے والے افراد یعنی چھتری۔

۳۔ زراعت پیشہ اور تجارت کرنے والے یعنی ویش۔

---

[1] دیکھئے مہابھارت کا ابتدائی حصہ [2] دیکھئے فرانسیسی سیاح برنیر کا سفرنامہ نیز قرون وسطی کے راجگان کی تاریخ

۴۔ نوکر چاکر اور خدمت گار یعنی "اچھوت"۔

یہ آخری طبقہ (جو سب سے بڑی تعداد میں تھا) پستی کی آخری منزل میں تھا، اس کے متعلق یہ تصور تھا کہ وہ خالق کائنات کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے، اس لئے اس کا کام صرف ان تینوں طبقوں کی خدمت کرنا اور ان کو آرام و راحت پہنچانا ہے۔

اس قانون نے برہمنوں کو اتنے حقوق دے دیئے تھے اور ان کو اتنا بلند رتبہ عطا کیا تھا جس میں کوئی دوسرا ان کے برابر نہ تھا، برہمن کے سارے گناہ معاف تھے خواہ وہ تینوں دنیاؤں کو اپنے گناہوں اور بدکرداریوں سے گندہ اور تباہ و برباد کر دے، اس پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا تھا، اس کو کسی صورت میں بھی سزائے موت نہیں دی جا سکتی تھی، اس کے برعکس اچھوت نہ کچھ کما سکتے تھے نہ جمع کر سکتے تھے، نہ کسی برہمن کے قریب بیٹھ سکتے تھے نہ اس کے بدن کو چھو سکتے تھے، نہ مقدس کتابوں کا پڑھنا ان کے لئے جائز تھا۔[۱]

اہل حرفہ اور خدمت کرنے والے طبقہ کے لوگ (جو چنڈال کہلاتے تھے) شہر سے باہر رہتے تھے، رات کو (خواہ کوئی موسم ہو) ان کا شہر میں رہنا ممکن نہ تھا، شہر کی چہار دیواری میں طلوع آفتاب کے بعد وہ کام کرنے کے لئے داخل ہوتے تھے، اور غروب سے پہلے ان کو باہر نکل جانا پڑتا تھا۔[۲]

۱؎ اس قانون کی تفصیلات اور دفعات جاننے کے لئے منو شاستر کا مطالعہ کریں۔ باب ۱-۲-۸-۹-۱۰-۱۱۔ ۲؎ قطب الدین ایبک کے عہد میں (۱۲۰۶ء - ۱۲۱۰ء) یہ جابرانہ نظام ختم ہوا، اور شہر کی چہار دیواری طبقاتی تقسیم کی نشانی ہونے کے بجائے "شہر پناہ" بن کر رہ گئی، اور شہروں میں امراء کے محلات، اور فقراء کے جھونپڑے ایک ساتھ نظر آنے لگے۔

پورا ملک انتشار کا شکار تھا، اور ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا، اس میں سینکڑوں ریاستیں اور حکومتیں تھیں جو اکثر برسرپیکار رہتی تھیں، بدامنی اور بدانتظامی اور رعیت کی طرف سے بے پرواہی اور ظلم و استبداد عام تھا۔

علاوہ بریں یہ ملک دنیا سے کٹ کر زندگی گذار رہا تھا، اس پر جمود طاری تھا وہ عادات و روایات اور رسم و رواج کے سخت شکنجہ میں گرفتار، طبقاتی کش مکش اور ناہمواری کا شکار، اور خون، نسل اور نسب کے تعصّبات سے زار و نزار ہو رہا تھا، ایک ہندو مؤرخ ودیادھر مہاجن سابق پروفیسر تاریخ، پنجاب یونیورسٹی کالج، اسلام کی آمد سے قبل ہندوستان کی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان کے عوام ساری دنیا سے کٹے ہوئے تھے، وہ اپنے آپ میں مگن اور دنیا کے حالات سے بے خبر تھے، اور اس بے خبری نے ان کی پوزیشن بہت کمزور کر دی تھی، ان میں جمود پیدا ہو چکا تھا اور ہزیمت و انحطاط کے آثار نمایاں تھے، اس زمانہ کے ادب میں کوئی جان نہیں تھی، فن تعمیر، مصوّری اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں بھی انحطاط تھا، ذات پات کی پابندیاں شدید تھیں، بیواؤں کی شادی نہیں کی جاتی تھی، اور کھانے پینے کے سلسلہ میں شدید پابندیاں تھیں، اچھوت بستیوں کے باہر رہنے پر مجبور تھے"[1]

جزیرة العرب

عربوں کے اخلاق بھی بہت بگڑ چکے تھے، وہ شراب اور جوئے کے رسیا تھے،

---

[1] VIDYADHAR MAHAJAN: MUSLIM RULE IN INDIA, (NEW DELHI 1970), P. 33

ان کی قساوتِ قلبی اور حمیّتِ جاہلی کا اندازہ ان کے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے سے کیا جا سکتا ہے، قافلوں کو لوٹنا، اور بے گناہوں کو تہِ تیغ کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، عورت کی ان کے یہاں کوئی عزّت باقی نہ تھی، مکان کے دوسرے سامان و اسباب کی طرح یا مویشیوں کی طرح جہاں چاہتی منتقل کی جاتی، یا ورثہ میں ملتی، کچھ کھانے مردوں کے ساتھ مخصوص تھے، عورتیں ان کو استعمال نہیں کر سکتی تھیں، آدمی جتنی عورتوں سے چاہتا شادی کر سکتا تھا، بعض لوگ اپنی اولاد کو افلاس اور معاشی پریشانی کے خوف سے قتل کر ڈالتے تھے۔[1]

قبائلی اور نسلی، خاندانی اور خونی عصبیت اور جنبہ داری بے حد شدید تھی جنگ ان کی گھٹی میں پڑی تھی، اور ایک دوسرے کو قتل کرنا ان کے لئے ایک کھیل اور تفریح تھا ایک معمولی واقعہ اکثر بڑی خوں ریز اور طویل جنگوں کا سبب بن جاتا بعض جنگوں کا سلسلہ ۴۰ ـ ۴۰ سال چلا اور ہزاروں آدمی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔[2]

یورپ

یورپین قومیں جو شمال و مغرب کے اندر دور تک آباد تھیں، جہالت و ناخواندگی کے مہیب سایہ میں تھیں، اور خوں ریز جنگوں میں مشغول، وہ تمدنِ انسانی کے کارواں سے بہت پیچھے اور علوم و فنون کی دنیا سے بہت دور تھیں، نہ بیرونی دنیا کو ان سے کوئی سروکار تھا نہ ان کو بیرونی دنیا سے کوئی مطلب ان کے جسم گندے اور دماغ اوہام و خرافات سے بھرے ہوئے تھے،[3] وہ نظافت کی طرف توجہ اور پانی کا استعمال کم سے کم

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قرآن مجید کتب حدیث، اشعار عرب، حماسہ، سبع معلّقات وغیرہ۔
[2] دیکھئے شعرِ جاہلی ایام عرب اور اخبار عرب کے سلسلہ کی کتب۔
[3] THILLY : HISTORY OF PHILOSOPHY. (NEW YORK 1945)

کرتے تھے، ان کے پادری اور راہب جسم کو اذیت پہونچاتے اور انسانوں سے فرار[۱] میں نہایت درجہ متشدد اور انتہا پسند تھے، ان کے یہاں ابھی تک یہی بات طے نہیں ہوئی تھی کہ عورت انسان ہے یا حیوان؟ اس کے اندر ابدی و غیر فانی روح ہے یا نہیں؟ اس کو ملکیت اور بیع و شرا کا حق حاصل ہے یا ان میں سے کسی بات کا وہ حق نہیں رکھتی؟

ROBERT BRIFFAULT لکھتا ہے:-

"پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی اس دور کی وحشت و بربریت زمانۂ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی چڑھی تھی، کیونکہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی جو سڑ گئی ہو، اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے، اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی، وہ ممالک جہاں یہ تمدن برگ و بار لایا اور گذشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ گیا تھا جیسے اٹلی، فرانس، وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔"[۲]

گھٹا ٹوپ اندھیرا اور جان لیوا مایوسی

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی جس میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تاریخ کا بدترین دور تھا، اور انسانیت کے مستقبل اور اس کی بقا و ترقی کے لحاظ سے انتہا درجہ تاریک اور مایوس کن۔

---

[۱] LECKY, W. E. H., HISTORY OF EUROPEAN MORALS. (NEW YORK 1855)

[۲] THE MAKING OF HUMANITY. P. 1164

مشہور انگریز مصنّف H. G. WELLS نے بھی ساسانی اور بازنطینی حکومتوں کے ذکر میں اس عہد کی تصویر کھینچی ہے' اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

"سائنس اور سیاسیات دونوں ان برسرپیکار اور زوال پذیر حکومتوں میں موت کی نیند سو چکے تھے، ایتھنس کے متاخرین فلسفیوں نے اپنی تباہی تک جو اس پر مسلط کر دی گئی تھی' عہد قدیم کے ادبی سرمایہ کو اگرچہ بغیر سوچ سمجھے' مگر بے انتہا عقیدت کے ساتھ محفوظ رکھا تھا لیکن اب دنیا میں انسانوں کا کوئی طبقہ ایسا باقی نہیں رہا تھا، جو عہد قدیم کے شرفاء کی طرح جری اور آزاد خیالی کا حامی ہوتا، اور قدماء کی تحریروں کی طرح تلاش و تحقیق یا جرأت مندانہ اظہار خیال کا حامل ہوتا، اس طبقہ کے ختم ہونے کی خاص وجہ سیاسی اور سماجی افراتفری تھی، لیکن ایک وجہ اور بھی تھی جس کے باعث اس عہد میں ذہن انسانی کند اور بنجر ہو چکا تھا، ایران اور بازنطینیہ دونوں ملکوں میں عدم رواداری کا دور تھا، دونوں حکومتیں ایک نئے انداز کی مذہبی حکومتیں تھیں جس میں آزادانہ اظہار خیال پر کڑے پہرے بٹھا دیئے گئے تھے"

بازنطینی شہنشاہی پر ایرانی شہنشاہی کے حملہ اور بازنطینیوں کی فتح کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد چھٹی صدی عیسوی میں سماجی و اخلاقی پستی پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنّف لکھتا ہے :۔

"اگر کوئی سیاسی پیشین گو ساتویں صدی کے آغاز میں دنیا کا جائزہ لیتا تو اس نتیجہ پر پہونچتا کہ صرف چند صدیوں کی بات ہے کہ پورا یورپ اور ایشیا منگولوں کے زیر اقتدار آجائے گا، مغربی یورپ میں نہ کوئی نظم تھا

اور نہ اتحاد، باز نطینی اور ایرانی حکومتیں ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر تُلی ہوئی تھیں، ہندوستان بھی منقسم اور تباہ حال تھا۔"[1]

عالمگیر فساد

غرض بعثتِ محمدیؐ کے زمانہ میں پوری انسانیت خودکشی کے راستہ پر تیزی کے ساتھ گامزن تھی، انسان اپنے خالق اور مالک کو بھول چکا تھا اور خود اپنے آپ کو اور اپنے مستقبل اور انجام کو فراموش کر چکا تھا، اس کے اندر بھلائی اور بُرائی اور زِشت وخوب میں تمیز کرنے کی بھی صلاحیت باقی نہیں تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کے دماغ و دل کسی چیز میں کھو چکے ہیں، ان کو دین و آخرت کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں اور روح و قلب کی غذا، اخروی فلاح، انسانیت کی خدمت اور اصلاحِ حال کے لئے ان کے پاس ایک لمحہ خالی نہیں، بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک شخص ایسا نظر نہ آتا جس کو اپنے دین کی فکر ہو، جو خدائے واحد کی پرستش کرتا ہو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراتا ہو جس کے جگر میں انسانیت کا درد ہو اور اس کے تاریک وہولناک انجام پر کچھ بے چینی ہو، یہ صورتِ حال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی ہو بہو تصویر تھی کہ۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ	خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال
بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ	کے سبب فساد پھیل گیا ہے تاکہ خدا
لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا	ان کو ان کے بعض عملوں کا مزہ چکھائے
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (سورۂ روم۔ ۴۱)	عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں۔

---

[1] A SHORT HISTORY OF THE WORLD (LONDON 1924). PP. 140-41, 144.

محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

جزیرۃ العرب میں کیوں مبعوث ہوئے؟

اللہ تعالیٰ کی مشیت وحکمت کا فیصلہ تھا کہ انسانیت کی ہدایت ونجات کا یہ آفتاب جس سے ساری کائنات میں روشنی پھیلی، جزیرۃ العرب کے افق سے طلوع ہو جو دنیا کا سب سے تاریک خطہ تھا اور جس کو اس تیز روشنی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کے لئے عربوں کا انتخاب اس لئے کیا اور ان کو ساری دنیا میں اس کی تبلیغ واشاعت کا ذمہ دار بنایا کہ ان کے دلوں کی تختی بالکل صاف تھی، اس میں پہلے سے کچھ نقوش تحریر اور نقش ونگار موجود نہ تھے جن کو مٹانا مشکل ہوتا، برخلاف رومیوں، ایرانیوں یا ہندوستانیوں کے جن کو اپنی ترقی، علوم وفنون اور اپنے تہذیب وتمدن اور فلسفہ پر بڑا ناز اور غرور تھا، اور اس کی وجہ سے ان کے اندر کچھ ایسی نفسیاتی گرہیں اور فکری وذہنی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں جن کا دور ہونا آسان نہ تھا، عربوں کے دل ودماغ کی سادہ تختیاں صرف ان معمولی اور ہلکی پھلکی تحریروں سے آشنا تھیں جن کو ان کی جہالت وناخواندگی اور بدوی زندگی نے ان میں ثبت کر دیا تھا، اور جن کا دھونا اور مٹانا اور ان کی جگہ پر نئے نقش قائم کرنا بہت آسان تھا، موجودہ علمی اصطلاح میں وہ "جہلِ بسیط" یا "جہلِ سادہ" کا شکار تھے، اور یہ وہ غلطی ہے جس کا مداوا ہو سکتا ہے، دوسری متمدن اور ترقی یافتہ قومیں "جہلِ مرکب" میں مبتلا تھیں جس کا علاج اور تدارک اور اس کو

دھو کر کے نئے حروف لکھنے کا کام ہمیشہ بے حد دشوار ہوتا ہے۔

یہ عرب اپنی اصل فطرت پر تھے مضبوط اور آہنی ارادہ کے مالک تھے اگر حق بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ اس کے خلاف شمشیر تک اٹھانے میں کوئی تکلف نہ کرتے اور اگر حق کھل کر سامنے آجاتا تو وہ اس سے دل وجان سے زیادہ محبت کرتے، اس کو گلے سے لگاتے اور اس کے لئے جان تک دینے میں پس وپیش نہ کرتے۔

یہ عربی نفسیات اور ذہن سُہیل بن عمرو کے ان الفاظ میں جھلکتا ہے جو صلح حُدَیبیہ کے معاہدہ کی تحریر کے وقت ان کی زبان سے نکلے، معاہدہ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا تھا، "ھذا ما قاضی علیہ محمد رسول اللّٰہ" (یہ وہ ہے جس کا فیصلہ محمد رسول اللہ نے کیا) انھوں نے کہا کہ "واللّٰہ لو کنا نعلم انک رسول اللّٰہ ما صددناک عن البیت ولا قاتلناک" (واللہ اگر ہم یہ جانتے اور مانتے کہ آپ خدا کے رسول ہیں تو نہ آپ کو بیت اللہ سے روکتے نہ آپ سے جنگ کرتے) یہ ذہن و مزاج عکرمہ بن ابی جہل کے الفاظ میں بھی جھلک رہا ہے، یرموک کی لڑائی پورے شباب پر تھی، اور عکرمہ پر سخت دباؤ پڑ رہا تھا جب رومی یلغار کرتے ہوئے عکرمہ کی طرف بڑھے تو انھوں نے ان کو للکار کر کہا کہ عقل کے دشمنو! (جب تک بات میری سمجھ میں نہیں آئی) میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلہ میں ہر جگہ صف آراء رہا، آج میں تم سے بھاگوں گا؟ پھر انھوں نے پکار کر کہا کہ ہے کوئی جو موت پر مجھ سے بیعت کرے؟ اچھے لوگ آئے اور بیعت کی پھر وہ آگے بڑھ کر لڑنے لگے یہاں تک کہ زخمی ہوئے اور شہادت پائی[۱]۔

یہ عرب بڑے حقیقت پسند، سنجیدہ و سلیم الطبع، صاف گو، سخت کوش و سخت جان

---

[۱] تاریخ طبری ج ۴ ص ۳۶

تھے، وہ نہ دوسروں کو فریب دیتے تھے، نہ اپنے کو فریب میں رکھنا پسند کرتے تھے، سچی اور پکی بات کے عادی، بات کی لاج رکھنے والے اور پختہ ارادہ کے مالک تھے، اس کا ایک واضح نمونہ اور ثبوت بیعت عقبۂ ثانیہ میں ہمیں نظر آتا ہے جس کے بعد ہی مدینہ طیبہ ہجرت کا آغاز ہوا۔

ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ جب اوس و خزرج عقبہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے کے لئے جمع ہوئے تو عباس بن عبادہ الخزرجی نے (اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے) کہا "اے اہلِ خزرج! کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا ہاں! کہنے لگے کہ تم ان سے احمر و اسود ہر قسم کے لوگوں سے جنگ پر بیعت کر رہے ہو (یعنی بہت بڑی تعداد اور مختلف اصناف کے لوگوں سے) اگر تم ایسا خیال کرتے ہو کہ تمہارے مال لوٹ لئے جائیں گے اور تباہ و برباد کر دیئے جائیں گے، تمہارے اشراف اور سردارانِ قبیلہ قتل کر دیئے جائیں گے تو تم ان کو دشمنوں کے حوالہ کر کے علیحدہ ہو جاؤ گے اگر ایسا ہے تو ابھی اس بات کو ختم کر دو، اس لئے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو واللہ دنیا و آخرت دونوں جگہ کی رسوائی ہے، اور اگر تمہارا فیصلہ یہ ہے کہ جس چیز کے لئے تم نے ان کو دعوت دی ہے اس کو پورا کرو گے خواہ تمہارا سارا مال و اسباب تہس نہس ہو جائے اور تمہارے سردار و اشراف قتل کر دیئے جائیں تو اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دو، اس وقت اس میں خدا کی قسم دنیا و آخرت دونوں جگہ کی کامیابی و بھلائی ہے، ان لوگوں نے جواب دیا کہ مال و دولت کی تباہی اور سرداروں کے قتل ہر چیز پر ہم آپ سے بیعت کرتے ہیں، لیکن اس کا صلہ یا رسول اللہ اگر ہم نے یہ عہد پورا کیا کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جنت

کہنے لگے ہاتھ بڑھائیے، آپ نے اپنا دست مبارک آگے کیا اور ان سب نے آپ سے بیعت کی۔[1]

اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اس عہد کو جس پر آپ سے بیعت کی تھی پورا کیا، حضرت سعد بن معاذ رضی نے اپنے مشہور جملے میں ان سب کی ترجمانی کی تھی کہ "خدا کی قسم اگر آپ چلتے چلتے برک الغماد[2] تک پہونچ جائیں گے تب بھی ہم آپ کے ساتھ چلتے رہیں گے اگر آپ اس سمندر کو عبور کرنا چاہیں گے تو ہم آپ کے ساتھ سمندر میں کود جائیں گے"[3]

عزم و ارادہ کی یہ پختگی اور سچائی، عمل کی سنجیدگی اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کا مزاج اور طبیعت اس جملہ سے بھی عیاں ہے جو اسلامی افواج کے مشہور قائد اور سپہ سالار عُقبہ بن نافع رض سے منسوب ہے، جب ان کی فتوحات اور پیش قدمیوں کی راہ میں بحرِ اوقیانوس[4] (اٹلانٹک) حائل ہوا تو اس موقع پر انھوں نے کہا کہ "خدایا یہ بحرِ زخار حائل ہے، ورنہ جی چاہتا ہے کہ برابر آگے بڑھتا جاؤں اور بحر و بر میں تیرے نام کی منادی کر دوں"[5]

اس کے برخلاف یونان، روم اور ایران کے لوگ زمانہ سازی اور ہوا کے رُخ پر چلنے کے عادی تھے، کوئی ظلم و زیادتی، ان کے اندر تحریک پیدا کرنے سے قاصر تھی کوئی اصول پسندی اور حقیقت ان کے لئے کشش نہ رکھتی تھی، کوئی دعوت اور عقیدہ ان کے خیالات و افکار اور احساسات و جذبات پر اس طرح طاری نہ ہوتا تھا کہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۴۶ (طبع مصطفیٰ البابی الحلبی) طبع دوم [2] برک الغماد کے متعلق مختلف اقوال ہیں، ایک قول یہ ہے کہ وہ یمن کا کوئی دور دراز مقام ہے سُہیلی کہتے ہیں کہ اس سے مراد حبش ہے مقصد یہ ہے کہ اگر آپ بعید ترین مقام تک بھی لے جائیں گے تو ہم ہمرکابی میں جائیں گے اور ساتھ نہ چھوڑیں گے۔

[3] زاد المعاد۔ ج ۱ ص ۳۴۲-۳۴۳، سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۱۵، بخاری و مسلم میں بھی یہ روایت آئی ہے۔

[4] مسلمان مورخین اور مصنفین عام طور پر اس کو بحرِ ظلمات سے یاد کرتے ہیں [5] کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۴۶

وہ اس کے لئے اپنی ہستی کو فراموش کردیں اور اپنے عیش اور دنیاوی لذتوں کو خطرہ میں ڈال دیں۔

عرب تہذیب و تمدن اور تعیش و آرام طلبی کی پیدا کی ہوئی ان تمام بیماریوں و خرابیوں سے محفوظ تھے، جن کا علاج بڑا دشوار ہوتا ہے، اور جو کسی ایمان و عقیدہ کے لئے گرم جوشی و جاں فروشی میں ہمیشہ حائل ہوتی ہیں، اور اکثر آدمی کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیتی ہیں۔

ان کے اندر صداقت بھی تھی دیانت بھی، اور شجاعت بھی، منافقت اور سازش اُن کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتی، بے جگری سے لڑنے والے گھوڑوں کی پیٹھ پر زیادہ وقت گذارنے والے، سخت قوتِ مدافعت اور قوتِ برداشت کے مالک، سادہ زندگی کے عادی، شہ سواری اور فنونِ جنگ کے عاشق، جو ایک ایسی قوم کے لئے ضروری شرط ہے جس کو دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا ہو، خصوصاً اُس دور میں جب معرکہ آرائیوں اور مہم جوئیوں کا سلسلہ ہو اور بہادری و شجاعت کا عام چلن ہو۔

دوسری بات یہ کہ ان کی فکری و عملی قوتیں اور فطری صلاحیتیں محفوظ تھیں، اور خیالی فلسفوں، بے فائدہ منطقی بحثوں اور موشگافیوں، علمِ کلام کے دقیق و نازک مضامین یا مقامی و علاقائی خانہ جنگیوں میں ضائع نہیں ہوئی تھیں، یہ ایک نوخیز اور اس لحاظ سے محفوظ" قوم تھی، اور زندگی و حرارت، جوش و نشاط اور عزم و آہنی ارادہ سے بھرپور تھی۔

آزادی و مساوات، فطرت اور مناظرِ فطرت سے محبت اور سادگی و سادہ دلی اس کی گھٹی میں پڑی تھی، اس کو کبھی کسی غیر ملکی اقتدار کے سامنے جھکنا نہ پڑا تھا، یہ قوم غلامی اور ایک انسان کے دوسرے انسان پر حکم چلانے کے معنی سے ناآشنا تھی، اس کو ایرانی و رومی شہنشاہیوں کے تکبر اور انسان اور انسانیت کو نگاہِ حقارت سے دیکھنے کا کبھی تجربہ نہ ہوا تھا، اس کے برخلاف ایرانی

سلاطین (جو جزیرۃ العرب کے پڑوس میں تھے) مافوق البشر سمجھے جاتے تھے، اگر ایرانی بادشاہ فصد کھلواتا یا کوئی دوا استعمال کرتا تو دار السلطنت میں اعلان کر دیا جاتا کہ آج بادشاہ سلامت نے فصد کھلوائی ہے یا دوا استعمال کی ہے، اس اعلان کے بعد شہر میں نہ کوئی پیشہ ور اپنے پیشہ میں مشغول ہوتا اور نہ کوئی سرکاری درباری آدمی کوئی کام کر سکتا۔[۱] اگر اس کو چھینک آتی تو اس کے لئے کسی کو دعائیہ کلمات کہنے کا حق نہ تھا، وہ خود اگر دعا کرتا تو آمین بھی نہیں کہہ سکتا تھا، اگر وہ اپنے وزراء و امراء میں کسی کے گھر فروکش ہوتا تو یہ دن بہت غیر معمولی اور اہم سمجھا جاتا اور اس دن سے اس خاندان کی نئی تقویم اور نئی جنتری شروع ہوتی اور خطوط میں نئی تاریخ ڈالی جاتی، ایک معینہ مدت کے لئے ٹیکس معاف کر دیئے جاتے، وہ شخص مختلف قسم کے اعزازات، انعامات اور معافیوں و ترقیوں سے نوازا جاتا محض اس بنیاد پر کہ بادشاہ نے اپنی تشریف آوری سے اس کو سرفراز کیا ہے۔[۲]

یہ ان آداب و لوازم تعظیم و بندگی کے علاوہ ہے جس کا بجا لانا ارکان سلطنت اور اہل دربار اور دوسرے تمام اشخاص کے لئے ضروری تھا، مثلاً ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہنا[۳] (یعنی سینہ پر ہاتھ رکھ کر ادب کے ساتھ سر نیاز خم کر دینا) ان کے سامنے اس طرح مؤدب کھڑا رہنا جس طرح نمازوں میں خدا کے سامنے کوئی کھڑا ہوتا ہے، یہ اس بادشاہ کے عہد کا تذکرہ ہے، جو نوشیرواں عادل کے نام سے شہرۂ آفاق ہے یعنی خسرو اول (۵۳۱ء تا ۵۷۹ء) اس سے

---

[۱] ملاحظہ ہو ایران بعہد ساسانیان ص ۵۳۵-۵۳۶ [۲] ایضاً ص ۵۴۳ [۳] اس کے لئے عربی میں ایک مستقل محاورہ بن گیا تھا کہتے تھے "کَفَّرَ فلانٌ" یعنی جھکتے ہوئے اپنا ہاتھ سینہ پر رکھ کر تعظیماً سر جھکا دینا، یہ ایران کا عام رواج تھا، اور وہیں سے یہ اصطلاح نکلی اور لغت عرب میں داخل ہوئی ہے "لسان العرب" میں ہے کہ کفر کے معنی ہیں ایرانی کا اپنے بادشاہ کی تعظیم کرنا اور اہل کتاب کی تکفیر یہ ہے کہ تسلیم و آداب کے طور پر آدمی اپنا سر جھکا دے، انھوں نے جریر کے اس شعر سے استناد کرتے ہوئے فضعوا السلاح وكفروا التكفيرا لکھا ہے کہ جیسے کوئی دیہاتی کسان اپنے مکھیا اور زمیندار کے سامنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر ادباً اپنا سر جھکا دیتا ہے (لسان العرب ج ۷ ص ۴۶۶ مادہ کفر)

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایران کے ان شہنشاہوں کا کیا حال ہوگا جو ظلم وسفّاکی اور بے رحمی میں مشہورِ زمانہ تھے۔

آزادئ خیال اور اظہارِ رائے (نہ کہ تنقید و نکتہ چینی) وسیع ایرانی سلطنت میں تقریباً مفقود تھی، طبری نے اس سلسلہ میں "نوشیروانِ عادل" کی ایک دلچسپ حکایت بیان کی ہے جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانی شہنشاہی میں آزادئ رائے اور اظہارِ خیال پر کتنی سخت پابندی تھی، اور دربارِ شاہی میں لب کشائی کی قیمت کیا ادا کرنی پڑتی تھی، اس واقعہ کو "ایران بعہد ساسانیان" کے مصنّف نے طبری کے حوالہ سے قلم بند کیا ہے:۔

"اس نے ایک کونسل منعقد کی اور دبیرِ خراج کو حکم دیا کہ لگان کی نئی شرحیں باوازِ بلند پڑھ کر سنائے، جب وہ پڑھ چکا تو خسرو نے دو دفعہ حاضرین سے پوچھا کہ کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ سب چُپ رہے، جب بادشاہ نے تیسری مرتبہ یہی سوال کیا تو ایک شخص کھڑا ہوا اور تعظیم کے ساتھ پوچھنے لگا کہ آیا بادشاہ کا یہ منشا ہے کہ ناپائیدار چیزوں پر دائمی ٹیکس لگائے، جو بمرورِ زمانہ ناانصافی پر منتہی ہوگا؟ اس پر بادشاہ للکار کر بولا کہ اے مردِ ملعون و گستاخ! تو کن لوگوں میں سے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں دبیروں میں سے ہوں، بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو قلم دانوں سے پیٹ پیٹ کر مار ڈالو اس پر ہر ایک دبیر نے اپنے اپنے قلم دان سے اس کو مارنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ بیچارہ مرگیا، اس کے بعد سب نے کہا کہ "اے بادشاہ! جتنے ٹیکس تو نے ہم پر لگائے ہیں، وہ ہمارے نزدیک سب انصاف پر مبنی ہیں"۔[1]

ہندوستان میں عزّت و ناموس کی تذلیل و توہین اور ان پس ماندہ طبقوں کی تحقیر

---

[1] ایران بعہد ساسانیان ص۵۱۱ ماخوذ از ترجمہ پروفیسر محمد اقبال۔

(جن کو فاتح آرین قوم اور ملکی قانون نے ایک کمترین مخلوق قرار دیا تھا اور جو پالتو جانوروں سے صرف اس بات میں مختلف تھے کہ دو پیروں پر چلتے تھے اور آدمیوں جیسی شکل رکھتے تھے) تصور سے ماورا ہے اس قانون میں یہ باقاعدہ دفعہ موجود تھی کہ اگر کوئی شودر کسی برہمن کو نقصان پہونچانے کے لئے ہاتھ اٹھائے یا لاٹھی اٹھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اگر اس کو لات مارے تو اس کا پیر کاٹ دیا جائے اگر یہ دعویٰ کرے کہ وہ اس کو تعلیم دے سکتا ہے تو اس کو کھولتا ہوا تیل پلایا جائے[1] اس قانون کی رو سے کتے، بلی، مینڈک، گرگٹ، کوّے، اُلّو اور اس اچھوت طبقہ کے فرد کے قتل کا جرمانہ برابر تھا۔[2]

رومی بھی اس معاملہ میں ایرانیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے، اگرچہ بے شرمی اور تذلیلِ انسانیت میں یہ بلند درجہ ان کو حاصل نہ تھا، ایک مغربی مورخ VICTOR CHOPART اپنی کتاب THE ROMAN WORLD میں لکھتا ہے:۔

"قیصر معبود سمجھے جاتے تھے، یہ بات موروثی و خاندانی طور پر نہ تھی، بلکہ جو بھی تخت و تاج کا مالک ہوتا وہ خدا تسلیم کر لیا جاتا تھا، اگرچہ اس میں ایسی کوئی نشانی اور علامت نہ ہوتی جو اس کو اس درجہ پر فائز ہونے کی طرف اشارہ کرتی (AUGUSTUS) کا شاہانہ لقب ایک شہنشاہ سے دوسرے شہنشاہ تک دستور و قانون کے بموجب منتقل نہیں ہوتا تھا، بلکہ رومی ایوانِ حکومت کا صرف اتنا کام تھا کہ ہر اس حکم پر جو شمشیر کی دھار پر صادر ہو صاد کر دیا کرے، یہ شہنشاہی صرف ایک فوجی آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کی ایک شکل تھی۔"[3]

اگر اس کا موازنہ عربوں کی اس حُرّیت پسندی، عزتِ نفس اور ادب و تعظیم میں اعتدال

---

[1] منوشاستر (دسواں باب) [2] آر سی، دت ص ۳۲۴-۳۴۳

[3] THE ROMAN WORLD (LONDON 1928), P. 418.

سے کیا جائے جو ظہورِ اسلام سے قبل ان کے اندر ملتا ہے تو دونوں قوموں کے مزاج اور عربی و عجمی معاشرہ کا فرق اچھی طرح واضح ہو جائے گا، وہ بعض اوقات اپنے بادشاہوں کو "أبیت اللعن" و "عِم صباحًا"[1] جیسے الفاظ سے خطاب کرتے تھے، یہ آزادی و خودشناسی اور اپنی عزت و ناموس کی حفاظت و پاسبانی عربوں میں اس درجہ پر تھی کہ وہ اپنے ملوک و امراء کے بعض مطالبوں اور فرمائشوں کو پورا کرنے سے بھی بعض اوقات عذر کر دیتے تھے، اس سلسلہ میں یہ دلچسپ واقعہ تاریخ میں آتا ہے کہ ایک عرب بادشاہ نے بنی تمیم کے ایک شخص سے ایک گھوڑی جس کا نام "سکاب" تھا، طلب کی تو اس نے دینے سے صاف انکار کر دیا اور یہ مشہور شعر کہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

أبیت اللعن ان سکاب علق نفیس لا تعار ولا تباع

اور مقطع یہ ہے ؎

فلا تطمع أبیت اللعن فیها ومنعکها بشئ یستطاع[2]

یہ آزادی و خودنگری بلندیٔ نفس، اور شرافت و حوصلہ مندی عوام کے سب طبقوں میں موجود تھی، اور مردوں اور عورتوں دونوں میں پائی جاتی تھی، اس کا ایک نمونہ ہمیں حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند کے قتل کے واقعہ میں نظر آتا ہے، یہ واقعہ عرب مورخین نے اس طرح بیان کیا ہے کہ عمرو بن ہند نے مشہور عرب شہسوار اور شاعر عمرو بن کلثوم کی دعوت کی اور یہ خواہش کی کہ اس کی ماں بادشاہ کی ماں کے ساتھ دعوت میں شریک ہو، چنانچہ عمرو بن کلثوم بنو تغلب کی ایک جماعت کے ساتھ جزیرہ سے حیرہ کی طرف روانہ ہوا، اور اس کی ماں لیلیٰ بنت مہلہل بھی

---

[1] "ابیت اللعن" دعائیہ جملہ ہے، معنی یہ ہیں کہ آپ عیب سے محفوظ رہیں "عم صباحًا" آپ اچھی طرح صبح کریں۔ [2] دیوان الحماسہ باب الحماسہ ص۶۷-۶۸ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "اے بادشاہ! یہ بہت قیمتی اور نفیس گھوڑی ہے، نہ اس کو عاریتًا دیا جا سکتا ہے، نہ اسے بیچا جا سکتا ہے، اس کو حاصل کرنے کی آپ کوشش نہ کریں، اس کا آپ سے روکنا میرے لئے ممکن ہے"۔

بنی تغلب کے کچھ ذمہ داروں کے ساتھ روانہ ہوئی عمرو بن ہند کا خیمہ حیرہ اور فرات کے درمیان نصب کیا گیا، ایک طرف عمرو بن ہند اپنے خیمہ میں داخل ہوا اور دوسری طرف لیلیٰ اور ہند خیمہ کے ایک علیحدہ کمرہ میں جمع ہوئیں، عمرو بن ہند نے اپنی ماں سے کہہ دیا تھا کہ جب کھانا لگ جائے تو نوکروں کو ذرا علیحدہ کر دینا اور کوئی ضرورت ہو تو لیلیٰ سے کام لینا، چنانچہ عمرو بن ہند نے دستر خوان لگانے کا حکم دیا، پھر کھانا لگوایا، اس درمیان میں ہند نے لیلیٰ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ بہن! ذرا یہ طباق تو مجھے اٹھا دو، لیلیٰ نے کہا کہ "جس کو ضرورت ہو وہ خود اٹھائے" اس نے دوبارہ مانگا اور اصرار کرنے لگی اس وقت لیلیٰ نے صدا لگائی ہائے کیا ذلت کی بات ہے اے بنی تغلب! یہ آواز عمرو بن کلثوم نے سنی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اس نے لپک کر عمرو بن ہند کی تلوار جو سامنے لٹک رہی تھی اٹھائی اور اس کے سر پر مار دی، اس کے ساتھ بنو تغلب نے خیمہ کو لوٹ لیا اور جزیرہ کی طرف واپس آئے، اسی واقعہ پر عمرو بن کلثوم نے وہ مشہور قصیدہ کہا جس کا شمار سبعہ معلقہ میں کیا جاتا ہے۔[1]

اسی طرح جب مغیرہ بن شعبہ مسلمانوں کے سفیر بن کر رستم کے دربار میں گئے تو وہ اپنی پوری شان و شوکت اور لوازمِ امارت کے ساتھ اپنے تخت پر بیٹھا تھا، مغیرہ ابن شعبہؓ عربوں کی عادت کے موافق اسی کے ساتھ اس کے تخت پر گاؤ تکیہ کے پاس بیٹھ گئے، اس کے درباری فوراً ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کو نیچے اتار لائے، اس پر انھوں نے کہا کہ ہم کو تو یہ خبریں ملی تھیں کہ تم لوگ بہت عقلمند ہو لیکن مجھے تم سے زیادہ بیوقوف کوئی نظر نہیں آتا، ہم عرب تو سب سے برابری کا معاملہ کرتے ہیں ہم میں سے کوئی کسی کو غلام نہیں بناتا سوائے حالتِ جنگ کے، میرا گمان تھا کہ تم بھی اپنی قوم سے اسی طرح مساوات و برابری کا معاملہ کرتے ہو گے،

---

[1] کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ ص ۳۶

اس سے بہتر یہ تھا کہ تم مجھے پہلے ہی مطلع کر دیتے کہ تم نے آپس میں ایک دوسرے کو خدا بنا رکھا ہے، اور یہ معاملہ تمہارے ساتھ طے نہ ہو سکے گا، اس صورت میں ہم تم سے یہ برتاؤ نہ کرتے اور نہ تمہارے پاس آتے لیکن تم نے ہمیں خود دعوت دی ہے۔[1]

جزیرۃ العرب میں آخری نبی کی بعثت کا دوسرا سبب جزیرۃ العرب اور مکہ[2] میں کعبہ کا وجود تھا جس کو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اس لئے تعمیر کیا تھا کہ ایک اللہ کی عبادت کی جائے، اور یہ جگہ ہمیشہ کے لئے توحید کی دعوت کا مرکز بنے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کرنے کے
لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی	لئے مقرر کیا تھا، وہی ہے جو مکہ میں ہے
لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝[3]	بابرکت اور جہان کے لئے موجبِ ہدایت۔

بائبل (عہدِ عتیق) میں اس قدر تحریف کے باوجود "وادی بکہ" کے الفاظ آج تک موجود ہیں لیکن مترجمین نے اس کو "وادی البکاء" بنا دیا ہے اور عَلَم کے بجائے نکرہ کر دیا ہے، "مزامیر داؤد" کے الفاظ جو عربی میں آتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

"طوبیٰ لاناس عزھم بك، طرق بیتك فی قلوبھم عابرین فی وادی البکاء یصیرونه ینبوعًا۔ (مزامیر ۸۴[4]-۵-۶-۷)

"مبارک وہ انسان جس میں قوت تجھ سے ہے، ان کے دل میں تیری راہیں ہیں وہ بکا کی وادی میں گذرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے (کتاب مقدس برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی)

---

[1] تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۰۱ [2] بکہ بلد حرام کا نام ہے، اس کے بکہ اور مکہ دونوں نام آتے ہیں اس لئے کہ عربی زبان میں میم اور ب میں اکثر تبادلہ ہوتا رہتا ہے جیسے لازم اور لازب اور ربیط اور ربیط ۱۹۸۰ء
[3] سورۂ آل عمران آیت ۹۶ [4] الکتاب المقدس فی ساحۃ استورمن مدینۃ نیویارک لندن۔

لیکن علماءِ یہود کو صدیوں کے بعد احساس ہوا کہ یہ ترجمہ غلط ہے چنانچہ (JEWISH ENCYCLOPEDIA) میں یہ اعتراف موجود ہے کہ وہ ایک مخصوص وادی ہے جس میں پانی نہ ملتا تھا اور جس نے یہ (مذکورہ بالا) عبارت لکھی ہے اس کے ذہن میں ایک ایسی وادی کی تصویر تھی جس کے خاص قدرتی حالات تھے جن کی ترجمانی اس نے ان الفاظ سے کی ہے[1]۔

ان صحیفوں کے انگریزی مترجموں نے ترجمہ میں صحت و احتیاط کا عربی مترجموں سے زیادہ ثبوت دیا ہے، انھوں نے "بکہ" کا لفظ اسی طرح باقی رکھا ہے جیسا کہ اصل صحیفہ میں تھا انھوں نے اس کو حرف "B" نہ کہ "b" سے لکھا ہے جیسے عام طور پر اسماء و اعلام کو لکھا جاتا ہے، یہ انگریزی ترجمہ درج ذیل ہے[2]۔

(BLESSED IS THE MAN WHOSE STRENGTH IS IN THEE :
IN WHOSE HEART ARE THE WAYS OF THEM. WHO PASSING
THROUGH THE VALLEY OF BACA MAKE IT A WELL :)
PSALM 84 : 5-6

(مبارک باد ہے ان لوگوں کو جن کی عزت و قوت تیرے ساتھ ہے جن کے دلوں میں تیرے راستے ہیں جو وادی بکہ کو عبور کریں گے اور اس کو ایک کنواں بنائیں گے)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی اس دعا کا نتیجہ تھی جو انھوں نے کعبہ کی بنیادیں رکھنے اور اس کی تعمیر کرتے وقت کی تھی، یہ دعا یہ ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ	اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ	انھیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجیو جو ان کو
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط	تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے

---

[1] VOL. II. P. 415 [2] ماخوذ از تفسیر ماجدی از مولانا عبدالماجد دریابادی، و رحمۃ للعالمین۔ از قاضی سلیمان منصور پوری۔ جلد اول۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ — اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے

(سورۂ بقرہ - ۱۲۹) — اور ان کے دلوں کو پاک صاف کیا کرے،

بے شک تو غالب اور صاحب حکمت ہے"

اللہ تعالیٰ کی سنّت ہے کہ وہ اپنے مخلصین و صادقین اور اپنی ذات عالی سے لو لگانے والوں اور دامن احتیاج پھیلانے والوں کی دعا ضرور قبول کرتا ہے انبیاء و مُرسلین کا رتبہ تو اس سے بھی اونچا ہے صُحفِ سماویہ اور اَخبارِ صادقہ ان مثالوں سے لبریز ہیں، خود توریت میں اس کا ثبوت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول کی، کتاب پیدائش (۲۰) کے صاف الفاظ یہ ہیں :-

"اور اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا، اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ ۱۲ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا"

اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ اپنے بارہ میں فرمایا کرتے تھے کہ "انا دعوۃ ابراھیم وبشری عیسیٰ"[۱] (میں ابراہیمؑ کی دعا اور عیسیٰؑ کی بشارت ہوں) توریت میں (اس کی تحریف کے باوجود) ابتک اس کے شواہد ملتے ہیں کہ یہ دعا قبول ہوئی، کتاب استثناء (۱۸-۱۵) میں موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔

"یقیم لك الرب الهك نبیاً من وسطك من اخوتك مثلی له تسمعون"

ترجمہ: خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھرلو۔

---

[۱] مسند امام احمد۔

"اخونك" (تیرے ہی بھائیوں) کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ اس سے مراد بنی اسمٰعیل ہیں جو بنی اسرائیل کے ابناء عم تھے، اسی صحیفہ میں دو آیتوں کے بعد یہ الفاظ درج ہیں

"قال لی الرب قد أحسنوا فیما تکلموا أقیم لهم نبیًا من وسط اخوتهم مثلك، واجعل کلامی فی فمه فیکلمهم بکل ما أوصیه به"

(سفر التثنیه - ۱۸ - ۱۷ - ۱۸)

"اور خداوند نے مجھے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا، میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منھ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا"

"أجعل کلامی فی فمه" (اپنا کلام اس کے منھ میں ڈالوں گا) کے الفاظ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی متعیّن طور پر نشان دہی کرتے ہیں، اس لئے کہ آپ ہی وہ تنہا نبی ہیں جن پر اللہ تعالےٰ کا کلام لفظاً و معناً نازل ہوا، اور اللہ تعالےٰ نے اس کا اعلان بھی فرمایا۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ٥ (سورۂ نجم ۳-۴)	اور نہ خواہشِ نفس سے منھ سے بات نکالتے ہیں، یہ قرآن تو حکم خدا ہے جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ٥ (سورۂ حٰم سجدہ - ۴۲)	اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے، دانا اور خوبیوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہے۔

اس کے برخلاف انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفے اس کا بالکل دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ

لفظاً و معناً دونوں طرح اللہ کا کلام ہیں، ان کے علماء بھی ان کو انبیاء کی طرف منسوب کرتے ہیں تکلف سے کام نہیں لیتے، جیویش انسائیکلوپیڈیا میں آتا ہے کہ:۔

"کتاب مقدس (عہد قدیم) کی پہلی پانچ کتابیں (جیسا کہ قدیم یہودی مذہبی روایات ہمیں بتاتی ہیں) موسیٰ نبیؑ کی تالیف ہیں، آخری آٹھ آیات کو مستثنیٰ کرکے (جن میں موسیٰؑ کے انتقال کا واقعہ بیان کیا گیا ہے) ربّی (یہودی عالم) اس تضاد، اور ایک دوسرے سے مختلف روایات پر غور کرتے رہتے ہیں جو ان صحیفوں میں آئی ہیں، اور اس میں اپنی حکمت و ذہانت سے اصلاح کرتے رہتے ہیں"[1]

جہاں تک اناجیل اربعہ کا تعلق ہے جن کو "عہد جدید" کہا جاتا ہے ان کو لفظاً و معناً کلامِ الٰہی ہونے سے دور کا بھی واسطہ نہیں، اس کا اطمینان ہر وہ شخص کر سکتا ہے، جس کی ان کتابوں پر نظر ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کتابیں سوانح و وقائع کی کتابیں زیادہ معلوم ہوتی ہیں، خدا کی نازل کردہ کتابیں جو وحی و الہام پر مبنی ہوں کم۔[2]

اس کے بعد جزیرۃ العرب کے مخصوص جغرافیائی محلِ وقوع کا نمبر آتا ہے جس نے اس کو سب سے موزوں مرکز دعوت کی شکل دے دی ہے، جہاں سے یہ دعوت و پیغام ساری دنیا کو پہونچایا جا سکتا ہے، اور ساری قوموں کو خطاب کیا جا سکتا ہے، ایک طرف وہ برّاعظم ایشیا کا ایک حصّہ ہے دوسری طرف برّاعظم افریقہ اور اس کے بعد یورپ سے بھی قریب ہے اور یہ سب وہ علاقے ہیں، جو تہذیب و تمدّن، علوم و فنون اور مذاہب و افکار کا ہمیشہ مرکز رہے ہیں، اور جہاں بڑی وسیع، اور طاقتور سلطنتیں قائم ہوئیں، پھر یہ علاقہ تجارتی کاروانوں کی

---

[1] JEWISH ENCYCLOPEDIA. VOL. 9, P. 589 [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں ہماری کتاب "منصب نبوّت" کا ساتواں خطبہ "ختم نبوت" فصل "آسمانی صحیفے اور قرآن علم و تاریخ کی روشنی میں"۔

گذرگاہ بھی تھا جس کے ذریعہ مختلف ممالک کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے تھے، یہ کئی برّاعظموں کو جوڑتا تھا اور ایک جگہ کی مخصوص اشیاء اور پیداوار دوسری جگہ جہاں اس کی ضرورت تھی منتقل کرتا تھا[1]، یہ جزیرہ نمائے عرب دو زبردست برسرِپیکار طاقتوں کے درمیان واقع تھا عیسائی طاقت اور مجوسی طاقت، مغرب کی طاقت اور مشرق کی طاقت، لیکن اس کے باوجود اپنی آزادی اور اپنی شخصیت کی اس نے ہمیشہ حفاظت کی اور اپنے چند سرحدی مقامات اور بعض قبائل کو چھوڑ کر اس نے کبھی ان طاقتوں کی ماتحتی قبول نہیں کی، وہ نبوت کی ایک ایسی عالمی دعوت کا بجا طور پر مرکز بن سکتا تھا جو بین الاقوامی خطوط پر قائم ہو انسانیت کو بلند سطح سے خطاب کر سکے، ہر قسم کے سیاسی دباؤ اور غیر ملکی اثرات سے بالکلیہ آزاد ہو۔

ان سب وجوہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے جزیرۃ العرب اور مکۂ مکرمہ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت، وحی آسمانی کے نزول اور دنیا میں اسلام کی اشاعت کے عالم گیر مرکز اور نقطۂ آغاز کے طور پر منتخب فرمایا۔

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ۔ (سورۃ الانعام۔۱۲۴)	اور اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے کہ اس کا پیغام کہاں اور کس کے حوالہ کیا جائے۔

---

[1] ڈاکٹر حسین کمال الدین نے جو ریاض یونی ورسٹی کے انجینیرنگ کالج میں سول انجینیرنگ کے شعبہ کے صدر ہیں اپنے ایک پریس انٹرویو میں کہا کہ وہ ایک نئے جغرافیائی نقطۂ نظر پر پہنچ چکے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ روئے زمین پر (خشکی کے حصہ) کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے انھوں نے اپنی تحقیق کا آغاز ایک ایسے نقشے سے کیا جس میں مکہ مکرمہ سے دوسرے مقامات کی مسافتیں دکھائی گئی تھیں ان کا مقصد اس سے دراصل ایک ایسے کم قیمت آلہ کی تیاری تھی جو سمتِ قبلہ کا تعین کر سکے، اسی درمیان میں ان پر یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ مکہ مکرمہ ٹھیک دنیا کے وسط میں واقع ہے اسی تحقیق سے ان پر یہ راز بھی منکشف ہوا کہ مکہ مکرمہ کو بیت اللہ کا مرکز اور ہدایت آسمانی کا نقطۂ آغاز بنانے میں خدا کی مصلحت کیا تھی (روزنامہ الاہرام ۵ جنوری ۱۹۷۷ء)

عرب کا تاریک ترین دور

اور ایک مستقل نبی کی بعثت کی ضرورت

ان صلاحیتوں اور خوبیوں کے باوجود جن سے اللہ تعالیٰ نے عربوں کو سرفراز کیا تھا اور جن کی وجہ سے بعثتِ محمدی اور ظہور اسلام کے لئے ان کا انتخاب فرمایا تھا جزیرۃ العرب میں بیداری، اور بے چینی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے، اور حنفاء[1] اور تلاشِ حق کا جذبہ رکھنے والے چند نفوس باقی رہ گئے تھے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، اور جن کی حیثیت برسات کی اندھیری اور ٹھٹھری ہوئی رات میں جگنوؤں سے زیادہ نہ تھی جو نہ کسی گم گشتہ کو راہ دکھا سکتے ہیں نہ کسی کو گرمی و حرارت پہونچا سکتے ہیں۔

یہ دور جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، جزیرۃ العرب کی تاریخ کا بھی تاریک ترین دور تھا، یہ ملک ظلمت و انحطاط کی اس آخری منزل پر تھا جب اصلاح کی امید ختم ہو جاتی ہے، یہ وہ سخت و جاں گداز اور سنگین مرحلہ تھا جو کسی نبی کو تبلیغ کے راستہ میں پیش آیا ہوگا۔

سیرت نبوی کے ایک انگریز مصنّف (SIR WILLIAM MUIR) نے جو اسلام اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں اپنی خوردہ گیری اور عیب چینی میں مشہور ہے اس دور کی خوب تصویر کھینچی ہے، اور مغربی مصنّفین کے اس نقطۂ نظر کی تردید کی ہے کہ آپ کی

---

[1] حنفاء ان کو کہتے ہیں جو بُت پرستی چھوڑ چکے تھے، اور اپنی سمجھ کے مطابق ابراہیمی عقیدہ پر قائم تھے۔

بعثت سے قبل لاوا بالکل پک چکا تھا، محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا کیا کہ بروقت اور صحیح جگہ پہونچ کر اس کو آگ دکھا دی، چنانچہ یہ لاوا پھوٹ پڑا، وہ کہتا ہے۔

"محمد کے عنفوانِ شباب کے زمانہ میں جزیرہ نمائے عرب بالکل ناقابل تغیر تھا، شاید اس سے زیادہ ناامیدی کی حالت کسی اور زمانہ میں نہیں تھی"[1]

یہی مصنّف دوسری جگہ لکھتا ہے :۔

"فروغ عیسائیت کی معمولی کوششوں نے عرب کی اوپری سطح پر وقتاً فوقتاً معمولی ارتعاش تو پیدا کیا تھا، اور نسبتاً شدید تر یہودی اثرات کبھی کبھی اندرونی سطح میں بھی نظر آجاتے تھے، لیکن مقامی بُت پرستی اور اسماعیلیوں کی توہّم پرستی کا تیز دھارا ہر سمت سے کعبہ کی جانب اُمڈ کر آرہا تھا، اور اس کا واضح ثبوت مہیّا کر رہا تھا کہ مکّہ کا مذہب اور طریقۂ عبادت عربوں کے ذہن پر شدّت کے ساتھ اور بلا شرکتِ غیرے قابض ہو چکا تھا"[2]

اسی تاریخی حقیقت کا باسورتھ اسمتھ (BOSWORTH SMITH) نے اختصار لیکن طاقت اور وضاحت کے ساتھ اظہار کیا ہے، وہ لکھتا ہے :۔

"سب سے زیادہ فلسفیانہ رجحان رکھنے والا ایک مورّخ کہتا ہے کہ ان تمام انقلابات میں جنہوں نے انسانیت کی عمرانی تاریخ پر لافانی نقوش چھوڑے ہیں، ان میں کسی کا ظہور عقلِ انسانی کے لئے اتنا غیر متوقع نہ تھا جتنا کہ عرب کے اس مذہب کا۔

---

[1] WILLIAM MUIR : THE LIFE OF MAHOMET, VOL. I (LONDON 1858), P. CCXXXV—III

[2] WILLIAM MUIR : THE LIFE OF MAHOMET, VOL. I (LONDON 1858), P CCXXXIX

ہمیں پہلی ہی نظر میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ علم تاریخ (اگر علم تاریخ نام کی کوئی چیز ہے) اس سے قاصر ہے کہ وہ اسباب و علل کی ان کڑیوں کو تلاش کرے جن کا تلاش کرنا اس کا فرض ہے۔"[1]

نبی کی ضرورت

چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں حالات کا بگاڑ اتنا بڑھ گیا تھا اور انسانیت کی پستی اس حد کو پہونچ چکی تھی کہ اب وہ کسی مُصلح، ریفارمر اور معلّمِ اخلاق کے بس کی بات نہ تھی، مسئلہ کسی ایک عقیدہ کی تصحیح کا، کسی مخصوص عادت کو بدلنے کا یا کسی طریقۂ عبادت کی ترویج کا یا کسی معاشرہ کی سماجی اصلاح کا نہ تھا، اس کے لئے وہ مصلح اور معلّمینِ اخلاق کافی تھے جن سے کوئی زمانہ اور کوئی علاقہ کبھی خالی نہیں رہا، مسئلہ یہ تھا کہ جاہلیت کے مشرکانہ و بت پرستانہ اور انسانیت کے اس مہلک اور تباہ کن ملبہ کو کس طرح ہٹایا اور صاف کیا جائے جو صدیوں اور نسلوں سے تلے اوپر جمع ہو رہا تھا، اور جس کے نیچے انبیاء کرام کی صحیح تعلیمات اور مصلحین کی مساعی اور خدمات دفن تھیں پھر اس کی جگہ پر وہ نئی مستحکم اور عظیم الشان، وسیع و عریض اور بلند و بالا عمارت کیسے قائم کی جائے جس کے سایۂ رحمت میں ساری انسانیت کو پناہ مل سکے، مسئلہ یہ تھا کہ وہ انسان کیوں کر بنایا جائے، جو اپنے پیش رو انسان سے ہر چیز میں جُدا ہو اور ایسا نظر آئے کہ وہ ابھی ابھی وجود میں آیا ہے یا اس کو نئی زندگی ملی ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ	بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو
وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ	زندہ کیا اور اس کے لئے روشنی کر دی

---

[1] MOHAMMED AND MOHAMMEDANISM (LONDON, 1876) P. 105

فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ — جس کے ذریعہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے
لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا۔ — کہیں اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھیرے
(سورۂ انعام۔۱۲۲) — میں پڑا ہوا ہو اور اس سے نکل ہی نہ سکے۔

یہ مسئلہ فساد کی جڑ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے اور بت پرستی کی بنیاد کو بیخ و بن سے اس طرح اکھاڑ پھینکنے کا تھا کہ دور دور اس کا کوئی اثر اور نشان باقی نہ رہ جائے اور عقیدۂ توحید نفس انسانی کی گہرائیوں میں عملاً اس طرح پیوست اور راسخ کر دیا جائے کہ اس سے زیادہ تصور کرنا مشکل ہے اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور عبادت کا رجحان انسانیت کی خدمت اور حق پرستی کا جذبہ اور ہر غلط خواہش اور شوق کو لگام دینے کا ملکہ اور اس کی صلاحیت و قوت پیدا کی جائے مختصر یہ کہ انسانیت کو (جو خودکشی پر آمادہ تھی بلکہ اس کے لئے پر تول چکی تھی اور اس میں اپنی دانست میں اس نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی) کمر پکڑ کے دنیا و آخرت کے جہنم سے بچا یا جائے اور اس کو اس شاہراہ پر ڈالا جائے جس کا پہلا سرا وہ حیاتِ طیبہ ہے جو عارفین و اہلِ ایمان کو اس دنیا ہی میں نصیب ہوتی ہے اور دوسرا اور انتہائی سرا وہ ہمیشہ رہنے والی جنت ہے جس کا تقویٰ کی زندگی اختیار کرنے والوں سے وعدہ کیا گیا ہے

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو ارشاد فرمایا ہے اس سے بڑھ کر اس صورتِ حال کی کوئی تصویر اور ترجمانی نہیں ہو سکتی ہے ارشاد ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ — اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے
اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ — کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت
بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا — ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی
حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ — ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہونچ
مِّنْهَا۔ (سورۂ آل عمران۔۱۰۳) — چکے تھے تو خدا نے تم کو اس سے بچا لیا۔

بنی نوع انسان کی پوری تاریخ میں ہمیں اس سے زیادہ نازک و رپے چیدہ کام اور اس سے بڑی اور عظیم الشّان ذمہ داری نظر نہیں آتی جو ایک نبی اور فرستادۂ الٰہی کی حیثیت سے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ڈالی گئی، نہ کوئی کھیتی اتنی زرخیز ثابت ہوئی اور برگ و بار لائی جیسی آپ کی نہ کوئی کوشش وسعی اتنی بارآور ثابت ہوئی جتنا آپ کی سعی انسانیتِ عامہ کے حق میں مفید و حیات بخش ثابت ہوئی یہ عجائبات تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ اور دنیا کا سب سے بڑا معجزہ ہے اس کی شہادت مشہور فرانسیسی ادیب اور شاعر نے بھی بڑی قوت و بلاغت اور وضاحت و صراحت کے ساتھ دی ہے، یہ ادیب لیمرٹائن (LAMARTINE) ہے، وہ نبوّتِ محمّدیؐ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

"کسی بھی انسان نے کبھی بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے لئے اتنا رفیع الشان مقصد منتخب نہیں کیا اس لئے کہ یہ مقصد انسان کی طاقت سے باہر تھا، توہمات اور خوش اعتقادیوں کو جو انسان اور اس کے خالق کے درمیان حجاب بن گئی تھیں زیروزبر کرنا، انسان کو خدا کے حوالہ کرنا اور خدا کی چوکھٹ پر انسان کو لانا، اس زمانہ کی اصنام پرستی کے مادّی خداؤں کی جگہ خدائے واحد کے پاکیزہ اور عقلی تصوّر کو از سرِ نو بحال کرنا، یہ تھا وہ عظیم مقصد کسی انسان نے کبھی بھی ایسے عظیم الشان کام کا جو کسی صورت سے انسانی طاقتوں کے بس کا نہ تھا، اتنے کمزور ذرائع کے ساتھ بیڑا نہیں اٹھایا۔"

آگے لکھتا ہے :۔

"اس سے بھی زیادہ آپ کا یہ کارنامہ ہے کہ آپ نے قربان گاہوں، دیوتاؤں، مذاہب، تصورات، عقائد اور نفوس کے اندر ایک تہلکہ ڈال دیا، ایک ایسی کتاب کے اساس بنا کر جس کا ہر حرف قانون کی حیثیت رکھتا ہے آپ نے ایک ایسی روحانی ملت کی تشکیل

کی جو ہر نسل اور ہر زبان کے افراد پر مشتمل ہے اس ملّتِ اسلامیہ کی امت کی خصوصیت
جسے محمدؐ نے ہمارے لئے ورثہ میں چھوڑا ہے یہ ہے۔ اسے جھوٹے خداؤں سے سخت نفرت ہے
اور مادہ سے مبرا خدا سے شدید لگاؤ، یہی محبت اسے خدائے واحد کی اہانت کے خلاف
انتقام پر مجبور کر دیتی ہے، اور یہی محبت محمدؐ کے متبعین کی خوبیوں کی بنیاد بنتی ہے،
اپنے عقائد کو ایک تہائی دنیا سے تسلیم کرا لینا بے شک آپ کا معجزہ تھا لیکن زیادہ صحیح
تو یہ ہے کہ یہ ایک فرد کا نہیں بلکہ عقل کا معجزہ ہے خدا کی توحید کے تصور کا ایسے
دور میں اعلان کرنا جب کہ دنیا لاتعداد ضمنی خداؤں کی پرستش کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی،
بذاتِ خود ایک قوی معجزہ تھا، محمد کی زبان سے جیسے ہی اس عقیدہ کا اعلان ہوا انہوں کے
تمام قدیم معبدوں میں خاک اڑنے لگی اور ایک تہائی دنیا ایمانی حرارت سے لبریز ہو گئی"[1]
یہ عمومی اور ہمہ گیر انقلاب اور انسانیت کی حیاتِ نو یا تعمیر نو کا عظیم الشان کام
نئی رسالت کا طالب تھا جو تمام رسالتوں اور نبوتوں سے بڑھ کر ہو اور ایسے نبی کا خواستگار
تھا جو ہدایت اور دینِ حق کا پرچم آفاقِ عالم میں ہمیشہ کے لئے بلند کر دے، اللہ تعالے کا ارشاد ہے

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ	جو لوگ کافر ہیں یعنی اہل کتاب و مشرک
الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ	وہ کفر سے باز رہنے والے نہ تھے، جب تک
حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُولٌ	ان کے پاس کھلی دلیل نہ آتی یعنی خدا کے
مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝	پیغمبر جو پاک اوراق پڑھتے ہیں جن میں
فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ (سورۂ بینہ ۱-۳)	مستحکم آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔

---

[1] لیمرٹائن LAMARTINE ہسٹوری ڈی لاٹرکی HISTOIRE DE LA TURQUIE جلد دوم
ص ۲۷۶-۲۷۷ پیرس (۱۸۵۴ء) ماخوذ از "اسلام ان دی ورلڈ" تصنیف ڈاکٹر زکی علی لاہور (۱۹۴۷ء) ص ۱۵-۱۶

جزیرۃ العرب[1]

جزیرۃ العرب کے حدود

جزیرۃ العرب اپنے طول و عرض میں دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما ہے علمائے عرب مجازاً اس پر جزیرۃ العرب کا اطلاق کرتے ہیں[2]، اس کے تین طرف پانی ہے، یہ ملک ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے، اس کے مشرق میں خلیج عرب ہے، جسے یونانی خلیج فارس کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کے جنوب میں بحرِ ہند ہے اور اس کے مغرب میں بحر احمر ہے جیسا کہ ان جدید نقشوں میں دکھایا جاتا ہے، اور یونانی و لاطینی اصطلاح میں اس کو خلیج عرب

---

[1] ہم نے اس حصہ میں قارئینِ سیرت کے لئے انہی بنیادی معلومات کا انتخاب کیا ہے جنھیں جاننا ضروری ہے جیسے اس خطے کی طبعی حالت و جغرافیہ، اقوام و مذاہب کی تاریخ میں اس کا مقام، اس کے باشندوں کے رجحانات وغیرہ، اس طرح سیرت کا مطالعہ کرنے والا اس ماحول سے بالکل ناواقف نہیں رہے گا جس میں کارِ نبوّت کی عظیم مہم انجام دی گئی، یہ مضمون ان قدیم و جدید کتابوں سے ماخوذ ہے، جو جزیرۃ العرب پر لکھی گئی ہیں ہم نے خاص طور پر ڈاکٹر جواد علی کی کتاب (المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام (۱۔ ۹) سے زیادہ استفادہ کیا ہے، اس سے زیادہ تفصیل کا محل وہ کتابیں ہیں، جو جزیرۃ العرب کے جغرافیہ پر لکھی گئی ہیں یا تمدن عرب اور تاریخ ادب عربی سے متعلق ہیں ان کی تعداد بہت ہے۔

[2] ملک عرب کے لئے جزیرۃ العرب کا استعمال قدیم زمانہ سے عام ہے حقیقتاً قدیم زمانہ میں جزیرہ اور جزیرہ نما کے درمیان فرق کرنے اور ان کے لئے علیحدہ لفظ بولنے کا رواج نہ تھا، بعض اہلِ علم نے اس کو جدید جغرافیائی اصطلاح میں جزیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جس کا ایک نمونہ علامہ خضری کی کتاب "تاریخ الامم الاسلامیہ" حصہ اول میں دیکھا جا سکتا ہے، لیکن یہ کوشش تکلف سے خالی نہیں اور اس میں جزیرۃ العرب کے حدود کو بہت دور تک لے جانے کی ضرورت پڑتی ہے۔

جزیرہ نمائے عرب
بحر روم
شام
دمشق
اردن
فرات
بادیۃ الشام
عراق
کویت
ایران
الخلیج العربی
دومۃ الجندل
تبوک
تیماء
حائل
مدائن صالح
العلاء
نجد
ینبع
مدینہ
مکہ
طائف
سعودی عرب
الربع الخالی
ابہا
صعدہ
صنعاء
زبید
یمن
مخا
عدن
حضرموت
مکلا
عمان
صحار
مسقط
سوڈان
حبشہ
۲۰۰
۴۰۰
میل

(SINUS ARABICUS) کے نام سے نمایاں کیا جاتا ہے، اور قدیم عربی کتابوں میں بحرِ قلزم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کی شمالی حدود مفروضہ سرحدی خط ہے جو (علمائے عرب کی اصطلاح میں) خلیج عقبہ سے خلیج عرب میں شطّ العرب کے دہانے تک گذرتا ہے۔

مسلمانوں نے جزیرۃ العرب کو پانچ قسموں پر تقسیم کیا ہے (۱) حجاز۔ جو ایلہ (عقبہ) سے یمن تک ہے اور ان کی رائے میں حجاز اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس پہاڑی سلسلے پر مشتمل ہے، جو تہامہ کو (جو بحرِ احمر کے ساحل کی نشیبی زمین ہے) نجد سے الگ کرتا ہے (۲) تہامہ جس کا ابھی بیان ہوا، (۳) یمن (۴) نجد۔ یہ وہ مرتفع حصّہ ہے جو حجاز کے پہاڑوں سے شروع ہو کر مشرق میں صحرائے بحرین تک چلا جاتا ہے، یہ وسیع و مرتفع علاقہ ہے جس میں بہت سے ریگستان اور پہاڑ واقع ہیں۔ (۵) عروض! اس کے مشرق میں بحرین، اور مغرب میں حجاز ہے، اسے عروض یمن اور نجد کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں، اسے یمامہ بھی کہا جاتا ہے۔[۱]

جَزِیْرَۃُ الْعَرَبْ کے طبعی حالات اور اس کے باشندے

اس پورے جزیرہ نما پر صحرائیت کا غلبہ ہے، اور طبعی عوامل اور ارضیاتی حوادث اور اپنے جغرافی جائے وقوع کے سبب اس پر خشکی غالب ہے اسی وجہ سے ماضی اور زمانۂ حال میں اس کے باشندوں کی تعداد بہت کم رہی ہے، اور متمدّن معاشرے اور بڑی مرکزی حکومتیں وجود میں نہ آسکیں، بدویت اور اس کے دیہاتی رنگ، انفرادیت کے شدید رجحان، قبائل کے جنگ و جدال کے سبب تمدّن سرسبز علاقوں اور ان جگہوں میں سمٹ کر

---

[۱] راویانِ جغرافیہ اس تقسیم کی سب سے پرانی روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ تک پہونچاتے ہیں۔

(کارٹوگرافی از محمود اختر)

رہ گیا جہاں اچھی بارش ہوتی یا سوتے اور چشمے پھوٹتے تھے یا جہاں پانی سطح زمین سے قریب ہوتا اور اس میں کنویں کھودے جا سکتے تھے، اس لئے کہنا چاہئے کہ جزیرۃ العرب میں زندگی کی سرگرمی پانی کی بدولت باقی رہتی تھی، چنانچہ قافلے اسی کا رُخ کرتے اور اسی کی تلاش میں رہتے، اور فطرت اعراب کو ہر جگہ سے لاکر شاداب علاقوں میں جمع کر دیتی تھی، وہ کسانوں کی طرح زمین سے ایک جگہ چمٹے نہیں رہتے تھے بلکہ کسی سرزمین پر وہ اسی وقت تک قیام پذیر رہتے تھے، جب تک وہاں جانوروں کے لئے گھاس چارہ اور ان کے لئے پانی رہتا تھا، اور جب یہ سہولت ختم ہو جاتی تو وہ نئی جگہوں کی تلاش میں چل پڑتے تھے۔

اس وجہ سے ان کی زندگی جفاکشی اور سختی کا نمونہ تھی، اور ان کی سوسائٹی قبیلہ کی شکل اختیار کر لیتی قبیلہ ایک بدوی کے لئے حکومت و قومیت کے مرادف ہوتا تھا اور یہ قبائلی زندگی راحت طلبی اور استقرار و استحکام سے ناآشنا ہوتی اور صرف قوت کی زبان سمجھتی، یہ ایسی زندگی تھی جو انسانوں کے لئے مشقت و مصیبت ہی لاتی تھی، اور پڑوس کی متمدن آبادیوں کے لئے بھی خطرہ بنی رہتی تھی چنانچہ وہ آپس میں بھی لڑتے رہتے تھے اور اس سے فرصت پاکر متمدن آبادی سے برسرِ پیکار ہو جاتے تھے، لیکن دوسرے لحاظ سے ایک عرب اپنے قبیلے کے آداب و روایات کے سلسلے میں بڑا وفادار اور مخلص ہوتا تھا، وہ موقع پر ایسا شریف النفس میزبان ہوتا جو مہمانی کے تمام فرائض بخوشی انجام دیتا جنگی معاہدوں کا پابند ہوتا، دوستی کا حق ادا کرتا اور رسم و رواج کا آخری حد تک احترام کرتا تھا، ان تمام خصوصیات کی گواہی ان کے شعر و ادب حکم و امثال اور اقدار و اطوار سے بکثرت ملتی ہے۔

ایک عرب مساوات کا دلدادہ، حریت کا عاشق، حقیقت پسند، فعال اور عملی انسان ہوتا تھا، وہ رکیک اور پست حرکتوں سے پرہیز کرتا تھا، وہ اپنی محدود زندگی اور بدویت

پر نہ صرف راضی بلکہ نازاں اور اپنے مقدر پر خوش اور مطمئن تھا، مذہب سے ان کا علاقہ اکثر کمزور ہوتا، ان کا ایمان اپنے قبائلی رسوم اور آبائی روایات پر اس سے کہیں زیادہ پختہ ہوتا تھا، ان کا اخلاقی نصب العین ان شریفانہ و مردانہ صفات سے عبارت تھا جسے وہ لفظ "مروءت" سے تعبیر کرتے اور اپنے شعر و ادب میں جس کے گیت گاتے اور کلمہ پڑھتے ہیں۔

تمدنی و ثقافتی مراکز

ان جگہوں میں جہاں بارش، چشمے یا کنووں کا پانی وافر طور پر ہوتا وہاں قریوں اور دیہاتوں اور موسمی بازاروں اور میلوں کی شکل میں ایک تمدن وجود میں آجاتا تھا، ان چیزوں کا عربوں کی زندگی پر عمومی اثر پڑتا تھا، زندگی کے ان مرکزوں میں وہ معاشرے اور ماحول پیدا ہوتے جن کا خاص رنگ اور مستقل طرز ہوتا جن میں آب و ہوا صنعتوں اور پیشوں اور اس معاشرہ کے اقتصادی حالات کا الگ الگ رنگ نمایاں ہوتا تھا چنانچہ مکہ میں ایک خاص معاشرہ تھا جس کا امتیاز بالکل الگ تھا اسی طرح اہل حیرہ، اہل یثرب کے معاشرے اپنی اپنی خصوصیات رکھتے تھے، یمن کا معاشرہ عرب معاشروں میں اپنے مخصوص حالات، قدیم تمدنی تاریخ اور نئے سیاسی وجوہ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا، اور غلہ کی پیداوار، جانوروں کی پرورش، معدنیات سے استفادہ، محلوں اور قلعوں کی تعمیر میں بہت بڑھا ہوا تھا صنعتوں اور ضروریات زندگی کے لئے وہ باہر سے سامان اور آلات درآمد کرتا اور عراق، شام اور افریقہ سے تجارتی تعلقات بھی رکھتا تھا۔

اہل عرب کے طبقات اور قسمیں

راویوں اور مورخوں کا قدیم عربوں کی اس تقسیم پر تقریباً اتفاق ہے کہ وہ تین قسموں

پر مشتمل ہے (۱) عرب بائدہ (جو اسلام سے پہلے ختم ہو چکے تھے) (۲) عرب عاربہ (بنو قحطان جو عرب بائدہ کے بعد ہوئے) (۳) عرب مستعربہ (حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو حجاز میں آباد ہوئی) وہ نسب کے لحاظ سے اہل عرب کی دو قسمیں کرتے ہیں۔

(۱) قحطانی جن کی آبادی کا ابتدائی مرکز یمن تھا، اور (۲) عدنانی جو پہلے حجاز میں آباد تھے، اسی طرح ماہرین انساب عدنان کی دو شاخیں بتاتے ہیں، ایک ربیعہ دوسری مضر، قحطانی و عدنانی قدیم زمانہ سے ایک دوسرے کے رقیب و حریف تھے، اسی طرح ربیعہ و مُضر کے درمیان بھی صدیوں سے عداوت و مقابلہ چلا آ رہا تھا ماہرین انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ قحطانی اصلی اور زیادہ قدیم ہیں اور عدنانی ان کی شاخ ہیں[1] جنھوں نے ان سے عربی سیکھی، اور پھر جیسے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد نے حجاز میں ہجرت کے بعد اپنا لیا، حضرت اسمٰعیلؑ عرب مستعربہ یعنی عدنانیوں کے جد امجد ہیں۔

اہلِ عرب انساب کا خاص خیال رکھتے اور اسے بڑی اہمیت دیتے ہیں جس کا اعتراف عجمی اہلِ نظر نے بھی ہمیشہ کیا ہے، چنانچہ ایرانی سپہ سالار اعظم رستم نے اپنے درباریوں کو (جب وہ مسلمانوں کے سفیر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے پھٹے کپڑوں اور خستہ حالی کے سبب حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے) تنبیہ کی کہ تم عجیب احمق ہو، عرب کھانے اور لباس کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ وہ اپنے حسب و نسب کی حفاظت کرتے ہیں[2]۔

---

[1] عصر حاضر کے بعض محققین کی رائے ہے کہ اصل عرب عدنانی ہیں اور وہی پہلے عرب عاربہ ہیں جبکہ اکثر مورخین کا خیال اس کے برعکس ہے ان محققین کا کہنا ہے کہ یہ تقسیم جاہلی نصوص پر مبنی نہیں بلکہ اسلامی دور میں لکھی ہوئی کتابوں سے ماخوذ ہے اور اس کی بیشتر روایتیں ان راویوں کے اقوال پر مبنی ہیں جو قحطانی اور یمنی نسل سے تعلق رکھتے تھے، واللہ اعلم۔ [2] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج۷، ص۴۰

اہم قبائل کے مقامات
قبائل کے مقامات
بڑے شہر
دجلہ
فرات
تغلب
عدوان
عذرہ
لخم
غسان
بلی
کوفہ
کلب
جذام
عبس، مرہ
ذبیان
طے
أسد
فزارہ، سعد
غطفان، أشجع
تمیم
ربیعہ
مضر
قضاعہ
سلیم و مزینہ
مدینہ
یربوع
عامر
حنیفہ
ہوازن
لحیان
عبدالقیس
مسقط عمان
أزد
دئل
جدہ
مکہ
زکوان
خزاعہ
مذحج
خثعم
ہمدان
کندہ
أزد (شنوءہ)
خولان
حارث
صنعاء
پیمانہ
میل

لسانی وحدت

اس وسیع ملک کے لئے (جو ایک برّ صغیر کے برابر ہے) یہ بات ذرا بھی تعجب خیز نہ ہونی کہ اس میں زبانوں کی کثرت اور تنوّع ہوتا کیونکہ قبیلوں کے درمیان خاصے طویل فاصلے ہیں، اور اس لئے بھی کہ جنوبی علاقے کے لوگ شمالی علاقے کے لوگوں سے اور مشرقی علاقے کے لوگ مغربی علاقے کے لوگوں سے مشکل سے ملتے تھے، قبائلی عصبیت اور نسلی احساس برتری کا بھی شکار رہتے تھے، اور روم و ایرانی سرحدوں کے قریب رہنے والے عرب قبائل ان کی زبانوں سے قدرتاً کم و بیش متاثر بھی تھے، اور یہ ناگزیر بھی تھا، چنانچہ انھیں اسباب کی وجہ سے وسط یورپ اور ہندوستان کے تحتی براعظم میں زبانوں کی حیرت انگیز حد تک کثرت ہے دستور ہند میں تسلیم شدہ قومی زبانوں کی تعداد پندرہ[۱۵] ہے، اس میں بعض مستقل زبانیں بھی ہیں جن کے بولنے والوں کو ترجمان کی ضرورت پڑتی ہے یا انگریزی سے کام لینا پڑتا ہے۔

لیکن جزیرۃ العرب کا اپنی وسعت اور قبائل کی کثرت کے باوجود شروع سے طرّۂ امتیاز رہا ہے کہ ظہور اسلام سے اس وقت تک اس کی ایک ہی مشترک زبان عربی ہے جو ہمیشہ سے اس جزیرہ کے رہنے والے بدوی اور متمدن قحطانی و عدنانی لوگوں کے بول چال اور باہمی تعلقات کی زبان رہی ہے جس میں اگرچہ لہجوں اور مقامی بولیوں کا قدرتی اختلاف موجود ہے، (جو فلسفۂ زبان، جغرافی اور علیحدگی پسندگی کے رجحانات سے پیدا ہوتا ہے، فاصلوں سے لہجوں کا فرق پیدا ہونا ناگزیر بھی ہے) تاہم اس میں ایک لسانی وحدت بھی موجود رہی ہے، دعوتِ اسلامی کے لئے سہولت، اشاعتِ اسلام میں

سُرعت اور پھیلی ہوئی اکائیوں کو فصیح (قرآنی) عربی زبان میں مخاطب کرنے اور اس سے متاثر کرنے میں اس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

جزیرۃ العرب اقوام و ملل کی تاریخ میں

آثار قدیمہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جزیرۃ العرب میں قدیم حجری عہد (CHELLEAN) سے انسانی آبادی کا نشان ملتا ہے اور جو سب سے پرانے آثار پائے گئے ہیں اس عہد حجری کے اوّلین زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں، عربوں کا ذکر تورات میں بھی آیا ہے جس سے عبرانیوں کے عربوں سے تعلقات کا پتہ چلتا ہے، تورات میں عربوں کا ذکر اس کی تاریخ ۷۵۰،۲۰۰ ق م سے متعلق ہے، اس طرح تلمود میں بھی عربوں کی طرف اشارے ہیں، جوزی فس فلاویوس کی کتاب میں (جو ۳۷ تا ۱۰۰ء میں زندہ تھا) عربوں کے متعلق قیمتی معلومات اور نبطیوں کے حالات ملتے ہیں بعض غلطیوں اور غلط فہمیوں کے باوجود جو ان قدیم تحریروں میں پائی جاتی ہیں، اسلام سے پہلے لکھی جانے والی یونانی ولاطینی کتابوں میں بھی تاریخی حالات و واقعات اور اہم جغرافی معلومات دستیاب ہوتے ہیں ان میں بہت سے ایسے عربی قبائل کا نام بھی ملتا ہے کہ اگر یہ کتابیں نہ ہوتیں تو ہم ان سے واقف نہیں ہو سکتے تھے، اسکندریہ ان اہم مرکزوں میں شمار ہوتا تھا، جہاں عربوں کے حالات اور عادات اور ملک کی پیداوار کی کیفیت معلوم کرنے کا خاص اہتمام تھا تاکہ وہاں کی چیزوں کو بحرِ روم کے ساحل پر واقع ملکوں کے تاجروں تک پہونچایا جا سکے۔

عربوں کا ذکر کرنے والے سب سے قدیم یونانی اخیلس (۵۲۵۔۴۵۶ ق م) اور ہیروڈوٹس (۴۸۰۔۴۲۵ ق م) ہیں، ان کے علاوہ عہد قدیم کے کچھ اور مصنفین بھی ہیں،

جن کے بیانات میں عربوں اور بلادِ عرب کی طرف اشارے موجود ہیں، ان میں بطلیموس کا نام نمایاں ہے جو اسکندریہ میں دوسری صدی مسیحی میں ہوا ہے، اور جس نے ریاضی میں "المجسطی" لکھی ہے جو عربی در سیات کی ایک معروف کتاب ہے۔ مسیحی ماخذ میں بھی عرب جاہلیت اور عرب اسلام سے متعلق خاصا مواد ہے، اگرچہ وہ زیادہ تر مسیحیت، اس کی اشاعت اور اس کے مرکزوں کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔

تورات میں جن عربوں کا ذکر آیا ہے وہ اعراب یعنی بدوی عرب ہیں اس لئے کہ اس میں عرب بادیہ ہی کے اوصاف کا ذکر ہے، اس طرح یونانیوں، رومیوں کی کتابوں اور اناجیل میں جہاں ایسی صفات کا ذکر ہے، ان سے مراد بدوی عرب ہی ہیں جو رومن امپائر اور یونانی سرحدوں پر یورش کرتے رہتے، قافلوں کو لوٹتے اور تاجروں اور مسافروں سے ٹیکس وصول کرتے رہتے تھے، سسلی کے دیدروس نے عربوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ آزادی کے عاشق کھلی فضا میں زندگی گذارنے والے آزاد اور انے اور آزادئ مطلق کے قائل ہیں، اسی لئے ہیروڈوٹس نے ان کے بارے میں لکھا ہے، وہ ہر اس قوت کا مقابلہ کرتے ہیں جو انھیں غلام بنانے اور ذلیل کرنے کی کوشش کرتی ہے آزادی عربوں کا وہ امتیاز ہے جس کے لئے وہ یونانی اور لاطینی اہلِ قلم کی نظروں میں ممتاز رہے ہیں۔

اس طرح عرب و ہند کے تعلقات ایک دوسرے سے واقفیت اور تجارتی و ثقافتی لین دین بہت پرانا ہے، اور اسلام اور اس کی فتوحات سے بہت پہلے کی چیز ہے ایشیائی ممالک میں ہندوستان عربوں سے سب سے زیادہ واقف اور جغرافی و اقتصادی لحاظ سے اس کے قریب تھا جیسا کہ ہندوستانی اور عربی ماخذ اور جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے۔[۱]

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "عرب و ہند کے تعلقات" از مولانا سید سلیمان ندوی، جو اس موضوع پر سب سے بہتر اور مفصل کتاب ہے۔

نبوّت اور آسمانی مذاہب سے جزیرۂ عرب کا تعلق

جزیرۃ العرب بہت سی نبوی دعوتوں اور انبیاء کا گہوارہ رہا ہے، قرآن کہتا ہے:۔

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (سورۃ الاحقاف-۲۱)	اور قوم عاد کے بھائی (ہود) کو یاد کرو جب انھوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں ہدایت کی، اور ان سے پہلے اور پیچھے بھی ہدایت کرنے والے گذر چکے تھے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو مجھے تمھارے بارے میں بڑے دن کے عذاب کا ڈر لگتا ہے۔

اس آیت میں حضرت ہود مراد ہیں جو عاد کی طرف بھیجے گئے ہیں، اور مورّخین کے قول کے مطابق عاد کا تعلق عرب بائدہ سے تھا، اور وہ "احقاف" میں رہتے تھے، حقف ریت کے بلند ٹیلے کو کہتے ہیں، عاد کی بستیاں جزیرہ کی جنوبی بلندیوں پر تھیں جو آج کل "ربع خالی" کے جنوب مغرب میں حضرموت کے قریب واقع ہے ان میں نہ اب زندگی ہے نہ کوئی آبادی ہے جب کہ ایک زمانہ میں وہ سرسبز و شاداب علاقے اور گلزار شہر تھے جن میں عاد جیسی جابر قوم آباد تھی، انھیں اللہ نے تیز آندھی سے ہلاک کر دیا جس نے انھیں ریتیلے طوفان میں ڈھک لیا تھا۔[۱]

آیت یہ بھی بتا رہی ہے کہ حضرت ہودؑ اس علاقے میں آنے والے پہلے اور آخری نبی

---

[۱] تفصیل کے لئے الحاقہ کی آیت ۶-۷ سامنے رہے۔

نہ تھے، ان سے پہلے اور بعد بھی انبیاء آتے رہے تھے، اس لئے قرآن کہتا ہے "وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ"۔

اسی طرح قوم ثمود کے نبی حضرت صالحؑ کی بعثت بھی جزیرۃ العرب میں ہوئی، ثمود "الحجر" میں رہتے تھے، جو تبوک اور حجاز کے درمیان ایک بستی ہے حضرت اسمٰعیلؑ پیدائش کے بعد ہی مکہ آ گئے تھے، وہ وہیں رہے، اور وہیں انتقال فرمایا، اور اگر جزیرہ کو وسعت دے کر مدین کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو حضرت شعیبؑ بھی عربی نبی ثابت ہوتے ہیں اس لئے کہ مدین شام کے علاقے میں ارض عرب کے حدود پر تھا مورخ ابوالفداء لکھتا ہے :-

"اہل مدین عرب تھے اور مدین میں رہتے تھے جو ارضِ معان سے قریب اور شام کے ان اطراف میں تھا جو حجاز سے ملے ہوئے ہیں اور بحیرۂ لوط کے نزدیک تھا، اور قومِ لوط کے بعد ہی ان کا زمانہ ہے"۔

عرب کی سرزمین بہت سے انبیاء و مرسلین کا مرجع و ماویٰ بنی تھی جن پر اللہ کی زمین اپنی کشادگی کے باوجود تنگ کر دی گئی تھی، اور وہ اپنے وطن میں پردیسی بن کر رہ گئے تھے چنانچہ ان حضرات نے اس دُور دَراز سرزمین کا انتخاب کیا جو جابر بادشاہوں اور ظالم حاکموں کے اثر سے دور تھی جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مکہ اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ مدین میں پیش آیا، اس کے علاوہ بہت سے مذاہب کو جب اپنے مرکزوں میں پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملا تو وہ اس جزیرہ میں آکر آباد ہو گئے چنانچہ یہود کی ایک بڑی جماعت رومیوں کے ظلم سے تنگ آکر یمن و یثرب آگئی اور نصرانیت نے قیاصرۂ روم کے ظلم و سفاکی سے بھاگ کر نجران میں پناہ لی۔[1]

---

[1] مضمون کے اس آخری حصہ میں ہم نے شیخ محمد ابوزہرہ کی کتاب "خاتم النبیین" جلد اول اور فصل "ارض النبوۃ الاولی ھی ارض العرب" سے استفادہ کیا ہے۔

بعثت سے پہلے

حضرت اسماعیلؑ مکہ میں

سیدنا ابراہیم علیہ السّلام مکہ کی طرف آئے، جو خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا، اس میں پانی کھیتی، غلّہ اور ضروریاتِ زندگی میں سے کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی جو انسانی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے' ان کے ساتھ ان کی بیوی ہاجرہ اور صاجزادے اسماعیل بھی تھے' یہ سفر دراصل دنیا میں پھیلی ہوئی بُت پرستی سے ہجرت اور ایک ایسے مرکز کی تاسیس کے لئے کیا جا رہا تھا جہاں اللہ تعالےٰ کی عبادت کی جائے اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی دعوت دی جائے' اور یہ مرکز ہدایت کا ایک روشن مینار انسانوں کی جائے پناہ و جائے امن' اور توحید حنیفیت اور دین خالص کی دعوت کا نقطۂ آغاز بن سکے۔[1]

اللہ تعالےٰ نے ان کے اس عمل خالص کو قبول فرمایا اس خشک وادی میں خوب برکت عطا فرمائی' اور اس چھوٹے سے مبارک خاندان کے لئے جو صرف ماں بیٹے پر مشتمل تھا (جن کو حضرت ابراہیمؑ اس دور افتادہ اور بے آب و گیاہ صحرا میں خدا کے بھروسہ پر چھوڑ گئے تھے) پانی کا ایک چشمہ جاری فرمادیا جو "زمزم" کہلایا اور اللہ تعالےٰ نے اس میں بہت برکت دی۔

---

[1] قرآن مجید (سورۂ بقرہ و سورۂ ابراہیم)

اسماعیلؑ جب کچھ بڑے ہوئے اور چلنے پھرنے اور دوڑنے بھاگنے لگے تو حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کی محبت پر ان کی محبت کو قربان کرنا چاہا اور ان کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا اس لئے کہ خواب میں ان کو اس کی ہدایت کی گئی تھی، سعادت مند فرزند نے ارشادِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور خوش دلی و اطمینان کے ساتھ اس پر تیار ہو گئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ذبحِ عظیم[1] (بڑی قربانی) کو اس کا فدیہ بنا دیا اور ان کو محفوظ و مامون رکھا تاکہ دعوت الی اللہ میں وہ اپنے والد کا ہاتھ بٹا سکیں اور خاتم النبیین اور سید المرسلین کے جدِّ امجد بنتے نیز اس امتِ مسلمہ کے مورثِ اعلیٰ بننے کا شرف ان کو حاصل ہو جس پر دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کی ذمّہ داری قیامت تک کے لئے ڈالی گئی ہے۔

حضرت ابراہیم مکہ واپس ہوئے اور باپ بیٹے دونوں نے مل کر اللہ کے گھر کی تعمیر شروع کی ان کی دعا یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اس گھر کو قبول کرے اور اس میں برکت عطا فرمائے اور وہ دونوں اسلام پر جئیں اور مریں، اور ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد کو یہ دولت اور میراث حاصل ہو، وہ اس دعوت کی صرف حفاظت اور پاسبانی ہی نہ کریں اور ہر خطرہ بلکہ ہر نگاہِ بد اور راستے کے ہر کانٹے اور پتھر سے اس کو دور رکھیں، بلکہ اس دنیا میں اس کے داعی اور علم بردار بن کر رہیں، اس کو ہر چیز پر ترجیح دیں، اس کی راہ میں کسی قربانی سے دریغ نہ کریں، یہاں تک کہ یہ دعوت سارے عالم میں پھیل جائے، اور اللہ تعالیٰ ان کی اولاد میں ایک ایسا نبی پیدا کرے جو اپنے جدِ اعلیٰ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو از سرِ نو زندہ کرے اور اس کام کی تکمیل کرے جس کو وہ شروع

---

[1] قرآن مجید، سورۂ صافّات۔

کر رہے ہیں :-

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(سورہ بقرہ - ۱۲۷ - ۱۲۹)

اور جب ابراہیم اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے تو دعا کئے جاتے تھے کہ ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیو اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بنائے رہیو! اور پروردگار ہمیں ہمارے طریق عبادت بتا، اور ہمارے حال پر (رحم کے ساتھ) توجہ فرما! بیشک تو توجہ فرمانے والا مہربان ہے! اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں انھیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجیو! جو ان کو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے اور (ان کے دلوں) کو پاک صاف کیا کرے، بے شک تو غالب اور صاحبِ حکمت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بھی دعا فرمائی تھی کہ یہ گھر ہمیشہ ہمیشہ امن و سکون کا گہوارہ رہے اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو بتوں کی پرستش سے محفوظ رکھے جس سے زیادہ

نفرت و کراہیت ان کو کسی چیز سے نہ تھی، اور جس سے بڑا خطرہ وہ اپنی آئندہ نسل کے لئے کسی چیز کو نہ سمجھتے تھے، اس لئے کہ انبیاء کرام کے بعد ان کی قوموں کا انجام ان کی نظر کے سامنے تھا اور انھوں نے دیکھا تھا کہ ان کی مسلسل کوششوں اور عظیم قربانیوں کے باوجود یہ قومیں کس طرح ان کے راستہ سے ہٹ گئیں اور ان کے دنیا سے تشریف لے جانے ہی شیطانوں مفسدوں اپنے اپنے وقت کے دجالوں بتوں کے پجاریوں اور جاہلیت کے علم برداروں نے ان کو شکار کیا اور لقمۂ تر بنایا۔

انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور اس تمنا کا بھی اظہار کیا کہ ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد اس دعوت اور جہاد سے برابر رشتہ قائم رکھے اور ان کی بت شکنی، شرک و بت پرستی سے نفرت و بیزاری، راہِ حق میں مسلسل محنت اور جدّوجہد، اپنے بت تراش و بت فروش والد کے مقابلہ میں ان کی صف آرائی، حق گوئی و دل سوزی اور ان کی ہجرت اور ترکِ وطن کو ہمیشہ یاد رکھے، اور یہ محسوس کرے کہ اتنے نازک و اہم کام کے لئے اس ویرانے اور پتھریلی و سنگلاخ زمین (جو نہ کھیتی کے لائق تھی نہ تہذیب و تمدّن کی پرورش اور ترقی کا اس میں کوئی سامان تھا) کے انتخاب کا راز کیا ہے اور دنیا کے بڑے بڑے آباد و گلزار شہروں اور تجارت و زراعت، صنعت و حرفت کے مرکزوں پر جہاں ہر طرح کے اسبابِ عیش اور سامانِ راحت موجود تھے اس دور افتادہ و گمنام خطّہ کو کیوں ترجیح دی گئی ہے؟

انھوں نے اپنے اللہ سے یہ بھی دعا کی کہ ان کی اولاد کو محبوبیت و دل نوازی، مقبولیت و شہرت اور مرجعِ خلائق اور مرکزِ آفاق بننے کا شرف حاصل ہو، لوگوں کے دل بے ساختہ ان کی طرف کھنچیں اور وہ دنیا کے کونے کونے سے آکر اپنی محبّت و عقیدت کا خراج ان کو پیش کریں، رزق خود بخود ہر طرف سے ان کو پہونچتا رہے اور میوے اور پھل نیز ہر طرح کے

ثمرات اور کوششوں کے بہترین نتائج اور فوائد و منافع ان کو حاصل ہوں :-

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ	اور جب ابراہیم نے دعا کی کہ میرے
هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ	پروردگار اس شہر کو (لوگوں کے لئے)
اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ	امن کی جگہ بنا دے اور مجھے اور میری
اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ	اولاد کو اس بات سے کہ بتوں کی پرستش
تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ	کرنے لگیں بچائے رکھ اے پروردگار
فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ رَبَّنَا اِنِّیْ	انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ،
اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ	سو جس شخص نے میرا کہا مانا وہ میرا ہے
ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ	اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے
رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ	والا مہربان ہے ، اے پروردگار !
اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ	میں نے اپنی اولاد کو میدان (مکہ)
اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ	میں جہاں کھیتی نہیں تیرے عزت
لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ۝	و ادب والے گھر کے پاس لا بسایا ہے
(سورۂ ابراہیم ۳۵ - ۳۷)	اے پروردگار تاکہ یہ نماز پڑھیں تو
	لوگوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ
	ان کی طرف جھکے رہیں اور ان کو
	میووں سے روزی دے تاکہ تیرا شکر کریں۔

قبیلۂ قریش

یہ ساری دعائیں اور تمنائیں ایک ایک کر کے پوری ہوئیں ، اللہ تعالیٰ نے

ان دونوں کی اولاد میں برکت عطا فرمائی، یہ ابراہیمی عربی خاندان خوب برگ و بار لایا اور پھیلا، اسماعیل علیہ السلام نے قبیلۂ جُرہُم[1] میں رشتہ کیا جو عرب عاربہ میں شمار کیا جاتا تھا، اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں بہت برکت ہوئی یہاں تک کہ انھیں میں عدنان پیدا ہوئے جن کا سلسلۂ نسب حفظ و احتیاط اور تواتر و اجماع کے لحاظ سے انسابِ عرب میں سب سے زیادہ روشن اور ممتاز ہے۔

عدنان کی بھی کثیر اولاد ہوئی جن میں مَعد بن عدنان زیادہ مشہور ہیں، معد کی اولاد میں مُضَر نامور ہوئے اور ان کی اولاد میں فہر بن مالک نے خاندان کا نام روشن کیا، فہر بن مالک بن النضر کی اولاد کا نام "قُریش" پڑ گیا، اور یہ نام ان کے سارے ناموں پر اس طرح غالب آیا کہ یہ قبیلہ قریش کہلانے لگا، اہلِ عرب نے قریش کی عالی نسبی، سیادت و امارت، فصاحت و بلاغت، قوت بیانیہ، اخلاق عالیہ، شجاعت و حوصلہ مندی پر پورا اتفاق کر لیا، اور اب یہ ایک ایسی حقیقت بن گئی جو ضرب المثل کی طرح مشہور اور اختلاف سے بالاتر سمجھی گئی ہے اور اس میں دو رائیں نہیں ہیں۔[2]

قُصَیّ بن کلاب اور ان کی اولاد

فہر کی اولاد میں قُصَیّ بن کلاب پیدا ہوئے اور مکہ کی سرداری قبیلۂ جُرہُم کے ہاتھ میں رہی یہاں تک خزاعہ جو بیت اللہ کے نگراں اور محافظ تھے ان پر غالب آ گئے،

---

[1] کہا جاتا ہے کہ قبیلۂ جُرہُم وہ سب سے پہلا قبیلہ ہے جس نے مکہ میں اقامت کی اور اس کا سبب پانی کے اس نہ ختم ہونے والے سرچشمہ کا وجود تھا، بعض روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے لڑکے اسماعیل کو اس وادی میں چھوڑ کر ہجرت فرمائی اس وقت یہ قبیلہ یہاں موجود تھا۔

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے سیرت ابن ہشام ج ۱۔ اور سیر و انساب کی دیگر کتابیں۔

اس کے بعد قصیّ بن کلاب کا ستارۂ اقبال بلند ہوا، اور ان کی صلاحیتیں اور خدمات سامنے آئیں اور بیت اللہ کی خدمت کا یہ منصب ان کے حوالہ کیا گیا، قریش کے سارے افراد ان کے ساتھ مل گئے اور انھوں نے قبیلۂ خزاعہ کو مکہ سے بے دخل کر کے اس کا نظم و انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا قصیّ بن کلاب بہت ہر دل عزیز و مقبول سردار تھے، بیت اللہ کی دربانی و پاسبانی ان کے ذمہ تھی، اس کی کلید ان ہی کے قبضہ میں تھی، اور ان کی اجازت کے بغیر کوئی اس میں داخل نہ ہو سکتا تھا، اسی کے ساتھ زمزم کا سقایہ اور رفادہ[1] یعنی حجاج کی سالانہ ضیافت، ندوہ یعنی ان کی وہ مجلس جو مختلف مشوروں اور لڑائیوں میں پرچم کے علم بردار اور لشکر کے قائد کے انتخاب وغیرہ کے لئے حسب ضرورت ہوتی تھی، سب چیزیں ان کے دائرہ اختیار میں تھیں اور اس طرح مکہ کا سارا شرف اور ہر قسم کی فضیلت ان کو حاصل ہو گئی تھی۔

ان کی اولاد میں عبد مناف نے زیادہ عزت و وجاہت حاصل کی، ان کے سب سے بڑے صاحبزادے ہاشم تھے، اور سقایہ و رفادہ کا یہ کام ان کے ذمہ رہا، یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطّلب کے والد تھے، عبد المطّلب کو سقایہ و رفادہ کا یہ منصب بلند اپنے چچا المطّلب بن عبد مناف سے حاصل ہوا، انھوں نے اپنی قوم میں جو عزت و نیک نامی اور وجاہت و ہر دل عزیزی پائی وہ اب تک ان کے آباء و اجداد میں کسی اور کے حصہ میں نہ آئی تھی[2]۔

بنی ہاشم

بنی ہاشم قبیلۂ قریش کی سنہری اور اہم کڑی تھے، تاریخ و سیر کی کتابوں نے ان کے

---

[1] رفادہ اس کھانے اور دعوت کو کہتے ہیں جو حجاج کے لئے اس بنیاد پر ہر سال کی جاتی تھی کہ وہ رحمان کے مہمان ہیں۔ [2] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام۔ ج ۱ (اولاد عدنان)

جو واقعات و حالات ہمارے لئے محفوظ کر دیئے ہیں (اور وہ اصل حقیقت سے بہت کم ہیں) اگر ہم ان کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہو گا کہ ان میں شریفانہ انسانی احساسات کی کتنی نمود تھی اور ہر چیز میں اعتدال، عقلِ سلیم، بیت اللہ کی اللہ کی نگاہ میں جو وقعت و حرمت ہے اس کا پورا احساس ظلم و حق تلفی سے گریز، عالی ہمتی، کمزوروں و مظلوموں کے ساتھ شفقت و ہمدردی، سخاوت و شجاعت مختصر یہ کہ عربوں کے نزدیک الفروسیۃ (شہسواری) کے جتنے اوصافِ عالیہ اور صفاتِ حمیدہ ہیں، اور اس میں جتنے بلند و لطیف معانی پوشیدہ ہیں ان کا جلوہ ان کی سیرت میں ہمیں نظر آتا ہے یہ وہ سیرت و کردار ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آباء کرام کے ہر طرح شایانِ شان ہے، اور آپ نے جس اعلیٰ و بلند اخلاق کی اپنے قول و عمل سے دعوت دی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوائے اس کے کہ وہ انقطاعِ وحی کے دور میں تھے، اور جاہلیت کے عقائد و عبادات میں اپنی قوم کے ساتھ بہر حال شریک و سہیم تھے۔

مکہ میں بُت پرستی اور اس کا اصل سرچشمہ اور تاریخ

قریش کا قبیلہ ابراہیم خلیل اللہ اور اپنے جدِ اعلیٰ اسماعیلؑ کے دین پر برابر قائم اور توحید اور خدائے واحد کی عبادت پر ثابت قدم رہا یہاں تک کہ عمرو بن لحی الخزاعی کا دور آیا، یہ پہلا شخص تھا جس نے حضرتِ اسماعیلؑ کے دین میں تغیر کیا، بتوں کو نصب کیا، جانوروں کی تعظیم اور ان کو "سائبہ"[1] بنانے کا

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۷۶ ـ ۷۷ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے عمرو بن عامر الخزاعی کو دیکھا کہ وہ جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹتا ہوا چل رہا ہے یہ وہ پہلا شخص تھا جس نے جانوروں کو بتوں کے نام سانڈ بنا کر چھوڑنے کی بنیاد ڈالی (بخاری و مسلم، احمد) محمد بن اسحاق سے دوسری جگہ مروی ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے دین اسماعیل کو بدلا، بُت نصب کئے (باقی ص ۹۹ پر)

رواج ڈالا اور حلال و حرام کے نئے قاعدے وضع کئے جن کا احکام الٰہی سے کوئی تعلق نہ تھا، اور جو شریعت ابراہیمی سے بالکل جُدا تھے، یہ قصہ یوں کھڑا ہوا کہ یہ شخص مکہ سے شام گیا اور یہ دیکھا کہ وہاں کے لوگ بتوں کو پوجتے ہیں، یہ بات اس کو بہت پسند آئی اور اس نے کچھ بت وہاں سے حاصل کر کے مکہ میں نصب کئے اور لوگوں کو ان کی تعظیم اور پرستش کا حکم دیا۔

یہ بات بھی ممکن اور قرین قیاس ہے کہ وہ شام جاتے ہوئے "بتراء" سے گزرا ہو جس کو قدیم مورّخ اور جغرافیہ دان "بطراء" اور "بطرہ (PATRA)" کہتے آئے ہیں، یہ شرق اردن کے جنوب میں واقع مشہور پہاڑی قصبہ ہے جس کا ذکر رومیوں اور یونانیوں کے یہاں ملتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کو نبطیوں نے[1] جو اصلاً عرب تھے، ہزاروں سال پہلے تعمیر کیا تھا، یہ لوگ مصر، شام، وادی فرات اور رومہ کے سفر برابر کرتے رہتے تھے، اور ہو سکتا ہے کہ وادی فرات جاتے ہوئے وہ حجاز سے ضرور گزرتے ہوں، یہ لوگ کھلی ہوئی بت پرستی میں مبتلا تھے، پتھروں سے بت تراشتے اور اس کی پوجا کرتے تھے، مورخین کا خیال ہے کہ شمالی حجاز کا مشہور بُت "لات" جو سب سے اہم سمجھا جاتا تھا در اصل "بتراء" ہی سے برآمد کیا گیا تھا، اور اہم اور خاص بتوں میں شامل کر لیا گیا تھا۔

اس کی تصدیق فلپ ہِٹی (P. K. HITTI) کی کتاب HISTORY OF SYRIA سے بھی ہوتی ہے، جس میں ان نبطی علاقوں (موجودہ شرق اردن) پر روشنی ڈالی

(باقی ص ۹۸ کا) اور جانوروں کو سائبہ کرنے کا رواج ڈالا، چھٹا یا سانڈ جو استعمال میں نہ آئے اور بتوں کے لئے وقف سمجھا جائے۔ [1] مصنف نے ۱۹ اگست ۱۹۷۳ء کو رابطۂ عالم اسلامی کے وفد کے رکن کی حیثیت سے یہ جگہ خود دیکھی ہے، اور پہاڑوں میں تراشے گئے بُت پرستی کے معاملہ کی کثرت خاص طور پر نوٹ کی ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کا سفر نامہ "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک"

گئی ہے، اس کا کہنا ہے کہ:-

"ان معبودوں کا سردار "ذوالشراء" تھا، جو ایک مستطیل ستون یا سیاہ مربع پتھر سے مشابہ تھا، "لات" جس کی عرب پرستش کرتے تھے، دراصل "ذی الشراء" ہی سے متعلق تھا، دوسرے نبطی بت جن کا ذکر ان تاریخی آثار اور قدیم نبطی تحریروں اور نقوش میں ملتا ہے، وہ "مناۃ" اور "عزّیٰ" ہیں ان تحریروں میں "ہبل" کا ذکر بھی ملتا ہے"۔[1]

یہ خیال رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں بت پرستی کی مختلف قسمیں جزیرۃ العرب کے چاروں طرف اور بحر و بر کے علاقہ میں پھیل رہی تھیں اور حضرت مسیحؑ اور ان کے حواریوں کی دعوت ظاہر نہ ہوئی تھی جس نے بت پرستی کی یہ پیش قدمی روکی اور اس کی تیزی و سرگرمی کو کم کیا، رہ گئی یہودیت تو وہ محدود و نسلی مذہب تھا، جو بنی اسرائیل کے اندر منحصر تھا اور بنی اسرائیل کے سوا کسی اور کو توحید کی دعوت دینے کی اجازت اس میں نہ تھی (DE LACY O' LEARY) اپنی کتاب "عرب محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے پہلے" میں لکھتے ہیں:-

"یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ بتوں کی عبادت دراصل شام کی "دین" ہے جو جزیرۃ العرب کو شامی و یونانی مخلوط روایات سے ملا ہے جو شام میں عام تھیں اور شاید عرب کے بقیہ حصوں میں ان کا زیادہ رواج اور چلن نہ تھا"۔[2]

---

[1] P. K. HITTI : HISTORY OF SYRIA, (LONDON 1951), P. 382-83

[2] ARABIA BEFORE MUHAMMAD, (LONDON 1927) P. 196-97

اسی طرح بت پرستی وادی فرات اور جزیرۃ العرب کے مشرق میں عام تھی اور چونکہ اس علاقہ سے جزیرۃ العرب کے تجارتی تعلقات اور دوستانہ روابط تھے، اس لئے کچھ بعید نہیں کہ جزیرۃ العرب میں بت پرستی پھیلنے میں اس علاقہ کا بھی حصّہ ہو GEORGES ROUX نے اپنی کتاب "قدیم عراق" میں اس کی صراحت کی ہے کہ عراق کی قدیم تاریخی تحریریں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ بت پرستی وہاں تیسری صدی عیسوی اور اس کے بعد تک عام تھی، یہ ملک ان بتوں اور معبودوں کا مرکز تھا، جس میں غیر ملکی بت بھی تھے، اور مقامی بھی۔[1]

ایک روایت یہ بھی ہے کہ قریش میں بت پرستی کا آغاز تدریجی طور پر ہوا اس کی ایک توجیہ مؤرخین عرب کے بیان سے بھی ہو سکتی ہے کہ پہلے وہ لوگ جب مکّہ سے کہیں سفر کرتے تھے، تو حرم کے کچھ پتھر تبرک کے طور پر "تعظیمًا" اپنے ساتھ لے لیتے تھے۔

اس کے بعد جو پتھر ان کو زیادہ پسند آتے اس کی عبادت کرنے لگتے، ان کی اولاد اور نئی نسل، اس تفصیل سے بھی ناواقف تھی، اس نے کھلی ہوئی بت پرستی اختیار کرلی اور جس طرح اور دوسری گمراہ قومیں تھیں، اسی طرح یہ بھی گمراہی میں جا پڑیں، تاہم عہدِ ابراہیمی کے کچھ باقی ماندہ اعمال اور روایات کو وہ اپنے سینہ سے لگائے رہے، مثلاً بیت اللہ کی تعظیم، طواف، حج اور عمرہ،[2] اقوام و مذاہب کی مرحلہ وار تاریخ

---

[1] ANCIENT IRAQ (1972), P. 283-84 [2] اس کی تفصیل، اِن بتوں کے نام اور ان کے مقامات نیز اس سلسلہ کے واقعات اور بت تراشی کے محرکات و اسباب کو سمجھنے کے لئے "کتاب الاصنام" للکلبی اور "بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب" از علامہ سید محمود شکری الآلوسی ج ۲ بعنوان (ذکر شیٔ من اخبار الاصنام و سبب اتخاذ العرب لہا) ملاحظہ کریں ص ۲۰۰-۲۱۵

اور وسائل سے مقاصد تک اور مقدمات سے نتائج تک ان کی تدریجی منتقلی کے جائزے سے ان مورخین کی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ عربوں میں اور خاص طور پر قریش میں بُت پرستی کا آغاز کس طرح ہوا، بعض دوسری مسلم قوموں اور فرقوں میں تصویروں، شبیہوں اور مزارات سے وابستگی اور تعظیم و تقدیس میں جس طرح غلو سے کام لیا گیا، اس کی تاریخ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اسی لئے اسلامی شریعت نے وہ تمام راستے اور چور دروازے پہلے ہی سے بند کر دیئے ہیں جو شرک یا اشخاص اور مقامات و آثار کی تقدیس و تعظیم میں غلو کی طرف لے جاتے ہیں۔[1]

---

[1] شریعت اسلامی اور احادیث صحیحہ میں اس کے دلائل اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے ان ہی میں سے ایک مشہور حدیث ہے "لا تتخذوا قبری عیدا" (میری قبر کو عید اور جشن کی جگہ نہ بنانا اس پر میلہ لگانا) ایک اور حدیث ہے کہ "لا تشد الرحال إلا إلى ثلاثة مساجد" (صرف تین مسجدیں ہیں جہاں باقاعدہ زیارت کی نیت کر کے سفر کرنا جائز ہے) دوسری حدیث ہے "لا تطروني كما اطرت النصارى المسيح بن مريم" (میری اس طرح حد سے بڑھی ہوئی مدح سرائی نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے مسیح بن مریم کی کی ہے) اس طرح کی بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں جاندار کی تصویر سازی کی حرمت میں دراصل یہی حکمت اور روح پوشیدہ ہے، قدیم زمانہ میں بہت سی قومیں اپنے بزرگوں کی تصاویر کی محبت و تعظیم سے مجسمہ سازی اور بالآخر بت تراشی اور بت پرستی تک پہنچی ہیں ابن کثیر آیت مندرجہ ذیل کی تفسیر میں لکھتے ہیں "وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا" محمد بن قیس راوی ہیں کہ آدم اور نوح کے درمیان وہ نیک اور صالح اشخاص تھے جن کے متبعین اور عقیدت مندوں کی خاصی تعداد تھی، جب ان کا انتقال ہوا تو ان مریدین و متبعین نے سوچا اگر ہم ان کی کوئی شبیہ یا تصویر بنائیں تو اس سے ان کی یاد تازہ ہوگی اور عبادت میں زیادہ ذوق و سرور حاصل ہوگا، اس خیال سے انھوں نے ان کی تصاویر بنائیں جب یہ نسل بھی ختم ہوئی اور نئی نسل آئی تو شیطان نے اس کو یہ سکھایا پڑھایا کہ ان کے آباء و اجداد دراصل ان تصویروں اور شبیہوں کی عبادت کرتے تھے اور ان ہی کی برکت سے بارش ہوتی تھی، رفتہ رفتہ یہ ان کی باقاعدہ پرستش کرنے لگے اور کھلی ہوئی بت پرستی کا آغاز ہو گیا۔

اصحاب الفیل کا واقعہ

اسی زمانہ میں ایک اتنا بڑا واقعہ پیش آیا جس سے بڑا واقعہ عربوں کی تاریخ میں کبھی نہ ہوا تھا، یہ اس بات کی دلیل تھی کہ کوئی بہت بڑی بات مستقبل قریب میں ہونے والی ہے، اور اللہ تعالےٰ عربوں کے ساتھ خیر کا ارادہ رکھتا ہے، اور کعبہ کی شان اس طرح دوبالا ہونے والی ہے کہ وہ شان اور عظمت دنیا کی کسی عبادت گاہ اور کسی اور گھر کو حاصل نہ ہوگی، اور اس کے ساتھ اس سے تاریخ مذاہب اور انسانیت کے مستقبل کا وہ ابدی پیغام، اور لافانی کردار وابستہ ہے جس کو اسے انجام دینا اور تکمیل تک پہونچانا ہے۔

اللہ تعالےٰ کی نظر میں بیت اللہ کی عزت و حرمت پر قریش کا عقیدہ

قریش کے لوگ یہ عقیدہ اور ایمان رکھتے تھے کہ اس گھر کی اللہ تعالےٰ کی نگاہ میں ایک خاص قدر و منزلت ہے، اور وہی اس کا حامی و ناصر اور نگہبان و پاسبان ہے، ان کا یہ عقیدہ اور ایمان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دادا اور قریش کے سردار عبد المطّلب اور حبشہ کے بادشاہ ابرہہ کی گفتگو سے پوری طرح عیاں ہے، اس کا قصّہ یہ ہے کہ ان کے دو سو[2] اونٹ ابرہہ نے لے لئے تھے، وہ اس کے لئے ابرہہ سے ملنے گئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی ابرہہ نے ان کی بہت عزّت کی، اپنے تخت سے اتر آیا، پہلو میں بٹھایا، اور ضرورت دریافت کی، انھوں نے کہا کہ میرے دو سو[2] اونٹ جو بادشاہ نے لئے ہیں وہ واپس لینا چاہتا ہوں، بادشاہ نے عبد المطّلب کے اِس

حقیر و ذاتی مطالبہ پر اپنی حیرت واستعجاب ظاہر کرتے ہوئے کہا تم دو سو اونٹوں کی بات کرتے ہو جو میں نے لے لئے ہیں، اور اس گھر کی فکر نہیں کرتے جس پر تمہارا اور تمہارے آباء واجداد کا دین قائم ہے، اور جس کو ڈھانے کے لئے میں یہاں آیا ہوں، اس کے لئے تم کوئی گفتگو نہیں کرتے؟

عبد المطلب نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیا کہ میں تو اونٹوں کا مالک ہوں (اس لئے اس کی فکر کرتا ہوں) جو گھر کا مالک ہے وہ آپ اس کی حفاظت کرے گا۔

اس نے کہا "کہ وہ مجھ سے کہاں بچ سکتا ہے!"

انھوں نے جواب دیا "اَنتَ وذاك" یہ تم جانو اور وہ (گھر کا مالک اور رب) جانے۔[1]

اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اس کی تفصیل آگے آئے گی، اور اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اب کسی حملہ آور کی مجال نہیں ہے کہ اس کو بری نظر سے دیکھے اور اس پر دست درازی کرے بے شک اپنے گھر اور اپنے دین کی حفاظت اللہ تعالیٰ ہی کے ذمہ تھی، اور اس کام کی تکمیل اسی کو کرنی تھی۔

اس اہم واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ابرہۃ الاشرم جو نجاشی (شاہ حبشہ) کا صنعاء میں عامل (گورنر اور حاکم) تھا، اس نے صنعاء میں ایک بڑا گرجا تعمیر کیا اور اس کا نام (القُلَّیس) رکھا، مقصد یہ تھا کہ عربوں کے حج کا رخ اس طرف پھیر دیا جائے اس کے لئے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی کہ کعبہ بندگانِ خدا کی پناہ گاہ اور مرکز و مرجع

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۴۹-۵۰

کی حیثیت سے باقی ہے اور لوگ دور دراز مقامات سے کارواں در کارواں وہاں حاضر ہوں، وہ چاہتا تھا کہ یہ رتبۂ بلند اور مرکزیت گرجا کو حاصل ہو۔

یہ بات عربوں کے لئے بہت شاق تھی اس لئے کہ کعبہ کی محبت ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور وہ کسی گھر، معبد اور مذہبی مرکز کو اس کے برابر نہ سمجھتے تھے، اور اس کو چھوڑ کر کوئی بڑی سے بڑی دولت لینے پر تیار نہ تھے، اس مسئلہ نے ان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ ہر جگہ موضوعِ سخن بن گیا، اسی درمیان میں کنانی اس کام کے لئے نکل کھڑا ہوا، اور اس گرجا میں جا کر قضائے حاجت کی اور اس کو نجس کر دیا، اس سے ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو گیا، ابرہہ کو اس بات پر بے حد غصہ آیا اور اس نے اسی وقت قسم کھائی کہ وہ خود کعبہ پر حملہ آور ہوگا اور اس کو گرائے بغیر اطمینان کی سانس نہ لے گا۔[1]

---

[1] ہو سکتا ہے کہ ابرہہ کے حملہ اور فوج کشی کا سبب محض ایک عبادت گاہ کی بے حرمتی و اہانت سے زیادہ وسیع و اہم ہو اور وہ مکہ کو فتح کرنے کی نیت رکھتا ہو تاکہ شام سے یمن کا رابطہ قائم ہو جائے اور عیسائی حکومت کے قدم جزیرۃ العرب میں مضبوطی سے جم جائیں، یہ اقدام روم اور حبش کے عین مفاد میں تھا اس لئے کہ وہ دونوں عیسائیت سے تعلق رکھتے تھے، یہ منصوبہ خواہ اس کے اسباب جو بھی ہوں، اس گھر اور مرکز کو راستہ سے ہٹائے اور مکہ کو اس روحانی پیشوائی سے بے دخل کئے بغیر ممکن نہ تھا جس کے لئے تقدیر کا فیصلہ یہ تھا کہ اسے تمام انسانوں کے لئے سرچشمۂ ہدایت جائے پناہ اور آخری نبوت کا مرکز بننا ہے، لیکن مشیتِ الٰہی کا فیصلہ کچھ اور تھا، اس کا بھی احتمال ہے کہ رومیوں ہی نے ابرہہ کو فتح مکہ پر اکسایا ہو اور اس کے پیچھے بعض سیاسی مقاصد کے حصول کا جذبہ ہو، مثلاً ایرانی اثرات کو کمزور کرنا اس لئے کہ جزیرۃ العرب میں رومیوں کے اثر و نفوذ کا مقابلہ تنہا ایرانی ہی کر رہے تھے

ابرہہ لشکر لے کر چلا اور ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ساتھ لے لی عربوں نے ہاتھیوں کے بارے میں پہلے سے بہت کچھ سن رکھا تھا، یہ خبر ان پر بجلی بن کر گری اور وہ اس حملہ سے بے حد خائف ہوئے اور کوشش کی کہ کسی طرح اس لشکر کو آگے بڑھنے سے روکا جائے لیکن ان کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ابرہہ اور اس کے لشکر جرّار کا مقابلہ ان کی طاقت سے باہر ہے، چنانچہ یہ معاملہ انھوں نے اللہ کے سپرد کیا، ان کو پورا یقین تھا کہ اس گھر کا جو مالک اور رب ہے وہ اس کی خود پاسبانی کرے گا۔

قریش نے لشکر کی دست درازیوں اور مظالم سے بچنے کے لئے پہاڑیوں و وادیوں میں پناہ لی اور منتظر رہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے گھر کی حرمت و ناموس کے لئے کیا کرتا ہے، عبد المطلب اور ان کے ساتھ قریش کے کچھ لوگ باب کعبہ کا حلقہ پکڑ کر خدا کے حضور آہ وزاری میں مشغول ہو گئے اور ابرہہ اور اس کے لشکر کی ہزیمت کے لئے نصرتِ خداوندی کی دعا کی، اِدھر ابرہہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ کعبہ کی طرف بڑھا، اپنے ہاتھی کو جس کا نام "محمود" تھا اس نے حملہ کے لئے تیار کیا، لیکن مکّہ کے راستہ ہی میں ہاتھی ایک جگہ بیٹھ گیا اور مارنے کے باوجود اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا، جب انھوں نے اس کا رخ یمن کی طرف کیا تو وہ فوراً اٹھا اور بہت تیزی سے دوڑنے لگا اس وقت اللہ تعالےٰ نے سمندر کی طرف چڑیوں کے جھنڈ بھیجے، ہر چڑیا اپنے پنجوں میں پتھر لئے ہوئے تھی، یہ پتھر جس کو لگتے اس کو ہلاک کر دیتے، یہ دیکھ کر اہلِ حبشہ جس راستے سے آئے تھے، اس پر تیزی سے واپس بھاگے، اور چڑیوں کے پتھروں سے گرتے گئے اور ہلاک ہوتے گئے، ابرہہ کا جسم بھی چھلنی ہو گیا، وہ اس کو اٹھا کر

اپنے ساتھ واپس لے جانے لگے تو اس کا ایک ایک پور گرنے لگا یہاں تک کہ صنعائ پہونچ کر اس نے بہت بری طرح جان دی۔[1]

یہ واقعہ قرآن مجید میں بھی بیان کیا گیا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ o اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ o وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ o تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ o فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ o (سورۂ فیل ۱-۵)	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا، کیا ان کا داؤں غلط نہیں کیا، اور ان پر جھلّڑ کے جھلّڑ جانور بھیجے، جو ان پر کھنگر کی پتھریاں پھینکتے تھے تو ان کو ایسا کر دیا جیسے کھایا ہوا بھس۔

واقعۂ فیل اور اس کے اثرات

جب اللہ تعالیٰ نے اہلِ حبشہ کو مکہ سے ناکام و نامراد واپس کیا اور ان پر یہ عذاب نازل ہوا جس کا ذکر ابھی گزرا ہے تو عربوں کے دلوں میں قدرتی طور پر قریش کی بڑی عظمت پیدا ہو گئی، وہ کہنے لگے کہ بے شک یہ اللہ والے ہیں ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی اور ان کو لڑنا بھی نہ پڑا، ان کے دل میں کعبہ کی عظمت پہلے سے دو چند ہو گئی اور اس کی عند اللہ حرمت و عزت پر ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔[2]
یہ اللہ تعالیٰ کی ایک کھلی ہوئی نشانی اور معجزہ تھا اور اس بات کا پیش خیمہ کہ مکہ

---

[1] دیکھئے واقعۂ فیل سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۳-۵۷ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۷

میں ایک ایسے نبی کا ظہور ہونے والا ہے جو کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کرے گا، اس کے ہاتھوں اس کی شان دوبالا ہوگی، اس کے دین کا اس گھر سے بہت گہرا اور ابدی ولازوال تعلق رہے گا، اس واقعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اس نبی کی بعثت اور ظہور کا مبارک دن کچھ دور نہیں ہے۔

عربوں میں اس واقعہ کو بجا طور پر بہت اہمیت حاصل ہوئی اور اس سے انھوں نے نئی تاریخ شروع کی چنانچہ ان کی تحریروں میں اس کا رواج ملتا ہے کہ یہ بات عام الفیل (یعنی واقعہ فیل والے سال میں) پیش آئی فلاں شخص عام الفیل میں پیدا ہوا یہ واقعہ عام الفیل کے اتنے سال کے بعد کا ہے، عام الفیل ۵۷۰ء کے مطابق ہے۔

مکّہ
بعثتِ نبویؐ کے وقت

مکّہ ایک اہم شہر

بہت سے وہ لوگ جو زمانۂ بعثت کے حالات سے اچھّی طرح واقف نہیں ہیں، اور عربوں کی تاریخ، سماجی زندگی، ان کے ادب اور شاعری اور قبائلی روایات پر ان کی زیادہ گہری نظر نہیں ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ مکّہ بعثتِ نبوی کے وقت ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں زندگی عقلی، اجتماعی اور تمدّنی ہر لحاظ سے دورِ طفولیت میں تھی، وہ قبائل کی چند آبادیوں کا نام تھا جہاں بالوں کے بنے ہوئے خیموں اور ڈیروں میں (جن کے چاروں طرف اونٹوں، بھیڑ بکریوں اور گھوڑوں کے باندھنے کی جگہیں تھیں) ان کی گزر بسر تھی، وہ زیادہ تر وادیوں کے کنارے اور پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے تھے، ان کا کھانا سوکھی روٹی یا اونٹ کا گوشت تھا جو وہ ٹھیک سے پکانا بھی نہیں جانتے تھے، اونٹ کے بالوں سے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، ان کے کھانے پینے میں کوئی تنوّع تھا نہ لباس میں کوئی خوش نمائی، نہ زندگی میں گرمی اور حرارت، نہ احساس میں نزاکت و لطافت، نہ خیال میں بلند پروازی۔

مکّہ کی یہ تاریک اور حقیر تصویر جو سیرت و تاریخ کی عام کتابوں میں پیش کی گئی ہے، اور وہ زیادہ تر عجمی زبانوں میں لکھی گئی ہیں، اس تاریخی حقیقت کے خلاف ہے،

جو تاریخ کی کتابوں اور ادب اور جاہلی اشعار میں ملتی ہے اور جس میں مکّہ اور باشندگانِ مکّہ کی عادات و روایات اور دستور و قوانین کا (جو ابتدائی بدویانہ زندگی سے ابتدائی شہری اور تمدّنی زندگی کے دور میں داخل ہو چکے تھے) خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ تصویر قرآن مجید کے ان اوصاف و اسماء سے بھی کوئی مطابقت نہیں رکھتی جس میں مکّہ کو "اُمّ القریٰ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ ۝ (سورۂ شوریٰ۔ ۷)	اور اس طرح تمہارے پاس قرآن عربی بھیجا تاکہ تم بڑے گاؤں (یعنی مکّہ) کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے اردگرد رہتے ہیں ان کو راستہ دکھاؤ اور انھیں قیامت کے دن کا بھی جس میں کچھ شک نہیں ہے خوف دلاؤ، اس روز ایک فریق بہشت میں ہوگا اور ایک فریق دوزخ میں۔

دوسری جگہ اس کے متعلق یہ ارشاد ہے:۔

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ (سورۂ تین ۱-۳)	انجیر کی قسم اور زیتون کی اور طورِ سینین کی اور اس امن والے شہر کی۔

ایک جگہ آیا ہے:۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ (سورۂ بلد۔ ۱-۲)	اس شہر (مکّہ) کی قسم اور تم اسی شہر میں تو رہتے ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ مکّہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط ہی میں دورِ جہالت سے دورِ تہذیب

میں داخل ہو چکا تھا، اگرچہ یہ تہذیب اپنے محدود دائرہ میں تھی، یہ شہر ایک ایسے نظام کے ماتحت تھا جو باہمی تعاون و اتحاد، اجتماعی و عمومی مفاہمت اور تقسیم کار کی بنیاد پر قائم تھا، اور یہ نظام قصیٌ بن کلاب کے ہاتھوں قائم ہوا تھا جن کی پانچویں پشت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔

ابتداء میں مکّہ کی آبادی قدرتی طور پر بہت محدود تھی، یہ مقام دو پہاڑیوں "جبل ابو قُبَیس" (جو صفا پہاڑی کے اوپر واقع تھا) اور "جبل احمر" کے درمیان واقع تھا جس کو جاہلیت میں "اَعْرَف" کہتے تھے، اور جو وادی قُعَیقعان کے بالکل سامنے تھا، لیکن بیت اللہ کی بدولت اور اس کے خادموں اور پاسبانوں اور مکّہ کے باشندوں کو عام طور پر جو عزّت و وجاہت حاصل تھی نیز وہاں جو غیر معمولی امن و سکون تھا، اس کی وجہ سے ان قبائل کے لئے مکّہ میں بڑی کشش تھی، چنانچہ اس کی آبادی زمانہ کے ساتھ خود بخود بڑھتی گئی، خیموں اور چھول داریوں کی جگہ پتھر یا گارے کے بنے ہوئے مکانات تعمیر ہو گئے اور آبادی و آبادکاری کی یہ لہر مسجد حرام سے مکّہ کی بالائی و نشیبی وادیوں تک پھیل گئی، ابتداء میں یہ لوگ اپنے مکانات کی چھتیں بھی بیت اللہ کی طرح مربع شکل کی نہ بناتے تھے، اور محسوس کرتے تھے کہ یہ ایک طرح کی بے ادبی ہے آہستہ آہستہ اس کا وہ اہتمام باقی نہیں رہا اور اس میں بڑی گنجائش پیدا کر لی گئی، تاہم مکانات بیت اللہ سے اس وقت بھی احتراماً بلند نہ کئے جاتے تھے۔

بعض راویوں کا بیان ہے کہ اہلِ مکّہ کعبہ کے احترام و تعظیم میں اپنے مکانات گول بناتے تھے، پہلا شخص جس نے مربع مکان بنوایا وہ حمید بن زھیر ہے، اس کے عمل کو اہلِ قریش نے ناپسند کیا۔

مکّہ کے مالداروں اور سرداروں کے مکانات پتھر کے بنے ہوئے ہوتے تھے،

اور ان میں کئی کمرے ہوتے تھے، اور آمنے سامنے دو دو دروازے ہوتے تھے تاکہ گھر کے ایک حصّہ میں مہمانوں کی موجودگی کے وقت عورتیں دوسرے دروازے سے نکل سکیں۔

مکّہ کی تعمیرِ نو اور اس کے اصل بانی

مکّہ کی اس توسیع و ترقی اور تعمیرِ نو میں سب سے بڑا ہاتھ قُصَیّ بن کلاب کا تھا، اس لئے کہ انھوں نے سب سے پہلے قریش کو اس مقصد سے متحد کیا، اور رہائش کے لئے جگہوں کی باقاعدہ حد بندی کی جس کو عربی اصطلاح میں رِباع[1] کہتے ہیں، قریش کی مختلف برادریوں اور خاندانوں کو ان مکانات میں آباد کیا، ان کی اولاد نے مکّہ کی آراضی کی تقسیم اور حد بندی کا کام جاری رکھا، خود بھی آباد ہوئے اور زمینیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کیں، اور خرید و فروخت اور تعمیرات کا یہ سلسلہ بغیر کسی اختلاف و تنازعہ کے قریش اور دوسری برادریوں کے درمیان چلتا رہا۔

زندگی کی تنظیم اور عہدوں کی تقسیم

قُصَیّ اپنی قوم اور اہلِ مکّہ دونوں پر حاوی تھے حِجَابَة (بیت اللہ کی دربانی) سِقَایَة[2] (سبیل اور پانی وغیرہ کا انتظام) رِفَادة (حُجّاج بیت اللہ کی سالانہ دعوت عام) ندوۃ (مجلس مشورہ) اور لِواء یعنی جنگی امور سب ان ہی کے ہاتھ میں تھے۔

---

[1] ابو الولید الازرقی (م ۲۲۳ھ) نے اپنی کتاب "اخبار مکہ" میں اس کی پوری تفصیل بیان کی ہے، رباع مکانات اور اس کے گرد و پیش کے حصوں کو کہتے ہیں، واحد رُبع ہے فتحہ کے ساتھ [2] حُجّاج کے لئے پانی کے کچھ حوض تیار کئے جاتے تھے جس کو کھجور اور کشمش وغیرہ سے شیریں بنایا جاتا اور یہ لوگ جب مکہ آتے تو یہی پانی پیتے۔

انھوں نے دار الندوۃ کو مسجد حرام سے بالکل متصل تعمیر کیا، اور اس کا دروازہ کعبہ کی طرف نکالا، یہ قصیٰ بن کلاب کا گھر بھی تھا اور قریش کے مشوروں اور فیصلوں اور مکہ کی سوسائٹی کا مرکز بھی، قریش کا کوئی فرد مرد یا عورت شادی کرنا چاہتا، کسی اہم اور فوری معاملہ میں مشورہ کی ضرورت ہوتی، کسی قبیلہ کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا ہوتا یا اس کی تیاری کا مرحلہ آتا حتیٰ کہ کوئی بچی جب بڑی ہوتی تو اس کو اوڑھنی اوڑھانے کی بھی رسم یہیں انجام دی جاتی، قصیٰ کی شخصیت کو ان کی زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی دین ومذہب جیسی عظمت حاصل رہی جس کی سند کے بغیر کوئی کام نہ ہو سکتا تھا، قانون یہ تھا کہ دار الندوہ میں بنی قصیٰ کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے وہی اشخاص آسکتے ہیں، جن کی عمر چالیس سے کم نہ ہو، البتہ بنی قصی اور ان کے حلیف قبائل کے سب افراد بڑے ہوں یا چھوٹے اس میں شریک ہونے کا حق رکھتے تھے، دار الندوہ میں جن برادریوں اور خاندانوں کو شرکت کی اجازت تھی وہ تھے ہاشم، اُمیہ، مخزوم، جمح، سہم، تیم عدی، اسد، نوفل، زُہرہ یہ دس مختلف خاندان کے لوگ تھے۔

ان کے انتقال کے بعد عہدوں کی نئی تقسیم ہوئی، بنی ہاشم کو سقایہ، بنی اُمیہ کو قریش کا پرچم "عقاب" بنی نوفل کو رفادہ[1]، بنی عبد الدار کو لواء، سدانہ اور حجابہ اور بنی اسد کو مشاورت کا قلم دان دیا گیا۔

قریش کے مختلف اشخاص میں جو صاحب الرائے اور اصحابِ وجاہت تھے ان میں یہ ذمہ داریاں تقسیم تھیں (حضرت) ابو بکر (صدیقؓ) (جو بنی تیم میں سے تھے) کے پاس دیت،

---

[1] رفادہ اس کھانے کو کہتے ہیں جو حجاج کے لئے بطور ضیافت کے تیار کیا جاتا تھا، اس کی شکل یہ تھی کہ قریش ہر سال کچھ مقررکردہ رقم اس کے اخراجات کے لئے قصیٰ کو پیش کرتے تھے (الخضری صـ ۳۶)

تاوان اور جرمانہ وغیرہ تھا، خالدبن الولیدؓ کے پاس جو بنی مخزوم میں تھے قبّہ اور اعنّۃ کا قلم دان تھا، قبہ اس خیمہ کو کہتے ہیں جس میں فوجی ضروریات کا سامان رکھا جاتا تھا' اعنّہ وہ سامان تھا جو جنگ کے دوران قریش کے گھوڑوں پر رہتا تھا، عمر بن الخطابؓ کے پاس سفارت تھی، جب کسی قبیلہ سے جنگ مقصود ہوتی تو ان کو سفیر بنا کر فریق مخالف کے پاس بھیجا جاتا، اگر کوئی برادری ان پر فخر کرتی تو اس کے مقابلہ کے لئے ان کا انتخاب ہوتا، اور سب اس پر راضی رہتے، صفوان بن اُمیّہ (بنی جمح) کے ذمہ ایسار وازلام[1] کا کام تھا، کوئی بڑا اقدام اس عمل کے بغیر نہ کیا جاتا، حارث بن قیس کے سپرد نظم و انتظام اور بتوں کے نام پر جمع کیا ہوا مال تھا، یہ ذمہ داریاں اور اعلیٰ مناصب ان کو آباء و اجداد سے نسلی طور پر حاصل ہوئے تھے۔

تجارتی سرگرمیاں اور درآمد و برآمد

قریش تجارتی اغراض سے دو سفر کرتے تھے، ایک شام کی طرف موسم گرما میں دوسرا یمن کی طرف موسمِ سرما میں' اشہرِ حرم (رجب' ذی قعدہ، ذی الحجّہ، مُحرّم) ان کے نزدیک عزت و حرمت کے مہینے سمجھے جاتے تھے' اور ان میں جنگ سے احتراز کیا جاتا، ان میں ان کے بازار بیت اللہ کے پہلو میں حرم شریف کے اندر لگتے تھے' اور جزیرۃ العرب کے دُور دراز مقامات سے لوگ اس میں ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے تھے' اور اس میں ان کو ضروریاتِ زندگی کا پورا سامان

---

[1] ایسار وازلام۔ جوئے کے دو پانسے جو کسی معاملہ میں کسی پہلو کو ترجیح دینے کے لئے پھینکے جاتے ان پر مختلف علامتیں ہاں، نہیں لکھی رہتیں۔

ملتا تھا، مکہ کی تاریخ میں ہمیں جن بازاروں کا ذکر ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے باشندے تمدن و ترقی کی کس سطح پر تھے، ان بازاروں میں ایک بازار عطر فروشوں کے لئے مخصوص تھا، ایک مختلف پھلوں کے لئے، ایک رُطب کے لئے، ایک بازار صرف حجاموں کے لئے تھا، یہ سب بازار بہت کشادہ اور وسیع ہوتے تھے، جن میں گیہوں گھی، شہد اور مختلف اجناس جو تجارتی قافلے باہر سے لاتے تھے، بڑی مقدار میں موجود رہتی تھیں، یمامہ اہلِ مکہ کے لئے غلہ کی منڈی تھی[1]، ان بازاروں کے علاوہ خاص ایک گلی جوتوں کی دکانوں کے لئے اور ایک کپڑوں کے لئے مخصوص تھی۔

اہلِ مکہ کی کچھ تفریح گاہیں بھی تھیں جہاں گرمی کے دنوں میں سرِ شام مکہ کے خوش باش و خوش طبع نوجوان جمع ہوتے تھے جو زیادہ دولت مند اور ناز و نعم کے عادی تھے وہ سردیاں مکہ میں گزارتے تھے اور گرمیاں طائف میں، مکہ کے کچھ نوجوان بھی خوش پوشاکی و جامہ زیبی اور تجمّل و آرائش میں مشہور تھے، ان میں سے بعض کی پوشاکیں کئی کئی سو درہم میں تیار ہوتیں۔

تجارتی سرگرمیاں اور نقل و حرکت مکہ میں پورے عروج پر تھی، وہاں کے تاجر افریقہ و ایشیاء کے مختلف ممالک کا سفر کرتے رہتے تھے اور ہر ملک کے نوادرات، تحفے اور مشہور و مخصوص اشیاء یا وہ چیزیں جن کی ان کے ملک کو ضرورت تھی اپنے ہمراہ لاتے تھے، افریقہ سے جو چیزیں وہ درآمد کرتے تھے ان میں گوند، ہاتھی دانت، سونا،

---

[1] چنانچہ جب ثمامہ بن اثال نے (جو بنی حنیفہ کے ایک سردار تھے) اسلام لانے کے بعد مکہ گیہوں لے جانے پر پابندی لگادی تو قریش کو بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑا، اور انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عرضداشت لکھی کہ آپ ثمامہ کو غلہ لانے لے جانے پر پابندی ہٹالینے کا حکم دیں آپ نے ایسا ہی کیا (زاد المعاد ج ۱ ص ۳۷۷ و صحیح مسلم)

آبنوس کی لکڑی، یمن سے کھالیں، اگربتّی و لوبان، اور کپڑے، عراق سے گرم مسالے، ہندوستان سے سونا، ٹین، جواہرات، ہاتھی دانت، صندل کی لکڑی، گرم مسالے اور زعفران، مصر و شام سے مختلف قسم کے تیل، غلّہ و اجناس، اسلحہ اور ریشم اور شراب شامل ہیں۔

وہ بعض سلاطین و امراء کو مکہ کی خاص مصنوعات، سوغات کے طور پر بھی بھیجا کرتے تھے، ان میں سب سے زیادہ خاص چیز چمڑا ہوتا تھا، چنانچہ جب قریش نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس اپنے دو نمایندے عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص بن وائل کو بھیجا اور جو مسلمان وہاں ہجرت کر گئے تھے، ان کو واپس لینے کی کوشش کی تو انھوں نے مکّہ کے خاص تحفہ کے طور پر اس کو چمڑا بھی دیا تھا۔

عورتیں بھی تجارتی کاروبار کرتی تھیں اور شام اور دوسرے ممالک میں ان کے تجارتی قافلے جایا کرتے تھے، حضرت خدیجہ بنت خویلد اور حنظلیہ اُمّ ابی جہل اس میں زیادہ مشہور تھیں، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے:۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا	مردوں کو حصّہ ہے اپنی کمائی سے
وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ۔	اور عورتوں کو حصّہ ہے اپنی کمائی
(سورۃ النساء۔۳۲)	سے۔

اقتصادی حالت، اوزان اور پیمانے

ان وجوہ کی بنا پر مکّہ تجارت میں آگے تھا، اہل مکّہ میں سے متعدد افراد بہت خوش حال اور فارغ البال تھے، اور ان کے پاس خاصا سرمایہ اکٹھا ہو گیا تھا، اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ قریش کا تجارتی کارواں جو غزوۂ بدر کے موقعہ پر شام سے واپس آیا،

وہ ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا، اور اس پر پچاس ہزار دینار کا مال واسباب لدا ہوا تھا۔

اہل مکہ رومانی اور بازنطینی اور ایرانی وساسانی سکے استعمال کرتے تھے، مکہ اور جزیرۃ العرب میں اس وقت رائج سکے دو قسم کے تھے، ایک درہم، دوسرے دینار، درہم کی دو قسمیں تھیں، ایک قسم وہ تھی جس پر فارس کا نقش اور مہر تھی اس کو "بغلیہ" اور "سوداء دامیہ" کہتے تھے، دوسری قسم وہ تھی جس پر روم کا نقش تھا، اور اس کو زیادہ تر "طبریۃ" اور "بزنطیہ" کہتے تھے، وہ سب چاندی کے سکے تھے، ان کے مختلف اوزان تھے، اسی لئے اہل مکہ ان کے شمار پر نہیں بلکہ وزن پر معاملہ کرتے تھے، علماء کے اقوال سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ درہم جس کا شریعت میں اعتبار ہے جو کے پچپن ۵۵ دانوں کے ہم وزن ہے، اور دس ۱۰ درہم سات ۷ مثقال سونے کے مساوی ہے، اور خالص سونے کا ایک مثقال بہتر ۷۲ دانوں کے ہم وزن ہے، اور اسی پر (جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا ہے) سب کا اجماع ہے۔

عہدِ نبوت میں جو سکے رائج تھے اور جن کا زیادہ استعمال تھا، وہ اکثر چاندی کے ہوتے تھے، علماء کا قول ہے کہ اس زمانہ میں چاندی کا رواج تھا، سونے کا نہیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۲۲۲)

جہاں تک دینار کا تعلق ہے، وہ سونے کا ہوتا تھا، اور جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور میں شام اور حجاز میں اس کا رواج تھا، یہ سب سکے رومی تھے، جو روم ہی میں ڈھالے جاتے تھے، اور ان پر بادشاہِ روم کی تصویر ہوتی تھی، اور اس کا نام رومی زبان میں کندہ ہوتا تھا، جیسا کہ ابن عبدالبر نے "التمہید" میں لکھا ہے، لفظ دینار دراصل ایک قدیم رومی سکہ (DENARIUS) سے عربی زبان میں آیا ہے، اور بعض مغربی ممالک میں یہ لفظ اب تک رائج ہے، اور انجیل میں اس کا ذکر متعدد بار آیا ہے، دینار کا وزن

ایک مثقال کے برابر مانا جاتا تھا، اور خالص سونے کا ایک مثقال جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، متوسط جو کے بہتر (۷۲) دانوں کے ہم وزن مانا گیا تھا، اور یہ مشہور ہے کہ جاہلیت اور اسلام کسی عہد میں اس میں تغیر نہیں ہوا دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں ہے کہ بازنطینی دینار ۲۵ر۴ گرام کے برابر ہوتا ہے[۱] مستشرق زمباور کی تحقیق یہ ہے کہ مکہ کا مثقال ۲۵ر۴ گرام کے برابر ہوتا ہے (دیکھئے مادہ دینار ج ۹ ص۲۷) درہم اور دینار کے مابین تناسب ۷/۱۰ تھا۔

جہاں تک اس کے تبادلہ کا تعلق ہے، حدیث، فقہ، تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ایک دینار دس درہم کے مساوی تھا، ابوداؤد میں عمرو بن شعیب سے مروی ہے کہ "دیت" کی قیمت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ۸۰۰ دینار یا آٹھ ہزار (۸۰۰۰) درہم تھی، اس کے بعد صحابہ کا اسی پر عمل رہا، یہاں تک کہ اسی پر امت کا اجماع ہوگیا، مشہور احادیث میں درہم کے نصاب اور اس کی واجب مقدار کے بارہ میں جو صراحت آئی ہے اور جمہور فقہاء کی بھی یہی رائے ہے اس سے اس کا پورا ثبوت ملتا ہے کہ سونے کا نصاب بیس دینار ہے اور اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عہد جاہلیت اور آغاز اسلام میں ایک دینار کی قیمت دس درہم یا اس کے مساوی سکوں کے برابر تھی۔

امام مالکؒ نے موطا میں لکھا ہے کہ "وہ صحیح مسلک جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں ہے، یہ ہے کہ زکوٰۃ بیس دینار پر یا دو سو درہم پر واجب ہے"[۲]

---

[۱] بعض محققین کا کہنا ہے کہ اس دور میں دینار کا معیاری وزن وہی تھا جو بوزنطی صولدیوس کا تھا یعنی تقریباً ۵۵ر۴ گرام خلیفہ عبدالملک کی اصلاحات کے بعد اس کا وزن گھٹا کر ۲۵ر۴ کر دیا گیا۔

[۲] مستفاد از "بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب" آلوسی "التراتیب الاداریۃ" عبدالحی الکتانی "فقہ الزکاۃ" یوسف القرضاوی۔ تفسیر ماجدی

ناپ تول کے جو پیمانے اس زمانہ میں رائج تھے، ان میں صاع، مُدّ، رطل، اوقیہ اور مثقال تھے، اور انھیں میں سے کچھ نئی قسمیں انھوں نے اور نکالی تھیں، علم الحساب سے بھی ان کو واقفیت تھی حصوں اور میراث کی تقسیم میں قرآن نے ان کے اسی حساب پر اعتماد کیا ہے۔

قریش کا دولت مند طبقہ

جن گھرانوں میں خوش حالی اور مالی فراوانی تھی، ان میں بنو اُمیہ اور بنو مخزوم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اشخاص میں ولید بن المغیرة، عبد العزّٰی (ابولہب) ابواحیحہ بن سعید بن العاص بن امیہ (جس کا ابوسفیان کے قافلہ میں تیس ہزار دینار کے بقدر حصہ تھا) عبد اللہ بن ربیعہ المخزومی جیسے امیر و رئیس لوگ تھے، ان میں عبد اللہ بن جدعان التیمی زیادہ نامور اور مشہور تھے، جن کے متعلق یہ آتا ہے کہ وہ سونے کے پیالہ میں پانی پیتے تھے، اور ان کا پورا لنگر خانہ تھا، جس میں غریبوں اور بھوکے لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا، عباس بن عبد المطلب کا شمار بھی قریش کے دولت مند لوگوں میں تھا، وہ اپنی دولت لوگوں پر خوب خرچ کرتے تھے، اور سودی لین دین بھی کرتے تھے، یہاں تک کہ اسلام کا غلبہ ہوا سود کی حرمت نازل ہوئی، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر سودی رقوم کے خاتمہ کا اعلان فرمایا، اور اس کا آغاز اپنے چچا عباس بن عبد المطلب سے کیا اور ارشاد ہوا کہ "پہلا سود جس کو میں ساقط کرتا ہوں وہ عباس بن عبد المطلب کا سود ہے"۔

ان میں ایسے تعیش پسند دولت مند بھی تھے، جن کے گھروں میں شبینہ محفلیں

گرم رہتی تھیں اکرے فرش فروش سے آراستہ دستر خوان سجے ہوئے اور بادہ وجام کا دور چلتا ہوا۔

سرداران قوم کی محفلیں زیادہ تر بیت اللہ کے سامنے جمتی تھیں، جہاں شعر و شاعری ہوتی، جاہلیت کے ممتاز شعراء جیسے لبید بن ربیعہ وغیرہ اس میں شریک ہوتے، یہ بھی ذکر آتا ہے کہ عبد المطلب کا فرش کعبہ کے سایہ میں بچھتا تھا، ان کے لڑکے ان کے ادب و احترام میں فرش کے باہر چاروں طرف بیٹھتے اور جب تک وہ نہ آجاتے کوئی فرش پر نہ بیٹھتا۔

مکہ کی صنعتیں اور ادب و ثقافت

اہلِ مکہ کی نظر میں صنعت و حرفت کی زیادہ اہمیت نہ تھی، بلکہ وہ اس کو حقارت سے دیکھتے تھے، اور اپنے لئے باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے، عام طور پر صنعت و حرفت غلاموں یا عجمیوں کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی تھی، تاہم بعض صنعتیں جن کی انھیں سخت ضرورت تھی، وہاں موجود تھیں، اور مکہ کے بعض لوگ ان سے متعلق تھے، روایت میں آتا ہے کہ حضرت خبّاب بن الارت تلواریں تیار کرتے تعمیرات وغیرہ میں جس کی ضرورت ہر شخص کو پیش آتی ہے رومی اور ایرانی مزدوروں سے کام لیا جاتا تھا۔

ناخواندگی وہاں عام تھی، لیکن کچھ لکھنے پڑھنے والے لوگ موجود تھے، قرآن مجید نے اسی لئے ان کو "اُمّی" یعنی ناخواندہ سے تعبیر کیا ہے "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ" (الجمعہ۔۲) (وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں

انھیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا۔)

مکّہ والے پورے جزیرۃ العرب میں حسن ذوق، لطافتِ طبع اور آرائش و تجمّل میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، جیسا کہ تقریباً ہر قدیم تہذیب رکھنے والے دارالسلطنت اور پایۂ تخت کا حال ہوتا ہے۔

جہاں تک ان کی زبان کا تعلق ہے اس کو سند اور میزان کا درجہ حاصل تھا اور جزیرۃ العرب کے اطراف و اکناف میں اسی پر اعتماد کیا جاتا تھا، مکہ کے باشندے سب سے زیادہ فصیح و بلیغ، اور قادر الکلام تھے اور ابتذال و سوقیانہ پن نیز عجمی اثرات سے بہت دور اور محفوظ رہتے، تناسب اعضاء، جسمانی ساخت حسن و جمال نیز اعتدال و توازن میں بھی دوسرے علاقوں کی بہ نسبت وہ زیادہ ممتاز تھے، اور جوانمردی و عالی ظرفی کے ان اعلیٰ صفات کے حامل تھے، جس کو عربی میں "الفتوۃ" اور "المروءۃ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جن کا ذکر عرب شعراء اور خطباء نے بار بار کیا ہے، اس لئے وہ خیر و شر دونوں میدانوں میں سب کے استاد تھے۔

ان کی دلچسپی کے موضوعات میں بالترتیب، انساب، اخبار عرب شعر و شاعری، علم نجوم، نچھتر، پرندوں سے شگون لینے اور کسی قدر طب و علاج جو ان کے تجرّبات اور بزرگوں کی روایات پر مبنی تھا، اور بہت کچھ شہسواری گھوڑوں کی پہچان، اس کے اعضاء و صفات سے گہری واقفیت اور قیافہ شناسی جیسے علوم شامل ہیں، علاج و معالجہ کے جو طریقے ان میں رائج تھے، ان میں داغنے، فاسد عضو کو کاٹنے، فصد کھلوانے، پچھنا لگوانے اور استعمال ادویہ کا ذکر آتا ہے

جنگی طاقت

جہاں تک جنگی طاقت کا تعلق ہے، قریش طبعاً امن پسند اور عافیت کوش تھے، دوسری معاصر قوموں کی طرح ان کی معیشت کا زیادہ تر انحصار تجارت کے فروغ، قافلوں کی مستقل آمد و رفت، بازاروں، اور منڈیوں کی تنظیم اور تاجروں اور سیاحوں کی آمد پر تھا جس سے ان کی مذہبی عظمت و اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا تھا، اور اقتصادی منفعت بھی حاصل ہوتی تھی، اور ہر طرح کا رزق مختلف جہتوں سے وہاں پہونچتا رہتا تھا، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝	تو چاہیئے بندگی کریں اس گھر
الَّذِيٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ	کے رب کی جس نے ان کو کھانا
وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝	دیا بھوک میں، اور امن دیا
(سورۂ لایلاف۔۳-۴)	ڈر میں۔

عرب کی طویل اور خوں ریز جنگوں کی وجہ سے بھی جن کا سلسلہ تیس تیس[۳۰] چالیس چالیس[۴۰] برس تک جاری رہا اور جن کے نتیجہ میں (جیسا کہ جاہلی شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ نے اپنے معلقہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے) ہزاروں بچے یتیم اور ہزاروں عورتیں بے سہاگ اور بیوہ ہوگئیں، وہ جنگ کے خوفناک نتائج اور اس کے دُور رس اثرات سے ناواقف نہ تھے، وہ مکہ کی "حرب الفجار" اور مدینہ کی جنگ "بُعاث" کا حشر دیکھ چکے تھے کہ اُن کا ان دونوں شہروں کی تمدنی، اقتصادی اور اخلاقی زندگی پر کیا اثر پڑا تھا اس لئے ایک حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے وہ عرب کے دوسرے جنگ جُو قبائل کی طرح

(جن کا پیشہ ہی جنگ تھا) بلا ضرورت جنگ کو دعوت دینے کے لئے تیار نہ تھے۔
دوسرے الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قریش (جب تک ان کی قبائلی ومذہبی غیرت کو للکارا نہ جائے) "بقائے باہم" کے اصول پر کاربند تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ قابلِ لحاظ فوجی طاقت کے بھی مالک تھے، شجاعت وبہادری میں ضرب المثل اور شہ سواری میں فرد، چنانچہ "الغضبۃ المضریۃ" (مضری غصہ) پورے جزیرۃ العرب میں معروف تھا، اور زبان وادب اور محاورات وامثال میں شامل ہو گیا تھا۔
قریش نے اپنی اس ذاتی طاقت پر بس نہیں کیا، بلکہ وہ "احابیش" کی قابلِ لحاظ قوت سے بھی فائدہ اٹھاتے رہے جو کہ مکہ کے اطراف میں رہنے والے بعض عرب قبائل (کنانہ اور خزیمہ بن مدرکہ کے بطن سے تھے، خزاعہ قریش کے حلیف تھے، اس کے علاوہ قریش کے پاس غلاموں کی بھی بڑی تعداد تھی جو تمام لڑائیوں میں ان کے پرچم کے نیچے رہتے تھے، وہ بیک وقت کئی ہزار جنگ جو میدان میں جھونک دیتے تھے، غزوۂ احزاب میں یہ تعداد دس ہزار تک جا پہونچی تھی اور یہ عہدِ جاہلیت کی تاریخ میں جزیرۃ العرب کی سب سے بڑی جنگی نفری تھی۔

مکہ جزیرۃ العرب کا ایک بڑا شہر اور اس کا روحانی وسماجی پایۂ تخت

اس مذہبی حیثیت ومرکزیت، معاشی فارغ البالی، تجارتی سرگرمیوں و تمدن ومعیشت میں ترقی کی وجہ سے مکہ جزیرۃ العرب کا ایک بڑا شہر بن گیا تھا، اور یمن کے مشہور شہر صنعاء سے آنکھیں ملا رہا تھا، اور جب چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں صنعاء پر یکے بعد دیگرے حبشہ اور ایران کا تسلّط ہو گیا اور حیرہ اور

غسّان کی ریاستوں کی بھی وہ سابقہ شان و شوکت جاتی رہی تو اس وقت مکّہ نے جزیرۃ العرب کے ایک ایسے مذہبی اور سماجی پایۂ تخت کی حیثیت اختیار کرلی جس میں اس کا کوئی شریک و ہمسر نہ تھا۔

اخلاقی پہلو

مکہ کا اخلاقی پہلو بہت کمزور تھا سوائے ان چند جاہلی روایات و اقدار کے جن کو وہ اپنے سینہ سے چمٹائے ہوئے تھا، جوئے کا کاروبار ان میں عام تھا، اور وہ اس پر فخر کرتے تھے، شراب نوشی عام طور پر رائج تھی، عیش و طرب اور رقص و نغمہ کی محفلیں بکثرت آراستہ ہوتی تھیں اور دورِ جام چلتا تھا، بہت سے فواحش، ظلم و سفاکی، حق تلفی و ناانصافی اور ناجائز کمائی ان کے معاشرہ میں بری نظر سے نہ دیکھی جاتی تھی۔

اس اخلاقی پستی کی (جو عام طور پر جزیرۃ العرب اور خاص طور پر اہلِ مکّہ میں ہمیں نظر آتی ہے) سب سے سچّی اور نازک تصویر وہ ہے جو قریش ہی کے ایک فرزند اور مکّہ کے اصلی و قدیم ساکن جعفر بن ابی طالب نے نجاشی کے سامنے پیش کی تھی، اور اس وقت کی عربی معاشرت اور جاہلی کردار کا نقشہ کھینچا تھا، ان کا بیان یہ تھا کہ:۔

"اے بادشاہ! ہم جاہلیت والی قوم تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، ہر طرح کی بے حیائی کرتے تھے، رشتوں کو توڑتے تھے، پڑوسی کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے، اور طاقت ور کمزور کو کھاتا تھا۔"[۱]

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۳۶

مذہبی پہلو

مذہبی پہلو (اخلاقی و تمدنی زاویۂ نگاہ سے) اور زیادہ کمزور تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ عہدِ نبوت سے ان کا فاصلہ بہت بڑھ چکا تھا، جہالت عام تھی، بت پرستی جو انھوں نے اپنے پڑوس کی قوموں سے سیکھ لی تھی، دلوں میں گھر کر چکی تھی، بتوں سے ان کو ایک قسم کا عشق ہو گیا تھا، چنانچہ صرف کعبہ کے اندر اور صحن میں تین سو ساٹھ بت تھے، جن میں سب سے بڑا ہُبل تھا، جس کو مخاطب کرتے ہوئے ابوسفیان نے جنگِ اُحد میں کہا تھا، اُعْلُ ہُبَل (ہُبل کی بڑائی ہو) یہ جوف کعبہ کے اندر ایک گڑھے کے اوپر تھا، جس میں نذرانے وغیرہ جمع ہوتے تھے، یہ بُت سُرخ عقیق کا بنا ہوا تھا، انسان کی شکل میں تھا، جس کا دایاں ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا، قریش نے اس کو اسی طرح سے پایا تھا، اس پر اُنھوں نے سونے کا ہاتھ لگوا دیا تھا، کعبہ کے سامنے دو بت رہتے تھے جن میں ایک کا نام "اُساف" تھا دوسرے کا "نائلہ" ایک کعبہ سے بالکل ملا ہوا تھا، دوسرا زمزم کے پاس تھا، قریش نے کعبہ کے قریب والے بت کو بھی دوسرے بت کے پاس منتقل کر دیا، یہ وہ جگہ ہے جہاں عرب قربانی وغیرہ کرتے تھے، صفا پر بھی ایک صنم تھا، جس کا نام تھا "نہیك مجاود الریح" مَروہ پر جو بُت نصب تھا، اس کا نام "مطعم الطیر" تھا۔

مکہ کے ہر گھر میں ایک بُت تھا، جس کی یہ گھر والے عبادت کرتے تھے، عزّیٰ عرفات سے قریب تھا، اور اس پر ایک معبد بنا دیا گیا تھا، یہ قریش کے نزدیک تمام بتوں سے زیادہ معزز اور بڑا تھا، وہ ان بتوں کے سامنے تیروں سے فال نکالا کرتے تھے، "الخلصة" مکہ کے نشیب میں نصب تھا، اس بُت کو ہار پہنائے جاتے تھے، جَو اور گیہوں کا نذرانہ

اس کو پیش کیا جاتا تھا، اس کو دودھ سے نہلایا جاتا تھا، اس کے لئے قربانی کی جاتی تھی، اور اس پر شترمرغ کے انڈے لٹکائے جاتے تھے، بُت مکّہ میں گلی گلی آواز دے کر بیچے جاتے تھے، دیہات کے لوگ پسند کرتے، خریدتے اور اپنے گھر کی زینت بناتے۔

اس طرح یہ قوم (اپنی ساری جواں مردی، وفاداری و جاں نثاری اور اپنے کریمانہ عربی اوصاف کے باوجود) بُت پرستی، بتوں سے عشق و شیفتگی، اوہام و خرافات سے وابستگی، صحیح دینی مفہوم سے ناواقفیت اور پاکیزہ، نظیف و لطیف دینِ حنیف اور ملّتِ ابراہیمی سے دوری و بے تعلقی کے اس پست درجہ پر تھی، جہاں دنیا کی بہت کم قومیں ہوں گی۔

یہ چھٹی صدی کے وسط کا مکّہ ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اس کے سرد و تاریک اُفق سے آفتابِ اسلام کے طلوع سے پہلے ہمیں نظر آتا ہے۔[1]

اللہ تعالےٰ نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا ہے:۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (سورۂ یٰسین - ۶)

(یہ خدائے غالب و مہربان نے نازل کیا ہے) تاکہ تم ان لوگوں کو جن کے باپ دادا کو متنبہ نہیں کیا گیا تھا، متنبہ کردو وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

---

[1] اس فصل میں تفسیر و حدیث میں آنے والے اشارات کی رہنمائی سے نیز متفرق معلومات میں حسب ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے کتاب "الاصنام" للکلبی (م ۱۴۶ھ) سیرت ابن ہشام (م ۲۱۳ھ) "اخبار مکّہ" از امام ابی الولید محمد الازرقی (م ۲۲۳ھ) "بلوغ الأرب فی معرفۃ احوال العرب" سید محمود شکری الآلوسی (م ۱۳۴۲ھ) نیز "تاریخ مکّہ" از استاذ احمد سباعی اور کتاب "مکۃ والمدینۃ فی الجاہلیۃ وعہد الرسول" از استاذ ابراہیم الشریف۔

ولادتِ باسعادت سے آغازِ نبوّت تک

عبداللہ اور آمنہ

قریش کے سردار عبدالمطلب کے دس صاحبزادے تھے، جو سب ممتاز اور نامور تھے، عبداللہ اپنے سب بھائیوں میں بہت ستودہ صفات اور مرکزی حیثیت کے مالک تھے،[1] اُن کے والد نے ان کی شادی بنی زُہرہ کے سردار وہب کی صاحبزادی آمنہ سے کی جو اس وقت اپنی عالی نسبی اور عزت و وجاہت میں قریش کی سب سے محترم خاتون سمجھی جاتی تھیں۔[2] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شکم مادر میں تھے کہ آپ کے والد عبداللہ کا انتقال ہو گیا، حضرت آمنہ کو آپ کی ولادت سے پہلے ایسی بہت سی نشانیاں اور آثار نظر آئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے فرزند کی مستقبل میں بڑی شان ہونی ہے۔[3]

آپ کی ولادت باسعادت اور عالی نسبی

آپ کی ولادت شریفہ ۱۲ ربیع الاول[4] عام الفیل (مطابق ۵۷۰ء عیسوی)

---

[1] ابن ہشام ج ۱ ص ۱۰۸ [2] ایضاً ص ۱۱۰ [3] ایضاً ص ۱۵۸ [4] مشہور روایت یہی ہے لیکن فلکیات کے مشہور مصری عالم اور محقق محمود پاشا کی تحقیق یہ ہے کہ آپ کی ولادت شریفہ دوشنبہ کے دن ۹ ربیع الاول کو واقعۂ فیل کے پہلے سال ہوئی جو ۲۰ اپریل ۵۷۱ء عیسوی کے مطابق ہے۔

دوشنبہ کے دن ہوئی، یہ تاریخ انسانیت کا سب سے روشن اور مبارک دن تھا۔

آپ کا نسب مبارک اس طرح ہے، محمد بن عبداللہ بن عبدالمطّلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصیّ بن کلاب بن مُرّۃ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معدّ بن عدنان۔

عدنان کا نسب سیدنا اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام تک پہونچتا ہے[1]۔ جب آپ کی ولادت ہوئی تو آپ کی والدہ ماجدہ نے آپؐ کے دادا کو یہ اطلاع بھجوائی، وہ آئے محبّت سے آپ کو دیکھا اور گود میں لے کر کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی اور دعا کی[2]، اور آپؐ کا نام "محمدؐ" رکھا یہ نام بالکل نیا تھا چنانچہ عربوں کو اس پر بہت تعجب ہوا[3]۔

ایّام رضاعت

چند دن آپؐ کو آپ کے چچا ابولہب کی باندی ثُوَیبہ نے دودھ پلایا پھر عبدالطلب نے اپنے یتیم پوتے کے لئے (جن سے زیادہ اپنی اولاد میں ان کو کوئی محبوب نہ تھا) دیہات

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱-۲ نیز سیرت تاریخ اور انساب کی دیگر اہم کتب ہم نے عدنان تک آپ کا نسب یہاں درج کیا ہے جس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۵۹-۱۶۰

[3] ابن کثیر ج ۱ ص ۲۱۰ و ابن ہشام ص ۱۵۸ سہیلی کی کتاب "الروض الانف" اور ابن فورک کی "الفصول" سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے پوری تاریخ میں صرف تین اشخاص ایسے ملتے ہیں جنھوں نے اہل کتاب سے یہ سن کر کہ جزیرۃ العرب میں ایک نبی ظاہر ہونے والے ہیں جن کا نام محمد ہوگا، ان کو یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ اس کا وقت قریب ہے، ان کی بیویاں حمل سے تھیں، اس وقت اس لالچ میں انھوں نے یہ نذر مانی کہ لڑکا ہوا تو اس کا نام محمد رکھیں گے، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا بعض لوگوں نے اس سے زیادہ بھی تعداد بیان کی ہے، لیکن راقم سطور کا خیال ہے کہ مسئلہ ابھی بہت تحقیق طلب ہے اس لئے کہ قریش کے ہر فرد نے اس پر حیرت اور تعجب کا اظہار کیا تھا، نیز اس روایت کی فنّی جانچ پڑتال کی بھی ضرورت ہے۔

کی کسی دودھ پلانے والی کی تلاش شروع کی عرب اس زمانہ میں اپنے بچوں کی رضاعت اور ابتدائی پرورش کے لئے شہروں سے زیادہ دیہاتوں کو پسند کرتے تھے' اس لئے کہ وہاں کی آب و ہوا زیادہ صاف و پاکیزہ' اور وہاں کے رہنے والوں کے اخلاق میں اعتدال اور سلامتی طبع زیادہ نمایاں تھی' شہر کے مفاسد سے بھی حفاظت تھی اور وہاں کی زبان بھی صحیح اور فصیح مانی جاتی تھی۔

قبیلہ بنی سعد کی عورتیں اس کام میں اور فصاحت و بلاغت میں خاص شہرت رکھتی تھیں' ان میں حلیمہ سعدیہ بھی تھیں' جن کو یہ دولتِ عظمیٰ ہاتھ آئی' یہ بچوں کی تلاش میں اپنے گاؤں سے آئی تھیں' خشک سالی کا زمانہ تھا' اور لوگ سخت پریشانی میں مبتلا تھے' رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان سب عورتوں کے سامنے پیش کیا گیا، لیکن اکثر نے یہ سوچ کر کہ یہ یتیم بچہ ہے' اس کے والد ہوتے تو کچھ نفع کی امید تھی، ماں اور دادا سے کیا مال پائے گا؟ آپ کی طرف زیادہ التفات نہ کیا، پہلے پہل حلیمہ نے بھی آپ کی طرف کچھ خاص توجہ نہ کی اور ان کا رُخ بھی دوسری طرف ہونے لگا لیکن اچانک ان کے دل میں آپ کی محبت پیدا ہو گئی، کوئی دوسرا بچہ بھی سامنے نہیں تھا، چنانچہ وہ واپس آئیں اور آپ کو لے کر اپنے قافلہ میں واپس گئیں' اور اسی وقت آپ کی برکت کھلی آنکھوں انھوں نے دیکھ لی' ان کی ہر چیز میں ایک دوسرا رنگ نظر آنے لگا' ان کو دودھ میں' جانوروں میں' رزق میں ہر چیز میں صاف برکت محسوس ہوئی' ان کے ساتھ کی جتنی دودھ پلانے والیاں تھیں اب انھوں نے کہنا شروع کیا کہ حلیمہ تم کو بہت مبارک بچہ ملا ہے' بہت مبارک جان ہے' ان کو بی بی حلیمہ سے حسد بھی ہونے لگا۔

دوسری طرف خیر و برکت کا سلسلہ برابر قائم رہا' یہاں تک کہ بنی سعد کے

اس قبیلہ میں آپ کی عمر مبارک کے دو سال پورے ہو گئے اور بی بی حلیمہ نے آپ کا دودھ چھڑا دیا، آپ کا نشو و نما عام بچوں سے مختلف طور پہ ہو رہا تھا، اس موقع پر وہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو لے کر آپ کی والدہ کے پاس حاضر ہوئیں اور ساتھ ہی یہ خواہش ظاہر کی کہ کچھ مدت کے لیئے ان کو اور رہنے دیا جائے چنانچہ بی بی آمنہ نے آپ کو ان کے پاس واپس لوٹا دیا۔[1]

واپسی کے بعد جب آپ بنی سعد میں تھے، دو فرشتے آئے آپ کا سینۂ مبارک شق کیا، آپ کے قلب مبارک سے گوشت کے ٹکڑے یا لوتھڑے کی مانند ایک سیاہ چیز نکال کر پھینک دی، پھر آپ کے قلب کو خوب اچھی طرح دھو کر اور صاف کر کے اپنی جگہ واپس کر دیا، اور وہ اسی طرح ہو گیا جیسے پہلے تھا۔[2]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے رضاعی بھائیوں کے ساتھ جنگل میں بکریاں بھی چرایا کرتے تھے، اور سادگی و جفاکشی، فطرت صحیحہ اور گاؤں کی صاف ستھری زندگی، شہر کی آلائشوں سے محفوظ آپ ہوا، اور فصاحت و بلاغت کے ماحول میں آپ کی پرورش ہو رہی تھی جس میں بنی سعد کا بڑا نام تھا، آپ صحابۂ کرام سے

---

[1] رضاعت کی یہ طویل و دلنواز کہانی سیرت ابن ہشام میں بہت بلیغ انداز میں بیان کی گئی ہے دیکھیے ص ۱۶۲-۱۶۶ [2] اس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں ملاحظہ فرمائیں، امام مسلم نے انس بن مالک کی روایت سے کتاب الایمان "باب الاسراء برسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم" کے تحت اس واقعہ کو بیان کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھا ہے کہ فرشتے ظاہر ہوئے آپ کے سینۂ مبارک کو شق کر کے دل کو اس میں سے نکالا اور اس کو ایمان و حکمت سے بھر دیا یہ عالم مثال اور عالم شہادت کی درمیانی حالت کا واقعہ ہے، یہ شق صدر اس طرح کی چیز نہ تھی جس سے ضرر پہونچتا ہے اس کو دوبارہ سینے کا اثر آپ کے سینۂ مبارک پر باقی نہ رہا، عالم مثال اور عالم شہادت جہاں ملتے ہیں وہاں اس طرح کے واقعے پیش آتے ہیں (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۰۵)

کبھی کبھی فرمایا بھی کرتے تھے "میں تم سب سے زیادہ عرب ہوں، قریشی ہوں اور بنی سعد بن بکر کے قبیلہ میں میں نے دودھ پیا ہے"۔[1]

بی بی آمنہ اور دادا عبد المطلب کی وفات

جب آپ کا سن چھ سال کا ہوا تو آپ کی والدہ آپ کو آپ کے دادا کا ننھیال دکھانے کے لئے یثرب لے گئیں، وہ اپنے محبوب شوہر عبد اللہ بن عبد المطلب کی قبر پر بھی جانا چاہتی تھیں،[2] مکہ واپس ہوتے ہوئے ایک مقام پر جس کو "الابواء"[3] کہتے ہیں بی بی آمنہ کا انتقال ہو گیا، اب ایک طرف محبوب اور چاہنے والی ماں کی جدائی کا غم تھا، دوسری طرف مسافرت کی تنہائی، آپؐ کی ولادت سے برابر آپؐ کے ساتھ کچھ اسی قسم کا معاملہ پیش آتا رہا، یہ تربیتِ الٰہی کے وہ اسرار ہیں، جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ایک باندی ام ایمن برکۃ حبشیہ آپؐ کو لے کر مکہ آئیں اور یہ خدائی امانت آپؐ کے دادا عبد المطلب کے سپرد کی، اس کے بعد آپؐ دادا کے سایۂ شفقت میں رہے، جو آپ کو دل و جان سے زیادہ چاہتے تھے اور کسی وقت آپؐ سے غافل نہ ہوتے تھے، کعبہ کے سایہ میں اپنے فرش پر آپؐ کو اپنے ساتھ بٹھاتے اور طرح طرح سے محبت و شفقت کا اظہار کرتے۔

---

[1] ابن ہشام ج ۱ ص ۱۶۷ [2] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس سفر کے کچھ واقعات بیان فرماتے تھے ہجرت کے بعد آپؐ نے بنی النجار کے مکانات کو دیکھ کر فرمایا کہ میری ماں یہیں اتری تھیں اور بنی عدی بن النجار کی باؤلی میں میں خوب پیرا تھا، (شرح المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۱۶۷-۱۶۸) [3] یہ مقام مستورہ کے قریب ہے جو اس وقت مکہ اور مدینہ کے درمیان کی مشہور منزل اور نصف راستہ پر ہے۔

جب آپؐ کی عمر مبارک آٹھ سال کی ہوئی تو دادا عبدالمطلب[۱] کا بھی انتقال ہوگیا، اور آپ کو یتیمی کا ذائقہ پھر چکھنا پڑا جو پہلے سے زیادہ تلخ اور سخت تھا، اپنے والد کو تو آپ نے دیکھا بھی نہیں تھا، اور ان کی شفقت و محبت کے مزے سے بھی آپؐ ناواقف تھے، اس لئے ان کے انتقال کا صدمہ عقلی اور روایتی سے زیادہ نہ تھا لیکن دادا کے لطف و محبت سے محرومی کا احساس حسّی اور تجرباتی تھا، اور ان دونوں کا کھلا ہوا فرق ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

چچا ابوطالب کے ساتھ

دادا کے انتقال کے بعد آپ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ رہنے لگے، جو آپؐ کے والد کے حقیقی بھائی تھے، عبدالمطلب ان کو آپؐ کی خبر گیری اور حسنِ سلوک کی وصیّت برابر کرتے رہتے تھے، اس لئے وہ یکسو ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہوگئے اور اپنے صاحبزادوں علی، جعفر اور عقیل (رضی اللہ عنہم) سے زیادہ نرمی، شفقت اور نگہداشت و پرورش کا معاملہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رکھا۔[۲]

بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت ابوطالب تجارت کے لئے ایک قافلہ میں شامل ہو کر شام جانے لگے اس وقت آپ کی عمر نو (۹) سال[۳] تھی، آپ یہ دیکھ کر اپنے چچا سے لپٹ گئے، ابوطالب پر اس کا بہت اثر پڑا، اور انھوں نے اس سفر میں آپؐ کو اپنے ساتھ لے لیا۔

جب یہ تجارتی قافلہ "بُصریٰ" کے مقام پر پہونچا جو شامی علاقہ میں واقع ہے تو یہاں اس نے پڑاؤ کیا، یہاں ان کی ملاقات بُحَیری راہب سے ہوئی جو اپنے معبد یا خانقاہ

۱؎ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۶۸-۱۶۹ ۲؎ ایضاً ص ۱۷۹ ۳؎ زیادہ صحیح روایت کے مطابق۔

میں رہتے تھے، بحیرئی راہب نے معمول کے خلاف قافلہ کی میزبانی کی اور بہت اچھی طرح اس کا استقبال کیا، اس لئے کہ ان کو اس قافلہ کے ساتھ خدا کا خاص معاملہ اور غیر معمولی واقعات نظر آرہے تھے، جب انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ کی اور زیادہ پذیرائی کی، اور اس کا اطمینان کیا کہ نبوت کی نشانیاں آپؐ کے اندر موجود ہیں، انھوں نے ابو طالب کو آپؐ کے شان اور مرتبہ کی بلندی کی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ اپنے بھتیجہ کو لے کر وطن واپس جائیں اور یہود سے آپ کی خاص طور پر حفاظت کریں، اس لئے کہ تمھارے بھتیجہ کی آگے چل کر بڑی شان ہونے والی ہے، چنانچہ ابو طالب آپؐ کو بحفاظت مکہ واپس لے آئے[1]

---

[1] یہ واقعہ سیرت ابن ہشام اور سیرت کی دوسری کتابوں میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اس کی صحت میں محدثین ناقدین کو روایتاً و درایتاً دونوں لحاظ سے کلام ہے، علامہ شبلی نعمانی "سیرت النبیؐ" میں لکھتے ہیں کہ "امام ترمذی اس حدیث کے بعد لکھتے ہیں" حدیث حسن غریب لانعرفه الامن هذا الوجه" اس کے راویوں میں عبدالرحمٰن بن غزوان کا بھی نام آتا ہے، جن کے بارے میں کلام کیا گیا ہے، علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ وہ منکر احادیث روایت کرتے ہیں اور ان سب سے زیادہ منکر حدیث وہ ہے جس میں بحیرئی کا قصہ آیا ہے (ج ۱ ص۱۸۱)

ایک اور بات قابل گرفت یہ ہے کہ اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ ابو طالب نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بلال کے ساتھ روانہ کیا، علامہ ابن القیمؒ نے "زاد المعاد" میں لکھا ہے کہ ترمذی اور دوسری کتابوں میں یہ آتا ہے کہ انھوں نے آپ کے ساتھ بلال کو روانہ کیا، جو بالکل غلط ہے، اس لئے کہ بلال شاید اس وقت موجود ہی نہ تھے، اور اگر تھے بھی تو آپ کے چچا یا حضرت ابو بکر کے ساتھ ہرگز نہ تھے (زاد المعاد ج ۱ ص۱۸)

مستشرقین اور بدنیت مورخین ایسے مواقع ہمیشہ ڈھونڈتے رہتے ہیں، چنانچہ (باقی ص۱۳۴ پر)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نشو و نما خاص محفوظ و معصوم طریقہ پر ہوئی،

(باقی ص۱۳۳ کا) بحیری راہب سے آپ کی اس سرِ راہ ملاقات کو (جس کے عقیدہ اور علمی مرتبہ کا کچھ نام و نشان ہمیں نہیں ملتا) انھوں نے رائی کا پربت بنا دیا اور اس پر پورا ہوائی قلعہ تعمیر کر لیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عقیدۂ توحید کی یہ صاف بے لاگ تعلیمات آپؐ نے دراصل ایک عیسائی عالم سے حاصل کی ہیں؛ اس سے زیادہ قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ ایک فرانسیسی مستشرق CARRA DE VEAUX نے اِس موضوع پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی اور اس کا نام "مصنف قرآن" رکھا، اور اس میں یہ دعویٰ کیا کہ اس مختصر ملاقات میں "بحیری" نے پورا قرآن محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو املا کرایا۔

اگر بحیری راہب سے ملاقات کا واقعہ صحیح بھی تسلیم کیا جائے تب بھی کوئی سمجھ دار و عاقل شخص جس کے ہوش و حواس سلامت ہیں اور اس میں انصاف کا کوئی "ذرہ" موجود ہے اس بات پر غور کرنے کا بھی روادار نہ ہوگا، یہ بات کس کی عقل میں آسکتی ہے کہ ایک کم سن بچہ جس کی عمر سب سے صحیح روایت کے مطابق ۹ سال اور زیادہ سے زیادہ بارہ سال بتائی گئی ہے ایک ایسے سن رسیدہ شخص سے جس کی زبان سے بھی وہ آشنا نہیں اور جس کو صرف ایک وقت کے کھانے پر ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا ہے ایسے دقیق و اہم مسائل و نازک تفصیلات پر تبادلۂ خیالات کرے گا، اور چھٹی صدی عیسوی میں عیسائیت کے فرسودہ شدہ مشرکانہ عقائد و خیالات کی ان باریکیوں سے آگاہ ہو جائیگا جہاں تک پروٹسٹنٹ مذہب کے بڑے بڑے پادریوں اور عالموں کی رسائی نہ ہو سکی، پھر تیس چالیس سال کے بعد (جب بحیری راہب کی ہڈیاں بھی خاک میں مل چکی ہوں گی) قرآن کی شکل میں ان سب کو مرتب کر کے پیش کر دے گا؟ یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کو تعصب نے اندھا کر دیا ہو، یا خیال آرائی اور فرضی و وہمی باتیں تصنیف کرنے میں اس کو کمال ہو، اگر یہ قصہ سیرت کی کتابوں میں نہ ہوتا تو اس کے ذکر کی بھی یہاں ضرورت نہ تھی۔

اور جاہلیت کی نجاستوں اور بری عادتوں سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہمیشہ دور، اور پاک رکھا، آپ اپنی قوم میں شروع ہی سے سب سے زیادہ حمیدہ صفات و عالی ہمت حسنِ اخلاق سے آراستہ، حیادار، راست گفتار، امانت دار اور بد کلامی اور فحش بیانی سے بہت دور سمجھے جاتے تھے، یہاں تک کہ آپ کی قوم کے لوگ آپ کو "امین"[1] کے نام سے یاد کرنے لگے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان تمام باتوں اور جاہلیت کی عادتوں سے محفوظ رکھا تھا، جو آپ کے شان و رتبہ کے مطابق نہ تھیں اگرچہ اس معاشرہ میں ان کے اندر کوئی حرج نہ سمجھا جاتا تھا، نہ ان باتوں پر کسی کی نگاہ پڑتی تھی، آپ رشتوں کا خیال کرتے، لوگوں کا بوجھ ہلکا کرتے اور ان کی ضرورتیں پوری فرماتے، مہمان کا اکرام کرتے اور خیر و تقویٰ کے کاموں میں دوسروں کی مدد[2] کرتے، محنت کر کے روزی حاصل کرتے، اور معمولی اور ضرورت بھر غذا پر اکتفا فرماتے تھے۔

آپ کی عمر چودہ[14]، پندرہ[15] سال کی تھی کہ قریش اور قبیلہ قیس کے درمیان حرب الفجار شروع ہو گئی، اور آپ نے اس کو قریب سے دیکھا بلکہ آپ دشمن کے استعمال کئے ہوئے تیروں کو قریش تک پہونچاتے تھے، جو جنگ کا خاص طریقہ ہے اس موقع پر آپ کو جنگ کا عملی تجربہ ہوا، اور شہسواری و سپہ گری سے شناسائی ہوئی[3]۔

جب عمر مبارک کچھ اور زیادہ ہوئی تو آپ نے ذریعۂ معاش کی طرف توجہ کرنا ضروری سمجھا، اور بکریاں چرانے کا پیشہ اختیار کیا جو اس زمانہ کا ایک شریفانہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۳ [2] ملاحظہ ہو حضرت خدیجہ کی شہادت جو انھوں نے آپ کے غار حرا سے واپسی پر آپ کے اخلاق کے بارے میں دی۔ [3] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۶

ذریعۂ معاش ہونے کے علاوہ نفسیاتی تربیت اور کمزوروں و محتاجوں پر شفقت و محبت کے جذبات پیدا کرنے نیز صاف و تازہ ہوا کا لطف لینے اور جسم کی تقویت و ورزش کا سامان بھی اپنے اندر رکھتا ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ انبیاء کی سنت ہے، چنانچہ نبوت کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں، پوچھا گیا کہ آپ نے بھی اے اللہ کے رسولؐ؟ فرمایا ہاں میں نے بھی۔

آپؐ نے پہلے بھی بنی سعد میں اپنے رضاعی بھائیوں کے ساتھ بکریاں چرائی تھیں اس لئے آپ اس کام سے کچھ ناواقف و بے خبر نہ تھے، صحاح سے ثابت ہے کہ آپ مکہ میں چند قیراط[1] کے عوض (جو آپ بکریوں کے مالکوں سے لیتے تھے) بکریاں چراتے تھے۔

حضرت خدیجہ سے رشتۂ ازدواج

جب آپ پچیس ۲۵ سال کے ہوئے تو حضرت خدیجہ بنت خویلد کے ساتھ آپؐ نے نکاح کیا، حضرت خدیجہ قریش کی بہت باثر و بارسوخ خاتون تھیں اور فہم و فراست

---

[1] علامہ شبلی "سیرت النبی" جلد اول میں لکھتے ہیں کہ "قراریط" کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے، ابن ماجہ کے شیخ سوید بن سعید کی رائے یہ ہے کہ یہ قیراط کی جمع ہے، جو درہم یا دینار کا ایک جز تھا، اس لحاظ سے ان کے نزدیک حدیث کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اجرت پر بکریاں چراتے تھے، اور اسی وجہ سے بخاری نے باب الاجارۃ میں اس کا ذکر کیا ہے، ابراہیم الحربی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اجیاد کے قریب ایک جگہ کا نام ہے، ابن جوزی نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے اور علامہ عینی نے بہت قوی اور قابلِ ترجیح دلائل کے ساتھ اسی رائے کی توثیق کی ہے، "نور النبراس" کے مصنف نے بھی طویل بحث کے بعد اسی کو اختیار کیا ہے۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۶

اخلاق کریمانہ نیز مال و دولت کے لحاظ سے بھی ناموَر تھیں، یہ بیوہ تھیں اور ان کے شوہر ابو ہالہ کا انتقال ہوچکا تھا، اس شادی کے وقت آپؐ کی عمر شریف پچیس[۲۵] سال اور حضرت خدیجہؓ کی چالیس[۴۰] سال تھی۔[۱]

حضرت خدیجہ تجارتی کاروبار بھی کرتی تھیں، روپیہ ان کا ہوتا تھا اور دوسرے لوگ محنت کرتے تھے، اور اپنی محنت کا معاوضہ پاتے تھے، قریش بڑی تاجر قوم تھی، حضرت خدیجہ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی راست گفتاری، حسنِ اخلاق اور جذبۂ خیر خواہی کا علم بھی آپ کے سفرِ شام سے بخوبی ہوچکا تھا، جب آپؐ ان کا مال لے کر بغرض تجارت شام گئے تھے اور اس سفر میں جو انوکھے واقعات پیش آئے تھے، اس کا بھی ان کو علم تھا چنانچہ انھوں نے آپؐ سے رشتہ کی خواہش کی حالانکہ اس سے پہلے وہ قریش کے بڑے بڑے سرداروں کی درخواست کو نامنظور کر چکی تھیں، آپؐ کے چچا سیدنا حمزہ نے یہ پیغام آپ تک پہونچایا، ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور آپ کی ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا،[۲] اور آپ کے صاحبزادے ابراہیم کو چھوڑ کر (جن کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا تھا) آپ کی ساری اولاد ان ہی سے ہوئی۔[۳]

کعبہ کی تعمیرِ نَو اور ایک بڑے فتنہ کا سدِّ باب

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پینتیس[۳۵] سال کی ہوئی تو

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۷-۱۹۰ و سیرت ابن کثیر ص ۲۶۲-۲۶۵ [۲] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۹-۱۹۰ [۳] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹۰ و دیگر کتب سیرت۔

قریش نے کعبہ کی تعمیرِ نو کا ارادہ کیا اور اس پر چھت ڈالنے کی تجویز کی، اس سے پہلے اس کی نوعیت یہ تھی کہ مٹی اور گارے سے جوڑے بغیر بھاری پتھر تلے اوپر رکھ دیئے گئے تھے، جن کی بلندی قدِ آدم سے زیادہ تھی، اب اس کو منہدم کر کے از سرِ نو تعمیر کیا جانا تھا، جب دیواریں بلند ہو کر حجرِ اسود کی بلندی تک پہونچیں تو حجرِ اسود کے معاملہ میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا، ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ اس کو یہ شرف حاصل ہو اور وہ اس کو اٹھا کر اس کی صحیح جگہ نصب کرے، یہ معاملہ بڑھتے بڑھتے جنگ و جدال تک پہونچا، دورِ جاہلیت میں اس سے معمولی معمولی باتوں میں جنگیں ہوتی رہی ہیں، یہ تو ایک بڑی بات تھی۔

غرض کہ جنگ کی پوری تیاری کر لی گئی، بنو عبد الدار نے خون سے بھری ہوئی ایک بڑی لگن تیار کی اور انھوں نے اور بنو عدی نے مرتے دم تک لڑنے کا آپس میں معاہدہ کیا، اور خون کی لگن میں ہاتھ ڈال کر یہ معاہدہ اور عہد و پیمان پختہ کیا، یہ ایک بڑی تباہی اور عظیم فتنہ و فساد کا پیش خیمہ تھا، قریش کئی روز تک اسی الجھن میں رہے، پھر اس پر ان سب کا اتفاق ہو گیا کہ جو شخص مسجدِ حرام میں سب سے پہلے داخل ہو گا، وہ اس بات کا فیصلہ کرے گا، چنانچہ سب سے پہلے مسجد حرام کے دروازہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے، اور آپ کو دیکھتے ہی سب نے بے ساختہ کہا کہ یہ محمد الامین ہیں، ہم ان پر راضی ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر منگوائی، حجرِ اسود اٹھا کر اپنے دستِ مبارک سے اس میں رکھا پھر فرمایا کہ ہر قبیلہ چادر کا ایک کونہ پکڑ کر اٹھائے سب نے ایسا ہی کیا، جب وہ جگہ قریب ہو گئی جہاں اس کو نصب کرنا تھا تو آپ نے

اپنے ہاتھ سے اٹھا کر اس کو اس جگہ رکھ دیا، اس کے بعد باقی عمارت کی تعمیر ہوئی[1]۔

اس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قریش کو بڑے کشت و خون سے بچا لیا، آپؐ نے اس معاملہ میں جس حکمت اور تدبّر سے کام لیا اس سے بڑھ کر کوئی حکمت اور تدبیر نہیں ہو سکتی تھی، نبوّت کے بعد آپؐ نے تمام انسانوں اور دنیا کی قوموں کو جس طرح جنگوں کی بھٹّی سے نجات دی، یہ واقعہ دراصل اسی کا پیش خیمہ اور مبارک آغاز تھا، اور آپ کے فہم و تدبیر، بہترین تعلیمات، نرمی و تلطّف اور رفع نزاع و صلح جوئی کا ترجمان و آئینہ دار، یہ وہ بات تھی جس نے آپؐ کو رحمۃٌ للعالمین کا منصبِ عالی عطا کیا اور آپ اس سادہ اور اَن پڑھ قوم کے ان جنگ جُو اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے قبائل کے لئے نبیِّ رحمت ثابت ہوئے۔

حلفُ الفضول

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حلف الفضول میں بھی شریک رہے جو عربوں کا سب سے شریفانہ اور کریمانہ معاہدہ تھا، اس کا قصّہ یہ تھا کہ زَبید کا ایک شخص مکہ میں کچھ سامان تجارت لے کر آیا اور قریش کے ایک سردار عاص بن وائل نے یہ سامان خرید لیا، لیکن اس کا حق اس کو نہیں دیا، زبیدی نے سردارانِ قریش کی حمایت حاصل کرنا چاہی، لیکن عاص بن وائل کی حیثیت و وجاہت کی وجہ سے انھوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور اس کو سخت سُست کہہ کر

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹۲-۱۹۷

واپس کردیا، اب زبیدی نے اہلِ مکہ سے فریاد کی اور بہر باحوصلہ، صاحب ہمّت اور حق وانصاف کے حامی شخص سے جو اسے مل سکا شکایت کی آخر کار ان لوگوں میں غیرت نے جوش کیا اور یہ سب لوگ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے، انھوں نے ان سب کی دعوت وضیافت کی، اس کے بعد انھوں نے اللہ کے نام پر یہ عہد وپیمان کیا کہ وہ سب ظالم کے مقابلہ اور مظلوم کی حمایت میں ایک ہاتھ کی طرح رہیں گے اور کام کریں گے جب تک ظالم مظلوم کا حق نہ دے دے، قریش نے اس معاہدہ کا نام "حلف الفضول" یعنی فضول کا معاہدہ، رکھا، اور کہنے لگے کہ انھوں نے ایک فالتو کام ہیں، جو اُن کے فرائض میں نہیں آتا دخل اندازی کی ہے[۱] پھر سب مل کر عاص بن وائل کے پاس گئے اور زبیدی کا سامان واسباب اُن سے زبردستی لے کر زبیدی کو واپس کیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ سے بہت خوش تھے اور بعثت کے بعد بھی آپ نے اس کی تعریف وتحسین کی اور فرمایا کہ میں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک ایسے معاہدہ میں شریک تھا جس میں اگر اس کے نام پر اسلام کے بعد بھی مجھے بلایا جائے تو میں اس کی تکمیل کے لئے تیار رہوں، انھوں نے اس پر یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ حق، حق دار تک پہونچائیں گے اور یہ کہ کوئی ظالم، مظلوم پر غلبہ نہ حاصل کر سکے گا۔[۵۲]

---

[۱] سیرت ابن کثیر ج ۱ ص ۲۵۸-۲۵۹، اس کی ایک وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قریش سے پہلے قبیلہ جرہم نے بھی ایک ایسا معاہدہ کیا تھا، اس میں جو لوگ شریک تھے، ان میں سے تین کا نام فضل تھا، اس مماثلت کی وجہ سے قریش کے اس معاہدہ کا نام بھی یہی پڑ گیا (الروض الأنف شرح سیرۃ ابن ہشام) اس کے علاوہ اس کی اور توجیہات بھی ہیں۔ [۵۲] سیرت ابن کثیر ج ۱ ص ۲۵۸

جزیرۃ العرب کے حالات اور جزیرہ کے دینی، تہذیبی و سیاسی مرکز (مکہ مکرمہ) کے احوال پر نظر رکھنے والا جانتا ہے کہ اس حلف پر باضمیر لوگوں کی تیاری کا سبب محض کسی فرد واحد یا چند لوگوں کی حق تلفی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کا قوی محرک انتشار، بدامنی، بے اصولی اور لاقانونیت کی وہ حالت تھی جو مکہ اور اس کے ماحول پر طاری تھی نیز اس کا ایک اور محرک امن و استحکام کی — خصوصاً حرب فجار کے بعد — ضرورت اور حقوق کے احترام، اور مکہ آنے والے تاجروں اور کاریگروں کی حفاظت و حمایت کی اہمیت کا احساس بھی تھا۔

مبہم بے چینی

آپ اپنے اندر ایک مبہم بے چینی محسوس کرتے تھے جس کا سبب اور سرچشمہ اور اس کا مستقبل اور مآلِ کار آپ کو معلوم نہ تھا، آپ کے دل میں کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ اللہ تعالیٰ وحی و رسالت سے آپ کو سرفراز فرمانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا	اور اس طرح ہم نے اپنے حکم سے تمہاری
مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ	طرف روح القدس کے ذریعہ قرآن
وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا	بھیجا ہے تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور
نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ	نہ ایمان کو لیکن ہم نے اس کو نور بنایا
وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ	ہے کہ اس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو
مُّسْتَقِيْمٍ (سورہ شوریٰ۔ ۵۲)	چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور بے شک
	اے محمد تم سیدھا رستہ دکھاتے ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ٥
(سورۂ قصص۔۸۶)

اور تمھیں امید نہ تھی کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی مگر تمھارے پروردگا کی مہربانی سے (نازل ہوئی) تو تم ہرگز کافروں کے مددگار نہ ہونا۔

اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت و تربیت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشوونما بحیثیت اُمّی کے ہوئی، آپ نہ پڑھ سکتے تھے نہ لکھ سکتے تھے اس طرح آپ دشمنانِ اسلام کی تہمت طرازیوں اور افتراپردازیوں سے بہت دور اور محفوظ رہے، قرآن مجید نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ٥
(سورہ عنکبوت۔۴۸)

اور تم اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے ایسا ہوتا تو اہلِ باطل ضرور شک کرتے۔

قرآن مجید میں اسی لئے آپ کو اُمّی کا لقب دیا گیا اور ارشاد ہوا:۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ۔
(سورۂ اعراف۔۱۵۷)

وہ جو (محمد) رسول اللہ کی جو نبی اُمّی ہیں پیروی کرتے ہیں، جن کے اوصاف کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

بعثت کے بعد

انسانیت کی صبح صادق

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جس وقت اپنی عمر کے چالیس ۴۰ سال پورے کیے، اس وقت دنیا آگ کی ایک خندق کے بالکل کنارے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ لبِ بام کھڑی تھی، پوری نسلِ انسانی تیزی کے ساتھ خودکشی کے راستہ پر گامزن تھی، یہ وہ نازک وقت تھا جب انسانیت کی صبح صادق طلوع ہوئی، محروم و بد نصیب دنیا کی قسمت جاگی، اور بعثتِ محمدی کا مبارک وقت قریب ہوا، اللہ تعالےٰ کی سنّت بھی یہی ہے کہ جب تاریکی بہت بڑھ جاتی ہے اور قلوب سخت اور مردہ ہونے لگتے ہیں تو اس کی رحمت کا کوئی جاں نواز جھونکا چلتا ہے، اور انسانیت کے خزاں رسیدہ چمن میں پھر بہار آجاتی ہے۔

دنیا میں اس وقت جس جہالت اور جاہلیت کی حکمرانی تھی، خرافات واوہام اور شرک و بت پرستی کی وبا عام تھی، اس کو دیکھ کر آپ کی بے چینی خالقِ کائنات اور خالقِ ارض و سماوات کی ہدایات اور اس کے احکام کا انتظار انتہا تک پہونچ چکا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی طاقت اور غیبی آواز آپ کو چلا رہی ہے، اور آپ کی رہنمائی کر رہی ہے، اور اس بڑے منصب کے لئے آپ کو تیار کر رہی ہے۔

اس زمانہ میں تنہائی اور خلوت پسندی آپ کا شیوہ اور معمول بن گئی تھی، اور آپ کو سب سے علیحدہ ہو کر تنہا بیٹھنے سے بڑا سکون ملتا تھا، آپ مکّہ سے بہت دور نکل جاتے، یہاں تک کہ شہر کے مکانات بھی آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے آپ مکہ کی گھاٹیوں اور اندر کی وادیوں سے گزرتے تو شجر و حجر سے آواز آتی کہ "السلام علیك یارسول اللہ" آپ اپنے داہنے بائیں اور پیچھے مُڑ کر دیکھتے تو درختوں یا پتھروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔[۵۱]

غارِ حراء میں

آپ زیادہ تر غارِ حراء میں قیام فرماتے اور متواتر کئی کئی راتیں وہاں گذرتیں، اس کا انتظام پہلے سے آپ کر لیتے تھے، یہاں آپ ابراہیمی طریقہ پر اور فطرتِ سلیم کی رہنمائی سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے۔[۵۲]

بعثتِ مُبارک

اسی طرح آپ ایک بار غارِ حراء میں تشریف فرما تھے کہ منصبِ نبوّت سے آپ کو سرفراز کرنے کی مبارک ساعت آپہونچی۔

یہ ۱۷ رمضان[۵۳] آپ کی ولادت کے اکتالیسویں[۴۱] سال کا واقعہ ہے،

---

۵۱ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۳۴-۲۳۵ صحیح مسلم میں آپ کا یہ قول بھی مروی ہے کہ "میں مکہ کے ایک پتھر سے اب بھی واقف ہوں جو بعثت سے پہلے مجھے سلام کرتا تھا" (کتاب الفضائل باب فضل نسب النبی صلے اللہ علیہ وسلم) ۵۲ دیکھئے حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا ـــــ صحیح بخاری (باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) ۵۳ ابن کثیر ج ۱ ص ۳۹۲ روایت ابو جعفر محمد الباقر۔

(مطابق ۶ راگست ۶۱۰ئہ) جو حالتِ بیداری اور شعور کی حالت میں پیش آیا، آپ کے سامنے غارِ حراء میں فرشتہ آیا اور کہا کہ پڑھئے، آپ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کے بعد اس نے مجھے پکڑ کر دبایا یہاں تک کہ میں نے اس کی تکلیف محسوس کی، پھر مجھے چھوڑ دیا، اور کہا پڑھئے! میں نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس نے پھر مجھے پکڑا اور اتنی زور سے لپٹایا کہ مجھ پر اس کا سخت دباؤ پڑا، پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھئے، میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس نے پھر مجھے پکڑ کر دوبارہ اسی طرح دبایا اور چھوڑ دیا اور کہا:-

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ	(اے محمدؐ) اپنے پروردگار کا نام لے کر
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝	پڑھو جس نے عالم کو پیدا کیا جس نے
اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ	انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا،
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ	پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے
مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝	جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا
(سورۂ علق ۱-۵) [1]	اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا
	اس کو علم نہ تھا۔

یہ نبوّت کا پہلا دن تھا، اور پہلی وحی اور قرآن کا حصہ[2]۔

---

[1] ابن کثیر ج ۱ ص ۲۹۲ روایت ابو جعفر محمد الباقر۔ [2] ایک عجیب بات جو دنیا کے فلاسفہ و مفکّرین، اور مذہب و ثقافت کے مؤرخین کی توجہ چاہتی ہے، وہ اس پہلی وحی میں "قلم" کا تذکرہ ہے، جو ایک اُمّی پر ایک اُمّی قوم میں، اور ایک ایسے ملک میں نازل ہوئی جہاں قلم کا وجود بھی کم یاب تھا، اور جہاں پڑھے لکھے افراد انگلیوں پر گنے جاتے تھے، اس نے اس مذہب (باقی ص ۱۴۶ پر)

حضرت خدیجہؓ کے گھر میں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس عجیب واقعہ سے خوف زدہ ہو گئے اس لئے کہ ایسا نہ کبھی آپ کے ساتھ پیش آیا تھا، اور نہ آپ نے اس طرح کی بات کبھی سنی تھی، بنوّت اور انبیاء علیہم السلام کے عہد پر ایک طویل عرصہ گذر چکا تھا چنانچہ آپ کو اپنے لئے خطرہ محسوس ہوا اور آپ اپنے گھر تشریف لے گئے، شدّتِ خوف سے آپ کے شانۂ مبارک پر کپکپی طاری تھی، آپ نے پہونچتے ہی حضرت خدیجہ سے کہا کہ مجھے جلد اڑھا دو، مجھے جلد اڑھادو، مجھے کچھ خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔

حضرت خدیجہؓ نے آپ سے اس کا سبب پوچھا تو آپ نے سارا ماجرا بیان کیا وہ ایک عقل مند، اور ذی شعور خاتون تھیں، نبوّت، انبیاء، اور فرشتوں کے بارے میں انھوں نے بہت کچھ سن رکھا تھا وہ اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس (جنھوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی، صحف سماویہ کا مطالعہ کیا تھا اور اہلِ توریت اور اہلِ انجیل سے ان کی نشست و برخاست تھی) کبھی کبھی جایا کرتی تھیں اور اہلِ مکہ

(باقی ۱۴۵ کا) اور اس کی حامل اُمت کی قراءت وکتابت اور قلم سے کام لینے کی صلاحیت اور اس سے اس کے دائمی اور مضبوط ربط و تعلق کی (دوسرے سابقہ مذاہب کے برخلاف) نشان دہی کر دی، اور جو اس کی عالمی علمی و تصنیفی تحریک کا ایک رمز تھا جس کی اقوام و ملل کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

وہ رمز آیت "عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" کا اس وحی میں شامل ہونا تھا جو طلب علم، ذوق جستجو اور نئی معلومات کی تلاش اور پچھلے زمانوں میں دریافت نہ ہو سکنے والے مگر ثابت شدہ علمی حقائق کے عدم انکار کا محرک ثابت ہوا۔

کی نامناسب باتوں اور عادتوں کو پسند نہ کرتی تھیں جن کو فطرتِ سلیم اور ذہن مستقیم رکھنے والا کوئی شخص طبعاً پسند نہ کرے گا۔

وہ آپ کے رشتۂ زوجیت، شب و روز کی رفاقت اور آپ کی ہر ظاہر و پوشیدہ چیز سے واقفیت نیز اس خصوصی اعتماد و تعلق کی وجہ سے جو ان کو حاصل تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ سے سب سے زیادہ واقف تھیں، آپ کے شمائل و خصائل کو دیکھ کر ان کو اس کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ اللہ تعالےٰ کی تائید و توفیق ہر لمحہ آپ کے شاملِ حال ہے آپ اللہ تعالےٰ کے منتخب و مقبول بندے ہیں، اور آپ کی سیرت بھی محبوب و پسندیدہ سیرت ہے، اور جو شخص ایسے اخلاق اور ایسی سیرت اور ایسے اعلیٰ و پاکیزہ خصائل کا حامل ہو گا اس پر کسی شیطان یا جن اور آسیب کا اثر ہرگز نہیں ہو سکتا، یہ بات اللہ تعالےٰ کی حکمت اور رحمت و شفقت سے بعید اور اس کی سنتِ جاریہ کے منافی ہے، انھوں نے بڑے یقین و اعتماد کے لہجہ میں اور پوری قوت کے ساتھ کہا۔

"ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم اللہ تعالےٰ آپ کو کبھی ذلیل و رسوا نہ کرے گا، آپ صلہ رحمی اور رشتہ داری کا پاس و لحاظ کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں، محتاجوں کے کام آتے ہیں، مہمان کی ضیافت و خاطر مدارات کرتے ہیں، راہِ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں۔"[1]

ورقہ بن نوفل کی مجلس میں

حضرت خدیجہؓ نے یہ بات عقلِ سلیم اور فطرتِ صحیحہ نیز اپنی زندگی کے تجربوں

---

[1] صحیح بخاری (باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم)

اور لوگوں سے واقفیت کی بنیاد پر کہی تھی، لیکن یہ معاملہ بہت بڑا تھا، اور اس میں کسی ایسے شخص کے مشورہ کی ضرورت تھی، جو مذاہب اور ان کی تاریخ، نبوّت اور اس کے مزاج نیز اہلِ کتاب سے اچھی طرح واقف ہو، جن کے پاس انبیاء کے واقعات اور ان کے علم کا کچھ اندوختہ موجود ہے۔

انھوں نے سوچا کہ اپنے عالم و فاضل چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل سے مدد لینی چاہئے، چنانچہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر ان کے پاس گئیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ورقہ کو پورا واقعہ سنایا، ورقہ نے سنتے ہی کہا، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے آپ اس اُمّت کے نبی ہیں اور آپ کے پاس وہی ناموسِ اکبر آیا تھا، جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے پاس آیا تھا، اور ایک زمانہ آئیگا کہ آپ کی قوم آپ کو جھٹلائے گی اور ایذا پہونچائے گی، آپ کو نکالے گی، اور آپ سے جنگ کرے گی، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ سنا کہ قوم آپ کو نکال دے گی تو آپ کو کچھ تعجب ہوا، اس لئے کہ آپ قریش میں اپنی حیثیت و مرتبہ سے واقف تھے، اور جانتے تھے کہ صادق و امین کہتے ان کی زبان نہ تھکتی تھی، آپ نے تعجب کے ساتھ پوچھا کہ کیا وہ مجھے نکال دیں گے؟! ورقہ نے جواب دیا کہ ہاں! جب بھی کوئی وہ پیغام لے کر آیا جو آپ لائے ہیں تو لوگوں نے اس کی دشمنی پر کمر باندھ لی اور اس سے جنگ کی، یہ برابر ہوتا آیا ہے، اگر مجھے وہ دن نصیب ہوگا، اور میری زندگی وفا کرے گی تو میں آپ کی پوری قوّت کے ساتھ مدد کروں گا۔[1]

---

[1] ماخوذ از حدیث عائشہؓ صحیح بخاری، باب (کیف کان بدأ الوحی الی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) و سیرت ابن ہشام ص ۲۳۸

اس کے بعد ایک عرصہ تک وحی کا سلسلہ بند رہا، پھر جاری ہوا اور قرآن مجید کا نزول شروع ہوا۔

حضرت خدیجہؓ کا قبول اسلام اور ان کا کردار

سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ نے اسلام قبول کیا، رشتۂ زوجیت کی وجہ سے ان کو آپ کی خدمت و رفاقت، اور نصرت و اعانت کا خوب موقع تھا، اور انھوں نے ہر موقع پر آپ کی پُشت پناہی اور حمایت کی، لوگوں سے آپ کو جو تکلیفیں پہونچتی تھیں، وہ ان کو ہمیشہ ہلکا کرنے کی کوشش کرتیں اور آپ کی ہمّت بندھاتیں۔

حضرت علی اور زید بن حارثہ کا قبولِ اسلام

اس کے بعد حضرت علی ابن ابی طالبؓ اسلام لائے، اس وقت ان کی عمر دس سال تھی، اسلام سے پہلے وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی گود میں کھیلے تھے، آپ نے پریشانی و قحط سالی کے زمانہ میں ان کو ابو طالب سے مانگ لیا تھا، اور اپنے گھرانہ میں شامل کر لیا تھا[1]، اس کے بعد زید بن حارثہ (جو آپؐ کے غلام تھے، اور آپ نے ان کو متبنّٰی کیا تھا) اسلام لائے[2]۔

ان حضرات کا قبول اسلام دراصل ایسے لوگوں کی شہادت اور گواہی تھی، جو آپ سے سب سے زیادہ قریب تھے، اور آپ کے صدق و اخلاص اور حسنِ کردار سے سب سے زیادہ واقف، اور گھر والوں کی طرح ہر چھپی ڈھکی چیز سے باخبر تھے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۴۵ [2] ایضاً ص ۲۴۷

حضرت ابوبکرؓ کا قبولِ اسلام اور دعوت الی اللہ میں انکا حصہ

حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ کا قبولِ اسلام بھی کچھ کم اہم نہ تھا، اس لئے کہ ان کی دانش مندی، فہم و فراست، عالی ہمتی اور اعتدال و میانہ روی کی وجہ سے قریش میں ان کو ایک خاص درجہ حاصل تھا، انھوں نے اسلام کا اعلان و اظہار بھی کیا، وہ بڑی محبوب و دلکش شخصیت اور سادہ طبیعت کے مالک تھے، قریش کے انساب و تاریخ سے واقف تھے اور ایک با اخلاق و کامیاب تاجر بھی، چنانچہ اپنے اعتماد کے لوگوں، جاننے پہچاننے والوں اور اپنے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں میں انھوں نے اسلام کی تبلیغ شروع کی[1] سن رسیدہ و بالغ مردوں میں وہ پہلے مسلمان تھے۔

شرفائے قریش کا قبولِ اسلام

ان کی تبلیغ و دعوت سے قریش کے بہت سے نامی گرامی سردار اسلام لائے، جن میں عثمان بن عفانؓ، زبیر بن العوامؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، طلحہ بن عبیداللہؓ قابلِ ذکر ہیں، حضرت ابوبکرؓ ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور انھوں نے اسلام قبول کیا۔[2]

ان کے بعد ہی قریش کے اور بہت سے لوگ جن میں سے متعدد بڑی عزت و مرتبے کے مالک تھے، اسلام لائے، ان میں چند کے نام یہ ہیں، ابوعبیدہ بن الجراحؓ، ارقم بن ابی الارقمؓ، عثمان بن مظعونؓ، عبیدۃ بن الحارثؓ بن عبدالمطلب،

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۴۹-۲۵۰ [2] ایضاً ص ۲۵۰-۲۵۱

سعید بن زیدؓ، خباب بن الارتؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عمار بن یاسرؓ، صہیبؓ وغیرہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اس کے بعد لوگوں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کیا پوری پوری جماعتیں، اور وفود اسلام لاتے اور ان میں عورت و مرد دونوں ہوتے، یہاں تک کہ اسلام کا آوازہ مکہ کی فضائے آسمانی میں بلند ہوا اور جگہ جگہ اس کا چرچا ہونے لگا۔[۱]

کوہِ صفا پر پہلا اعلانِ حق

ابتداء میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دعوت و تبلیغ کے اس کام کو چھپا کر کرتے رہے اور تین[۳] سال اس حال میں گذر گئے، پھر اللہ تعالےٰ کی طرف سے آپ کو اس کے برملا اظہار و اعلان کا حکم ہوا، اور ارشاد ہوا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (سورۂ حجر۔ ۹۴)	پس جو حکم تم کو خدا کی طرف سے ملا ہے وہ (لوگوں) کو سنا دو اور مشرکوں کا ذرا خیال نہ کرو۔
وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (سورۂ شعراء ۲۱۴-۲۱۵)	اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنا دو اور جو مومن تمہارے پیرو ہو گئے ہیں ان سے تواضع پیش آؤ۔
وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ۝ (سورۂ حجر۔ ۸۹)	اور کہدو کہ میں تو علانیہ ڈر سنانے والا ہوں۔

---

[۱] سیرت ابن ہشام صـ ۲۶۲

اس حکم کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کوہ صفا کی چوٹی پر چڑھے اور بلند آواز میں یہ صدا لگائی "یا صباحاہ" یہ نعرہ عربوں کے لئے جانا پہچانا تھا، اور اس وقت لگایا جاتا تھا جب کسی دشمن یا غنیم کے حملہ کا فوری خطرہ ہوتا "یا صباحاہ" کا نعرہ سننا تھا کہ قریش کا سارا قبیلہ وہاں جمع ہوگیا جو کسی وجہ سے نہیں آسکا اس نے اپنا نمایندہ بھیجا، اس وقت آپ ان سے مخاطب ہوئے اور ارشاد فرمایا:۔

"اے بنی عبد المطلب! اے بنی فہر! اے بنی کعب! اگر میں تم کو یہ اطلاع دوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک لشکر کھڑا ہے اور تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم اس بات پر یقین کروگے؟"

عرب حقیقت پسند اور عملی لوگ تھے، انھوں نے ایک شخص میں سچائی، امانت و دیانت اور خیر خواہی کا بارہا تجربہ کیا تھا جب انھوں نے دیکھا کہ یہ شخص (جس کے متعلق اب تک ان کی یہ رائے رہی ہے) پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہے، اور پہاڑ کی دوسری طرف بھی اس کی نظر ہے، وہ صرف اپنے سامنے کی چیز دیکھ رہے ہیں، تو ان کی ذہانت، انصاف پسندی اور اس امین و صادق مخبر کی اطلاع و خبر نے ان کی رہنمائی کی اور ان سب نے کہا کہ ہاں ہم یقین کریں گے۔

دعوت و تربیت کا حکیمانہ انداز

جب یہ فطری اور ابتدائی مرحلہ طے ہوا اور سننے والوں کے اعتماد و یقین کا علم ہوگیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "فَاِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ" تو یہ سمجھو کہ میں تم کو ایک سخت عذاب سے ڈرانے اور آگاہ کرنے

آیا ہوں جو بالکل تمھارے ہاتھوں کے سامنے ہے۔

یہ دراصل منصبِ نبوّت کی صحیح تعریف اور نشان دہی تھی اور غیبی حقائق اور وہبی علوم میں نبوّت کو جو خصوصیت وانفرادیت حاصل ہے اس کی بڑی حکمت وبلاغت کے ساتھ ترجمانی جس کی نظیر ہم کو مذاہب اور نبوّت کی تاریخ میں نہیں ملتی، واقعہ یہ ہے کہ اس سے مختصر وآسان راستہ SHORT CUT اور اس سے زیادہ قابلِ فہم اور واضح پیرایۂ بیان کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ سنتے ہی مجمع پر ایک خاموشی چھا گئی، لیکن ابولہب نے کہا سارے دن تمھارے لئے خرابی ہو کیا صرف یہی کہنے کے لئے تم نے ہمیں بلایا تھا۔[۱]

اس طریقہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بے نظیر پیغمبرانہ حکمت کے ساتھ ان کو اس حقیقت پر متنبہ کیا کہ سب سے خطرناک دشمن خود ان کے اندر چھپا ہوا اور ان کے گھروں میں بیٹھا ہوا ہے، حقیقتاً اس سے ڈرنے، اور اس کے گزند سے بچنے کی ضرورت ہے کسی پہاڑ کی کمین گاہ یا کسی دیوار کی اوٹ میں بیٹھنے والے اور مناسب وقت پر چھاپہ مارنے والے دشمن کی جانی ومالی تاخت اور جو نقصان وہ پہونچا سکتا ہے اس کی اس تباہ کن وخونخوار دشمن کے سامنے کیا حقیقت ہے، جو ان کے اندرون میں موجود ہے؟ اس کائنات کے خالق وحاکم اور اپنے محسن ومنعم کی ذات وصفات، حقوق وفرائض اور اس کے اسمائے حسنیٰ سے غفلت، کھلی

---

[۱] یہ واقعہ ابن کثیر ج ۱ ص ۴۵۵-۴۵۶ میں امام احمد بن حنبل کی روایت سے نقل کیا گیا ہے جنھوں نے ابن عباس سے اس کی روایت کی ہے ابن کثیر کہتے ہیں کہ شیخین (امام بخاری، امام مسلم) نے بھی اسی مفہوم کی روایت اعمش سے کی ہے۔

شرک وبت پرستی، اندھا دھند نفس اور خواہشات کی غلامی، اوہام وخرافات کی پیروی، حدود الٰہیہ سے تجاوز اور ممنوعات ومحرّمات، ظلم وسفّاکی قطع رحمی وناانصافی میں سر سے پاؤں تک ڈوبے رہنا، کسی گھات لگانے والے لشکر اور چھاپہ مار دستہ سے زیادہ نقصان رساں اور خطرناک ہے، جس کے اندیشہ سے ان کی نیند اُڑ جاتی ہے، اور اس کی اطلاع کی ایک آواز پر وہ دیوانہ وار دوڑ پڑتے ہیں۔

دشمنی وایذا رسانی کا آغاز اور ابوطالب کی مدافعت وشفقت

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا برملا اور بلا خوف وخطر اعلان کرنا شروع کیا تو اس وقت تک آپ کی قوم نے اس کی زیادہ پروا نہیں کی اور ان کو زیادہ خطرہ محسوس نہیں ہوا اور انھوں نے اس کے رد اور جواب کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن جب آپ نے ان کے معبودوں کی مذمت کرنی شروع کی تو یہ بات ان کو بہت بُری لگی اور وہ سب آپ کی مخالفت پر کمربستہ اور متحد ہو گئے۔

اس موقع پر آپ کے چچا ابوطالب آپ کی مدافعت کے لئے سینہ سپر ہو گئے اور آپ کے ساتھ بہت شفقت ونرمی کا معاملہ کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اس اعلانِ حق اور تبلیغ ودعوت میں جان ودل سے مشغول ہو گئے، اور آپ کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لائے دوسری طرف ابوطالب آپ کے لئے سینہ سپر ہو گئے اور آپ کی ہر طرح حفاظت کرتے رہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ابو طالب کا مکالمہ

اب قریش میں ہر طرف اور ہر وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا چرچا ہونے لگا لوگ ایک دوسرے کو آپ کی مخالفت اور دشمنی پر آمادہ کرتے اور اس کے لئے فضا تیار کرتے، چنانچہ ایک مرتبہ یہ سب لوگ ایک پورا وفد بنا کر ابو طالب کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ :-

"اے ابو طالب آپ سن رسیدہ بزرگ ہیں اور ہماری نگاہ میں آپ کی خاص قدر و منزلت ہے ہم نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ آپ اپنے بھتیجے کو منع کر دیں، لیکن آپ نے اس سلسلہ میں کچھ نہ کیا، اب خدا کی قسم ہم اس سے زیادہ صبر نہ کریں گے جتنا صبر کا ثبوت ہم نے اب تک دیا ہے، اب ہم اپنے آباء و اجداد کی مذمت، اور ہمیں نا سمجھ و بے وقوف ٹھہرانے اور ہمارے معبودوں کو عیب لگانے کی کوشش زیادہ برداشت نہیں کر سکتے، یا تو آپ ان کو اس حرکت سے باز رکھیں یا پھر ہم ان سے اور آپ سے سمجھ لیں گے یہاں تک کہ ہم میں سے کوئی ایک فریق ختم ہو جائے"[1]

ابو طالب پر اپنی قوم کی جدائی اور دشمنی بھی شاق تھی، اور وہ اس پر بھی راضی نہ تھے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیں اور ان کو قوم کے حوالہ کر دیں، انھوں نے آپ کو بلا بھیجا اور کہا کہ :-

"میرے بھتیجے! تمھاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے تھے، اور ایسا ایسا

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۶۵-۲۶۶

کہہ رہے تھے، ذرا میری جان کا بھی خیال کرو، اور اپنی جان کا بھی، مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جس کو میں اٹھا نہ سکوں"۔

اگر میرے داہنے ہاتھ میں وہ سورج رکھ دیں اور بائیں ہاتھ میں چاند

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ سن کر خیال ہوا کہ شاید ابوطالب اب ان کے معاملہ میں متردد ہیں، اور اب آپ کی زیادہ حمایت و پشت پناہی نہ کر سکیں گے، آپ نے فرمایا کہ:۔

"چچا! خدا کی قسم اگر وہ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں اور یہ چاہیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں، یہاں تک کہ اللہ تعالے اس کو غالب کرے یا میں اس راستہ میں ہلاک ہو جاؤں، تب بھی میں اس سے باز نہ آؤں گا"۔

یہ کہہ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ رو دیئے، اس کے بعد آپ اُٹھے اور تشریف لے جانے لگے، آپ کو اس طرح جاتا دیکھ کر ابوطالب نے آپ کو آواز دی اور کہا کہ میرے بھتیجے! آؤ، آپ سامنے تشریف لائے، انھوں نے کہا جاؤ اور جو تمھارا دل چاہے کہو اور جس طرح چاہو تبلیغ کرو، خدا کی قسم میں تم کو کبھی کسی کے حوالہ نہ کروں گا۔[1]

قریش کے ہاتھوں مسلمانوں پر مظالم

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوت الی اللہ کا کام پورے زور شور سے

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۶۵-۲۶۶

شروع کردیا، جب قریش آپؐ سے اور آپؐ کے چچا ابو طالب سے مایوس ہو گئے تو ان کا سارا غصہ ان کے قبیلہ کے ان افراد پر اترنے لگا جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا اور ان کا کوئی حمائتی نہ تھا۔

ہر قبیلہ اپنے قبیلہ کے ان اشخاص پر ٹوٹ پڑا جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا' ان کو قید و زدوکوب' بھوک' پیاس اور مکہ کی سخت گرمی اور جھلسا دینے والی تپش کی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا۔

حضرت بلالؓ حبشی کو جو اسلام لا چکے تھے ان کے آقا امیہ ٹھیک تپتی ہوئی دوپہر میں باہر لاتے' پیٹھ کے بل لٹاتے پھر حکم دیتے کہ ایک بہت بڑا پتھر لا کر ان کے سینہ پر رکھا جائے' پھر کہتے کہ نہیں! خدا کی قسم نہیں' تم کو اس وقت تک اسی حال میں رکھا جائے گا جب تک تمھارا دم نہ نکل جائے یا تم محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا انکار کرو اور لات وعزّیٰ کی پرستش کرنے لگو' لیکن وہ اس سخت ابتلاء و آزمائش میں بھی اعلان توحید سے باز نہ آتے اور کہتے "احد احد" وہ ایک ہے' وہ ایک ہے۔

اس حالت میں ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے گذرے اور امیہ کو ایک زیادہ مضبوط و توانا اور سیاہ فام غلام دے کر حضرت بلالؓ کو آزاد کرا دیا۔[1]

بنی مخزوم عمّار بن یاسر اور ان کے والد اور والدہ (اس لئے کہ یہ اسلام کی نعمت سے سرفراز ہو چکے تھے) کو باہر لاتے اور ان کو مکہ کی سخت گرمی اور تپش میں مختلف قسم کی تکلیفیں پہونچاتے' اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اِدھر گذر ہوتا تو فرماتے' آل یاسر ذرا صبر! تمھاری منزل جنّت ہے' ان کی والدہ کو مشرکین نے اس وقت

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۳۱۷-۳۱۸

شہید بھی کر دیا، اس حالت میں کہ وہ اسلام کے سوا ہر چیز کا انکار کر رہی تھیں۔[1]

مُصعبؓ بن عُمیر مکہ کے بہت خوش پوشاک نوجوان تھے، اور ناز و نعم میں پلے تھے، وہ اپنے والدین کے بڑے لاڈلے تھے، ان کی والدہ صاحبِ ثروت تھیں اور ان کو اچھّے سے اچھّا لباس پہناتی تھیں، خوشبوؤں کے استعمال میں بھی اہل مکّہ میں اُن سے بڑھ کر کوئی نہ تھا، حضرمی جوتے جو بہت قیمتی ہوتے ہیں ان کے استعمال میں رہتے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے تھے، میں نے مکہ میں مُصعب بن عُمیر سے زیادہ خوش وضع و خوبرو، جامہ زیب اور ان سے زیادہ ناز پروردہ کسی اور کو نہیں دیکھا، مصعبؓ ابن عمیر کو جب یہ اطلاع ملی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم "دار ارقم" میں دعوت اسلام دیتے ہیں تو وہ بھی وہاں پہونچے، اسلام قبول کیا، اور آپ کی تصدیق کی، وہاں سے نکل کر یہ بات اپنی والدہ اور اپنی قوم کے ڈر سے ظاہر نہیں کی اور چھپ چھپ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملتے رہے، عثمان بن طلحہ نے ایک بار ان کو نماز پڑھتے دیکھ لیا، اور ان کی والدہ اور ان کے قبیلہ والوں کو خبر کر دی، وہ ان کو پکڑ لے گئے اور قید کر دیا، اور جب تک حبشہ کی طرف پہلی ہجرت نہ ہوئی وہ جیل ہی میں رہے، اس پہلے قافلہ کے ساتھ انھوں نے ہجرت کی، پھر مسلمانوں کے ساتھ اس شان سے واپس ہوئے کہ ان کی حالت یکسر تبدیل ہو چکی تھی، اور نرمی اور مُرفّہ الحالی کی جگہ کھردراپن پیدا ہو گیا تھا، ان کی والدہ بھی اس تغیّر حال کو دیکھ کر ان کو لعنت و ملامت کرنے سے باز رہیں۔[2]

بعض مسلمانوں نے مشرکین کی پناہ بھی لی تھی، یہ مشرکین قریش کے با اثر و ذی وجاہت سردار تھے، اور ان کی پوری حفاظت کرتے تھے، عثمانؓ بن مظعون نے ولید بن المغیرہ کی

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۳۱۹-۳۲۰ [2] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۸۲، استیعاب ج ۱ ص ۲۸۸

پناہ لی تھی لیکن ان کی غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا، اور انھوں نے ان کی حمایت کی ذمہ داری ان کو واپس کر دی، انھوں نے کہا کہ مجھے اس کی خواہش اور تمنا ہوئی کہ میں غیر اللہ کی پناہ نہ لوں، ان سے اور کسی مشرک سے کچھ بات ہوئی اس پر اس مشرک کو غصہ آگیا اور اس نے اٹھ کر ان کی آنکھ پر ایک ایسا طمانچہ مارا کہ آنکھ جاتی رہی، ولید بن المغیرہ قریب ہی یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس نے کہا کہ خدا کی قسم میرے بھتیجے تمھاری آنکھ اس صدمہ سے محفوظ تھی، اور تم ایک مضبوط پناہ میں تھے (تم نے خواہ مخواہ اس مصیبت کو دعوت دی) حضرت عثمان بن مظعون نے جواب دیا کہ واللہ میری اچھی آنکھ بھی یہ تمنا کر رہی ہے کہ اس کے ساتھ وہی حادثہ پیش آئے، اور اے عبد شمس! میں تو اس کے جوار اور اس کی پناہ میں ہوں جو تم سے زیادہ صاحب عزت اور با اقتدار ہے[1]۔

جب حضرت عثمان بن عفانؓ اسلام لائے تو ان کو ان کے چچا حکم بن ابی العاص بن اُمیہ نے خوب مضبوطی سے باندھ دیا، اور اس کے بعد کہا کہ کیا تم اپنے آباء و اجداد کا دین چھوڑ کر ایک نئے دین کو اختیار کر رہے ہو، خدا کی قسم میں تم کو اس وقت تک نہ کھولوں گا جب تک تم اپنے اس دین کو نہ چھوڑ دو گے، حضرت عثمانؓ نے کہا کہ واللہ میں اس کو کبھی بھی نہ چھوڑوں گا، جب حکم نے اپنے دین پر ان کی یہ مضبوطی اور یہ یقین دیکھا تو ان کو رہا کر دیا[2]۔

خبابؓ بن الارت بیان کرتے ہیں کہ ایک دن قریش کے لوگ مجھے پکڑ کر لے گئے، آگ جلائی، اور اس میں مجھے گھسیٹ کر ڈال دیا، پھر ایک شخص نے میرے سینہ پر اپنا پیر اس طرح رکھ دیا کہ میری پیٹھ زمین سے بالکل لگ گئی۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۷۰-۳۷۱ [2] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۳۷

پھر انھوں نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی تو معلوم ہوا کہ ساری پیٹھ پر برص کے داغ پڑ گئے تھے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قریش کی دشمنی اور ایذا رسانی کی مختلف کوششیں

جب ان نوجوانوں اور سرفروشانِ اسلام کو اسلام سے پھیرنے کی یہ کوششیں جو قریش کی طرف سے ہو رہی تھیں، ناکام ہوتی نظر آئیں، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں بھی کوئی نرمی پیدا نہ ہوئی، تو یہ بات اسلام کے دشمنوں پر بہت گراں گزری، انھوں نے کچھ بے وقوفوں اور اوباش لوگوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا، انھوں نے آپ کو جھٹلایا اور طرح طرح کی تکلیفیں دینا شروع کیں، آپ پر جادوگری اور شاعری، کہانت اور جنون کے الزامات لگائے، اور آپ کی ایذا رسانی کے لئے نئے نئے طریقے استعمال کئے اور ہر قسم کے حربے آزمائے۔

ایک دن سردارانِ مکہ حجر[2] میں جمع تھے کہ اچانک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور طواف کرتے ہوئے ان کے قریب سے گزرے، انھوں نے کچھ فقرہ بازی کی اور آپ پر طنز کیا، تین مرتبہ جب آپ ان کے قریب سے گذرے، انھوں نے اسی طرح آپ کا مذاق اڑایا، آخر میں آپ رک گئے اور فرمایا کہ قریش کے لوگو کیا تم سنتے ہو، قسم اس کی

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۱۷ [2] حجر حطیم اور دیوار کعبہ کی درمیانی جگہ کو کہتے ہیں، اس کا نام حجر اسماعیل بھی ہے، حطیم اس حصہ کا نام ہے جو کمان نما دیوار اور کعبۃ اللہ کے درمیان ہے، اس کے دونوں کنارے بیت اللہ کی شمالی و مغربی جہت سے ملتے ہیں، حجر پہلے کعبہ میں شامل تھا، جب بعثت سے قبل ایک سیلاب میں کعبہ کی دیواریں منہدم ہو گئیں اور قریش نے نئے سرے سے اس کی تعمیر کی تو مالی دشواریوں کی وجہ سے انھوں نے اس کو اتنا ہی رہنے دیا اور بقیہ حصہ کو ایک منڈیر یا مختصر دیوار سے گھیر دیا جو کمان کی شکل کی ہے۔

جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تمھارے لئے ہلاکت لے کر آیا ہوں؟ آپ کے ان الفاظ سے سب اس طرح خاموش ہوئے کہ معلوم ہو رہا تھا کسی میں جان ہی نہیں ہے، اس کے بعد انھوں نے آپ سے ملاطفت اور تعلق کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔

دوسرے روز بھی یہی قصہ پیش آیا، وہ لوگ اس جگہ جمع تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے وہ سب ایک ساتھ آپ پر ٹوٹ پڑے اور آپ کو گھیر لیا، ان میں سے ایک شخص نے آپ کی چادر پکڑ کر اس طرح گھسیٹنی شروع کی کہ گلوئے مبارک کو اذیت پہونچی یہ دیکھتے ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے اور اس شخص کے بیچ میں گئے، اور رُو رُو کر یہ کہنے لگے "اتقتلون رجلاً ان یقول ربی اللہ" کیا تم ایک شخص کو محض اتنی بات پر جان سے مار ڈالنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے' اس پر انھوں نے آپ کو تو چھوڑ دیا، لیکن حضرت ابوبکرؓ اس حالت میں گھر واپس ہوئے کہ ان کا سر کھل گیا تھا' ان کی داڑھی پکڑ کر کھینچتے ہوئے اُن کو باہر لے جایا گیا۔[1]

ایک دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نکلے تو آپ کو دن بھر سخت اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، کوئی ایسا شخص (آزاد یا غلام) نہ ملا جس نے آپ کی تکذیب نہ کی ہو اور آپ کو کسی نہ کسی قسم کی تکلیف نہ پہونچائی ہو' جب آپ اپنے گھر پر تشریف لائے تو تکلیف کے اثر سے آپ چادر اوڑھ کر لیٹ گئے' اس وقت سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، اور آپ کو "یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّر" کہہ کر خطاب کیا گیا۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۸۹-۲۹۱ امام بخاریؒ نے بھی یہ واقعہ مختصراً بیان کیا ہے۔ باب مالقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ من المشرکین بمکۃ۔

حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ کفارِ قریش کا معاملہ

ایک دن حضرت ابوبکرؓ ایک مجمع میں تبلیغ کی نیت سے کھڑے ہوئے اور اللہ اور اس کے رسول کی دعوت دینی شروع کی، تو مشرکین غیظ و غضب کے عالم میں ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کو بہت زیادہ زدوکوب کیا، عتبہ بن ربیعہ دو پھٹے پرانے جوتوں سے ان کے چہرہ کو اس طرح مارتا رہا کہ بعد میں ان کے چہرہ کے خدوخال پہچانے نہ جاتے تھے۔

بنو تمیم حضرت ابوبکرؓ کو اس حالت میں اٹھا کر لے گئے کہ اُن کو اُن کی موت میں کوئی شبہ نہ تھا، دن ڈھلے آپ کو ہوش آیا اور پہلا لفظ جو آپ کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ بتاؤ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خیریت سے ہیں؟ انھوں نے اس پر ان کو برا بھلا کہا (کہ اس حال میں بھی ان کو اپنے سے زیادہ اُن کی فکر ہے جن کی وجہ سے یہ ساری پریشانی اٹھانی پڑی) اسی وقت ام جمیل جو اسلام لا چکی تھیں ان سے قریب ہوئیں تو انھوں نے ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں دریافت کیا، انھوں نے کہا آپ کی والدہ قریب کھڑی ہیں سن لیں گی، انھوں نے کہا کہ اُن کے سامنے کوئی حرج نہیں، ام جمیل نے بتایا کہ آپؐ بخیر اور صحیح سالم ہیں، انھوں نے کہا میری اللہ سے نذر ہے کہ میں اس وقت تک نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا، جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں حاضر نہ ہو جاؤں لیکن وہ دونوں رک گئیں جب لوگوں کی آمد و رفت بند ہوئی اور سناٹا ہوا، تو وہ دونوں حضرت ابوبکرؓ کو سہارا دے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائیں، ان کی یہ حالت دیکھ کر حضورؐ پر بہت اثر پڑا، آپؐ نے اُن کی والدہ کے لئے بہت دعاء کی، اور ان کو اسلام لانے پر

آمادہ کیا اور وہ اسی وقت مسلمان ہو گئیں۔[1]

لوگوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے میں قریش کا تردد و پریشانی

قریش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں بہت پریشان تھے، اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آپؐ کی کیا ایسی بات بیان کریں جس سے لوگ آپؐ سے بدگمان ہو جائیں اور آپؐ کے پاس آنے سے باز آئیں، وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ان قافلوں کو جو دور و قریب سے آتے تھے اور آپ کا پیغام سنتے تھے، آپؐ سے دور رکھا جائے، وہ سب مل کر ولید بن المغیرہ کے پاس (جو ان سب میں زیادہ معمّر تھا، اور حج کا موسم بھی آچکا تھا) پہونچے اور ان سے مشورہ چاہا، انھوں نے کہا کہ اے جماعت قریش! حج کا زمانہ آچکا ہے، اس موسم میں عرب کے مختلف وفود آئیں گے، اور ان سب کے کان میں یہ بات پڑ چکی ہے اس لئے ان صاحب (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) کے بارہ میں کوئی ایسی متفقہ بات اور کوئی ایسا صیغہ طے کر لو جس سے ایک دوسرے کی تکذیب نہ ہو، اور سب ایک ہی بات کہیں، بہت دیر تک اس مسئلہ میں غور و خوض ہوتا رہا، اور مختلف تجویزیں سامنے آئیں لیکن ولید کو کسی بات پر اطمینان نہ ہوا، اور اس نے ان کی ساری تجویزوں کو ناقص ٹھہرایا، اب انھوں نے خود اس کی رائے پوچھی، اس نے جواب دیا کہ میرے خیال میں تو سب سے زیادہ دل لگنے والی بات یہ ہوگی کہ سب مل کر یہ کہو، وہ جادوگر ہے، جادو کرنے آیا ہے، وہ اپنے جادو سے باپ بیٹے، بھائی بھائی، میاں بیوی اور خاندان والوں میں جدائی پیدا کر دیتا ہے۔

یہ پیغام لے کر وہ وہاں سے واپس ہوئے، جب موسم حج کا آغاز ہوا، اور قافلوں کی

---

[1] سیرت ابن کثیر ج ا ص ۴۳۹-۴۴۱

آمد شروع ہوئی تو یہ سب مختلف گزرگاہوں اور عام شاہراہوں پر بیٹھ گئے، جو بھی گذرتا وہ اسے آپؐ کے پاس جانے سے روکتے، اور یہ سب باتیں جھوٹے کی گئی تھیں دہراتے[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی میں قریش کی سنگدلی و بے رحمی

قریش نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی میں سنگدلی و بے رحمی کی انتہا کردی، مختلف طریقوں سے آپ کو سخت تکلیفیں پہنچائیں، نہ قرابت اور رشتہ کا پاس کیا، نہ انسانیت کا لحاظ۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں سربسجود تھے، اور آپؐ کے قریب قریش کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ عُقبہ بن ابی معیط کہیں سے اونٹ کی ایک اوجھڑی لایا اور آپ کی پیٹھ پر پھینک دی، آپؐ اسی طرح سجدہ میں پڑے رہے یہاں تک کہ صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں اور اس کو آپ کی پیٹھ سے ہٹایا، اور جس نے یہ حرکت کی تھی اس کے لئے بددعا کی، آپؐ نے بھی ان لوگوں کے لئے بددعا کی۔[2]

حضرت حمزہ کا قبول اسلام

ایک دن ابوجہل صفا کے پاس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قریب سے گزرا، اور آپؐ کو بہت بُرا بھلا کہا اور اذیت پہونچائی آپؐ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ چلا گیا تھوڑی دیر میں حضرت حمزہ تیر کمان لگائے ہوئے ایک شکار سے واپس آئے، یہ قریش کے سب سے بہادر اور حوصلہ مند نوجوان سمجھے جاتے تھے، ان کو عبداللہ بن جدعان کی باندی نے سب ماجرا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۷۰ باختصار [2] بخاری باب "ذکر ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ من المشرکین بمکۃ"

بتایا، وہ غصہ میں اسی وقت مسجد حرام میں داخل ہوئے، دیکھا کہ ابوجہل اپنے آدمیوں کے حلقہ میں بیٹھا ہوا ہے، وہ اس کے قریب گئے اور بالکل سر کے اوپر کھڑے ہوکر یہی کمان اس کے سر کے اوپر ماری اور اس کو سخت زخمی کر دیا، اور کہا کہ تمہاری یہ جرأت کہ تم ان کو برا بھلا کہو اور گالی دو حالانکہ میں ان ہی کے دین پر ہوں اور جو وہ کہتے ہیں وہی میں کہتا ہوں، ابوجہل خاموش رہا حضرت حمزہ اسلام لے آئے اور قریش کو ان کی شجاعت، رسوخ اور وجاہت کی وجہ سے اس بات سے سخت ضرب پہونچی۔[1]

عُتبہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بات چیت

جب قریش نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حامیوں اور ایمان لانے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے تو عتبہ بن ربیعہ نے یہ تجویز پیش کی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کے ذریعہ مفاہمت کی کوئی شکل پیدا کی جائے، اس نے قریش سے اجازت چاہی کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مل کر کچھ پیش کش اور تجویزیں ان کے سامنے رکھنا چاہتا ہے، ممکن ہے وہ اس کو قبول کر کے اپنی دعوت و تبلیغ سے باز آجائیں، قریش نے اس کو اجازت دیدی اور اپنا نمائندہ بھی قرار دیا۔

عُتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا آپ کے سامنے بیٹھ گیا اور کہا کہ میرے بھتیجے! تم ہمارے درمیان جس حیثیت کے مالک ہو اس کا تمھیں علم ہے، تم نے ایک بڑے جھگڑے کی بات اپنی قوم میں کھڑی کر دی ہے، تم نے ان کے شیرازہ کو

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۹۱-۲۹۲

منتشر کیا، ان کو بے وقوف و جاہل ٹھہرایا، ان کے معبودوں اور ان کے مذہب کو عیب لگایا، ان کے اسلاف اور آباء و اجداد کے طریقہ کا انکار کیا، اب میں کچھ باتیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں، ممکن ہے اس میں سے کوئی بات تمہارے لئے قابلِ قبول ہو۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "ابوالولید" کہو، میں سُن رہا ہوں!

اس نے کہا کہ میرے بھتیجے! جو طریقہ و دین تم لائے ہو اگر اس سے تمہارا مطلب و مقصود مال و دولت ہے تو ہم یہ مال و دولت تمہارے لئے اتنا اکٹھا کر دیں گے کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ گے' اگر عزّت اور ناموری چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا سردار تسلیم کر لیں گے' اور کوئی فیصلہ تمہاری مرضی کے بغیر نہیں کریں گے' اگر بادشاہت چاہتے ہو تو ہم تم کو بادشاہ بنا لیں گے' اگر آسیب اور جن وغیرہ کے اثر سے یہ بات ہے جس کا دفعیہ تمہارے پاس نہیں ہے تو اس کے لئے ہم معالجین فراہم کر سکتے ہیں' اور اس پر پوری فیاضی سے اپنا مال خرچ کر سکتے ہیں' یہاں تک کہ تم کو اس سے شفاءِ کامل حاصل ہو جائے۔

جب عُتبہ سب کہہ چکا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا جو کچھ کہنا تھا تم کہہ چکے؟ اس نے کہا۔ ہاں!

آپؐ نے فرمایا، اب مجھ سے سنو!!

اس کے بعد آپؐ نے سورۂ فُصّلت کی کچھ آیتیں سجدۃ تک اس کے سامنے تلاوت کیں عُتبہ کے کان میں جب یہ کلام پڑا تو اس نے خاموشی کے ساتھ اس کو سُننا شروع کیا، اس نے دونوں ہاتھ پُشت کی طرف ٹیک لئے تھے اور کان کلامِ ربّانی سننے میں محو تھے، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آیت سجدۃ تک پہونچے تو آپؐ نے سجدہ فرمایا'

اور ارشاد ہوا، ابوالولید تمھیں جو کچھ سننا تھا سُن لیا، اب جیسا تم سمجھو!
عُتبہ جب لوٹ کر اپنے ساتھیوں میں آگیا تو لوگ اس کی صورت دیکھ کر کہنے لگے،
ہم قسم کھا کے کہتے ہیں کہ ابوالولید جس چہرے کے ساتھ گئے تھے، یہ چہرہ اس سے بدلا ہوا ہے،
جب وہ بیٹھا تو لوگوں نے فوراً پوچھا، ابوالولید کیا خبر لائے؟ کہنے لگا، خبر یہ ہے کہ میں نے
ایک ایسا کلام سُنا ہے جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنا تھا، خدا کی قسم، اے قریشیو!
نہ وہ شعر ہے، نہ وہ سحر ہے، نہ کہانت اور علم نجوم ہے، میری بات مانو اور اس شخص کو
اس کے حال پر چھوڑ دو، اس پر انھوں نے اس کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا، انھوں نے کہا کہ
واللہ اس کی زبان کا جادو تم پر چل گیا۔
اس نے کہا، میری رائے یہی ہے، اب جو تمھارا جی چاہے کرو۔[1]

مسلمانوں کی حبشہ کی طرف ہجرت

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ آپؐ کے اصحاب و رفقاء کو
سخت آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اور آپ ان کی حفاظت و مدافعت پر
قادر نہیں ہیں، تو آپؐ نے ان سے فرمایا، اگر تم لوگ حبشہ کی طرف نکل جاؤ تو اچھا ہے،
وہاں کا جو بادشاہ ہے اس کی وجہ سے کوئی دوسرے پر ظلم نہیں کرتا، وہ ایک اچھا ملک ہے،
یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ تمھارے لئے نجات و کشادگی کا کوئی سامان پیدا کر دے۔
اس موقعہ پر مسلمانوں کی ایک جماعت نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، یہ اسلام
میں پہلی ہجرت تھی، یہ دس آدمی تھے،[1] اور انھوں نے اپنا امیر عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۹۳-۲۹۴

کو مقرر کیا تھا، اس کے بعد جعفر بن ابی طالبؓ نے ہجرت کی، پھر بہت سے مسلمان یکے بعد دیگرے وہاں پہونچے، ان میں سے کچھ لوگ تنہا تھے، اور کچھ اہل وعیال کے ساتھ تھے، ان لوگوں کی جنھوں نے حبشہ کی ہجرت کی کل تعداد تراسی ۸۳ بتائی گئی ہے[1]۔

ہجرتِ حبشہ کا واحد محرک قریش کی ایذا رسانی سے نجات ہی نہ تھی، بلکہ اسلام کی دعوت اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فکر کو کم کرنا بھی تھا۔

مہاجرین کی فہرست کے جائزہ سے اس کے دائرہ کی وُسعت وتنوُّع کا اندازہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس میں معاشرہ کے تمام طبقات کی نمائندگی ہے، امیر وفقیر بھی نظر آتے ہیں، بوڑھے اور جوان بھی، مرد بھی اور عورتیں بھی، اور ان کی اکثریت کا تعلق مکّہ کے قدیم خاندانوں سے تھا جس سے دعوتِ اسلامی کی زبردست تاثیر اور اس کی قوت و وُسعت کا پتہ چلتا ہے۔

قریش کا تعاقب

قریش نے یہ دیکھا کہ مسلمان وہاں پہونچ گئے ہیں، اور آرام وسکون سے ہیں تو انھوں نے عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عَمرو بن العاص بن وائل کو وہاں بھیجا، اور ان کے ساتھ نجاشی اور اس کے جنگجو سرداروں اور سپہ سالاروں کے لئے بہت سے تحائف اور ہدایا بھی بھیجے، جو مکّہ کی خاص سوغات سمجھے جاتے تھے، یہ دونوں نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے، اس کے سپہ سالاروں اور سرداروں کو طرح طرح کے تحفے دے کر وہ پہلے ہی ہموار کر چکے تھے، بادشاہ کے دربار میں دونوں نمایندوں نے اپنی گفتگو

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۲۰-۳۲۱

اس طرح شروع کی:۔

"بادشاہ معظم کے ملک میں ہمارے یہاں کے کچھ بے وقوف لڑکوں نے آکر پناہ لی ہے، جنھوں نے اپنا دین بھی چھوڑا ہے اور آپ کا دین بھی قبول نہیں کیا، بلکہ ایک نیا دین ایجاد کیا ہے جس کو نہ ہم جانتے پہچانتے ہیں نہ آپ، ہمیں آپکے پاس ان کی قوم کے کچھ سر برآوردہ و ذمہ دار لوگوں نے (جو ان کے باپ، چچا اور قریبی عزیز ہوتے ہیں) بھیجا ہے تا کہ آپ ان لڑکوں کو واپس کر دیں اس لئے کہ یہ ان کے معاملات سے زیادہ واقف اور ان سے زیادہ قریب ہیں"۔

جو سردار بادشاہ کے گرد و پیش تھے یک زبان ہو کر بولے "یہ دونوں بالکل صحیح کہہ رہے ہیں، آپ ان کو ان کے سپرد کر دیں" نجاشی کو اس بات پر بہت غصّہ آیا، اور اس نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور یہ پسند نہیں کیا کہ جو اس کی پناہ لینے آئے اس کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے، اس نے اس پر قسم کھائی، اور مسلمانوں کو بلایا اور اپنے پادریوں کو جمع کیا، اور مسلمانوں کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہا، وہ دین کیا ہے جس کے لئے تم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا ہے، اور اس کو ترک کرنے کے بعد نہ میرے دین کو قبول کیا، اور نہ کسی اور معروف دین و مذہب کو اختیار کیا ہے؟

جاہلیت کی تصویر کشی اور اسلام کا تعارف جعفر بن ابی طالبؓ کی زبان سے

اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی جعفر بن ابی طالبؓ کھڑے ہوئے اور انھوں نے حسب ذیل تقریر کی:۔

"اے بادشاہ، ہم ایک جاہلیت والی قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے مُردار کھاتے تھے، ہر قسم کی بے حیائیوں اور گناہوں میں آلودہ تھے ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو پھاڑ کھاتا، ہم اس حال میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جس کے خاندان ونسب وحسب سے اور جس کی سچائی، امانت داری، اور عفت وپاک بازی سے ہم پہلے سے واقف تھے، انھوں نے ہم کو یہ دعوت دی کہ ہم صرف ایک اللہ پر ایمان لائیں اور اسی کی عبادت کریں، اور ہم اور ہمارے باپ دادا جن بتوں اور پتھروں کو پوجتے تھے، اس کو بالکل چھوڑ دیں اور ان سے قطع تعلق کرلیں، انھوں نے ہم کو سچ بولنے، امانت ادا کرنے، رشتہ داری کا خیال کرنے، پڑوسی سے اچھا سلوک کرنے، ناجائز وحرام باتوں اور ناحق خون سے پرہیز کرنے کا حکم دیا، بے حیائی کے کاموں، جھوٹ فریب، یتیم کا مال کھانے، پاک دامن وپاک باز عورتوں پر الزام لگانے سے منع فرمایا، انھوں نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کریں، اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ ٹھہرائیں، انھوں نے ہمیں نماز کا، زکوٰۃ کا، روزہ کا حکم دیا (اس موقع پر انھوں نے اس طرح کے اور ارکانِ اسلام بیان کئے) ہم نے ان کی تصدیق کی، ان پر ایمان لائے، اور جو طریقہ اور تعلیم وہ اللہ کی طرف سے لائے ہیں اس کی پیروی کی، صرف ایک اللہ کی عبادت اختیار کی اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کیا، جو انھوں نے حرام کیا اس کو حرام مانا، جو انھوں نے حلال کیا، اس کو حلال تسلیم کیا، اس پر

ہماری قوم ہماری دشمنی پر کمربستہ ہوگئی، انھوں نے ہم کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائیں اور ہم کو اس دین سے پھیرنے کے لئے مختلف آزمائشوں میں ڈالا اور اس کی کوشش کی کہ اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر ہم پھر بتوں کی عبادت کو اختیار کرلیں، اور جن گناہوں اور جن جرائم کو پہلے جائز سمجھتے تھے پھر جائز اور حلال سمجھنے لگیں۔

جب انھوں نے ہمارے ساتھ بہت زور زبردستی کی، ہم پر ظلم کیا، ہمارا جینا دوبھر کردیا اور ہمارے دین کے راستہ میں دیوار بن کر کھڑے ہوگئے تو ہم آپ کے ملک میں پناہ لینے کے لئے آئے، اور اس کے لئے آپ ہی کا انتخاب کیا، آپ کے جوار اور پناہ کی خواہش کی، اے بادشاہ! ہم یہاں یہ امید لے کر آئے ہیں کہ ہم پر کوئی ظلم نہ کیا جاسکے گا"۔

نجاشی نے یہ پوری تقریر سکون و وقار سے سنی اور کہا کہ تمھارے نبی، اللہ کے پاس سے جو کچھ لائے ہیں، اس کی کوئی چیز تمھارے پاس ہے؟

حضرت جعفرؓ نے کہا کہ ہے۔

نجاشی نے کہا کہ مجھے وہ پڑھ کر سناؤ۔

حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی ابتدائی آیتیں تلاوت کیں تو نجاشی رو پڑا، اور اس کے آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر ہوگئی، اس کے دربار کے پادریوں پر بھی گریہ طاری ہوگیا، یہاں تک کہ ان کے (مذہبی) صحیفے آنسوؤں سے بھیگ گئے۔

حضرت جعفرؓ کی حکمت و بلاغت

شاہ حبشہ کے سامنے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی تقریر اور اسلام کی دعوت،

اُن کی حکمت، موقعہ ومحل کی رعایت اور نفسیاتِ انسانی کی واقفیت کا دل آویز نمونہ ہے، اس سے لفظی بلاغت سے کہیں زیادہ "عقلی بلاغت" کا اظہار ہوتا ہے، جس کی ہدایتِ ربانی اور تائیدِ غیبی کے سوا کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی، اسی کے ساتھ اس سے حضرت جعفرؓ کی سلامتیِ طبع اور دوراندیشی کا بھی پتہ چلتا ہے جس میں بنو ہاشم قریش پر اور قریش تمام عرب پر فائق تھے، اس موقعہ پر حضرت جعفرؓ نے اپنی تقریر کو عرب جاہلیت کی صورتِ حال پیش کرنے اور یہ بتانے تک محدود رکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے رسول بنا کر بھیجا، آپؐ نے اللہ کی طرف بلایا اور دین حق کی دعوت، مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی، جو لوگ اس پر ایمان لائے ان کی زندگیوں میں انقلاب عظیم رونما ہوا، یہ صورت حال کی ایسی وضاحت ومصوّری ہے، جو ایک "آپ بیتی" کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے بیان کرنے والے کی صداقت میں شبہ کی گنجائش نہیں، حکیمانہ دعوت وبیان حقیقت کا ایک ایسا اسلوب ہے، جو پیش کرنے والے کے لئے نہ تو مشکلات وشبہات پیدا کرنے والا ہے، نہ مخالفین ومعترضین کو جرح کرنے، اور سامعین کو مخالفت پر آمادہ کرنے کا موقعہ دینے والا ہے، ایک امر واقعہ اور ایک معاشرہ کی سچی سرگزشت ہے، جس میں ایک نبی کی دعوت وتعلیم نے قبول کرنے والوں کو انسانیت کی پست ترین سطح سے اٹھا کر بلند ترین سطح پر پہونچا دیا، جس کا جی چاہے اس کو جانچ لے، اور اس انقلاب حال کو آنکھوں سے دیکھ لے۔[1]

وفد قریش کی ناکامی

نجاشی نے کہا کہ بلاشبہ یہ اور جو کچھ حضرت عیسیٰؑ لائے تھے ایک ہی نور کی

---

[1] "روائع من ادب الدعوة فی القرآن والسیرة" از مؤلف ص۱۲۲-۱۲۳

کرتیں ہیں، پھر وہ قریش کے دونوں قاصدوں کی طرف متوجہ ہوا، اور کہا، تم یہاں سے چلے جاؤ، خدا کی قسم میں ان کو تمھارے حوالہ کرنے والا نہیں۔

اس موقع پر عمرو بن العاص نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلایا، یہ ایک زہر میں بجھا ہوا تیر تھا۔ انھوں نے کہا کہ۔

بادشاہ سلامت! یہ لوگ حضرت مسیحؑ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں جن کا زبان سے نکالنا بھی مشکل ہے۔

نجاشی نے پوچھا کہ تم لوگ حضرت مسیحؑ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

جعفر بن ابی طالبؓ نے جواب دیا، ہم ان کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی ہے، وہ اللہ کے بندے ہیں اس کے رسول ہیں اور اس کی روح اور کلمہ ہیں جو اس نے کنواری پاکباز مریم پر القا کیا، یہ سن کر نجاشی نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا اور ایک تنکا اٹھا کر کہا کہ خدا کی قسم جو کچھ تم نے بیان کیا ہے حضرت عیسیٰؑ اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں ہیں۔

اس نے مسلمانوں کو بہت اعزاز و اکرام سے رخصت کیا، ان کو امان دی، قریش کے وہ دونوں قاصد ذلیل و خوار ہو کر وہاں سے نکلے اور مسلمانوں نے بہت اچھے گھر اور اچھے پڑوس میں عزت کی جگہ پائی۔[1]

مسلمانوں کا جذبۂ احسان شناسی

اسی زمانہ میں نجاشی کے کسی دشمن نے اس پر حملہ کیا، مہاجر مسلمانوں نے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۳۴-۳۳۸ باختصار۔

اپنے بارے میں نجاشی کے قابلِ تعریف موقف اور اس کے احسان کے جواب میں اس کا ساتھ دیا،[۱] جو اسلام کی اخلاقی تعلیمات کے مطابق اور مسلمانوں کے اخلاق کے شایانِ شان تھا۔

حبشہ میں دین کی دعوت اور اسلام کا تعارف

حبشہ کی ہجرت ۵ھ نبوی میں ہوئی تھی جہاں جعفر بن ابی طالبؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ۷ھ تک رہے، اور وہ غزوۂ خیبر کے موقعہ پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے، اس طرح وہ تقریباً پندرہ ۱۵ سال حبشہ میں رہے، جو ایک طویل مدّت ہوتی ہے، جس سے حضرت جعفرؓ نے دعوتِ اسلامی کے سلسلہ میں ضرور فائدہ اٹھایا ہوگا کہ وہ ملک دوسرے نصرانی ممالک کے مقابلہ میں رواداری اور مظلوموں کو پناہ دینے میں خاص امتیاز رکھتا تھا، اور اس کا حاکم اپنے انصاف اور انسانیت کے لئے معروف تھا، مگر وہ زمانہ تفصیلی و تحریری وقائع نگاری کا نہیں تھا، اس لئے اس کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے سامنے تاریخی ودستاویزی حقائق تو نہیں ہیں لیکن یہ بات ہر طرح قرینِ قیاس ہے کہ انھوں نے اس طویل قیام سے (جس سے کوئی اور فائدہ اٹھانا مقصود نہ تھا) دین کی دعوت اور اسلام کے تعارف میں پورا فائدہ اٹھایا ہوگا۔

حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ

پھر اللہ تعالےٰ نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے ذریعہ اسلام

---

[۱] مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲۰۲

اور مسلمانوں کی نصرت وحمایت کا غیبی سامان کیا، حضرت عمرؓ قبیلۂ قریش کے ایک معزّز شخص تھے، وہ بہت بارعب، پرجلال اور طاقت ور شخصیت کے مالک تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کی بڑی خواہش اور آرزو تھی کہ وہ مسلمان ہو جائیں، آپ اس کے لئے دعا بھی فرمایا کرتے تھے۔

ان کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ ان کی بہن فاطمہ بنت الخطابؓ اسلام لاچکی تھیں اور ان کے بعد ان کے شوہر سعید بن زید بھی مشرّف بہ اسلام ہو چکے تھے، لیکن دونوں نے اپنے قبولِ اسلام کو حضرت عمر کے رعب و دبدبہ نیز اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی سخت گیری کی وجہ سے اب تک ظاہر نہیں کیا تھا، خبّاب بن الارتؓ فاطمہ کو قرآن پڑھاتے تھے۔

حضرت عمر ایک مرتبہ تلوار لٹکائے ہوئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابِ کرام کی تلاش میں نکلے، ان کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ یہ سب حضرات اس وقت صفا کے قریب کسی گھر میں جمع ہیں، راستہ میں ان کو نُعیم بن عبد اللہ ملے جو ان ہی کے قبیلہ بنی عدی سے تعلق رکھتے تھے، اور اسلام لاچکے تھے، انھوں نے پوچھا، عمر کہاں کا ارادہ ہے؟ کہنے لگے کہ (نعوذ باللہ) محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کرنے جارہا ہوں، جس نے بے دینی اختیار کی، قریش کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا، ان کو جاہل و بے وقوف قرار دیا، ان کے دین کو عیب لگایا معبودوں کو گالیاں دیں، آج ان کا قصّہ ہی تمام کر دینا ہے۔

نعیم نے کہا، عمر! تم کس دھوکہ میں پڑے ہو، اپنے گھر والوں کی خبر لو اور پہلے ان کو ٹھیک کرو۔

حضرت عمر نے پوچھا، میرے گھر میں کون؟

انھوں نے جواب دیا، تمھارے بہنوئی اور چچازاد بھائی سعید بن زید، تمھاری بہن فاطمہ، یہ دونوں مسلمان ہوچکے ہیں اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا دین اختیار کرچکے ہیں، پہلے ان کو دیکھ لو۔

حضرت عمرؓ الٹے پاؤں اپنی بہن اور بہنوئی کی طرف چل دیئے، اس وقت ان کے پاس خبابؓ بن الارتؓ بیٹھے ہوئے تھے، ان کے ساتھ ایک صحیفہ تھا جس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی، اور وہ ان کو یہ سورہ پڑھا رہے تھے، جب ان کو حضرت عمر کی آہٹ محسوس ہوئی تو خبابؓ گھر کے ایک اندرونی کمرہ میں چھپ گئے، فاطمہ نے یہ صحیفہ جلدی سے ران کے نیچے دبا لیا، لیکن حضرت عمر نے خباب بن الارتؓ کی تلاوت و قراءت سن لی تھی، جب اندر داخل ہوئے تو پوچھا کہ یہ کیا کھسر پھسر ہو رہی تھی؟ ان دونوں نے جواب دیا کہ کیا تم نے کچھ سن لیا؟ انھوں نے کہا، ہاں سنا ہے، اور مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ تم نے محمدؐ کا دین قبول کرلیا ہے، پھر وہ اپنے بہنوئی سعید بن زید کو مارنے دوڑے ان کی بہن فاطمہؓ ان کو بچانے کے لئے لپکیں تو انھوں نے ان کی بھی خبر لی اور زخمی کردیا۔

جب یہ سب کچھ کرچکے تو ان کی بہن اور بہنوئی نے کہا کہ ہاں بے شک ہم مسلمان ہوچکے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاچکے ہیں، اب تم ہمارا جو چاہے کرلو۔

جب عمرؓ نے اپنی بہن کے جسم پر خون کے دھبے دیکھے تو ان کا جوش ٹھنڈا ہوا اور ان کو اپنے اس فعل پر ندامت سی ہوئی، وہ رک گئے، اور کہنے لگے، مجھے وہ صحیفہ دو جو ابھی میں نے پڑھتے ہوئے تم دونوں کو سنا تھا، میں دیکھوں کہ محمدؐ کی

تعلیم کیا ہے؟ حضرت عمرؓ پڑھے لکھے تھے، جب انھوں نے یہ کہا تو ان کی بہن بولیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ معلوم نہیں تم اس کے ساتھ کیا کرو، انھوں نے کہا تم ڈرو نہیں اطمینان رکھو، انھوں نے اپنے معبودوں کی قسم کھا کر ان کو اس کا یقین دلایا، جب انھوں نے ایسی باتیں کہیں تو ان کی بہن کو یہ لالچ ہوئی کہ شاید عمر اسلام لے آئیں، انھوں نے نرمی سے کہا، بھائی جان آپ شرک کی وجہ سے نجس و ناپاک ہیں، اور اس صحیفہ کو صرف پاک آدمی چھو سکتا ہے۔

حضرت عمر کھڑے ہوئے، جا کر غسل کیا تب ان کی بہن نے یہ صحیفہ ان کے ہاتھ میں دیا، اس میں سورۂ طٰہٰ درج تھی، تھوڑا ہی سا پڑھا تھا کہ حضرت عمر بول اٹھے کیا پاکیزہ اور لائقِ احترام کلام ہے؟

جب خبابؓ نے یہ سنا تو اپنے حجرہ سے نکل کر سامنے آگئے، اور کہنے لگے، اے عمر، خدا کی قسم مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی دعوت سے آپ کو ضرور سرفراز کرے گا، اس لئے کہ میں نے کل ہی حضورؐ کو یہ دعا کرتے سنا تھا، اے اللہ اسلام کی ابو الحکم بن ہشام (ابو جہل) یا عمر بن الخطاب کے ذریعہ مدد فرما، اے عمر اب تو تم کو کچھ اللہ کا خوف اور شرم و لحاظ آنا چاہیئے۔

اس وقت عمر نے کہا، خباب! مجھے محمدؐ کے پاس لے چلو، میں ان کے ہاتھ پہ اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں، خبابؓ نے کہا کہ وہ صفا کے پاس ایک گھر میں ہیں، آپ کے ساتھ اور کئی ہمراہی ہیں، حضرت عمرؓ نے تلوار حمائل کی، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے، اور دروازہ پر دستک دی، جب انھوں نے ان کی آواز سنی تو ایک صحابیؓ نے کھڑے ہو کر اور پہلے دروازہ کی دراز سے جھانک کر اطمینان

کرنا چاہا، دیکھا کہ وہ تلوار لگا کر آئے ہیں، وہ گھبرائے ہوئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ! عمر بن الخطاب ہیں، اور تلوار لگا کر آئے ہیں، حضرت حمزہؓ بولے، آنے دو، اگر وہ نیک ارادے سے آرہے ہیں تو بسم اللہ اور نہیں تو ہم ان ہی کی تلوار سے ان کا کام تمام کردیں گے، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اجازت دے دو، چنانچہ ان صحابیؓ نے حضرت عمر کو آنے کی اجازت دے دی۔

حضرت عمر آنے لگے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آگے بڑھ کر حجرہ میں ان سے ملے اور ان کا دامن یا گریبان مضبوطی سے پکڑ کر کھینچا اور فرمایا ابن خطاب! یہاں کس ارادہ سے آئے ہو، خدا کی قسم مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ خاتمہ سے پہلے تمھیں کوئی سخت آفت یا مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

حضرت عمر نے کہا، یا رسول اللہ میں آپ کے پاس اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے اور اللہ تعالےٰ نے جو ہدایت اور تعلیم ان کے ذریعہ بھیجی ہے اس کو قبول کرنے حاضر ہوا ہوں۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ سن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نعرۂ تکبیر بلند کیا، اس تکبیر سے اس گھر میں جتنے صحابۂ کرام تشریف رکھتے تھے، سب سمجھ گئے، کہ عمر مسلمان ہو گئے![1]

حضرت عمر کے اسلام لانے سے مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی اور عزتِ نفس کا احساس پیدا ہوا حضرت حمزہؓ پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے، وہ جانتے تھے کہ کفارِ قریش پر اس واقعہ کا کتنا سخت ردِ عمل ہوگا، اور مکہ کی زندگی میں اس کا

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۳۴۲-۳۴۶

کیا اثر محسوس کیا جائے گا، اوران کا یہ خیال کچھ خوش فہمی پر مبنی نہ تھا، اس لئے کہ مشرکین پر کسی شخص کا اسلام لانا اتنا شاق نہیں گذرا تھا، اور اس کو وہ اہمیت نہیں دی گئی تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کو دی گئی۔

حضرت عمرؓ نے اپنے مسلمان ہونے کا کھل کر اعلان کیا، یہ بات قریش میں فوراً پھیل گئی، وہ حضرت عمرؓ سے بھی لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے، اور حضرت عمرؓ بھی پوری طرح مقابلہ پر آ گئے، اور آخر کار مخالفین اور دشمنانِ اسلام شکستہ و نامراد ہو کر اور ہمت ہار کر بیٹھ رہے۔[1]

قریش کی طرف سے بنی ہاشم کا مقاطعہ اور محاصرہ

اسلام قبائل عرب میں تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا تو قریش کو بڑی فکر ہوئی، انھوں نے ایک مشاورتی اجتماع کیا اور اس میں یہ بات طے کی گئی کہ ایسا معاہدہ تحریر کیا جائے جس کے ذریعہ بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب کو اس کا پابند کر دیا جائے کہ وہ کسی اور جگہ شادی نہیں کر سکتے، نہ دوسرے ان سے شادی کرنے کے مجاز ہوں گے، نہ کوئی چیز ان کے ہاتھ فروخت کریں گے نہ اُن سے خریدیں گے، اجتماع کے بعد انھوں نے ان دفعات کو ایک تحریری شکل میں قلم بند کیا پھر سب نے ایک عہد نامہ اور میثاق کی حیثیت سے اس کو باضابطہ طور پر منظور اور واجب العمل قرار دیا، اور مزید توثیق کے لئے یہ معاہدہ کعبہ کے اندر آویزاں کر دیا گیا۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج۱/ص۳۴۹

شعب ابی طالب میں

جب قریش نے ایسا معاملہ کیا تو بنو ہاشم اور بنو المطلب ابو طالب کے ساتھ ہو گئے اور اس گھاٹی یا وادی میں ان کے ساتھ محصور ہو گئے، یہ ۷ سنہ بعد بعثت کا واقعہ ہے، بنو ہاشم میں سے ابو لہب بن عبد المطلب اس میں شامل نہ تھا وہ قریش کا ہم نوا تھا، بنو ہاشم ایک عرصہ تک اسی طرح محصور رہے اس محاصرہ نے اتنا طول کھینچا کہ ببول کے پتے کھا کر گزارا کرنے کی نوبت آئی ان کے بچے بھوک سے روتے اور بلبلاتے تھے اور ان کے رونے کی آواز دور تک جاتی تھی، قریش تاجروں کو بھی ان کے خلاف بھڑکاتے تھے چنانچہ ان تاجروں نے چیزوں کی قیمت اتنی زیادہ کر دی کہ وہ یہ سامان خرید ہی نہ سکیں۔

تین ۳ سال اس سخت حال میں گزرے، اس زمانہ میں خفیہ طریقہ سے کچھ ضروریات زندگی ان کے پاس پہونچ پاتی تھیں، قریش کے وہ لوگ جو ان کے ساتھ سلوک و صلہ رحمی کا معاملہ کرنا پسند کرتے تھے، وہ ان کی اس طرح در پردہ مدد کرتے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس حال میں بھی اپنی قوم میں تبلیغ و دعوت کا فریضہ دن رات، خفیہ و علانیہ، ہر طریقہ سے انجام دیتے، اور بنو ہاشم صبر اور امید اجر کے ساتھ ان تمام تکلیفات کو برداشت کرتے۔

عہد نامہ کی تنسیخ اور مقاطعہ کا خاتمہ

اسی دوران میں قریش کے کچھ با ضمیر و عالی حوصلہ اشخاص کے دل[illegible] ہشام بن عمرو بن ربیعہ پیش پیش تھے اس ظالمانہ معاہدہ کے خلاف ناپسندیدگی کا

جذبہ پیدا ہوا، اور اس کو انھوں نے ایک خلافِ انسانیت فعل قرار دیا، ہشام حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کرنے والے شخص تھے، اپنی قوم میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا انھوں نے اس سلسلہ میں قریش کے ان اشخاص سے جن کے اندر کچھ نرم خوئی، حوصلہ مندی اور عالی ظرفی محسوس ہوئی، رابطہ قائم کیا اور ان کی شرافت و انسانیت کو غیرت دلائی، اور اس پر آمادہ کیا کہ اس ظالمانہ معاہدہ کو ختم کیا جائے، یہ پانچ اشخاص تھے، اور ان سب نے اس کو کالعدم قرار دینے پر اتفاق کر لیا، دوسرے دن جب قریش کی محفلیں آراستہ تھیں، عین اس محفل میں زُہیر بن ابی امیہ جن کی ماں عاتکہ بنت عبد المطلب تھیں، لوگوں کے سامنے آئے اور کہنے لگے۔

"اے مکہ والو! ہم مزے سے کھائیں پئیں اور بنو ہاشم دانہ دانہ کو ترسیں اور جاں بلب ہوں، ان کے ساتھ خرید و فروخت تک بند ہو، خدا کی قسم میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا، جب تک کہ اس ظالمانہ معاہدہ کو پُرزہ پُرزہ نہ کر دیا جائے"!

اس موقع پر ابو جہل نے مداخلت کرنا چاہی لیکن اس کی کچھ چل نہ سکی، مُطعم بن عدی اس معاہدہ کو پھاڑنے کی غرض سے اس کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ دیمک پورے کاغذ کو چاٹ کر ختم کر چکی ہے، صرف باسمک اللّٰھم کے الفاظ باقی ہیں۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی ابو طالب کو اطلاع پہلے سے فرما چکے تھے۔)

بہر حال اس معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دیا گیا، اور جو کچھ اس میں تحریر تھا وہ سب کالعدم ہو گیا۔[1]

---

[1] سیرت ابن ہشام ۱/ص ۳۵۰-۳۵۱

ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات

نبوت کے دسویں سال، ایک ہی سال کے اندر ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ دونوں کا انتقال ہوگیا، ان دونوں کا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسنِ صحبت، حسن سلوک، وفاداری اور نصرت وحمایت کا جو معاملہ تھا وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے، ابوطالب نے اسلام قبول نہ کیا، اس حادثہ کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پے در پے کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

قرآن مجید کی انقلاب آفرینی ومسیحائی اور قلبِ سلیم پر اس کے اثرات

طُفَیل بن عَمْرو دوسی جو عرب کے ایک سر برآوردہ ومعزز شخص اور ممتاز شاعر تھے، مکہ آئے تو قریش نے حسب معمول ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے روکنا چاہا، اور ان کو آپؐ سے قریب ہونے اور آپ کی بات سننے سے بہت ڈرایا اور کہا کہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں تمھارے ساتھ اور تمھاری قوم کے ساتھ وہی پیش نہ آئے جو یہاں ہم کو پیش آرہا ہے، اس لئے نہ تم ان سے کچھ بات کرنا نہ ان کی سننا۔ طُفَیل کہتے ہیں کہ "واللہ وہ میرے پیچھے پڑے رہے، یہاں تک کہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ ان کی سنوں گا نہ ان سے بات کروں گا، اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی اور حرم کی طرف گیا، اچانک میری نگاہ اٹھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کعبہ کے نزدیک نماز پڑھ رہے ہیں، میں آپؐ کے پاس کھڑا ہوگیا، اور اللہ نے آپ کا کچھ کلام مجھے زبردستی سنوا ہی دیا،

کہتے ہیں کہ میں نے بہت اچھا کلام سنا، میں نے اپنے دل میں کہا، میری ماں مجھے روئے، خدا کی قسم میں سخن ور بھی ہوں اور سخن شناس بھی، کلام کی اچھائی برائی مجھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی، آخر یہ کلام سننے سے مجھے کیا چیز مانع ہو رہی ہے؟ اگر وہ واقعی اچھی بات ہے تو میں اسے قبول کروں گا، بری بات ہے تو چھوڑ دوں گا۔"

اس کے بعد طفیل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آپ کے گھر میں ملے اور یہ ماجرا بیان کیا، رسول اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام لانے کی دعوت دی، اور ان کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت کی، چنانچہ وہ مسلمان ہو گئے، اور اسلام کے داعی و مبلّغ بن کر اپنی قوم و برادری میں واپس ہوئے، انھوں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنے سے بھی انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہوں گے میں ان سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا، اس بات پر وہ سب لوگ بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، انھوں نے اپنے قبیلہ دوس کو اسلام کی دعوت دی اور اس قبیلہ میں اسلام کی خوب اشاعت ہوئی۔[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ شروع میں اپنے گھر ہی میں نماز پڑھتے تھے، پھر ان کی طبیعت اس پر راضی نہ ہوئی اور انھوں نے اپنے گھر کے صحن میں نماز کی ایک جگہ بنالی اور اس میں نماز پڑھنے اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگے، جب وہ تلاوت کرتے تو مشرکین کی عورتیں اور بچے ان پر ٹوٹے پڑتے ان کو دیکھتے رہتے اور تعجب کرتے، حضرت ابوبکرؓ بہت رقیق القلب تھے، تلاوت کرتے وقت ان کی آنکھیں بے ساختہ اشکبار ہو جاتی تھیں، اس بات نے مشرکین کے سرداروں کو بہت خوفزدہ کر دیا، انھوں نے ابن الدغنہؓ کو جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کو پناہ دی تھی، بلوا بھیجا، جب وہ ان کے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱/ ص ۳۸۲-۳۸۴ باختصار۔

سامنے آئے تو ان سب نے ان سے کہا کہ تم نے ابوبکر کو جو پناہ دی تھی، ہم نے اس کو اس شرط پر تسلیم کیا تھا کہ وہ اپنے گھر کے اندر اللہ کی عبادت کریں لیکن انھوں نے اپنی نماز اور قراءت سب کچھ علی الاعلان کرنا شروع کر دیا ہے، ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہمارے لڑکوں اور عورتوں کو متأثر و مسحور نہ کر دیں، اب اگر وہ اس پر راضی ہوں کہ اپنے گھر کے اندر اللہ کی عبادت کریں تو ٹھیک ہے، اگر اس سے انکار کریں تو ان سے کہو کہ تمھاری پناہ اور حفاظت واپس کر دیں اس لئے کہ نہ ہم تمھارے عہد کو توڑنا چاہتے ہیں، نہ ابوبکر کو علانیہ عبادت و تلاوت کی اجازت دینے پر راضی ہیں۔

جب ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکرؓ کو قریش کے اس مطالبہ سے آگاہ کیا، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں تمھاری پناہ اور ضمانت کو واپس کرتا ہوں، اور اللہ کی ضمانت و حفاظت پر راضی ہوں۔[۱]

طائف کا سفر اور سخت اذیتوں کا سامنا

ابوطالب کے انتقال کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ بہت سی تکلیفیں اور اذیتیں پہونچیں جن کی ہمت ابوطالب کی زندگی میں قریش والے نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ آپؐ کے سر پر مٹی بھی پھینکی گئی، جب ان اذیتوں کا سلسلہ دراز ہونے لگا، اور مشرکین و کفار کی اسلام سے کراہت اور اس کی ناقدری اور حقارت اور بڑھ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا قصد فرمایا،[۲] آپ کی نیت یہ تھی کہ

---

[۱] بخاری شریف بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا (باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ) تلخیص کے ساتھ

[۲] راجح قول یہ ہے کہ طائف کا یہ سفر دسویں سال شوال کی آخری تاریخوں میں ہوا (خاتم النبیین۔ از شیخ محمد ابوزہرہ مرحوم ج ۱ ص ۵۸۰)

قبیلۂ ثقیف کو اسلام کی دعوت دیں اور ان سے نصرت کے خواستگار ہوں آپؐ کو اہلِ طائف سے کچھ خیر کی امّید تھی، اور اس میں تعجب کی بھی کوئی بات نہیں اس لئے کہ آپ کے ایامِ رضاعت قبیلۂ بنی سعد میں گزرے تھے، جو طائف کے قریب آباد تھا۔

طائف کی اہمیت

طائف کا شہر اپنی اہمیت، آبادی کے پھیلاؤ اور خوش حالی و فارغ البالی میں مکّہ کے بعد دوسرے نمبر پر تھا، قرآن مجید میں قریش کی زبان سے اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ	اور یہ بھی کہنے لگے کہ یہ قرآن دونوں
عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ	بستیوں (یعنی مکہ اور طائف) میں سے
عَظِيْمٍ ○ (سورۂ زخرف ۳۱)	کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا۔

یہ شہر مشہور بُت "لات" کی عبادت کا بھی مرکز تھا، جہاں باقاعدہ لوگ تیرتھ کے لئے آتے تھے، اس بات میں وہ مکہ کا ہمسر و ہم ردیف تھا جو قریش کے سب سے بڑے بُت "ہُبَل" کی عبادت کا مرکز تھا، امراء و خوش حال طبقہ یہیں گرمیاں گزارتا تھا، عہدِ اسلامی اور اس کے بعد بھی اس کو یہ اہمیت حاصل رہی۔

اموی شاعر عمر بن ربیعہ کہتا ہے۔

تشتو بمکہ نعمۃً　　ومصیفھا بالطائف[۱]

اہلِ طائف جائداد اور زمینوں کے مالک تھے، ان کے پاس بڑے بڑے

---

[۱] وہ ناز پروردہ جاڑے مکہ میں گذارتی ہے اور گرمیاں طائف میں۔

باغات اور مزرعے تھے، اس دولت وخوش حالی نے ان کے اندر غرور وناز پیدا کردیا تھا، اور وہ اس آیت کا مصداق اور نمونہ تھے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ	اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے
نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَآ	والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے
اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ	خوش حال لوگوں نے کہا کہ جو چیز
وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا	دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اس کے
وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ	قائل نہیں اور (یہ بھی) کہنے لگے کہ
(سورۂ سبا۔۳۴۔۳۵)	ہم بہت سا مال اور اولاد رکھتے
	ہیں اور ہم کو عذاب نہیں ہوگا

اہلِ طائف کا سلوک اور آپؐ کی دعا

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لائے تو سب سے پہلے ثقیف کے سرداروں اور ذمہ دار لوگوں سے ملنے تشریف لے گئے، اور ان کے پاس بیٹھ کر ان کو دینِ حق کی دعوت دی، لیکن آپ کو اس کا بہت بُرا اور سخت جواب ملا، انھوں نے آپ کا مذاق بھی اُڑایا، اور شہر کے اوباش لوگوں اور غلاموں کو آپؐ کے ستانے پر مامور کردیا، یہ لوگ آپؐ کو گالیاں دیتے شور مچاتے اور آپ پر پتھر پھینکتے، اسی بے کسی اور کرب کے عالم میں آپ پناہ لینے کے لئے ایک کھجور کے سایہ میں تشریف فرما ہوئے، طائف میں آپؐ کو جتنا ستایا گیا وہ مشرکینِ مکہ کی ایذا رسانیوں سے کہیں زیادہ تھا، انھوں نے راستہ کے دونوں طرف

اپنے آدمی کھڑے کر دیئے آپ ایک قدم بھی اٹھاتے تو کسی طرف سے پتھر آپ پر پھینکا جاتا حتیٰ کہ آپ کے دونوں پیر زخموں سے لہولہان ہو گئے، اس وقت بے ساختہ آپ کے قلب و زبان پر یہ دعا جاری ہوئی' اور آپ نے اللہ تعالیٰ سے اپنی کمزوری' بے سروسامانی اور لوگوں کی نگاہ میں بے وقعتی کی فریاد کی اور اللہ کی نصرت و تائید کے ان الفاظ میں خواستگار ہوئے آپ نے فرمایا:۔

اللهم اليك اشكو ضعف قوتي،	الٰہی اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور
وقلة حيلتي، وهواني على	لوگوں میں تحقیر کے بابت تیرے سامنے
الناس، يا ارحم الراحمين	فریاد کرتا ہوں تو سب رحم کرنے والوں سے
أنت رب المستضعفين إلى	زیادہ رحم کرنے والا ہے، درماندہ اور
من تكلني، الى بعيد يتجهمني،	عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور
أم إلى عدو ملكته امري؟	میرا مالک بھی تو ہی ہے، مجھے کس کے
ان لم يكن بك غضب علي فلا	سپرد کیا جاتا ہے کیا بے گانہ ترش
ابالي، غير ان عافيتك هي	روکے' یا اس دشمن کے جو کام پر
اوسع لي، اعوذ بنور وجهك	قابو رکھتا ہے' اگر مجھ پر تیرا غضب
الذي اشرقت له الظلمات	نہیں تو مجھے اس کی پرواہ نہیں
وصلح عليه امر الدنيا والآخرة	لیکن تیری عافیت میرے لئے زیادہ
من ان ينزل بي غضبك او يحل	وسیع ہے میں تیری ذات کے نور
علي سخطك، لك العتبى	سے پناہ چاہتا ہوں جس سے
حتى ترضى ولا حول	سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں'

ولا قوۃ الا باللہ۔ | اور دنیا و دین کے کام اس سے ٹھیک ہو جاتے ہیں کہ تیرا غضب مجھ پر اترے یا تیری نارضامندی مجھ پر وارد ہو، مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے فرشتے کو آپ کے پاس بھیجا اور اس نے آپؐ سے اس کی اجازت طلب کی کہ وہ ان دونوں پہاڑوں کو جن کے درمیان طائف واقع ہے، ملا دے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سے ارشاد فرمایا کہ نہیں، مجھے امید ہے کہ ان کی اولاد میں سے کوئی ایسا پیدا ہوگا جو خدائے واحد کی عبادت کرے گا اور اس کے ساتھ کسی اور ہستی کو شریک نہ ٹھہرائے گا۔[۱]

جب عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ نے آپؐ کی یہ حالت دیکھی تو ان کا دل کچھ نرم پڑا اور ان کی انسانیت کی رگ میں کچھ جنبش پیدا ہوئی ان دونوں نے اپنے ایک نصرانی غلام کو بلایا جس کا نام "عداس" تھا، اور اس سے کہا کہ لو یہ انگور کا خوشہ ایک طباق میں رکھ کر اس شخص کے پاس لے جاؤ اور کہو کہ یہ ان کے کھانے کے لئے ہے، عداس نے اس پر عمل کیا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سن کر اور آپ کے اخلاق کریمانہ دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔[۲]

---

[۱] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۰۲ [۲] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۱۹-۴۲۲۔ وسیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۱۴۹-۱۵۳ وزاد المعاد ج ۱ ص ۳۰۲ باختصار و تلخیص۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مکہ تشریف لائے تو آپ کی قوم آپ کی مخالفت، دشمنی اور آپ کے تمسخر اور ایذا رسانی میں اسی طرح سرگرم تھی۔

واقعۂ معراج

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی، راتوں رات آپ کو قدرت غیبی کے ساتھ مسجد حرام لے جایا گیا، وہاں سے مسجد اقصیٰ پہونچا یا گیا، اس کے بعد ان مقامات قرب و اختصاص، ساتوں آسمانوں کی سیر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے مشاہدے اور انبیاء کرام سے ملاقات کے وہ تمام واقعات پیش آئے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝	ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی
لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ	اور نہ (حد سے) آگے بڑھی انھوں نے
الْكُبْرٰى ۝[1]	اپنے پروردگار کی قدرت کی کتنی ہی
(سورۂ النجم ـ ۱۷ - ۱۸)	بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی ایک ضیافت و عزت افزائی تھی، جو آپ کی دل داری و دل نوازی اور طائف کے ان زخموں کو مندمل کرنے اور اس ذہنی ناقدری اور بے گانگی و بیوفائی کی تلافی کے لئے تھی جس کے سخت امتحان سے آپ وہاں گزرے تھے۔

جب صبح ہوئی تو آپ نے لوگوں کو اس واقعہ کی خبر دی، قریش نے اس پر

---

[1] دیکھئے سورۂ اسراء و سورۂ نجم و کتب حدیث و سیرت، واقعۂ معراج کی حقیقت اور اس کے اسرار و حکم کے سمجھنے کے لئے حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ حصہ دوم "الاسراء الی المسجد الاقصیٰ ثم الی سدرۃ المنتہیٰ" کا مطالعہ کیا جائے۔

بہت تعجب کا اظہار کیا، اس کو ایک محال اور ناممکن امر قرار دیا، اور آپ کو جھٹلایا اور مذاق اڑایا، حضرت ابوبکرؓ نے یہ سن کر کہا کہ اگر آپؐ نے ایسی بات کہی ہے تو سچ کہی ہے، تم کو اس پر تعجب کیوں ہے؟ خدا کی قسم آپ مجھے یہ خبر دیتے ہیں، وحی آپؐ کے پاس دن رات کے کسی حصہ میں آسمان سے زمین تک آجاتی ہے، تو میں آپ کی تصدیق کرتا ہوں، یہ تو اس سے بھی مشکل اور بعید ہے جس پر تم لوگ تعجب کر رہے ہو۔[1]

معراج کے بلند و لطیف مطالب و معانی

واقعۂ معراج محض ایک جزئی و ضمنی واقعہ نہ تھا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالے کی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرایا گیا اور آسمان و زمین کی بادشاہت بے پردہ و بے حجاب ہو کر آپؐ کے سامنے آگئی، نبوت کے اس غیبی و آسمانی سفر میں اس کے علاوہ بھی بہت بلند و لطیف مطالب و معانی پوشیدہ ہیں، اور اس میں بہت دور رس اشارات کئے گئے ہیں، یہ دونوں سورتیں، سورۂ اسراء اور سورۂ نجم، جو واقعۂ معراج کے سلسلہ میں نازل ہوئیں، یہ اعلان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دونوں قبلوں (مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ) کے نبی اور دونوں سمتوں مشرق و مغرب کے امام، اور اپنے پیش رو تمام انبیاء کرام کے وارث اور بعد میں آنے والی پوری نسلِ انسانی کے رہبر و رہنما ہیں، آپ کی شخصیت اور آپؐ کے سفرِ معراج میں مکہ بیت المقدس سے اور مسجدِ حرام مسجدِ اقصیٰ سے ہم آغوش ہو گئی، آپؐ کی امامت میں تمام انبیاء نے نماز پڑھی اور یہ دراصل آپؐ کے پیغام و دعوت کی عمومیت و آفاقیت آپؐ کی امامت کی

---

[1] سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۹۶ و سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۹۹

ابدیت، اور ہر طبقۂ انسانی کے لئے آپ کی تعلیمات کی ہمہ گیری و صلاحیت کی دلیل و علامت تھی۔

یہ واقعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا صحیح تعارف اور اس کی صحیح نشان دہی، آپ کی امامت و قیادت کا بیان، آپ کی اس اُمّت (جس میں آپ مبعوث ہوئے) کے اصل مقام و حیثیتِ عرفی کا تعیّن اور اس پیغام و دعوت اور مخصوص کردار کی پردہ کشائی کرتا ہے، جو اس اُمّت کو اس وسیع و عریض دنیا اور عالمی برادری میں انجام دینا ہے۔

واقعۂ معراج دراصل ایک محدود، مقامی اور عارضی نوعیت، اور نبوّت کی ابدی اور عالم گیر شخصیت کے درمیان خطِّ فاصل اور امتیازی لکیر کی حیثیت رکھتا ہے، اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، کوئی قومی یا مقامی لیڈر، کوئی ملکی و وطنی رہنما، کسی خاص نسل کے نجات دہندہ اور کسی نئی شوکت و عظمت کے بانی ہوتے تو آپ کو اس معراجِ آسمانی کی ضرورت نہ تھی، اس کے لئے آپ کو نہ آسمان و زمین کی وسیع بادشاہت کے سیر و مشاہدہ کی حاجت تھی، نہ اس کی ضرورت تھی کہ آپ کے ذریعہ آسمان و زمین کا یہ نیا تعلق قائم ہو، اس وقت آپ کی یہ سرزمین، یہ ماحول اور یہ سوسائٹی آپ کے لئے کافی ہوتی، اس کو چھوڑ کر آپ کو کسی اور خطّۂ زمین کی طرف توجہ کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی، نہ کہ بلند آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچنے کی یا مسجدِ اقصیٰ تشریف لے جانے کی جو آپ کے شہر سے بہت دور اور عیسائی مذہب اور طاقتور رومن شہنشاہی کے زیرِ اقتدار تھا۔

واقعۂ معراج یہ اعلان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان قومی اور سیاسی رہنماؤں کی صف سے کوئی تعلق نہیں رکھتے جن کی صلاحیتوں اور

کوششوں کا دائرہ ان کے ملک یا ان کی قوم تک محدود رہتا ہے، اور ان سے صرف انھیں نسلوں اور قوموں کو فائدہ پہونچتا ہے، جن سے ان کا تعلق ہوتا ہے اور اسی ماحول تک ان کا اثر باقی رہتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتے ہیں، آپ جس گروہ اور جماعت سے تعلق رکھتے ہیں وہ خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کی صف ہے جو آسمان کا پیغام زمین والوں کو اور خالق کا پیغام مخلوق کو پہونچاتے ہیں، اور ان سے پوری نوع انسانی، (زمانہ و تاریخ، رنگ و نسل اور ملک و قوم سے قطع نظر) سرفراز و سربلند ہوتی ہے، اور اس کی قسمت جاگتی ہے۔

نماز کی فرضیت

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ پر اور آپ کی امت پر پچاس۵۰ وقتوں کی نماز فرض فرمائی اور آپ برابر اس میں تخفیف کا سوال کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دن و رات میں پانچ۵ وقت تک محدود کر دیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ جو ایمان و احتساب کے ساتھ یہ نمازیں پڑھے گا اس کو اجر پچاس۵۰ نمازوں ہی کا ملے گا۔[۱]

قبائلِ عرب کو دعوتِ اسلام

اب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حج کے موسم میں قبائلِ عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنی شروع کی اور ان سے حمایت و نصرت کے خواستگار ہوئے آپؐ نے ان سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا کہ "اے بنی فلاں! میں تمھاری طرف اللہ کا رسول

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب (کیف فرضت الصّلاۃ)

بنا کر بھیجا گیا ہوں جو تم کو اللہ کی عبادت کا حکم دیتا ہے، اور اس کا حکم دیتا ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اُن تمام ہستیوں سے جن کو تم نے اس کا ہمسر بنا لیا ہے، اور ان کی عبادت کرتے ہو، قطع تعلق کرلو، اس پر ایمان لاؤ اور اس کی تصدیق کرو، اور میری اس وقت تک حفاظت کرو جب تک اللہ نے جو چیز لے کر مجھے بھیجا ہے وہ میں اچھی طرح کھول کر بیان نہ کردوں"!

جب آپ اپنی بات فرما چکے تو ابولہب کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اے بنی فلاں! یہ تم کو اس بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ تم لات وعُزّیٰ کی بندگی و وفاداری کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکو اور اپنے مددگار جنوں سے بھی ترکِ تعلق کر کے اس بدعت و گمراہی کو اختیار کرلو جو وہ لائے ہیں، اس لئے تم نہ ان کی بات ماننا اور نہ ان کی سننا۔[1]

اسلام کا راستہ

یہ راستہ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی طرف جاتا تھا، کانٹوں سے اور ہر قسم کے اندیشوں اور خطرات سے بھرا ہوا تھا، جس پر اپنی جان کا خطرہ مول لئے بغیر چلنا اور منزلِ مقصود تک پہونچنا ممکن نہ تھا۔

حضرت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے مکہ تک پہونچنے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ مبارک میں حاضر ہونے اور قبول اسلام کا جو واقعہ بیان کیا ہے، اس سے اس پر روشنی پڑتی ہے، وہ کہتے ہیں:-

"جب ابوذرؓ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱/ ص ۴۲۲-۴۲۳

اپنے بھائی سے کہا کہ تم اس وادی میں جاؤ اور ذرا ان صاحب کا کچھ پتہ لگاؤ جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے اُن کی گفتگو سنو اور پھر مجھے آکر بتاؤ، وہ روانہ ہوئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملے آپ کی بات سنی پھر واپس جاکر ابوذر رضی اللہ عنہ سے یہ کہا کہ میں نے دیکھا کہ وہ بہت پسندیدہ واعلیٰ ترین اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں اور ایسا کلام میں نے سنا جو شعر نہیں کہا جاسکتا، انھوں نے کہا کہ میں جو کچھ جاننا چاہتا تھا اس میں میری تشفّی نہیں ہوئی، پھر انھوں نے خود سفر کی تیاری کی اور پانی کا مشکیزہ لے کر روانہ ہوئے، مکہ پہونچے، حرم شریف میں پہونچ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرنا شروع کیا، وہ آپؐ کو پہچانتے نہ تھے اور کسی سے دریافت کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے، اسی تلاش میں رات ہوگئی، اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان کو دیکھا، اور ان کو اندازہ ہوگیا کہ یہ کوئی نو وارد اور مسافر ہے، وہ ان کے پیچھے ہو لئے، لیکن کسی نے ایک دوسرے سے کچھ نہ پوچھا جب صبح ہوئی تو وہ اپنا مشکیزہ اور زادِ راہ لے کر پھر اسی مسجد میں پڑ گئے اور یہ دن بھی اسی طرح گزر گیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو دیکھا، اسی پر شام ہوئی، وہ پھر اپنے سونے کی جگہ چلے گئے، اس وقت حضرت علیؓ ان کے قریب سے گزرے، اور یہ کہا کہ کیا ابھی تک اس مسافر کے لئے یہ وقت نہیں آیا کہ اس کو اپنی منزلِ مقصود معلوم ہو، تیسرے روز حضرت علیؓ اسی طرح ان کے پاس پہونچے، ان کو اٹھایا اور کہا کہ تم

مجھے بتاؤ گے نہیں کہ کیا چیز تمھیں یہاں لائی ہے؟ انھوں نے کہا، اگر تم مجھ سے اس کا وعدہ اور عہد کرو کہ میری رہنمائی کروگے تو میں بتا سکتا ہوں، جب انھوں نے یہ وعدہ کیا تو وہ ان کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئے وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہونچے تو یہ بھی ان کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوئے، آپ کی بات سنی اور اسی جگہ مسلمان ہو گئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اپنی قوم میں واپس جاؤ اور یہ دعوت ان لوگوں کو پہونچاؤ یہاں تک کہ میری بات اچھی طرح ظاہر ہو جائے، انھوں نے کہا کہ اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں ان کے درمیان چیخ چیخ کر یہ دعوت دوں گا، پھر نکل کر مسجد حرام میں آئے اور اعلان کیا " اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدًا رسول اللہ" یہ سن کر لوگوں نے انھیں گھیر لیا، اور اتنا مارا کہ بے دم ہو کر زمین پر لیٹ گئے، اتنے میں حضرت عباس آئے، ان کو جھک کر دیکھا، اور لوگوں سے کہا، کہ تم جانتے نہیں کہ یہ قبیلہ "غِفار" سے تعلق رکھتے ہیں اور تمھارے تاجروں کا راستہ جو شام تک جاتا ہے اسی قبیلہ سے ہو کر گزرتا ہے، پھر انھوں نے ان کو بچایا، دوسرے دن بھی انھوں نے یہی کیا، اور لوگوں نے اشتعال میں آکر ان کو زدوکوب کیا اور حضرت عباس نے آکر ان کی مدد کی۔[1]

---

[1] بخاری شریف (باب اسلام ابی ذر رضی اللہ عنہ)۔

انصار کے قبولِ اسلام کا آغاز

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حج کے زمانہ میں تبلیغِ اسلام کی مہم پر روانہ ہوئے "عقبہ"[۱] کے پاس انصار کے قبیلۂ خزرج کے کچھ لوگ آپ کو ملے آپؐ نے ان کو اللہ کی طرف دعوت دی، اسلام ان کے سامنے پیش کیا، اور قرآن مجید کی تلاوت کی، یہ لوگ مدینہ میں یہودیوں کے پڑوس میں رہتے تھے، اور ان سے یہ سنتے رہتے تھے کہ قریبی زمانہ میں کوئی نبی آنے والا ہے، وہ آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ واللہ یہ وہی نبی معلوم ہوتے ہیں، جن کی خبر تم کو یہود دیتے تھے، دیکھو اب کوئی اس میں تم سے سبقت نہ لے جائے، چنانچہ انھوں نے اسی وقت آپؐ کی تصدیق کی، اور آپؐ سے یہ عرض کیا کہ ہم اپنی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں، اور اس قوم میں جتنا شر و فساد اور تفرقہ ہے اتنا کسی اور قوم میں نہیں ہے، شاید آپ کے ذریعہ اللہ ان کو متحد کر دے، ہم وہاں جا کر ان کو اس معاملہ سے آگاہ کریں گے اور اس کی دعوت دیں گے، آپؐ بھی ان پر وہ چیز پیش کریں جس کو ہم نے قبول کیا ہے، اگر اللہ تعالےٰ ان کو آپؐ پر متحد کر دے تو آپؐ سے زیادہ عزت والا پھر کوئی نہ ہوگا۔[۲]

وہ ایمان لانے کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے، جب مدینہ پہونچے تو اپنے دوسرے بھائیوں سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا، اور ان کو بھی اسلام کی

---

[۱] عقبہ کے معنی گھاٹی کے ہیں، یہ منیٰ کے پہاڑوں کے اس کنارے پر جس کا رخ مکۂ مکرمہ کی طرف ہے ایک پہاڑی جزء میں ذرا آنکھ کھنے والی جگہ تھی جس کا جائے وقوع جمرۃ الکبریٰ کے پاس ہی تھا غالباً اسی وجہ سے جمرۃ الکبریٰ کو جمرۃ العقبہ بھی کہتے ہیں، عقبہ کی یادگار کے طور پر اس کی جگہ پر بعد میں ایک مسجد بھی تعمیر کر دی گئی تھی [۲] سیرت ابن ہشام ج ۱/ ص ۴۲۸-۴۲۹

دعوت دی، یہاں تک کہ ان کی قوم اور برادری میں اسلام کی خوب اشاعت ہوئی اور انصار کا کوئی گھر ایسا نہ بچا جہاں آپؐ کا چرچا نہ ہو۔[1]

بیعت عقبۂ اولیٰ

دوسرا سال ہوا اور حج کا موقع آیا تو انصار کے بارہ[12] آدمی آپؐ سے بیعت عقبۂ اولیٰ کے موقع پر ملے اور آپؐ کے دستِ مبارک پر چوری، زنا، قتلِ اولاد سے پرہیز کرنے، اچھی باتوں میں اطاعت کرنے اور توحید پر بیعت کی، جب انھوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ مصعبؓ بن عُمیر کو کر دیا اور ان کو ہدایت کی کہ ان کو قرآن مجید پڑھائیں، اسلام کی تعلیم دیں اور دین کے مسائل سے باخبر کریں، چنانچہ ان کو مدینہ میں، مُقرِئی (پڑھانے والا) کہا جاتا تھا، وہ اسعد بن زُرارہ کے ہاں مہمان ہوئے تھے، اور وہاں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔[2]

انصار کے قبولِ اسلام کا اصل سبب

اللہ تعالیٰ کا کرنا کہ ایسے نازک وقت میں اس نے اپنے رسول اور اپنے دین کی نصرت وحمایت کے لئے اوس وخزرج[3] کو کھڑا کر دیا (یہ یثرب کے دو بہت بڑے اور اہم عرب قبیلے تھے) اور ان کو اس کا زرّیں موقع نصیب فرمایا کہ وہ اس نعمت کی،

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱/ ص ۴۲۸-۴۲۹ [2] ایضاً ص ۴۳۴ باختصار [3] اوس وخزرج أَزْد کے دو قبیلے تھے جو قحطان کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، ان کے مورثِ اعلیٰ ثعلبہ بن عمر و سدِّ مَارب (یمن) کی تباہی و بربادی کے بعد (۱۲۰ سنہ قبل مسیح میں) حجاز منتقل ہوئے پھر مدینہ کو اپنا مستقر بنایا جیسا کہ آگے اس کی تفصیل آئے گی۔

جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نعمت نہیں، قدر کریں اور اسلام کے استقبال اور قبولیت میں اپنے ہم عصروں اور اہلِ حجاز پر سبقت لے جائیں اور اس وقت اس دین کو اپنے سینہ سے لگائیں، بلکہ اس کے لئے سینہ سپر ہو جائیں، جب سب قبائلِ عرب اور بخصوصیت سے قریش نے اس سے بالکل آنکھیں پھیر لی تھیں "وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" (اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے سیدھے راستہ کی رہنمائی فرماتا ہے۔)

مختلف اسباب وعوامل نے جو دراصل اللہ تعالیٰ کی حکمت ومشیت پر مبنی تھے، اور ان کا مقصد اسلام کی اشاعت اور غلبہ کے لئے راستہ ہموار کرنا تھا، اوس وخزرج کو اس سعادتِ عظمیٰ کے لئے تیار کر دیا تھا، ان میں اور قریش میں کئی باتیں مابہ الامتیاز تھیں، اوس وخزرج کے یہ قبائل قریشِ مکہ کے برخلاف نرم مزاج اور نرم دل، اور انتہا پسندی، تشدد، تکبر اور انکارِ حق جیسے رذائل سے پاک تھے، ان صفات کا تعلق ان نسلی ونسبی خصوصیات سے تھا جن کی طرف اشارہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یمن کے ایک وفد سے ملنے کے بعد فرمایا تھا، ارشاد ہوا تھا کہ "أتاکم اھل الیمن أرق أفئدۃ وألین قلوبًا" (تمہارے پاس اہلِ یمن آئے ہیں جو بہت نرم وگداز دل رکھنے والے ہیں) یہ دونوں قبیلے اپنی اصل میں یمن ہی سے وابستہ تھے زمانۂ قدیم میں ان کے آباو اجداد وہیں سے یہاں منتقل ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:۔

وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ	اور (ان لوگوں کے لئے بھی) جو
مِنْ قَبْلِھِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ	مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر
اِلَیْھِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِھِمْ	(یعنی مدینہ) میں مقیم اور ایمان میں

حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ (سورۂ حشر-۹)

(مستقل) رہے اور جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش اور خلش نہیں پاتے اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔

اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ باہمی خانہ جنگیوں اور مستقل لڑائیوں نے ان کو چور چور کر دیا تھا، بُعاث کی جنگ پر ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، اس کی تلخ کامیوں سے ابھی ان کے کام و دہن پوری طرح آشنا تھے، اور اب ان کے اندر اتحاد، صلح و صفائی اور جنگ سے بچنے کی یک گونہ خواہش پیدا ہو گئی تھی، ان کے یہ الفاظ اس صورتِ حال کی ترجمانی اور ان کی اندرونی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں "ہم اپنی قوم کو چھوڑ کر آئے ہیں، کسی قوم میں اتنا شر و فساد اور باہمی عداوت نہیں جتنی ان کے درمیان ہے، شاید اللہ آپ کے ذریعہ ان کو یکجا کر دے، اگر اللہ تعالیٰ ان کو متحد کر دے گا، تو پھر آپ سے زیادہ باعزت کوئی نہ ہوگا" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، بُعاث کی جنگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک تائیدِ غیبی اور مدینہ کی ہجرت و نصرت کی ایک تمہید تھی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ قریش اور بقیہ تمام عربوں کا تعلق نبوت اور انبیاء سے بہت طویل عرصہ سے منقطع تھا، اور بُعدِ زمانہ کی وجہ سے وہ اس کے مطلب و مفہوم سے

بالکل ناآشنا ہو گئے تھے، ان کی جہالت اور ناخواندگی نقطۂ عروج کو پہونچ گئی تھی، بُت پرستی میں ان کو حد درجہ غلو وانہماک تھا، وہ ان اقوام وملل (یہودی وعیسائی) سے بہت دور تھے، جو اپنا انتساب ان انبیاء کی طرف کرتے تھے، اور آسمانی صحیفوں کے (خواہ محرّف ومسخ شدہ شکل ہی میں سہی) حامل اور علمبردار تھے، اللہ تعالےٰ نے آیت مندرجہ ذیل میں اسی تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اُنۡذِرَ اٰبَآؤُهُمۡ فَهُمۡ غٰفِلُوۡنَ۔ (سورۂ یٰسین۔٦)	تاکہ تم ان لوگوں کو جن کے باپ دادا کو متنبہ نہیں کیا گیا تھا متنبہ کردو، وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس کے برخلاف اوس وخزرج، یہود کو نبوّت اور انبیاء کے بارے میں آپس میں گفتگو کرتے اور توریت کی تلاوت کرتے ہوئے برابر دیکھتے اور سنتے تھے، بلکہ یہودی اکثر ان کو خبر دیا کرتے تھے کہ آخر زمانہ میں ایک نبی مبعوث ہوگا ہم اس کے ساتھ مل کر تم کو اس طرح قتل کریں گے جس طرح عاد اور ارم قتل کئے گئے[1]، ان ہی کی بابت اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَلَمَّا جَآءَهُمۡ كِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ ۙ وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ ۚ	اور جب خدا کے ہاں سے ان کے پاس کتاب آئی جو ان کی آسمانی کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے اور وہ پہلے (ہمیشہ) کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے تو جس چیز کو وہ خوب پہچانتے

[1] تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۲۱۷

فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ تھے جب ان کے پاس آپہنچی تو اس سے کافر ہو گئے، پس کافروں پر خدا کی لعنت.
(سورۂ البقرہ - ۸۹)

اوس و خزرج اور مدینہ کے قدیم باشندے جو عقیدۃً مشرک و بُت پرست تھے، دینی حقائق و اصطلاحات (نبوت و رسالت، وحی و الہام، حشر و نشر و آخرت) اور سنّتِ الٰہی سے اِس قدر نابلد و ناآشنا اور نامانوس و اجنبی نہ تھے، جتنے کہ قریش مکّہ اور ان کے ہم سایہ قبائل مرورِ زمانہ سے ہو گئے تھے' اس لئے کہ اوس و خزرج زمانۂ دراز سے یہودیوں کے ساتھ رہنے بسنے کی وجہ سے ان دینی حقائق و اصطلاحات اور انبیائے کرام کے ناموں اور حسنہ حسنہ حالات، مختلف زمانوں میں انبیاء کی بعثت اور ہدایت کے آسمانی نظام سے واقف ہو گئے تھے' ان کا دن رات یہودیوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا، جو اہلِ کتاب تھے، صلح و جنگ' عہد و معاہدہ اور تجارت و زراعت کے بھی تعلقات تھے' اس لئے جب اوس و خزرج سے تعلق رکھنے والے مدینہ کے ان باشندوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا علم ہوا' اور وہ حج کے موقع پر مکّہ آئے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس ان کو اسلام کی دعوت دی تو ایسا معلوم ہوا کہ اچانک ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا اور گویا وہ پہلے سے اس کے لئے تیار تھے.

یثرب کی خصوصیات اور اس کے انتخاب کی حکمتیں

مدینہ کے دار الہجرت اور مرکز دعوتِ اسلامی کی حیثیت سے انتخاب میں اہلِ مدینہ کے اکرام و عزّت افزائی، نیز اُن اسرار کی وجہ سے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ایک حکمت یہ بھی تھی کہ مدینہ کو جنگی اور جغرافیائی نقطۂ نظر سے ایک مستحکم قلعہ کی حیثیت

حاصل تھی۔

جزیرۃ العرب کا کوئی اور قریب کا شہر اس معاملہ میں اس کا ہمسر نہ تھا، حرۃ الوبرہ[1] مغربی جانب سے مدینہ کو اپنی حفاظت میں لئے ہوئے تھا، حرۃ واقم مشرقی سمت سے اس کو گھیرے ہوئے تھا، مدینہ کا شمالی حصہ واحد راستہ تھا جو کسی پیش قدمی کے لئے کھلا تھا (یہ وہی علاقہ ہے جہاں ۵ھ ہجری میں غزوۂ احزاب کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق تیار کرنے کا حکم دیا تھا) مدینہ کی دوسری جہتیں کھجور کے گھنے باغات یا کھیتوں سے گھری ہوئی تھیں، اگر کسی حملہ آور فوج کو اس سے گزرنا ہوتا تو اس کے راستہ میں ایسے تنگ راستے اور پگڈنڈیاں پڑتی تھیں جن کو پوری صف آرائی اور فوجی ڈسپلن کے ساتھ عبور کرنا آسان کام نہ تھا، اور معمولی فوجی چوکیاں اس پیش قدمی میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے کافی تھیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں "مدینہ کے ایک طرف کا حصہ یا راستہ کھلا ہوا تھا، بقیہ تمام سمتیں اور جہتیں آبادی اور کھجور کے باغات کی وجہ سے ایک دوسرے سے مل گئی تھیں اور کوئی دشمن اس میں سے ہو کر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔"

---

[1] حرۃ یا لابہ سیاہ پھیلے ہوئے اور آڑے ترچھے پتھروں کے علاقہ کو کہتے ہیں، یا اس حصہ کو جو آتش فشاں کے لاوا بہنے اور کسی جگہ جمع ہونے سے وجود میں آیا ہو، اس علاقہ میں اونٹوں اور گھوڑوں کا چلنا یا کسی لشکر کا گذرنا تو درکنار کسی ایک شخص کا پیدل چلنا بھی دشوار ہے، علامہ مجد الدین فیروز آبادی (م ۸۲۳ھ) نے اپنی کتاب "المغانم المطابہ فی معالم طابہ" میں حرف الحاء کے ضمن میں بہت سے حرات کا ذکر کیا ہے، جو مختلف جہتوں سے مدینہ کا احاطہ کرتے ہیں، بعض جگہ بہت قریب کسی جگہ کچھ دور، یہ اس کی بیرونی حملوں سے حفاظت کرتے ہیں یا کم از کم لشکر کی نقل و حرکت میں رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں، دیکھئے کتاب مذکور (ص ۱۰۵ تا ۱۱۴)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ کے انتخاب میں شاید خدا کی اسی حکمت و مصلحت کی طرف ہجرت سے قبل اشارہ فرمایا تھا، اور یہ ارشاد ہوا تھا کہ "مجھے تمہارا دار الہجرت دکھایا گیا ہے، یہ کھجور کے باغات والا علاقہ ہے اور "لابتین" وہ جلے ہوئے، بے ترتیب پتھروں والے دو علاقوں (لابتین) کے درمیان واقع ہے" اسی کے بعد جس کو ہجرت کرنا تھی اس نے مدینہ ہجرت کی۔[۱]

مدینہ کے یہ دو قبیلے جو اوس و خزرج کے نام سے مشہور تھے، غیرت قومی، خودداری، شہسواری اور قوت و مردانگی میں ممتاز تھے، یہ آزادی کے خوگر اور عادی تھے، انھوں نے نہ کسی کے سامنے کبھی اپنا سر جھکایا تھا، نہ کسی بڑے قبیلہ یا حکومت کو ٹیکس اور تاوان ادا کیا تھا، اس کی صراحت "اوس" کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ، کے اس جملہ میں موجود ہے جو انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے غزوۂ خندق کے موقع پر عرض کیا تھا، "جب ہم اور یہ شرک و بت پرستی میں مبتلا تھے، نہ ہم اللہ کی عبادت کرتے تھے نہ اس کو پہچانتے تھے، اس وقت بھی یہ مجال نہ تھی کہ مہمان داری یا قیمت دیئے بغیر یہ مدینہ کی ایک کھجور کھالیں۔[۲]"

"ابن خلدون" لکھتے ہیں :-

"یہ دونوں قبیلے یا برادریاں یثرب میں یہود پر غالب تھیں، اور عزت و وقار، اور شان و شوکت میں نام پیدا کئے ہوئے تھیں، ان کے قریب جو مُضَر کے قبائل آباد تھے، وہ بھی ان ہی کی ملت میں تھے۔[۳]"

---

[۱] صحیح بخاری (باب ہجرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم) [۲] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۳ [۳] تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۲۸۹

مشہور عرب مصنف ابن عبدربہ "العقد الفرید" میں لکھتے ہیں:-

"انصار قبیلۂ اَزْد سے ہیں، یہ اَوس و خزرج کہلاتے ہیں، حارثہ بن عمرو بن عامر کے دو بیٹوں سے ان کی نسل چلی ہے، یہ لوگ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خوددار اور سب سے زیادہ عالی حوصلہ تھے، اور کسی بادشاہ یا حکومت کے باج گذار نہیں رہے۔[1]"

اس کے علاوہ بنی ہاشم کا بنی عدی بن النجّار سے ننھیالی تعلق تھا، ہاشم نے ان کی ایک خاتون سلمٰی بنت عمرو سے شادی کی تھی۔

ہاشم کے ایک فرزند عبدالمطلب پیدا ہوئے، ہاشم نے اُن کو ماں کے پاس چھوڑ دیا، جب یہ کچھ بڑے ہوئے اور بالغ ہونے کے قریب ہوئے تو اُن کو اُن کے چچا مکہ لے آئے عرب کی سماجی زندگی میں رشتہ داریوں، اور قرابتوں کی بڑی اہمیت تھی، اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، ان ہی میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے جن کے گھر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہونچ کر قیام فرمایا۔

اوس و خزرج قحطان کی نسل سے تھے، مہاجرین اور جو لوگ مکّہ اور اس کے اطراف میں ان سے قبل اسلام لا چکے تھے، وہ عدنان کی نسل سے تھے، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کی اور انصار نے آپ کی حمایت و نصرت کی تو اس ذریعہ سے عدنان اور قحطان دونوں پرچمِ اسلام کے نیچے جمع ہو گئے اور ایک جان دو قالب بن گئے، عہد جاہلیت میں ان کے درمیان بڑی کش مکش اور رقابت تھی، اسلام کی برکت سے شیطان کو ان کی صفوں میں گھسنے اور وسوسہ

---

[1] العقد الفرید ج ۳ ص ۳۳۴

اندازی کا راستہ نہ مل سکا، اور جاہلی حمیّت اور قحطانیت اور عدنانیت پر بے جا تعصّب اور فخر و مباہات کا موقع جاتا رہا۔

ان تمام عوامل و اسباب اور ترجیحی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے یثرب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کرام کی ہجرت کے لئے مناسب ترین جگہ تھی، یہ شہر اس کا مستحق تھا کہ اس کو اسلامی دعوت کا مستقر و مرکز بنایا جائے یہاں تک کہ اسلام کو پوری قوت و استحکام حاصل ہو اس کے اندر پیش قدمی کرنے کی صلاحیت و طاقت پیدا ہو جائے اور وہ جزیرۃ العرب کو فتح کر سکے اور پھر اس وقت کی پوری متمدن دنیا پر اپنا پرچمِ ہدایت لہرا سکے۔

مدینہ میں اسلام کا فروغ

اب انصار (یعنی اوس و خزرج) کے گھرانوں میں اسلام کی اشاعت شروع ہوئی، پہلے سعد بن معاذ، اُسَید بن حُضَیر جو اَوس کی شاخ بنی الاشہل سے تعلق رکھتے تھے، اور اپنی قوم کے سردار تھے، اسلام لائے، اس میں بڑا دخل ان پہلے مسلمان ہونے والوں کی حکمتِ ایمانی اور تلطّف و مہربانی اور مصعب بن عمیرؓ کے حسنِ تبلیغ و دعوت کو تھا، اس کے بعد بنی عبد الاشہل نے بھی اسلام قبول کیا، اور بالآخر انصار کے گھروں میں سے کوئی گھر ایسا باقی نہ بچا جہاں کچھ مرد اور عورتیں مسلمان نہ ہوں[1]۔

بیعت عقبۂ ثانیہ

دوسرے سال مُصْعَب بن عمیرؓ مکہ واپس ہوئے اور انصار کے کچھ مسلمان

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۳۶ - ۴۳۸ باختصار۔

مشرکین کی ایک جماعت کے ساتھ جو حج کی غرض سے جارہی تھی مکہ پہونچے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عقبہ میں بیعت کا وعدہ کیا، جب وہ حج سے فارغ ہوئے اور ایک تہائی رات گذر گئی تو وہ عقبہ کے نزدیک ایک گھاٹی میں جمع ہوئے، ان سب کی تعداد تہتر (۷۳) تھی جن میں دو عورتیں بھی شامل تھیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، آپ کے ساتھ آپ کے چچا عباس ابن عبدالمطلب بھی تھے، وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے گفتگو فرمائی، قرآن مجید اُن کو پڑھ کر سنایا، ان کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دی اور اسلام قبول کرنے کا شوق دلایا، پھر آپ نے فرمایا کہ میں تم سے اس پر بیعت لیتا ہوں کہ تم میرے ساتھ حفاظت وخیال کا وہی معاملہ کروگے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ کرتے ہو، انھوں نے آپ سے بیعت کی، اور آپ سے یہ عہد لیا کہ آپ انھیں بے یار ومددگار نہ چھوڑیں گے اور نہ اپنی قوم کی طرف واپس ہو جائیں گے، آپ نے ان سے وعدہ کیا اور فرمایا کہ میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو جس سے تم جنگ کروگے اس سے میں بھی جنگ کروں گا، جس سے تم صلح کروگے اس سے میں بھی صلح کروں گا، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے بارہ ذمہ داروں اور سرداروں کا انتخاب کیا، نو خزرج کے اور تین اوس کے۔[1]

مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت

جب انصار کے اس قبیلہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرلی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۴۱ - ۴۴۴

اور آپ اور آپ کے ماننے والوں کی حمایت و مدد کا عہد کیا تو بہت سے مسلمان ان کی پناہ میں آگئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان تمام مسلمانوں کو جو آپ کے ساتھ مکّہ میں تھے، مدینہ کی طرف ہجرت کرنے اور انصار سے مل جانے کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ "اللہ عزّوجل نے تمھارے لئے کچھ بھائی اور گھر بار مہیا کر دیئے ہیں جہاں تم امن کے ساتھ رہ سکتے ہو" یہ سن کر لوگ جماعتیں بنا بنا کر ہجرت کرنے لگے، خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکّہ میں ٹھہر کر ہجرت کے بارہ میں حکمِ الٰہی کے منتظر رہے۔

مکّہ سے مسلمانوں کی ہجرت کوئی ہنسی کھیل نہ تھا جس کو قریش ٹھنڈے کلیجے برداشت کر لیتے، انھوں نے اس انتقالِ آبادی اور نقل و حرکت کے راستہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور مہاجرین کو مختلف آزمائشوں اور تکلیفوں میں ڈالنا شروع کیا، لیکن مہاجرین بھی اس رائے کو بدلنے والے اور اپنا قدم پیچھے ہٹانے والے نہ تھے، وہ کسی قیمت پر بھی مکّہ میں رہنا پسند نہ کرتے تھے، چنانچہ کسی کو اپنی بیوی اور بچّہ کو مکّہ میں چھوڑ کر تنہا جانا پڑا، جیسا کہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا، کسی نے اپنی زندگی بھر کی کمائی ہوئی پونجی سے ہاتھ دھوئے جیسا کہ صہیب رضی اللہ عنہ نے کیا۔

ام سلمہ رضی اللہ عنہا خود روایت کرتی ہیں کہ جب ابو سلمہؓ نے مدینہ ہجرت کا پختہ عزم کر لیا تو سفر کے لئے اپنا اونٹ تیار کیا، مجھ کو اس پر سوار کرایا اور میرے لڑکے سلمہ بن ابی سلمہ کو میری گود میں دے دیا پھر اونٹ کی نکیل ہاتھ میں لی اور روانہ ہوئے جب بنی المغیرہ کے کچھ لوگوں کی نظر ان پر پڑی تو وہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ تمھاری حد تک ٹھیک ہے تم اپنے کو بچا کر جا سکتے ہو، ان بی بی کو ہم تمھاری ہمرکابی کے لئے کیسے چھوڑ سکتے ہیں، وہ بیان کرتی ہیں کہ یہ کہہ کر انھوں نے اونٹ کی نکیل ان کے

ہاتھ سے چھین لی اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے، یہ دیکھ کر بنو عبدالاسد میں جو ابو سلمہ کے حمائتی تھے سخت اشتعال پیدا ہوا، انھوں نے کہا خدا کی قسم تم نے ان کو ہمارے بھائی سے چھین لیا ہے لیکن ہم اپنے لڑکے کو اب ان کے پاس ہرگز نہیں چھوڑیں گے، اس کے بعد دونوں میں میرے بچّہ پر کشاکش شروع ہوگئی اور دونوں اس کو اپنی طرف کھینچنے لگے حتیٰ کہ اس کا ہاتھ اکھڑ گیا، بنو عبدالاسد اس کو چھین لینے میں کامیاب ہوگئے اور اس کو اپنے ساتھ لے گئے، بنو المغیرہ نے مجھے اپنی قید میں کر لیا، میرے شوہر مدینہ روانہ ہو چکے تھے، اس طرح میرے لڑکے میرے شوہر اور میں، تینوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے، میں ہر صبح کو باہر آتی اور "ابطح" میں بیٹھ جاتی اور شام تک روتی رہتی، اس پر پورا ایک سال گزر گیا، ایک دن بنو المغیرہ ہی میں سے میرے چچا زاد بھائیوں میں سے ایک بھائی کی مجھ پر نظر پڑی اور میری اس حالت کو دیکھ کر اسے رحم آیا اور اس نے بنو المغیرہ سے کہا کہ اس غریب کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے، تم نے اس کو شوہر اور بیٹے دونوں سے محروم کر دیا ہے؟ وہ کہنے لگے، اگر تمہارا دل چاہے تو اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ، اس وقت بنو عبدالاسد نے میرا لڑکا مجھے واپس کیا، میں نے اپنا اونٹ تیار کیا، بچّہ کو گود میں لیا اور مدینہ میں اپنے شوہر کی تلاش کے لئے چل کھڑی ہوئی، اس حالت میں کہ اللہ کا کوئی بندہ میرے ساتھ نہ تھا، جب میں "تنعیم" تک پہونچی تو میری ملاقات عثمان بن طلحہؓ سے ہوگئی، جو بنی عبدالدار میں سے تھے، وہ دیکھتے ہی بولے، ابی اُمیّہ کی لڑکی! کہاں جارہی ہو؟ میں نے کہا مدینہ میں اپنے شوہر کے پاس جانا چاہتی ہوں انھوں نے کہا، تمھارے ساتھ کوئی ہے؟ میں نے جواب دیا میرے ساتھ اللہ کے سوا اور اس بچّہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، کہنے لگے، خدا کی قسم تمھیں منزل پر پہونچایا

آسان نہیں ہے، انھوں نے اونٹ کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے لی، اور مجھے لے کر آگے روانہ ہوئے، خدا کی قسم جن لوگوں سے اب تک میرا واسطہ پڑا ہے میں نے کسی کو بھی ان سے زیادہ شریف اور کریم النفس نہیں پایا، جب کوئی منزل آتی اور رکنا پڑتا تو وہ اونٹ کو بٹھا کر علیحدہ ہٹ جاتے، جب میں اتر آتی تو اونٹ کے پاس آکر سامان اتارتے پھر ایک درخت سے اس کو باندھتے پھر کسی درخت کے سایہ میں لیٹ جاتے جب شام ہوتی اور روانگی کا وقت آتا تو اٹھتے، اونٹ کو تیار کرتے سامان وغیرہ اس کے اوپر لادتے پھر وہاں سے کچھ دور ہٹ جاتے اور مجھ سے کہتے کہ بیٹھ جاؤ جب میں اچھی طرح بیٹھ جاتی تو آکر اس کی نکیل تھام لیتے اور اسی طرح دوسری منزل تک پہونچتے، اسی طرح کرتے ہوئے انھوں نے مجھے مدینہ پہونچایا، جب ان کی نظر بنی عمرو بن عوف کے گاؤں "قبا" پر پڑی تو مجھ سے کہنے لگے کہ تمھارے شوہر اسی گاؤں میں ہیں، (ابو سلمہ یہیں مقیم تھے) اب تم اللہ کا نام لے کر وہاں چلی جاؤ، یہ کہہ کر انھوں نے مجھے رخصت کر دیا، اور مکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

وہ کہتی تھیں کہ اسلام میں کسی گھرانہ کو وہ تکالیف نہیں اٹھانی پڑیں جو ابو سلمہؓ کے گھر والوں نے اٹھائی ہیں، اور میں نے کسی شخص کو عثمان بن طلحہؓ سے زیادہ شریف اور باحوصلہ نہیں پایا۔[1]

جب صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو کفار قریش نے ان سے کہا کہ تم ایک حقیر سائل اور مفلس کی حیثیت سے ہمارے پاس آئے تھے، ہمارے یہاں

---

[1] عثمان بن طلحہؓ بھی حدیبیہ کے بعد اسلام لے آئے ہجرت کی فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کی کلید ان کے حوالہ کی (ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱۵-۲۱۷ و الاصابہ فی تمییز الصحابہ ج ۲)

رہ کر تم اتنے دولت مند بن گئے اور یہ حیثیت تم نے حاصل کر لی اب تم چاہتے ہو کہ اپنے سارے سامان اور مال وجان کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤ، خدا کی قسم یہ نہیں ہو سکتا، صہیبؓ نے اُن سے کہا کہ اگر میں یہ مال واسباب تمھارے حوالہ کر دوں تو کیا تم مجھے جانے دو گے؟

انھوں نے کہا، ہاں۔

صہیبؓ نے جواب دیا کہ میں یہ سارا مال تمھیں دیتا ہوں۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپؐ نے فرمایا کہ رَبحِ صہیب، رَبحِ صہیب، صہیب نفع میں رہے، صہیب نفع میں رہے۔[۱]

اس موقع پر جن لوگوں نے مدینہ ہجرت کی ان میں حضرت عمرؓ، طلحہؓ، حمزہؓ، زید بن حارثہؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، زبیر بن العوامؓ، ابو حذیفہؓ، عثمان بن عفانؓ اور بہت سے دوسرے صحابۂ کرام شامل تھے، اس کے بعد ہجرت کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ میں دو آدمیوں کو چھوڑ کر (حضرت ابو بکرؓ و حضرت علیؓ) صرف وہی باقی بچا جو کسی معذوری سے نہیں جا سکا، یا وہ جو کسی آزمائش اور فتنہ میں پڑ گیا۔[۲]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کی سازش اور ناکامی

جب قریش نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں اس قدر حامی ومددگار پیدا ہو گئے ہیں، اور وہاں ان کا کوئی زور نہیں چل سکتا تو انھوں نے

---

[۱] ابن کثیر بحوالہ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۳ [۲] سیرت ابن ہشام ج ۱/ ص ۴۷۰-۴۷۹

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدینہ ہجرت سے بہت خطرہ اور خوف محسوس کیا، اور انھوں نے سوچا کہ اگر آپ تشریف لے گئے تو پھر آپ پر کوئی بس نہ چل سکے گا، یہ سوچ کر وہ سب لوگ "دارالندوہ" میں (جو اصل میں قصیؔ بن کلاب کا گھر تھا اور قریش اپنے سارے اہم معاملات یہیں طے کرتے تھے) جمع ہوئے اور اس مسئلہ پر غور و خوض کیا گیا، اس موقع پر قریش کے بڑے بڑے سردار سب موجود تھے۔

آخر میں متفقہ طور پر یہ بات طے پائی کہ ہر قبیلے سے ایک باہمت اور عالی نسب جوان کا انتخاب کیا جائے اور وہ سب مل کر یکبارگی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہوں، اس طرح یہ خون سارے قبائل میں تقسیم ہو جائے گا اور کسی ایک پر اس کی ذمہ داری نہ ہوگی، اور بنی عبدِ مناف ساری قوم سے جنگ کا خطرہ مول نہ لیں گے، اس کے بعد لوگ منتشر ہو گئے اور "اجتماعی جُرم" کا یہ منصوبہ طے ہو گیا۔

اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سازش سے آگاہ کر دیا، آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ آپؐ کی چادر اوڑھ کر آپؐ کے بستر پر سو جائیں، آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ تم کو کوئی گزند ہرگز نہ پہونچے گا۔

ادھر یہ پوری ٹولی آپؐ کے دروازہ پر تیار کھڑی تھی اور حملہ کے لئے پوری طرح کمربستہ تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور تھوڑی سی مٹی اپنے ہاتھ میں لے لی، اسی وقت اللہ تعالےٰ نے ان کی بصارت سلب کر لی، آپؐ یہ مٹی ان کے سروں پر پھینکتے ہوئے اور سورۂ یٰسین کی آیات کی "فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ" تک تلاوت کرتے ہوئے صاف ان کے سامنے سے گزر گئے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔

اس درمیان میں کسی آنے والے نے آواز دی کہ تم لوگ کس چیز کے انتظار میں کھڑے ہو؟! انھوں نے کہا محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے انتظار میں، اس نے کہا نامرادو! وہ تو جا چکے، اور اپنے کام کے لئے روانہ ہو گئے! انھوں نے جھانک کر دیکھا کہ کوئی شخص بستر پر لیٹا سو رہا ہے، ان کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، صبح ہوئی تو حضرت علیؓ بستر سے اُٹھے، یہ دیکھ کر ان کو بڑی شرمندگی ہوئی اور سب ناکام و نامراد واپس گئے۔[۱]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے، اور فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے یہاں سے نکلنے اور ہجرت کرنے کی اجازت عطا فرمادی ہے، حضرت ابوبکرؓ نے کہا "الصحبۃ یا رسول اللہ!" رسول اللہ رفاقت و صحبت کا طلب گار ہوں، آپ نے فرمایا "الصحبۃ" ہاں تم ہی رفیق ہو گے، حضرت ابوبکرؓ یہ سن کر خوشی سے رو پڑے، اس کے بعد انھوں نے دو سواریاں پیش کیں جو اسی سفر کی غرض سے انھوں نے پہلے سے تیار کر رکھی تھیں، عبداللہ بن اُریقط کو انھوں نے بطور رہبر کے معاوضہ پر طے کر لیا۔

عجیب تضاد

قریش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس قدر دشمنی اور آپ کی مخالفت

۱؎ سیرت ابن ہشام ج ۱/ ص ۴۸۰-۴۸۴

پر اس درجہ اتحاد کے باوجود آپ کی امانت و دیانت، سچائی، اور آپ کی عالی ظرفی و حوصلہ مندی پر کلی اعتماد کرتے تھے، پورے مکہ میں اگر کسی کو اپنی چیز کے ضائع ہونے یا غصب کئے جانے کا اندیشہ ہوتا تھا تو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ چیز رکھتا تھا، اس طور پر آپ کے پاس مختلف امانتیں جمع ہوگئی تھیں آپ نے حضرت علیؓ کو اس کا ذمہ دار بنایا کہ وہ اس وقت تک مکہ میں رہیں جب تک یہ امانتیں آپ کی طرف سے ادا نہ کردی جائیں، اللہ تعالےٰ نے سچ ارشاد فرمایا ہے:۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ (سورۂ انعام ۳۳)	ہم کو معلوم ہے کہ ان (کافروں) کی باتیں تمھیں رنج پہونچاتی ہیں (مگر) یہ تمھیں جھوٹا نہیں کہتے بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں۔

ہجرت سے ایک سبق

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس ہجرت سے سب سے پہلی بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ دعوت اور عقیدہ کی خاطر ہر عزیز و محبوب اور ہر مانوس و مرغوب شئے اور ہر اس چیز کو جس سے محبت کرنے جس کو ترجیح دینے اور جس سے بہر صورت وابستہ رہنے کا جذبہ انسان کی فطرتِ سلیم میں داخل ہے بے دریغ قربان کیا جاسکتا ہے، لیکن ان دونوں اول الذکر چیزوں کو ان میں سے کسی چیز کے لئے ترک نہیں کیا جاسکتا۔

مکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت اور آپؐ کے اور صحابۂ کرامؓ کے مرکز و وطن کے علاوہ دلوں کے لئے مقناطیس کی سی کشش رکھتا تھا، اس لئے کہ اسی شہر میں بیت اللہ ہے جس کی محبت ان کی روح اور خون میں پیوست تھی، لیکن ان میں سے کسی ایک چیز نے بھی آپؐ کو اور صحابۂ کرامؓ کو ترک وطن اور اہل وعیال کو خیرباد کہنے سے باز نہیں رکھا، کیونکہ زمین اس عقیدہ و دعوت کے لئے بالکل تنگ ہو چکی تھی، اور مکّہ والے ان دونوں چیزوں سے منہ پھیر چکے تھے۔

بشری وانسانی تعلق و محبّت اور ایمانی قوّت اور ذوق وشوق کے یہ ملے جلے جذبات آپؐ کے اس جملہ سے بخوبی جھلک رہے ہیں جو ہجرت کے وقت آپؐ نے مکّہ کو مخاطب کر کے کہا تھا" ما اطیبك من بلد وأحبك الیّ ولولا أن قومی اخرجونی منك ماسکنت غیرك۔"[1] (تو کتنا اچھا شہر ہے اور مجھے کس قدر عزیز و محبوب ہے، اگر میری قوم مجھے یہاں سے نہ نکالتی تو میں تیرے سوا کسی اور جگہ سکونت اختیار نہ کرتا۔)

یہ اللہ تعالےٰ کے اس فرمان کی تعمیل تھی :۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ	اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو
اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ	میری زمین فراخ ہے تو میری ہی
فَاعْبُدُوْنِ (سورۂ عنکبوت ۵۶)	عبادت کرو۔

غار ثور کی طرف

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ مکّہ سے چھپتے چھپاتے روانہ ہوئے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے عبد اللہ کو ہدایت کی کہ وہ ذرا خبر رکھیں کہ لوگ اُن کے

---

[1] ترمذی بروایت ابن عباس بطریق مرفوع (باب فضل مکّہ)

بارے میں کیا چہ میگوئیاں کر رہے ہیں، اپنے غلام عامر بن فُہیرہ کو حکم دیا کہ وہ دن بھر ان کی بکریاں چرایا کریں اور شام کو ان کا دودھ پہونچا دیا کریں، اسماء بنت ابی بکر کھانا پہونچایا کرتی تھیں۔

محبّت کی کرشمہ سازیاں

محبّت تخلیقِ انسانی سے لے کر آج تک ایک ایسے الہامی جذبہ کی حیثیت سے زندہ، پائندہ اور تابندہ ہے، جو نازک سے نازک باتوں کی طرف بطورِ خود رہنمائی کرتی ہے اور راستہ سجھاتی ہے، یہ "عشق است و ہزار بدگمانی" والا مضمون ہے، وہ اپنے محبوب سے کسی وقت غافل نہیں ہوتی اور موہوم سے موہوم چیز کا خطرہ محسوس کر لیتی ہے، اس سفر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا کچھ یہی حال تھا، چنانچہ روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غار کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت ابو بکر رضؓ چلنے میں کبھی آپؐ سے آگے رہتے کبھی پیچھے چلنے لگتے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو محسوس فرمایا اور کہا کہ ابو بکر کیا بات ہے کبھی تم میرے پیچھے چلنے ہو اور کبھی آگے؟ انھوں نے کہا کہ یارسول اللہ مجھے تعاقب کا خیال آتا ہے تو میں پیچھے چلنے لگتا ہوں، پھر گھات کا خطرہ ہوتا ہے تو آگے آجاتا ہوں[1]۔

جب دونوں حضرات غار تک پہونچ گئے تو حضرت ابو بکر رضؓ نے کہا کہ یارسول اللہ آپؐ ذرا توقّف فرمائیں میں غار کو دیکھ بھال لوں اور صاف کر لوں، اس کے بعد وہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۸۰ منقول از بیہقی بروایت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

غار کے اندر گئے اور اس کو صاف کرکے اور سوراخ وغیرہ بند کرکے باہر آئے اس وقت ان کو یاد آیا کہ ایک بل باقی رہ گیا ہے جس کو وہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکے پھر انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ آپؐ ذرا اور توقف فرمائیں میں اس کو دیکھ لوں پھر اس کے اندر گئے اور جب اس کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو کہا یا رسول اللہؐ اب آپؐ اندر اتر آئیں، چنانچہ آپؐ اندر تشریف لے آئے۔[1]

آسمانی کمک اور غیبی امداد

جب دونوں غار میں داخل ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے مکڑی کو بھیجا، اس نے غار اور غار کے منہ پر جو درخت تھا اس کے درمیان ایک جال بُن دیا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو چھپالیا، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دو جنگلی کبوتریوں کو بھیجدیا جو اوپر پھڑپھڑاتی رہیں پھر آکر وہاں بیٹھ گئیں۔[2]

"وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (اور اللہ ہی کے ہاتھ میں آسمانوں و زمین کے لشکر ہیں)

انسانی تاریخ کا سب سے نازک لمحہ

اِدھر مشرکین نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تعاقب شروع کیا، یہ انسانیت کے طول وطویل سفر کا سب سے نازک اور سب سے زیادہ فیصلہ کن لمحہ تھا، یا تو ایک ایسی بدنصیبی سامنے تھی جس کی کوئی انتہا نہیں یا ایک ایسی خوش نصیبی واقبال مندی کا آغاز ہونا تھا، جس کی کوئی حد نہ تھی، انسانیت نے بے چینی سے اپنی سانس روک لی تھی اور بے حس وحرکت ہوکر ان جاسوسوں اور تعاقب کرنے والوں کو پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی جو اس وقت غار کے

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۸۰ [2] ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۲۴۰-۲۴۱ (روایۃً عن ابن عساکر)

منہ پر کھڑے تھے، اور صرف اتنی دیر باقی تھی کہ اُن میں سے کوئی نیچے دیکھ لے لیکن خدا کی قدرت ان کے اور اس قدم کے درمیان حائل ہوگئی، اور وہ دھوکہ کھا گئے، انھوں نے دیکھا کہ غار کا منہ مکڑی کے جالے سے بند ہے تو ان کا ذہن بھی اِدھر نہ جاسکا کہ اندر کوئی ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:۔

فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَكِيْنَتَہٗ عَلَيْہِ وَاَيَّدَہٗ	تو خدا نے ان پر تسکین نازل فرمائی اور ان کو
بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا (سورۂ توبہ ـ ۴۰)	ایسے لشکروں سے مدد دی جو تم کو نظر نہیں آتے تھے

"لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا"

اس لمحہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نگاہ اوپر اٹھی تو انھیں مشرکین کے آثار نظر آئے، انھوں نے کہا یا رسول اللہؐ اگر ان میں سے کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو ہمیں دیکھ لے گا، آپؐ نے جواب دیا "ماظنك باثنين اللّٰہ ثالثھما[1]" (ان دو کے بارہ میں تمھارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہے؟) اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی:۔

ثَانِیَ اثْنَيْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ	(اس وقت) دو ہی شخص تھے جن میں
اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ	(ایک ابوبکرؓ تھے) دوسرے
اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔	(خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم)
(سورۂ توبہ ـ ۴۰)	جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے
	اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے
	کہ غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔

---

[1] صحیح بخاری (باب قولہ تعالےٰ "ثَانِیَ اثْنَيْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ" کتاب التفسیر)۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تعاقب میں سُراقہ کی روانگی

قریش نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو سَو اونٹنیاں انعام میں دی جائیں گی، ان لوگوں نے غار میں تین راتیں گذاریں، پھر دونوں آگے کی طرف روانہ ہوئے (عامر بن فُہیرہ اور عبداللہ بن اُریقط جن کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے راستہ بتانے کے لئے اُجرت پر ساتھ لیا تھا) ساحل کی طرف سے آپؐ کو لے کر چلے۔

سُراقہ بن مالک بن جُعشم کو انعام کی لالچ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تعاقب پر آمادہ کیا اور سَو اونٹنیوں کے شوق میں اس نے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر آپؐ کے نشاناتِ قدم کی مدد سے تعاقب شروع کیا، لیکن اس کے گھوڑے کو اچانک ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا لیکن اب بھی ہار نہ مانی اور آپؐ کے نشانات پر آگے بڑھتا رہا، دوسری مرتبہ اس کے گھوڑے نے پھر ٹھوکر کھائی اور وہ گرا پھر سوار ہوا اور تعاقب شروع کیا، یہاں تک کہ یہ لوگ اس کو سامنے نظر آگئے، اور اسی وقت تیسری بار گھوڑے نے سخت ٹھوکر کھائی اور اس کے دونوں اگلے پاؤں زمین میں دھنس گئے، سُراقہ گر پڑا، اسی کے ساتھ بگولہ یا آندھی کی شکل میں وہاں سے دھواں بھی اٹھا۔

سُراقہ نے جب یہ دیکھا تو سمجھ گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی حمایت میں ہیں اور وہ ہر صورت میں غالب آئیں گے، اس نے زور سے آواز دی اور کہا کہ میں سُراقہ بن جُعشم ہوں مجھے بات کرنے کا موقع دیجئے، مجھ سے آپؐ لوگوں کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہونچے گا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا اس سے پوچھو کہ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟ سُراقہ نے کہا کہ آپ ایک تحریر مجھے دیدیں جو ہمارے اور آپؐ کے درمیان ایک نشانی اور

یادگار کے طور پر محفوظ رہے عامر بن فہیرہ نے ہڈی یا جھلی پر ایک تحریر لکھ کر اُس کے حوالے کی۔[۱]

ایک خلافِ قیاس اور ماورائے عقل پیش گوئی

عین اس حال میں جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہجرت پر مجبور ہیں، مکہ میں رہنا ممکن نہیں، دشمن ہر طرف گھات میں ہیں اور ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اس دن کی طرف جاتی ہے جس دن آپؐ کے غلام کسریٰ کا تاج اور قیصر کا تخت اپنے پیروں سے روندیں گے، اور زمین کے خزانوں کے مالک ہوں گے، آپؐ نے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس درخشاں روشنی کی پیش گوئی کی اور سُراقہ سے ارشاد فرمایا، سُراقہ! اُس وقت تمھارا کیا حال ہوگا جب کسریٰ کے کنگن تم اپنے ہاتھ میں پہنو گے؟

بے شک اللہ نے اپنے نبی سے نصرت و حمایت اور فتح مُبین اور اپنے دین کے لئے غلبہ و عروج اور فتح مکمل کا وعدہ کیا تھا:۔

هُوَ الَّذِيٓ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى	وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت
وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ	اور دینِ حق دے کر بھیجا، تاکہ اس (دین)
كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○	کو (دنیا کے) تمام دینوں پر غالب
(سورۂ توبہ - ۳۳)	کرے اگرچہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

کوتاہ بیں اور کم عقل لوگوں نے اس بات کا انکار کیا، قریش نے اس کو امر محال اور انہونی بات سمجھی لیکن نگاہِ نبوّت دور کو قریب دیکھ رہی تھی:۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ — بے شک خدا خلاف وعدہ نہیں کرتا۔

اور حرف بحرف اسی طرح ہوا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے کسریٰ کے

---

[۱] سیرت ابن ہشام ص ۴۸۹-۴۹۰ نیز بخاری شریف جزء اول (باب ہجرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم الی المدینۃ) الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ۔

کنگن اس کا پٹکا اور تاج حاضر کیا گیا تو انھوں نے سُراقہ کو بلایا اور اس کو یہ پہنایا[۱]، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، سراقہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے زادراہ اور ضروری سامان کی بھی پیش کش کی لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول نہ فرمایا اور صرف اتنی بات کہی کہ "اَخْفِ عَنَّا" (ہماری اطلاع کسی کو نہ دینا)[۲]

مُبارک شخص

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اپنے سفر کے دوران اُمِّ مَعْبَدُ الخزاعیہ کے پاس سے گذرے، اُن کے پاس ایک بکری تھی، جس کا چارہ پانی کی کمی سے دودھ خشک ہوگیا تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیرا، اللہ کا نام لیا اور دعا کی، چنانچہ اسی وقت دودھ تیزی سے جاری ہوگیا، آپؐ نے یہ دودھ اُمِّ معبد کو اور اپنے ساتھیوں کو پلایا، یہاں تک کہ سب خوب سیراب ہوگئے، پھر آپؐ نے نوش فرمایا اور دوبارہ دُوہا یہاں تک کہ برتن پورا لبریز ہوگیا، جب ابومعبد اپنے کام سے واپس آئے اور واقعہ دریافت کیا، تو ام معبد نے ان سے کہا کہ "خدا کی قسم! ایک مبارک شخص ہمارے پاس سے گزرے، اور ایسی ایسی انھوں نے باتیں کیں" پھر انھوں نے بہترین الفاظ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی، یہ سن کر ابومعبد بولے، خدا کی قسم مجھے یہ قریش کے وہی شخص معلوم ہوتے ہیں، جن کی قریش کو تلاش ہے[۳]۔

رہبر نے ان دونوں کو ساتھ لے کر اپنا سفر جاری رکھا، یہاں تک کہ یہ قُبا تک، جو مدینہ کے مضافات میں ہے، پہونچ گئے، یہ واقعہ ۱۲ ربیع الاول دوشنبہ کا ہے، اور اسی سے اسلامی تقویم اور اسلامی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔

---

[۱] الاستیعاب ج ۲ ص۵۹۷ [۲] بخاری شریف (باب ہجرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم) [۳] زاد المعاد ج ۲ ص۳۰۹

عہدِ بعثت کے یثرب (مدینہ) پر ایک نظر

مکّی اور مدنی معاشروں کا فرق

شہر یثرب کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے جسے اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کا دارالہجرۃ، اسلام کی عالمی دعوت کا مرکز اور ظہورِ اسلام کے بعد قائم ہونے والے پہلے اسلامی معاشرہ کا گہوارہ بنایا، ہمیں اس کی تمدّنی، معاشرتی، اقتصادی صورتِ حال، قدیم قبائل کے باہمی تعلقات اور وہاں کے یہود کی معاشرتی، اقتصادی اور جنگی اہمیت اور اس زرخیز شہر کے معیارِ زندگی کو سمجھنا ہوگا، جہاں متعدد مذاہب، ثقافتیں اور معاشرے دوش بدوش تھے، جب کہ مکّہ مکرمہ کا ایک رنگ، ایک طرز اور ایک ہی مذہب تھا، اس سلسلہ میں یہاں پر قارئین کے سامنے کچھ تفصیلات پیش کی جاتی ہیں جن کی مدد سے وہ زمانۂ بعثت کے شہر یثرب کی نوعیت اور صورتِ حال کا کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں۔

یہود

اس تاریخی حقیقت کو ترجیح حاصل ہے کہ یہود کی اکثریت جزیرۃ العرب میں عموماً اور شہر یثرب میں خصوصاً پہلی صدی مسیحی میں آئی، مشہور یہودی فاضل

مدینہ منورہ و مضافات
مدینہ منورہ

ڈاکٹر اسرائیل ولفنسن لکھتا ہے:۔

"۷۰ء میں جب یہودی اور رومی جنگ کے نتیجے میں فلسطین اور بیت المقدس برباد ہوگئے، اور یہود دنیا کے مختلف علاقوں میں بکھر گئے تو یہود کی بہت سی جماعتوں نے بلادِ عرب کا رُخ کیا، جیسا کہ یہودی مورخ جوزیفس کا کہنا ہے، جو خود بھی اس جنگ میں شریک تھا، اور بعض مواقع پر اس نے یہودی ٹکڑیوں (UNITS) کی بھی قیادت کی تھی، عربی مآخذ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔"[1]

مدینہ میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے (جن میں بالغوں کی تعداد دو ہزار (۲۰۰۰) سے اوپر تھی) قینقاع، نضیر، قُریظہ، اندازہ کیا گیا ہے کہ قینقاع کے لڑنے والوں کی تعداد سات سو (۷۰۰) تھی، نضیر کے آدمیوں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی، جب کہ قریظہ کے بالغوں کی تعداد سات سو (۷۰۰) اور نو سو (۹۰۰) کے درمیان تھی۔[2]

---

[1] تاریخ الیہود فی بلاد العرب فی الجاہلیۃ وصدر الاسلام، اسرائیل ولفنسن (ابوذؤیب) ص ۹ (قاہرہ ۱۹۲۷ء)

[2] یہ اندازہ سیرت ابن ہشام کے ان اعداد و شمار سے کیا گیا ہے جو جنگوں اور واقعات کے تذکرے میں آئے ہیں، جیسے بنی نضیر کی جلاوطنی، بنی قریظہ کا قتل وغیرہ، قینقاع، نضیر اور قریظہ بڑے قبیلے تھے، جن کے ماتحت شاخیں بھی تھیں، جیسے بنی ہدل قریظہ کے تابع تھے، جن میں سے بعض بڑے صحابی بھی ہوئے اور جیسے بنی زنباع جو بنی قریظہ کی شاخ ہے، بعض یہودی جماعتوں کے نام اس معاہدے میں بھی آئے ہیں، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیان ہوا تھا، جیسے بنی عوف، بنی النجار، بنی ساعدہ، بنی ثعلبہ، بنی جفنہ، بنی الحارث وغیرہ اس معاہدے میں ان جماعتوں کے ذکر کے بعد آیا ہے کہ "ان بطانۃ یہود کانفسہم" (یہود کے خواص اور ان کے معتمد علیہم کا معاملہ بھی انھیں کی طرح ہے) اسی لئے سمہودی صاحب "وفاء الوفاء" کا کہنا ہے کہ یہود بیس (۲۰) قبیلوں سے زیادہ تھے"۔ (وفاء الوفاء ۱۱۶)۔

ان تینوں قبائل کے باہمی تعلقات کشیدہ رہتے تھے، اور کبھی لڑائیاں بھی ہوتی تھیں، ڈاکٹر ولفنسن کہتا ہے :-

"بنی قینقاع اور بقیہ یہود میں عداوت چلی آتی تھی جس کا سبب یہ تھا کہ بنی قینقاع بنی خزرج کے ساتھ "یوم بعاث" میں شریک تھے، اور بنی نضیر اور بنی قریظہ نے بنی قینقاع کا بڑی بے دردی سے کشت و خون کیا تھا، اور ان کا شیرازہ بری طرح سے منتشر کر دیا تھا، حالانکہ انھوں نے گرفتار ہونے والے تمام یہود کا فدیہ بھی ادا کر دیا تھا، چنانچہ "یوم بعاث" کے بعد یہودی قبائل میں باہمی نزاع چلی آ رہی تھی، جب قینقاع اور انصار کے درمیان جنگ ہوئی تو انصار کے مقابلہ پر ان کا کسی یہودی نے بھی ساتھ نہیں دیا۔"[1]

قرآن مجید نے بھی یہود کی باہمی عداوت کی طرف اشارہ کیا ہے :-

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ	اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم
دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ	آپس میں خون نہ بہاؤ گے اور اپنوں
مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ	کو اپنے وطن سے نہ نکالو گے پھر
تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ	تم نے اقرار کیا اور تم مانتے ہو، پھر
تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ	تم ہی اپنوں کو قتل کرتے ہو اور
فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ	اپنے ایک فرقے کو ان کے گھروں سے
تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ	نکالتے ہو، ان پر چڑھائی کرتے ہو،

[1] الیہود فی بلاد العرب ص ۱۲۹

وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ۔
(سورۃ البقرۃ ۸۴-۸۵)

گناہ اور ظلم کے طور پر، اور اگر وہ تمھارے پاس قید ہو کر آئیں تو تم فدیہ دیتے ہو، حالانکہ ان کا نکال دینا بھی تم پر حرام ہے۔

یہود مدینہ کی مختلف بستیوں اور محلوں میں رہتے تھے، جو انھیں کے لئے مخصوص تھیں، بنو قینقاع کو جب بنو نضیر اور بنو قریظہ نے مدینہ کے نواحی محلے سے بھگایا تو وہ شہر کے اندر ایک خاص محلے میں رہنے لگے، بنو نضیر مدینہ سے دو تین میل کی دوری پر وادی بطحان کی بلندی پر رہتے تھے، جو کھجوروں اور کھیتوں سے مالا مال تھی، بنو قریظہ مدینہ کے جنوب میں چند میلوں پر واقع مہزور کے علاقے میں رہتے تھے۔[۱]

مدینہ میں یہود کی مخصوص بستیاں تھیں جن میں قلعے اور مستحکم عمارتیں بنی ہوئی تھیں، ان میں وہ مستقل طور پر رہتے تھے، انھیں یہودی حکومت بنانے کا موقع نہیں ملا، بلکہ وہ قبائلی سرداروں کی حمایت وحفاظت کے تحت چین سے رہتے تھے، اور اس حمایت کے بدلے میں انھیں سالانہ محصول ادا کرتے تھے، جس کے سبب وہ بدوؤں کے حملوں سے بھی محفوظ رہتے تھے، اس خطرے کے پیش نظر یہودی معاہدوں پر مجبور تھے، چنانچہ ہر یہودی سردار اعراب اور رؤسائے عرب میں سے کسی نہ کسی کو اپنا حلیف بنائے رکھتا تھا۔[۲]

۱؎ "بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ" للدکتور محمد سید الطنطاوی ص۷۷

۲؎ تلخیص از "تاریخ العرب قبل الاسلام" ج ۷ ص۲۳: ڈاکٹر جواد علی (البغداد)

مذہبی امور

یہودی اپنے کو ایک مستقل مذہب اور آسمانی شریعت کا حامل سمجھتے تھے، چنانچہ وہ اپنے مدرسوں میں (جن کو مِدراس کہتے تھے) اپنے دینی اور دنیوی امور، شرعی احکام، تاریخ اور اپنے انبیاء اور رسولوں کے حالات پڑھتے اور پڑھاتے تھے اسی طرح مخصوص عبادت گاہوں میں وہ اپنی عبادات اور دینی شعائر انجام دیتے تھے، وہ انہی جگہوں پر اپنے تمام دینی اور دنیوی امور کے سلسلے میں مشورہ اور تبادلۂ خیالات کے لئے جمع ہوتے تھے، یہودی اپنے مخصوص دینی قوانین پر عمل کرتے تھے، جن میں سے کچھ انھوں نے اپنی کتابوں سے اخذ کئے تھے، اور کچھ ان کے کاہنوں اور عالموں نے اپنی طرف سے ایجاد کر لئے تھے، اسی طرح وہ اپنی عیدیں الگ مناتے تھے، کچھ خاص دنوں جیسے یومِ عاشورہ میں روزے رکھتے تھے۔[۱]

یہود کی مذہبی و اخلاقی حالت

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودِ مدینہ کا اپنے اصل دین اور اپنی کتابوں کی تعلیمات سے تعلق بہت کمزور ہو گیا تھا، اور مرورِ ایام سے وہ بھی اپنے ہمسایہ عربوں کی طرح ہو گئے تھے، مگر توحید کا کچھ اثر اور کھانے پینے میں حلال و حرام کی تمیز باقی رہ گئی تھی، لیکن جب اسلام خالص و قطعی عقیدۂ توحید کے ساتھ آیا (جو قرآن میں ہے) تو ان کا رہا سہا یہ امتیاز بھی ختم ہو گیا۔

۱؎ بنو اسرائیل فی القرآن و السنة ص۸۰-۸۱

وہ اخلاقی پستی کی انتہا کو پہونچ گئے تھے، اپنی حاجت روائی کے لئے سفلی اعمال سحر وغیرہ اپنے مخالفین سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کھانے میں زہر کی ملاوٹ، طنز و تعریض، اور دھوکہ میں ڈالنے والے ذو معنی کلمات بول کر اپنے مجروح دل کو تسکین دینا ان کی عادت بن گئی تھی، جو ان پست ذہنیت، شکست خوردہ معاشروں کی پہچان ہوتی ہے، جو مردانگی اور اخلاقی جرٔت سے محروم ہوتے ہیں، فنون سحر و کہانت میں یہود کی مہارت تاریخ کے مسلّمات میں ہے، اور ان کے علماء و اکابر اس کا فخریہ اظہار بھی کرتے ہیں، اور قرآن مجید نے بھی آیت:۔

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ	انھوں نے (اس سحر و جادو) کی بھی پیروی کی جن سے شیاطین سلیمان کی سلطنت اور عہد پر کام لیتے تھے۔
(سورۃ البقرہ۔۱۰۲)	

سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، یہود کا یہ شغف عہد رسالت تک باقی تھا، مشہور یہودی مستشرق مارگولیتھ (MARGOLIOUTH) (جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کے بارے میں اپنے تعصب کے لئے بھی مشہور رہے) لکھتا ہے:۔

"مدینہ کے یہود فن سحر میں بڑے ماہر تھے، اور علانیہ جنگ اور مردانہ وار صف آرائی پر کالے کرتب (جادو) کو ترجیح دیتے تھے"۔[۵۱]

غزوۂ خیبر کے بیان میں بکری کے گوشت میں زہر ملانے کا واقعہ آئے گا جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کی گئی، مگر آپؐ محفوظ رہے اور بشر بن براء بن معرور جنھوں نے کھانے میں شرکت کی تھی انتقال کر گئے۔[۵۲]

---

[۵۱] D. S. MARGOLIOUTH: MUHAMMAD & THE RISE OF ISLAM P. 189

[۵۲] صحیح بخاری باب "الشاة التي سُمّت للنبي صلی اللہ علیہ وسلم بخیبر۔"

معروف کلمات کو ایک خاص طرز سے استعمال کرنے اور ان سے بُرے معنی مراد لینے کا ذکر قرآن شریف میں اس طرح آیا ہے:۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا	اے ایمان والو تم راعنا مت کہا
رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا	کرو، اور انظرنا کہہ دیا کرو اور
وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝	سن لیجیو کافروں کو سزا دردناک
(سورۃ البقرۃ ۔ ۱۰۴)	ہوگی۔

ابو نعیم نے دلائل میں ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ "یہود آہستہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے "رَاعِنَا" کہتے تھے، جو ان کی زبان میں ایک بُری گالی تھی، وہ یہ کہہ کر آپس میں ہنستے تھے، اس پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، اور اس کے سدِّباب اور مسلمانوں کو مشابہت سے بچانے کے لئے اس سے روک دیا گیا، اور یہودیوں کے یہاں اس کلمہ کے معنی اسمع لا سمعت (سنو! خدا تم کو سننا نصیب نہ کرے) کے ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ (نعوذ باللہ) انھوں نے آپؐ کی نسبت "رعن" سے کی جو رعونت سے نکلا ہے، جس کے معنی جہل وحماقت کے ہیں اور الف مدِّ صوت کے لئے ہے۔[1]

بخاری نے حضرت عائشہؓ سے عروہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتی تھیں کہ یہود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتے وقت "السَّام علیك" کہتے تھے،[2] اور اس سے مراد موت لیتے تھے۔

---

[1] روح المعانی از علامہ آلوسی بغدادی ج ۱ ص ۳۴۸ - ۳۴۹

[2] جامع صحیح، کتاب الدعوات۔

حدیث میں آتا ہے "لکل داءٍ دواءٌ الا السام"[1] (موت کے سوا ہر بیماری کی دوا ہے)
اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی کہ:۔

وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ[2]	اور وہ لوگ جب آپ کے پاس آتے ہیں، آپ کو ایسے لفظ سے سلام کرتے ہیں جس سے اللہ نے آپ کو سلام نہیں فرمایا۔

اسی طرح وہ ایسی اخلاقی پستی میں مبتلا ہوئے جس کی کسی مہذب صاحب کردار اور شرعی و آسمانی تعلیمات پر مبنی معاشرہ سے توقع نہیں کی جاسکتی، اس رجحان کا پتہ اس عرب عورت کے قصے سے بھی ہوتا ہے جو بنو قینقاع کے بازار میں ایک کاریگر کے پاس کسی کام سے گئی تو یہودنے اس سے چہرہ سے نقاب اتارنے کے لئے اصرار کیا اور اس کے انکار پر کاریگر نے اس کی نقاب پیچھے سے باندھ دی اور جب وہ کھڑی ہوئی تو اس کی بے پردگی پر سب ہنس پڑے اور عورت نے ایک چیخ ماری جسے سن کر ایک مسلمان نے لپک کر اس کاریگر کا کام تمام کردیا، اور پھر یہود نے اس مسلمان کو شہید کردیا[3]۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہ تھا اور اسواق عرب میں اس کا امکان مشکل تھا۔

اقتصادیات

دوسری قوموں سے ان کے بیشتر مالی معاملات رہن اور سود پر قائم تھے،

---

[1] مجمع بحار الأنوار ج ۳ ص ۱۵۵ [2] المجادلہ ۔ ۸ دیکھئے روح المعانی اور تفسیر ابن کثیر [3] سیرت ابن ہشام ق ۲ ص ۴۸

اور مدینہ جیسے زراعتی علاقے کے پیش نظر انھیں اس کا سنہرا موقع بھی حاصل تھا' کیونکہ کسانوں کو کھیتی کے موقع پر اکثر قرض کی ضرورت پیش آتی ہے۔[1]

رہن کا نظام صرف زر یا مال تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ مجبوری کی حالت میں عورتیں اور بچے بھی رہن رکھ لئے جاتے تھے، چنانچہ کعب بن الاشرف کے قتل کے سلسلے میں امام بخاریؒ نے یہ روایت نقل فرمائی ہے۔

قال له محمد بن مسلمة	محمد بن مسلمہؓ نے کعب سے کہا کہ ہم چاہتے
قد اردنا ان تسلفنا وسقا	ہیں کہ تم ایک وسق یا دو وسق غلہ
او وسقين فقال نعم	ہمیں قرض دو اس نے کہا کہ بشرطیکہ
ارهنوني قالوا اي شيء	تم میرے پاس کچھ رہن رکھو انھوں نے
تريد؟ قال ارهنوني	پوچھا کہ تم کیا چیز چاہتے ہو؟ کعب نے
نساءكم، قالوا	کہا تم میرے پاس اپنی عورتوں کو
كيف نرهن نساءنا	رہن رکھدو، انھوں نے کہا کہ ہم
وانت اجمل العرب،	اپنی عورتوں کو تمھارے پاس کیسے
قال: فارهنوني ابناءكم،	رہن رکھدیں جبکہ تم عربوں میں
قالوا كيف نرهنك	خوبصورت ترین انسان ہو،
ابناءنا فيسب احدهم	اس نے کہا کہ تب اپنے بیٹوں کو
فيقال رهن بوسق	رہن رکھدو، اس پر انھوں نے
او وسقين قال هذا	کہا کہ ہم تمھارے پاس اپنے بیٹوں کو

[1] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ ص۸۰-۸۱

عار علینا ولکن نرھنك اللأمة۔[1]	کیسے رکھ دیں کر آگے انھیں طعنہ دیا جائے کہ وہ ایک یا دو وسق کے بدلے رہن رکھے گئے تھے، اور یہ ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہوگی، البتہ ہم تمہارے پاس ہتھیار رہن رکھ سکتے ہیں۔

اس قسم کے رہن کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ راہنوں اور مرتہنوں کے درمیان نفرت و عداوت پیدا ہو جائے خصوصاً اس وقت جبکہ عرب اپنی عورتوں کے سلسلے میں غیرت وحمیت کے لئے شہرت رکھتے تھے، مدینہ کی اقتصادیات پر یہود کے اس تسلط کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کا معاشی دباؤ بہت بڑھ گیا، اور وہ منڈیوں میں من مانی کرنے لگے اپنی مصلحت و منفعت کے مطابق مصنوعی قلت پیدا کر کے چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی سے کام لینے لگے اس لئے مدینہ کی اکثریت ان کی دھاندلی اور حد سے زیادہ سود خوری اور نفع اندوزی کی ایسی شرمناک حرکتوں کی وجہ سے ان سے نفرت کرنے لگی تھی جن سے ایک عرب آدمی دور رہتا ہے۔[2]

ان کی جبلی سیاست حرص و ہوس اور توسیع پسندی کے پیش نظر (DE LACY O' LEARY) نے اپنی کتاب "عرب قبل محمد" میں لکھا ہے کہ:۔

---

[1] بخاری نے اسے کتاب المغازی میں باب "قتل کعب بن الاشرف" میں ذکر کیا ہے، ابن ہشام نے بھی تھوڑے فرق کے ساتھ یہ قصہ السیرۃ النبویہ ج ۲ ص ۵۱ پر نقل کیا ہے [2] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ ص ۴۹

۱۰ اصل بدوی باشندوں[51] اور نوآباد یہودیوں کے تعلقات ساتویں صدی مسیحی میں بہت خراب ہو گئے تھے، کیونکہ ان یہودیوں نے اپنی کاشت کے علاقے ان بدوؤں کی چراگاہوں تک وسیع کر لئے تھے۔[52]

اوس و خزرج (مدینہ کے عرب باشندے) اور یہود کے تعلقات ذاتی نفع اور استحصال پر مبنی تھے، یہود ان دونوں قبیلوں کو لڑانے پر بھی اپنے فائدے کی صورت میں بہت خرچ کرتے تھے، جیسا کہ اوس و خزرج کی متعدد لڑائیوں میں انھوں نے کیا تھا جن کے نتیجہ میں یہ دونوں قبیلے تباہ ہو رہے تھے، ان کے پیش نظر صرف یہی رہتا تھا کہ مدینہ پر ان کا مالی تسلط برقرار رہے، آنے والے نبی کے سلسلے میں یہود کی گفتگو نے بھی اوس و خزرج کو داخل اسلام ہونے پر آمادہ کر دیا تھا۔[53]

دینی و ثقافتی حالت

بلاد عرب کے یہود کی زبان فطری طور پر عربی ہی تھی لیکن وہ خالص نہیں رہ گئی تھی، بلکہ اس میں تھوڑی سی عبرانی کی بھی آمیزش ہو گئی تھی، کیونکہ انھوں نے عبرانی کا استعمال پوری طرح نہیں چھوڑا تھا، وہ اپنی عبادتوں اور تعلیمی امور میں اس کا استعمال کرتے رہتے تھے۔[54]

---

[51] ان سے عرب قبائل مراد ہیں، جیسے اوس و خزرج اور دوسرے عرب جو مدینہ کے اطراف میں ان کے پڑوسی تھے

[52] ARABIA BEFORE MOHAMMAD, (LONDON 1927), P. 174

[53] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ للدکتور محمد سید الطنطاوی ص ۱۰۱-۱۰۳

[54] مکۃ والمدینۃ فی الجاہلیۃ وعہد الرسول: احمد ابراہیم الشریف ۲۰۳۔

یہود کے دینی و دعوتی پہلو کے بارے میں ڈاکٹر اسرائیل ولفنسن لکھتا ہے:۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یہود کو عرب میں اپنا دینی اقتدار وسیع کرنے کے وسائل حاصل تھے، اور وہ اگر چاہتے تو حاصل کردہ اقتدار سے کہیں زائد اثر و نفوذ حاصل کر سکتے تھے، لیکن تاریخ یہود کا ہر جاننے والا جانتا ہے کہ یہود نے دوسری قوموں کو اپنے دین کے قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں کیا اور بعض وجوہ سے اشاعتِ دینِ یہود کے لئے ممنوع رہی ہے۔"[1]

یہود (اپنے قومی مزاج کے مطابق) اپنے معاشرہ کو نئے حالات و تغیرات کے مطابق ڈھالنے، نئے چیلنج کو سمجھنے، اور موقعہ سے فائدہ اٹھانے، اور اسلام کو اختیار کرکے اپنی ثقافت و ذہانت اور تجربہ و صلاحیت کے لائق مقام پانے میں ناکام رہے، اور یہی افسوسناک انجام ہر اس معاشرہ کا ہوا ہے جو اپنے ماضی، نام و نسب پر فخر، اور خواب و خیال کی دنیا میں رہتا بستا ہے، اور کھوکھلی قیادت کا سہارا لیتا ہے۔

یہود اپنے کو صحیح طور پر نمایاں کرنے اور ایک صاحبِ پیغام اور اہلِ کتاب اور انبیاء سابقین کی امّت و ذرّیت ہونے کے لحاظ سے اپنی صلاحیت و فوقیت ثابت کرنے میں ناکام رہے، اور عرب کی گھٹیا بت پرستی اور پست ترین جاہلیت کو دیکھ کر ان میں کوئی بے چینی نہیں پیدا ہوئی، اور انھوں نے (کم سے کم) اس عقیدۂ توحید کی بھی دعوت نہیں دی جس کے وہ صدیوں سے (اپنے اخلاقی

---

[1] الیہود فی بلاد العرب: اسرائیل ولفنسن ۷۲۔

انحطاط اور قومی کمزوریوں کے باوجود) حامل چلے آرہے تھے، جس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ اپنے دین کی طرف کسی غیر اسرائیلی فرد کو دعوت دینے کے قائل ہی نہ تھے، یہودیت کو نسلی دین واعزاز سمجھنے کا عقیدہ ان کا دائمی شعار تھا، (جیسا کہ اسرائیل ولفنسن اور سابق امریکی یہودی اور حال کی مسلم فاضلہ مریم جمیلہ کا کہنا ہے) اس کے ساتھ ان کی آرام طلبی، اور حد سے زائد تجارتی و معاشی سرگرمی بھی ان کے لئے ایک رکاوٹ تھی۔

لیکن یہ یقینی بات ہے کہ اوس و خزرج اور دوسرے عرب قبائل سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد نے یہودیت کو اپنی مرضی سے یا رشتہ داری، یا یہودی ماحول میں پرورش پانے کے سبب اختیار کر لیا تھا، عرب کے یہودیوں میں سب قسمیں پائی جاتی تھیں، یہ بھی معلوم ہے کہ ممتاز یہودی تاجر اور مشہور شاعر کعب بن الاشرف (جو نضری کی نسبت سے بھی معروف ہے) قبیلۂ طے کا ایک فرد تھا، اس کے باپ نے بنی نضیر میں شادی کی تھی، چنانچہ کعب ایک پر جوش یہودی کی صورت میں پروان چڑھا، ابن ہشام لکھتے ہیں کہ:۔

"اس کا آبائی تعلق قبیلہ طے پھر بنی نبہان سے تھا، اس کی ماں بنی نضیر سے تھی"[۱]

عربوں میں ایک رسم یہ بھی کہ جس کا لڑکا زندہ نہ رہتا تھا، وہ یہ نذر مانتا تھا کہ اگر وہ زندہ رہا تو اس کو یہودیوں کے سپرد کر دے گا کہ وہ اس کو اپنے میں شامل کر لیں چنانچہ بہت سے عرب اس طرح بھی یہودی بن گئے تھے، سنن ابو داؤد میں حسب ذیل

---

[۱] ابن ہشام ج ۱ ص ۵۱۴

روایت ملتی ہے:۔

عن ابن عباسؓ قال: کانت المرأۃ تکون مقلاتاً فتجعل علی نفسھا ان عاش لھا ولد ان تھوّدہ، فلما اجلیت بنو النضیر کان فیھم من ابناء الانصار فقالوا لا ندع ابناءنا، فانزل اللہ تعالیٰ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔[1]

جس عورت کا بچہ زندہ نہ رہتا تھا وہ نذر مانتی تھی کہ اگر بچہ زندہ رہا تو اسے یہودی بنا دے گی چنانچہ جب بنو نضیر جلا وطن ہوئے تو ان میں سے انصار کے لڑکے بھی تھے، اس لئے وہ کہنے لگے کہ ہم اپنے بیٹوں کو نہیں چھوڑیں گے اس پر یہ آیت اتری "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ"۔

اوس وخزرج

اوس وخزرج (مدینہ کے عرب باشندوں) کا سلسلۂ نسب یمن کے قبیلۂ اَزْد سے ملتا ہے، جہاں سے یثرب کی طرف ہجرت کی لہریں مختلف وقفوں میں اٹھتی رہیں، جس کے کئی اسباب تھے، ان میں یمن کی غیر یقینی صورتِ حال، حبش کا حملہ، سدِّ مآرب کے انہدام و شکستگی کے بعد آبپاشی کی دقت وغیرہ بھی ہیں، اس طرح اوس وخزرج مدینہ میں یہود کے بعد آئے[2] اوس کے قبائل مدینہ کے جنوب و مشرق

---

[1] سنن ابوداؤد کتاب الجہاد باب لا اسیر یکرہ علی الاسلام ج ۲ ص ۵۲ [2] مشہور مستشرق سیڈیو کی تحقیق ہے کہ اوس اور خزرج نے ۳۰۰ مسیحی میں یثرب کو اپنا وطن بنایا ۴۹۲ء میں ان کا یثرب پر تسلط مکمل ہو گیا تھا۔ (تاریخ العرب العام ترجمہ عربی عادل زعیتر ص ۱۵)

میں آباد ہوئے، جو عوالی کا علاقہ کہلاتا ہے، خزرج کے قبائل وسطی اور شمالی علاقے میں آباد ہوئے، جو مدینہ کا نشیبی حصہ ہے، ان کے بعد مغرب میں حَرّۃُ الوبَرۃ تک اور کچھ نہیں ہے۔[۵۱]

خزرج چار قبیلے تھے، (۱) مالک (۲) عدی (۳) مازن (۴) دینار، یہ سب کے سب بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے جنھیں "تیم اللات" کہا جاتا ہے، بنو نجار کے قبائل مدینہ کے اس وسطی حصے میں آباد ہوئے جہاں اب اس وقت مسجد نبوی واقع ہے، اوس مدینہ کے زرخیز زراعتی علاقوں میں مقیم ہوئے، اور یہود کے اہم قبیلوں اور جماعتوں کے پڑوسی بنے، خزرج جہاں ٹھہرے وہ زیادہ سرسبز علاقہ نہ تھا، ان کا صرف ایک بڑا یہودی قبیلہ قینقاع ہی پڑوسی تھا۔[۵۲]

اب اوس و خزرج کے افراد کی یقینی تعداد معلوم کرنا بہت دشوار ہے، لیکن حالات و حوادث پر نظر رکھنے والا ان کی جنگی قوت کا اندازہ، ان جنگوں سے کر سکتا ہے، جن میں وہ ہجرت نبوی کے بعد شریک ہوئے، چنانچہ فتح مکہ کے دن ان کے لڑنے والے افراد کی تعداد چار ہزار تھی۔[۵۳]

مدینہ میں ہجرت کے وقت عربوں ہی کو بالادستی اور اقتدار حاصل تھا، یہود اپنے ان حریفوں کے مقابلے میں متحد اور منظم نہیں تھے، ان کے مختلف قبیلوں میں پھوٹ تھی، کچھ قبیلے اوس کے ساتھ معاہدہ کئے ہوئے تھے، اور کچھ خزرج کے ساتھ تھے، لڑائی کے وقت وہ اپنے ہم مذہبوں کے مقابلے پر عربوں سے زیادہ سخت گیر واقع ہوئے تھے، قینقاع اور بنی نضیر اور بنی قریظہ کی باہمی عداوت ہی کے نتیجے میں بنی قینقاع

---

۵۱ مکہ والمدینہ ص۳۱۱ ۵۲ ایضاً ۵۳ امتاع الاسماع بما للرسول من الابناء والاموال والحفدۃ والمتاع (علامہ تقی الدین احمد بن علی المقریزی) ص۳۶۴ ج۱

اپنے کھیت چھوڑ کر صنعت و حرفت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔[1]

اسی طرح اوس و خزرج کے درمیان بھی بہت سی جنگیں ہوئیں، جن میں سے پہلی جنگ سمیر تھی، آخری جنگ بُعاث تھی، جو ہجرت سے ۵ سال پہلے ہوئی تھی۔[2] یہود، اوس و خزرج کو باہم لڑانے کے لئے سازشیں کرتے اور اختلاف اور مقابلے کی آگ بھڑکاتے رہتے، تاکہ عرب ان کی طرف سے غافل رہیں، عرب بھی اس بات کو محسوس کرتے تھے، اس لئے ان کو "ثعالب" (لومڑی) کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

اس سلسلے میں ابن ہشام نے ابن اسحاق کی روایت سے جو واقعہ لکھا ہے، اس سے اس پر خاصی روشنی پڑتی ہے، اس واقعہ میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک کبیر السن یہودی شعث بن قیس نے ایک جگہ اوس و خزرج کو اسلام قبول کرنے کے بعد ایک مجلس میں بیٹھے لطف و محبت کی باتیں کرتے ہوئے سنا، اس کو یہ منظر دیکھ کر سخت تکلیف ہوئی اور وہ برداشت نہ کرسکا، اس نے ایک یہودی نوجوان کو جس کے انصار سے تعلقات تھے، اشارہ کیا کہ وہ اس مجلس میں شریک ہوجائے، پھر کسی تقریب سے جنگِ بُعاث، اور اس سے پہلے کی جنگوں کا ذکر چھیڑ دے اور ان موقعوں پر کہے ہوئے اشعار پڑھے، تاکہ دونوں قبیلوں کے زخم ہائے کہن تازہ ہوجائیں اور حمیّت جاہلیت اپنا رنگ دکھائے۔

یہ سازش بے نتیجہ نہیں رہی اور ان دونوں قبیلوں کی جو حریفوں اور دشمنوں کی طرح لڑتے تھے، رگِ حمیّت بھڑک اٹھی، قریب تھا کہ تلواریں میانوں سے نکل آئیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مہاجرین کے ساتھ تشریف لے آئے اور اپنے

---

[1] مکہ والمدینہ ۳۲۲ [2] فتح الباری ج ۷، ص۸۵، جنگ بُعاث کی تفصیلات اور اسباب و محرکات کے لئے ملاحظہ ہو کامل ابن الاثیر۔

ارشادات سے ان کے ایمان کی چنگاری کو فروزاں اور ان کے دینی جذبہ کو بیدار کر دیا، ان کو فوراً احساس ہوا کہ وہ ایک گہری سازش کا شکار ہو گئے، ان کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا، اوس و خزرج باہم بغل گیر ہوئے اور ایسا معلوم ہوا کہ کچھ نہیں ہوا تھا۔[۱]

طبعی اور جغرافیائی کیفیت

یثرب ہجرتِ نبوی کے وقت مختلف حصوں میں بٹا ہوا تھا، جن میں یہودی اور عرب قبائل رہتے تھے، اور ہر علاقہ کسی نہ کسی قبیلے کے حصّہ میں تھا، ان علاقوں کی دو قسمیں تھیں، ایک قسم زراعتی زمینوں اور مکانات اور ان کے رہنے والوں پر مشتمل تھی، اور دوسری قسم میں "آطام یا اُطم" یا گڑھیاں اور قلعہ بند محلے تھے،[۲] یہود کی ان گڑھیوں (آطام) کی تعداد ۵۹ تھی[۳] ڈاکٹر ولفنسن ان آطام (گڑھیوں) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> "یثرب میں آطام (گڑھیوں) کی بڑی اہمیت تھی، جہاں دشمن کے حملے کے وقت قبیلے کے لوگ پناہ لیتے تھے، اور خاص طور پر عورتوں، بچوں اور معذور لوگوں کو اس وقت ٹھکانا ملتا تھا جب مرد لڑنے کے لئے چلے جاتے تھے، یہ گڑھیاں گودام کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں جن میں غلے اور پھل جمع کئے جاتے تھے، کیونکہ وہ کھلی جگہوں پر لوٹ اور غارت گری کا نشانہ بن سکتی تھیں، اس کے علاوہ ان میں مال اور ہتھیار بھی رکھے جاتے تھے، یہ دستور تھا کہ سامان سے لدے ہوئے تجارتی قافلے گڑھیوں کے

۱؎ ملاحظہ ہو ابن ہشام ج ۱ ص۵۵۵-۵۵۶ ۲؎ ماخوذ از تاریخ الیہود فی بلاد العرب: اسرائیل ولفنسن ۱۱۶ - ۳؎ وفاء الوفاء فی اخبار دار المصطفٰی للسمہودی - ۱/۱۱۶

قریب ہی اترتے تھے' اور ان ہی گڑھیوں کے دروازں پر بازار بھی لگتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان گڑھیوں میں عبادت گاہیں اور "مدراس" (یہودی مدارس) بھی ہوتے تھے' اس لئے کہ جو عمدہ اور وافر سامان وہاں رہتا تھا اس سے اسی کا پتہ چلتا ہے' وہاں دینی کتابیں بھی رہتی تھیں چنانچہ وہاں بحث و مشورہ کے لئے یہودی سردار جمع ہوتے' جہاں وہ کسی اہم معاملے کو پختہ کرنے یا عہد و معاہدہ کے وقت کتب مقدسہ کی قسمیں کھاتے تھے۔"[1]

ڈاکٹر مذکور "اطم" کی تشریح کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے:۔

"عبرانی زبان میں اس کے معنی بند اور مسدود کر دینے کے ہوں گے' دیواروں کے ساتھ جب یہ لفظ آتا ہے تو اس کے معنی ان کھڑکیوں کے ہوتے ہیں جو باہر سے بند مگر اندر سے کھولی جا سکتی ہوں' اس کا استعمال فصیل یا زبردست حفاظتی دیوار کے لئے بھی ہوتا تھا' اس طرح ہم فرض کر سکتے ہیں کہ یہود "اطم" کو چھوٹے قلعہ کے معنی میں استعمال کرتے تھے' اس میں باہر سے روشندان ہوتے تھے' جو باہر سے بند اور اندر سے کھولے جاتے تھے۔"[2]

یثرب ان ہی محلوں اور قلعہ بندیوں کا نام تھا جو دراصل قریب قریب کی بستیوں کا مجموعہ تھا جن سے شہر بن گیا تھا' قرآن نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ	جو کچھ دیا اللہ نے اپنے رسول کو
مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى (سورہ حشر۔ ۷)	بستیوں والوں سے۔

---

[1] الیہود فی بلاد العرب ۱۱۶۔۱۱۷ [2] ایضاً ۱۱۷

نیز دوسری جگہ فرمایا گیا:۔

لَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ	وہ تم سے اکٹھے نہیں لڑتے مگر یہ کہ
قُرًی مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ	قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں
جُدُرٍ (سورۂ حشر۔۱۴)	کے پیچھے ہوں۔

مدینہ طیبہ میں حرّات کی بھی بڑی اہمیت تھی، حرّۃ لابہ[1] جلے ہوئے سیاہ پتھروں کے اس علاقہ کو کہتے ہیں جن کو آتشیں سیّال مادّہ نے ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے اور جو بالکل بے ترتیب اور سخت نوکیلے اور آڑے ترچھے میلوں کی مسافت میں پھیلے ہوئے ہیں، ان پر نہ پیدل چلنا آسان ہے اور نہ اونٹوں اور گھوڑوں کا گذرنا، مدینے کے دو حرّے مشہور ہیں، ایک جانبِ مغرب جس کو "حرّۃ الوبرۃ" کہتے ہیں اور ایک جانبِ مشرق جو "حرّۃ واقم" کے نام سے مشہور ہے، علامہ مجدالدین فیروز آزادی نے اپنی کتاب "المغانم المطابۃ فی معالم طابۃ" میں متعدد حرّات کا ذکر کیا ہے، جو مدینے کے گرد پھیلے ہوئے ہیں[2]، ان دونوں حرّات (حرّۃ الوبرۃ اور حرّۂ واقم) نے مدینے کو ایک قلعہ بند شہر بنا دیا ہے، جس پر صرف شمالی جانب سے فوج کشی ہوسکتی تھی، (اور یہی وہ جانب ہے جس کو غزوۂ احزاب میں خندق کھود کر محفوظ کردیا گیا تھا) جنوبی جانب گھنے نخلستانوں اور باغات اور گنجان آبادی کے ایک دوسرے سے ملے ہوئے مکانات سے ایسی گھری ہوئی ہے کہ ادھر سے بھی بیرونی حملہ مشکل ہے، ہجرت کے لئے مدینے کے انتخاب میں مدینے کے اس قدرتی استحکام اور فوجی خصوصیت

---

[1] لابہ اور لاوا (LAVA) متقارب الصوت اور متقارب المعنی لفظ ہیں، یہ اس آتش گیر مادہ کو کہتے ہیں جو کسی کوہِ آتش فشاں سے یا طبقات الارض کی کسی تبدیلی سے ابل کر بہتا ہے۔ [2] ملاحظہ ہو ص ۱۰۔۱۱۴

کو بھی دخل تھا۔[1]

حرۂ واقم جو مدینے کے مشرق میں تھا وہ حرۃ الوبرہ سے زیادہ آباد تھا، جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یثرب کو ہجرت فرمائی تو حرۂ واقم میں یہود کے اہم قبائل جیسے بنو نضیر و بنو قریظہ وغیرہ رہتے تھے، ان کے ساتھ اوس کی اہم شاخیں بنو عبد الاشہل، بنو ظفر، بنو حارثہ، بنو معاویہ بھی وہیں مقیم تھے، واقم بنی الاشہل ہی کے علاقے میں تھا جس کے نام پر حرۂ واقم تھا۔[2]

دینی حالت اور معاشرتی حیثیت

مدینہ کی عرب آبادی بیشتر معاملات میں قریش ہی کے تابع رہتی تھی، اور اہلِ مکہ قریش کو کعبہ کا متولی، دینی رہنما اور عقیدہ و عمل میں لائقِ تقلید مثال سمجھتے تھے، وہ جزیرۃ العرب میں پھیلی ہوئی بت پرستی کے تو تابع تھے ہی لیکن خاص طور پر انہی بتوں کو پوجتے تھے، جنھیں قریش اور اہلِ حجاز پوجتے تھے، الا یہ کہ بعض قبائل کی بعض علاقائی بتوں سے زیادہ وابستگی تھی، اس طرح مناۃ اہلِ مدینہ کا سب سے محبوب اور پرانا بُت تھا اور اوس و خزرج اس کو مقدس ترین سمجھتے تھے، اور اسے خدا کا شریک ٹھہراتے تھے، یہ بُت جبلِ قُدید کے مقابل مشلل کے مقام پر واقع تھا، جو ساحل کی طرف مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے "لات" اہلِ طائف کا محبوب بُت تھا، عزّیٰ اہلِ مکہ کا قومی بت تھا، اس لئے ان شہروں کے لوگ اپنے اپنے ان بتوں سے جذباتی تعلق رکھتے تھے، اہلِ مدینہ میں سے جو کوئی لکڑی یا کسی چیز کا بت اپنے گھر میں رکھتا تو

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب کا باب "یثرب کی خصوصیات" [2] منزل الوحی للدکتور محمد حسین ہیکل ص ۵۲۷

اسے "مناۃ" ہی کے نام سے پکارتا جیسا کہ بنی سلمہ کے ایک سردار عمرو بن الجموح نے اسلام لانے سے پہلے بنا رکھا تھا۔[۱]

امام احمدؒ نے عروۃؓ کے حوالے سے حضرت عائشہؓ سے "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ[۲]" الآیہ کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا "انصار اسلام لانے سے پہلے مناۃ کے نام پر تلبیہ پڑھتے تھے، اور جس کی وہ مشلل کے پاس پوجا کرتے تھے، اور اس کے نام پر حج شروع کرنے والا صفا و مروہ کی سعی صحیح نہیں سمجھتا تھا[۳]، جب لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ ہم زمانۂ جاہلیت میں صفا و مروہ کے طواف میں حرج سمجھتے تھے، تو اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ" الآیہ۔

ہم مدینے میں کسی اور بُت کے بارے میں نہیں جانتے کہ وہ لات و مناۃ یا عزّیٰ و ہبل کی طرح مشہور ہوا ہو اور لوگ اس کی عبادت کرتے اور اس کے لئے مدینہ کے باہر سے آتے ہوں، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکہ کی طرح مدینہ میں بتوں کی کثرت نہ تھی، اس لئے کہ مکہ کے ہر گھر میں ایک خاص بُت ہوتا تھا، مکہ میں بتوں کو لوگ پھیری میں لے کر نکلتے اور بیچتے تھے، بہر حال مکہ بت پرستی میں مقتدیٰ اور رہنما کی حیثیت رکھتا تھا، اور مدینے کی حیثیت ذیلی تھی۔

اہلِ مدینہ سال کے دو دنوں میں کھیل کود کا تیوہار مناتے تھے، نبی صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینے تشریف لائے تو اہلِ مدینہ سے فرمایا "قد ابدلکم اللہ تعالیٰ بہما

---

۱ ماخوذ از "بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب" از علامہ محمود شکری الآلوسی ۱/۳۴۶ - ۲/۲۰۶

۲ اس میں صحابہ سے اور کئی روایتیں بھی منقول ہیں۔ ۳ سورۂ بقرہ - ۱۵۸

خیراً منھما یوم الفطر والاضحیٰ[1]" (اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان دو دنوں سے بہتر دن عطا کئے ہیں: یوم فطر اور عید الاضحیٰ) بعض شارحینِ حدیث نے ان دونوں کے متعلق بتایا ہے کہ وہ نوروز اور مہرجان کے دن تھے، جنھیں شاید ان لوگوں نے اہلِ ایران سے لیا تھا[2]۔

اوس و خزرج کی شرافتِ نسب کا اعتراف قریش کو بھی تھا جو عرب عاربہ سے تعلق رکھنے والے بنو قحطان کی شاخ میں سے تھے، قریش ان سے شادی بیاہ کا تعلق بھی رکھتے تھے، چنانچہ سیّدِ قریش ہاشم بن عبد مناف نے بنی النجار میں شادی کی تھی، ان کی شادی سلمیٰ بنت عمرو بن زید سے ہوئی تھی جو بنی عدی بن النجار سے تھیں، جو خزرج کی ایک شاخ ہے اس کے باوجود قریش اپنے کو مدینہ کے عرب قبائل سے برتر سمجھتے تھے، غزوۂ بدر کے دن جب عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ نے مسلمانوں کو دعوتِ مبارزت دی اور ان کے مقابلہ پر انصار کے کچھ نوجوان نکلے تو انھوں نے پوچھا تم کون ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم انصار ہیں، تو انھوں نے کہا کہ ہمیں تم سے مطلب نہیں، پھر ان میں سے ایک آدمی نے آواز دی کہ اے محمدؐ ہمارے مقابلے پر ہمارے ہم قوم اور ہمارے ہمسر افراد بھیجئے، اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبیدہ بن الحارث! تم بڑھو، حمزہ تم بڑھو، علی تم کھڑے ہو، تو جب یہ لوگ ان کے قریب گئے اور اپنے نام بتائے تو قریش نے کہا کہ ہاں یہ شریف ہمارے جوڑ کے ہیں[3]۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قریش کاشت کاری کو (جس کے اہلِ مدینہ اپنے علاقائی

---

[1] صحیحین [2] بلوغ الارب [3] ابن ہشام ج ۱ ص ۶۲۵

حالات کی وجہ سے عادی تھے) کس قدر حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اس کا اظہار ابوجہل کے اس جملے سے بھی ہوتا ہے جسے عفراء کے دو[1] انصاری لڑکوں نے قتل کیا تھا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس نے جاں کنی کے عالم میں کہا "لو غیر اکار قتلنی"[1] (کاش ایک کسان کے علاوہ کسی نے مجھے قتل کیا ہوتا۔)

اقتصادی اور تمدنی حالت

مدینہ اپنی زمین کی نوعیت کے لحاظ سے ایک زرعی علاقہ تھا، اس لئے اس کے باشندوں کا انحصار زراعت اور باغبانی ہی پر تھا، اس کی اہم پیداواروں میں کھجوریں اور انگور تھے، کیونکہ وہاں ان کے بہت سے باغ تھے[2] جن میں بہت سے ٹٹیوں والے اور بہت سے بے ٹٹی کے تھے، اور کھیتیاں اور کھجور کے درخت دو[3] تنے کے اور ایک تنے کے ہوتے تھے۔

کھیتی میں مختلف غلّے اور سبزیاں ہوتی تھیں، کھجوریں قحط اور خشک سالی کے وقت لوگوں کی بیشتر غذائی ضرورت پوری کرتی تھیں، اور ضرورت کے وقت سکّہ کی طرح

---

[1] علامہ محمد بن طاہر پٹنی نے "مجمع البحار" میں اس کے معنی کسان اور کاشت کار دیئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وہ اہلِ عرب کے نزدیک کم درجہ کا پیشہ ہے، ابوجہل کا مطلب یہ تھا کہ عفرا کے لڑکے کسان ہیں، اس لئے اگر کسی اور نے قتل کیا ہوتا تو یہ عار نہ لگتا۔ ج ۱ ص ۶۸

[2] بیرحاء کے بارے میں ابوطلحہؓ کی حدیث ملاحظہ کریں جسے شیخین نے روایت کیا ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینے میں ایسے گھنے باغ بھی تھے کہ گوریا (کنجشک) جیسی چھوٹی چڑیا بھی گھس کر نکل نہیں پاتی تھی، ابوطلحہ انصاریؓ کے قصے میں ہے کہ وہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں ایک گوریا باغ سے نکلنے کے لئے اِدھر اُدھر اڑنے لگی، چنانچہ اس عجیب منظر کو وہ کچھ دیر تک دیکھتے رہے، اسی قصے میں آگے ہے کہ اس غفلت کی وجہ سے انھوں نے اس باغ کو صدقہ کر دیا۔ (ملاحظہ ہو مؤطا امام مالکؒ) [3] ملاحظہ ہو سورۃ الانعام ۱۴۱۔ اور الرعد ۴۔

ان سے بیع وشراء میں مدد لی جاتی تھی، اس طرح کھجور کے باغ اہلِ مدینہ کی زندگی میں بڑے خیر و برکت کا سرمایہ تھے، ان سے وہ غذا بھی حاصل کرتے اور صنعت و تعمیرات اور ایندھن اور جانوروں کو کھلانے کے کام میں بھی لاتے تھے۔[1]

مدینے کے کھجوروں کی بہت سی قسمیں تھیں جن کا احاطہ مشکل ہے،[2] اہلِ مدینہ کو طویل تجربے سے کھجوروں کی پیداوار کی افزائش اور عمدگی کے بہت سے طریقے معلوم تھے، جن میں سے نر و مادہ کی تمیز اور ان کے زیروں کا استعمال بھی تھا جس کو "تابیر" کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔[3]

باغبانی اور زراعت کا مطلب یہ نہیں کہ مدینہ میں کوئی تجارتی سرگرمی تھی ہی نہیں، البتہ مکہ کی طرح اس کی گرم بازاری نہ تھی، کیونکہ بے آب و گیاہ وادیٔ مکہ کے لوگوں کا انحصار قدرتی طور پر تجارت اور موسم سرما و گرما کے تجارتی سفروں پر تھا۔

مدینہ کی بعض صنعتیں یہودیوں ہی کے ساتھ مخصوص تھیں جنھیں شاید وہ یمن سے لائے تھے، بنی قینقاع کے لوگ عام طور پر سناری اور زرگری کا پیشہ کرتے تھے، اور یہود مدینہ میں سب سے زیادہ مال دار تھے، ان کے گھر مال و دولت اور سونے چاندی سے بھرے ہوئے تھے۔[4]

---

[1] ملاحظہ ہو بخاری کتاب العلم (باب طرح الامام المسألة علی الناس لیختبر ما عندھم من العلم) اور اس کی شرح ابن حجر کی "فتح الباری" یا عینی کی "عمدۃ القاری" میں ملاحظہ ہو۔ [2] کھجور سے متعلق عربی میں الفاظ کا جو وسیع ذخیرہ پایا جاتا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عربوں کی زندگی میں عموماً اور اہلِ مدینہ کی زندگی میں خصوصاً کھجور کو کیسی اہمیت و مرکزیت حاصل تھی، مثال کے طور پر ابن قتیبہ کی "ادب الکاتب" ثعالبی کی "فقہ اللغۃ" اور ابن سیدہ کی "المخصص" ملاحظہ ہوں، بہت سے اہلِ علم نے کھجور پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ [3] تابیر کا مطلب مادہ کھجور کے خوشوں کو چیر کر نر کھجور کے زیرے ڈالنے کے ہیں (شرح مسلم للنووی) [4] الیہود فی بلاد العرب ص ۱۲۸

مدینہ کی زمین آتش فشاں علاقوں (حرات) کی موجودگی کی وجہ سے بہت زیادہ زرخیز واقع ہوئی ہے جس کی وادیوں میں سیلاب کا پانی بھی خوب بہتا ہے اور زمینوں کے ساتھ کھیتوں اور باغوں کو بھی سیراب اور شاداب کرتا جاتا ہے، ان میں سب سے مشہور وادیٔ عقیق تھی، جو مدینے کی تفریح گاہ تھی، اس میں پانی بافراط بہتا تھا، اور باغوں کی کثرت تھی، مدینے کی زمین کنویں کھودنے کے لئے بھی بہتر تھی، جن کا باغات میں عام رواج تھا۔ باغات کے گرد چہار دیواری بھی ہوتی تھی، ایسے باغ کو اہلِ مدینہ حائط کہتے تھے،[۱]

اسی طرح مدینے کے بہت سے کنویں اپنے پانی کی فراوانی و شیرینی کے لئے مشہور تھے، وہاں نہریں اور رہٹ کا نظام بھی تھا، جس کے ذریعہ وہ اپنے باغوں تک پانی پہنچاتے تھے۔[۲] غلّوں میں اوّلیت جو اور پھر گیہوں کو حاصل تھی، اور سبزیوں اور ترکاریوں کی تو بہتات تھی، کھیتی کے معاملات کی کئی قسمیں تھیں، مثلاً مزابنہ، محاقلہ، مخابرہ، معاومہ،[۳]

---

[۱] صحیح بخاری (کتاب المغازی) میں کعبؓ بن مالک کی ابتلاء کا واقعہ دیکھئے جس میں آیا ہے کہ "جب مجھ پر لوگوں کی سختی اور بے اعتنائی بڑھ گئی تو میں حائط ابی قتادہ کی دیوار پر چڑھا جو میرا چچیرا بھائی تھا الخ

[۲] ابوہریرہؓ کی وہ حدیث پڑھیں جسے مسلم نے روایت کیا ہے، اور جس میں ایک باغ کے سیراب کرنے کا ذکر آیا ہے، اور اسی میں "شراج" (پانی کی نالیاں) اور "مسحاۃ" (پھاوڑے) سے آب رسانی کا بھی ذکر ہے۔

[۳] صحاح میں حرث و مزارعۃ کے ابواب دیکھئے، مزابنہ درخت میں لگی ہوئی کھجوروں کو نقد کھجوروں سے بیچنے کو کہتے ہیں، محاقلہ خوشوں میں لگے ہوئے غلّے کو نقد غلّے یعنی جو کو جو کے بدلے اور گیہوں کو گیہوں کے بدلے تول کر لینے کو کہتے ہیں، مخابرۃ اور مزارعۃ کچھ یکساں ہیں، یہ زمین کی پیداوار کی تہائی یا چوتھائی پر معاملہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن مزارعۃ میں بیج مالک کے ہوتے ہیں، اور مخابرۃ میں بیج کاشتکار کے، اہلِ لغت کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ وہ ایک ہی ہیں، مزارعۃ و مخابرہ کی صحت میں خلف و سلف کا اختلاف مشہور ہے (ماخوذ از شرح مسلم للنووی) معاومۃ کئی سال کی فصلوں کو بیچ دینے کو کہا جاتا ہے، جیسے درخت کے پھل دو، تین سال یا زیادہ کے لئے بیچ دیئے جائیں۔

ان شکلوں میں سے بعض کو اسلام نے باقی رکھا اور بعض کو منع کر دیا یا اس کی اصلاح کر دی۔

مکہ اور مدینہ میں جو سکے رائج تھے، وہ ایک ہی تھے، اور ہم ان کا تفصیل سے مکہ کے سلسلہ میں ذکر کر چکے ہیں، اہل مکہ کے مقابلے میں اہلِ مدینہ کو ناپ تول کے پیمانوں سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا، کیونکہ وہاں کے باشندوں کا سرمایہ غلے اور پھل ہی تھے، مدینے میں استعمال ہونے والے پیمانے یہ تھے "مُدّ، صاع، فرق، عرق، وسق[۱]" وزن کے لئے یہ چیزیں تھیں، درہم، شقاق، دانق، قیراط، نواۃ، رطل، قنطار، اور اوقیہ[۲]۔

مدینہ اپنی زرخیزی کے باوجود غذائی طور پر خود کفیل نہ تھا، اس لئے وہاں کے باشندے باہر سے بھی غذائی اشیاء درآمد کرتے تھے، وہ میدہ کا آٹا، گھی، اور شہد شام سے لاتے تھے، جیسا کہ ترمذی نے قتادہ بن نعمانؓ سے روایت کیا ہے جس میں آیا ہے کہ مدینے کے لوگوں کی غذا کھجوریں اور جو تھے، اور جب آدمی خوشحال ہوتا تو جب شام سے ضافط[۳] (تاجر) میدہ[۴] لے کر آتا تو اس سے اپنے لئے وہ چیزیں خرید لیتا لیکن اہل و عیال کھجوریں اور جو ہی کھاتے تھے[۵] یہ قصہ مدینہ کی غذائی صورت حال اور معیار زندگی کے اختلاف پر کافی روشنی ڈالتا ہے، جو ہجرت کے بعد اچانک سامنے آگئی تھی۔

یہود جن کی فطرت اور تاریخ ہر جگہ یکساں رہی ہے، مدینہ میں بھی عربوں سے زیادہ

[۱،۲] تفصیل کے لئے حدیث اور خلافات کی کتابیں دیکھیں اور اوزان کے لئے دیکھیں "التراتیب الاداریۃ" ۱/۴۱۵۔ [۳] ضافط کے متعلق علامہ محمد طاہر پٹنی کہتے ہیں ضافط اور ضفاط اسے کہا جاتا تھا جو مال و اسباب شہروں تک پہونچاتا تھا، یہ نبطی قوم کے افراد ہوتے تھے، جو مدینے تک آٹا، تیل وغیرہ پہونچاتے تھے، (مجمع البحار ۳/۴۱۰ طبع حیدرآباد) [۴] یہاں درمک کا لفظ آیا ہے جو سفید میدہ کو کہتے ہیں، اس کا واحد درمکہ ہے۔ [۵] ملاحظہ ہو آیت "وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا" کی تفسیر ترمذی میں۔ (سورۃ النساء-۱۰۷)

مالدار واقع ہوئے تھے، عرب اپنے بدوی اور قومی مزاج کی وجہ سے مستقبل کے بارے میں زیادہ سوچنے کے عادی نہ تھے کہ اس کے لئے مال جمع کرنے کی فکر کرتے، اس کے ساتھ ہی وہ مہمان نواز اور فیاض بھی تھے، اس وجہ سے یہود سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتے تھے، اور یہ قرض اکثر سودی یا رہنی ہوتا تھا۔

اہلِ مدینہ کے پاس اونٹ، گائیں اور بکریاں بھی تھیں، اونٹ کو زمین کی سینچائی کے لئے بھی استعمال کرتے تھے، اور ایسے اونٹوں کو الابل النواضح کہتے تھے، ان کے پاس چراگاہیں بھی تھیں، جن میں مشہور "زغابۃ" اور "غابۃ" تھیں، جہاں سے لوگ لکڑیاں بھی حاصل کرتے اور مویشیوں کو چراتے بھی تھے[1]، گھوڑوں کو وہ جنگوں میں استعمال کرتے تھے، اگرچہ وہ مکّے کی بہ نسبت کم تعداد میں پائے جاتے تھے، بنو سلیم گھوڑوں کے لئے مشہور تھے، جنھیں وہ باہر سے درآمد کرتے تھے۔

مدینے میں کئی بازار بھی تھے، جن میں سب سے اہم، سوق بنی قینقاع تھا، جو سونے اور چاندی کے زیورات و مصنوعات اور کپڑے والوں کا خاص بازار تھا، اس وقت مدینے میں سوتی اور ریشمی کپڑے، رنگین غالیچے اور منقّش پردے[2] عام طور پر موجود تھے، عطر فروش مختلف قسم کے عطر اور مشک فروخت کرتے تھے، اسی طرح عنبر اور پارے[3] کے تاجر بھی پائے جاتے تھے، خرید و فروخت کی بہت سی

---

[1] یاقوت حموی کی "معجم البلدان" اور سمہودی کی "وفاء الوفاء" ملاحظہ ہو [2] حضرت عائشہ رضی کی حدیث ملاحظہ ہو، جسے شیخین نے روایت کیا ہے، اس میں قرام کا ذکر آیا ہے، قرام کے بارے میں علامہ پٹنی کہتے ہیں کہ وہ باریک پردہ یا کئی رنگوں کی اون کی چادر یا وہ پردہ ہوتا ہے جو حجلۂ عروسی میں لگتا ہے کہا جاتا ہے کہ وہ مزیّن و منقّش بھی ہوتا ہے (مجمع بحار الانوار ۴/۲۵۸) [3] التراتیب الاداریۃ ۱/۹۷

قسموں میں سے بعض کو اسلام نے باقی رکھا، اور بعض کو روک دیا، جیسے نجش و احتکار، تلقی الرکبان، بیع المصراۃ (جانوروں کے تھن میں دودھ محفوظ کرکے بیچنا) بیع نسئیہ بیع الحاضر للبادی، بیع المجازفہ، بیع المزابنہ اور مخاضرۃ[1]، اوس و خزرج کے کچھ لوگ بھی سودی کاروبار کرنے لگے تھے، مگر وہ یہود کی نسبت بہت ہی کم تھا۔

مدینے کی تمدنی زندگی میں وہاں کے باشندوں کے مزاج و خوش مذاقی کے سبب خاصی ترقی ہو چلی تھی، چنانچہ دو منزلہ مکان بننے لگے تھے[2]۔

بعض گھروں کے ساتھ پائیں باغ بھی تھے، وہ میٹھے پانی کے عادی تھے، جسے انھیں کبھی دُور سے بھی لانا پڑتا تھا، بیٹھنے کے لئے کرسی کا استعمال بھی ہوتا تھا[3] شیشے اور پتھر کے پیالے اور آبخورے استعمال میں آتے تھے، اور مختلف قسم کے چراغ استعمال ہوتے تھے[4]، گھر اور کھیت کے کاموں میں چھوٹی ٹوکریاں اور زنبیلیں کام میں لائی جاتی تھیں، مال داروں خصوصاً یہود کے گھروں میں خاصا فرنیچر پایا جاتا تھا قسم قسم کے زیورات بھی استعمال ہوتے تھے، جیسے کنگن اور بازوبند، پازیب اور کڑے، کان کے بُندے اور بالیاں، انگوٹھیاں اور سونے یا یمنی دانوں کے ہار وغیرہ[5]۔

---

[1] کتب حدیث و فقہ کے ابواب بیع اور "مجمع بحار الانوار" ملاحظہ ہوں، جہاں ان لفظوں کی شرح اور ان کی حِلّت و حُرمت کے احکام ملیں گے [2] ملاحظہ ہو حدیث ہجرت اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قیام فرمانے کا واقعہ۔ [3] التراتیب الاداریہ ۱/۹۷ [4] ایضاً ص۱۰۴ [5] واقعۂ افک میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ملاحظہ ہو، جسے بخاری نے کتاب المغازی میں نقل کیا ہے، اس میں "جزع" کا لفظ ہے جو سیاہ سفید رنگ کے دانوں کو کہتے ہیں۔

عورتوں میں بُننے اور کاتنے کا عام رواج تھا، اور سلائی، رنگائی، معماری اور خشت سازی اور سنگ تراشی اِن صنعتوں میں تھیں جو ہجرت سے بہت پہلے ہی مدینے میں معروف تھیں۔

یثرب کا پیچیدہ اور ترقی یافتہ معاشرہ

اس طرح یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین نے مکہ سے یثرب نام کے کسی گاؤں کی طرف سفر نہیں کیا تھا بلکہ وہ حضرات ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف منتقل ہوئے تھے، اگرچہ یہ دوسرا شہر پہلے شہر کے مقابلے میں زندگی کے بہت سے مظاہر میں مختلف تھا، اور نسبتہً مکّہ سے کچھ چھوٹا بھی تھا، لیکن وہاں کی زندگی پیچیدگی میں مکّہ سے بڑھی ہوئی تھی، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پیش آنے والے مسائل مختلف نوعیّت کے تھے، کیونکہ وہاں کئی مذاہب اور معاشرے اور ثقافتیں موجود تھیں جن پر قابو پاتے اور مدینہ کو ایک عقیدے اور ایک دین کے رنگ میں رنگنے کا کام مُؤیَّد من اللہ رسول ہی کر سکتا تھا، جسے اللہ نے حکمت و بصیرت اور قوتِ فیصلہ اور انسانیت کے بکھرے شیرازے کو جمع کرنے اور متحارب قوتوں اور نظریوں کو ہدایت اور تعمیرِ انسانیت کے کام میں ایک دوسرے کا مددگار بنانے کی غیر معمولی صلاحیّت سے نوازا تھا، اور جسے ایک دلکش شخصیّت عطا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے کتنا صحیح کہا ہے کہ:-

هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ — وہی ہے جس نے اپنی مدد اور مسلمانوں

وَبِالْمُؤْمِنِينَ ۝ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

(سورۃ الانفال ۶۲-۶۳)

کے ذریعہ آپ کی پُشت پناہی کی اور ان کے دل ملا دیئے کہ اگر آپ دنیا کی ساری دولت بھی خرچ کر دیتے تب بھی ان کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے، لیکن اللہ ہی نے ان میں جوڑ اور اتفاق پیدا کر دیا، وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

مدینہ میں

مدینہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا استقبال کس طرح کیا؟

انصار کو یہ اطلاع ہو گئی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہو چکے ہیں، چنانچہ انھوں نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد شہر کے آخری کنارہ پر پہونچ جاتے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا انتظار شروع کر دیتے، اور اس وقت تک وہاں سے نہ ہٹتے جب تک کہ دھوپ بہت تیز اور ناقابلِ برداشت نہ ہو جاتی اور وہ سائے کی پناہ لینے پر مجبور ہوتے، اس وقت وہ اپنے اپنے گھروں میں چلے جاتے، یہ گرمی کا موسم اور سخت تپش کا زمانہ تھا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جس وقت مدینہ تشریف لائے اس وقت انصار انتظار کے بعد اپنے گھروں میں جا چکے تھے، سب سے پہلے آپ پر ایک یہودی کی نظر پڑی، یہودی انصار کو روزیہ سب کرتے دیکھتے تھے، آپ کو دیکھ کر اس نے بہت زور سے آواز لگائی، اور انصار کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی اطلاع دی، وہ سب یہ سنتے ہی نکل پڑے اور دیکھا کہ حضورؐ ایک کھجور کے درخت کے نیچے تشریف فرما ہیں، اور آپ کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ ہیں، جو آپ ہی کے ہم عمر معلوم ہوتے تھے، ان میں سے اکثر لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس سے پہلے زیارت نہیں کی تھی،

اس لئے ان لوگوں نے اپنے ذوق وشوق میں دونوں کو گھیر لیا اور ہجوم بڑھنے لگا، حضرت ابو بکرؓ نے یہ محسوس کرلیا کہ لوگ یہ نہیں سمجھ پائے ہیں کہ ان میں مخدوم کون ہے اور خادم کون؟ چنانچہ انھوں نے ایک چادر لے کر حضورؐ کے سر پر سایہ کرلیا، اور اس سے یہ شبہ زائل ہوگیا۔[1]

تقریباً پانچ سو انصاریوں نے اس مبارک قافلہ کا استقبال کیا اور آخر میں ادب کے ساتھ عرض کیا حضور! تشریف لے چلیں' آپ ہر طرح مامون ومحفوظ ہیں اور آپ کی ہر بات میں اطاعت کی جائے گی' رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفیق سفر اس قافلے کے جلو میں روانہ ہوئے' اور اِدھر سارا مدینہ آپؐ کے استقبال اور خوش آمدید کے لئے نکل کھڑا ہوا، خواتین کوٹھوں کی چھتوں سے نئے قافلے کو دیکھ رہی تھیں اور ایک دوسرے سے کہتی تھیں کہ دیکھو' ان میں حضورؐ کون ہیں؟ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ پھر ہم نے کبھی ایسا نظارہ نہیں دیکھا۔[2]

لوگ راستوں اور گزرگاہوں پر اور مکانوں کی چھتوں' کھڑکیوں اور دروازوں پر جمع ہوگئے تھے' لڑکے اور نوکر خدمت گار ہر طرف کہتے تھے' اللہ اکبر جاء رسول اللہ' اللہ اکبر جاء محمد' اللہ اکبر جاء محمد' اللہ اکبر جاء رسول اللہ (اللہ اکبر رسول اللہ تشریف لے آئے' اللہ اکبر محمد تشریف لائے' اللہ اکبر رسول اللہ تشریف لے آئے۔[3])

براء بن عازبؓ جو اس وقت کم سن تھے بیان کرتے ہیں کہ میں نے اہلِ مدینہ کو کسی چیز سے اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا جتنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد سے،

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص۴۹۳ [2] امام احمد بروایت انس ابن مالکؓ (ابن کثیر ج ۲ ص۲۶۹)

[3] صحیح بخاری ومسلم بطریق اسرائیلؒ بروایت ابو بکر رضی اللہ عنہ (حدیث ہجرت)۔

لونڈیاں تک پکارتی پھر رہی تھیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔[1]

مسلمانوں نے آپ کی آمد آمد سے خوش ہو کر جوش و مسرّت کے ساتھ نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ اس سے بڑھ کر ان کے لئے کوئی مسرّت نہ ہو سکتی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مدینہ اس وقت مسکرا، اور فخر و مسرّت سے اٹھلا رہا ہو، انصار کی بچیاں بڑے سرور و مستی کے عالم میں یہ اشعار پڑھتی تھیں۔[2]

طلع البدر علینا   من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا   ما دعا للہ داع

ایہا المبعوث فینا   جئت بالامر المطاع[3]

---

[1] صحیح بخاری (باب مقدم النبی صلے اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینہ) [2] ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۹ بیہقی بروایت عائشہؓ

[3] حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں اس موقع پر ایک علمی بحث پیدا کر دی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ثنیۃ الوداع جس کا ذکر ان اشعار میں آیا ہے مکہ سے مدینے آنے والے کے راستہ میں (جو جنوب سے شمال کی طرف آتا ہے) نہیں پڑتا ہے اس لئے کہ ثنیۃ الوداع شام جانے والے یا شام سے آنے والے کے راستہ میں واقع ہے، ان کی تحقیق ہے کہ یہ اشعار اس موقع پر پڑھے گئے جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تبوک سے بڑی عزّت و کامرانی کے ساتھ واپس تشریف لا رہے تھے، خود صحیح بخاری میں غزوۂ تبوک کی واپسی پر ثنیۃ الوداع کا ذکر کیا گیا ہے۔

لیکن عام طور پر اہل سیر جن میں سیرت کے قدیم مصنفین بھی شامل ہیں ان اشعار کو مکہ سے تشریف آوری کے موقع پر نقل کرتے ہیں، راقم نے بعض ایسے حضرات سے دریافت کیا جو مدینے کے گلی کوچے سے واقف تھے، انھوں نے کہا کہ مکہ سے آنے والا بھی یہ راستہ اختیار کر سکتا ہے، اور ہجرت جن حالات میں پیش آئی ان میں یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ آپ نے عام راستہ چھوڑ کر ثنیۃ الوداع سے مدینہ کا رخ فرمایا ہو (باقی ص ۲۵۴ پر)

ترجمہ:۔ ۱۔ پہاڑی کے اس موڑ سے جہاں سے قافلے رخصت کئے جاتے ہیں آج چودھویں کا چاند نکل آیا ہے۔

۲۔ جب تک دنیا میں اللہ کا ایک نام لینے والا بھی رہے گا، ہم پر شکرادا کرنا واجب رہے گا۔

۳۔ اے وہ ذات پاک جس کو ہمارے درمیان بھیجا گیا ہے آپ واجب الاطاعت حکم لے کر آئے ہیں۔

انس ابن مالکؓ انصاری، جو اس وقت کم عمر تھے، کہتے ہیں کہ جس دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے ہیں، میں حاضر تھا، واقعہ یہ ہے کہ میں نے کوئی دن اس سے زیادہ حسین اور روشن نہیں دیکھا جس دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

(باقی ص۲۵۳ کا) اس کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مدینہ میں ثنیۃ الوداع کے نام کا ایک ہی مقام نہ تھا، مکہ کے راستہ میں بھی ایک ایسی چڑھائی تھی جس کے آثار پر وادی عقیق واقع تھی، اور وہ چاروں طرف سے حرّہ سے گھری ہوئی ہے، یہ اس زمانہ میں اہلِ مدینہ کی ایک سیرگاہ بھی تھی، جہاں گرمیوں میں شام کو لوگ جمع ہوتے تھے، یہ بالکل ممکن ہے کہ ان اشعار میں اسی مقام کی طرف اشارہ ہو، تاریخ کی بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مدینہ مکہ جانے والوں کو یہاں تک پہونچانے آتے تھے (آثار المدینۃ المنورہ ص۱۶ طبع سوم)۔

خود ان اشعار میں اس امر کی داخلی شہادتیں پائی جاتی ہیں کہ یہ ترانۂ شکر و مسرّت اسی وقت گایا گیا ہے جب پہلی مرتبہ مدینہ آپؐ کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف ہوا، اشعار کی بے ساختگی، جوشِ مسرّت اور خاص طور پر آخری شعر "ایہا المبعوث فینا۔ جئت بالامر المطاع" بول رہا ہے کہ یہ اشعار اس وقت پڑھے گئے جب اہلِ مدینہ کی آنکھیں پہلی مرتبہ آپؐ کے دیدار پُرانوار سے روشن ہوئیں، اگر غزوۂ تبوک کے موقع پر بھی یہ اشعار پڑھے گئے جیسا کہ بعض صحیح روایات میں آیا ہے تو اس میں کوئی استبعاد نہیں کہ اس طرح کا ترانۂ مسرّت بار بار استقبال کے موقع پر گایا جا سکتا ہے

ہمارے ہاں (مدینہ) تشریف لائے۔[1]

مسجد قُباء اور مدینہ کا پہلا جمعہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے "قُباء" میں چار روز قیام فرمایا اور ایک مسجد کی بنیاد رکھی، جمعہ کے روز آپ وہاں سے آگے روانہ ہوئے، جمعہ بنی سالم بن عوف کی برادری میں پڑا، چنانچہ جمعہ کی نماز آپ نے ان ہی کی مسجد میں ادا کی، جمعہ کی یہ پہلی نماز تھی، جو آپ نے مدینہ میں پڑھی۔[2]

ابو ایوب انصاریؓ کے گھر میں

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شہر سے گذرے تو راستوں میں جماعتیں بنا بنا کر لوگوں نے آپ سے اس کی درخواست کی کہ آپ ان کے ہاں قیام فرمائیں، وہ کہتے تھے، آپ ہمارے ہاں اقامت فرمائیں، تعداد، سامان، اور عزّت و شوکت کے ساتھ، کبھی کبھی لوگ آپ کی اونٹنی کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے لیتے، آپ فرماتے کہ، اس کو جانے دو، یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے، ایسا کئی بار ہوا۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بنی النجّار کے محلہ سے گزرے تو بچیوں اور باندیوں نے ان اشعار سے آپ کا استقبال کیا۔

نحن جوارٍ من بنی النجّار	یا حبّذا محمد من جارٍ[3]
ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں۔	اے خوشا بخت کہ محمدؐ آج ہمارے پڑوسی ہیں۔

---

[1] دارمی بروایت انسؓ [2] ابن ہشام ص۴۹۴ [3] بیہقی بروایت انس بن مالکؓ (ابن کثیر ج۲ ص۱۷۷)

جب آپؐ بنی مالک بن النجّار کے گھر تک پہونچے تو اونٹنی ایک جگہ پر، جہاں آج مسجدِ نبوی کا دروازہ ہے، خود بخود ٹھہر گئی، اس وقت اس جگہ کھجور کا ایک کھلیان تھا، جو بنی نجّار کے دو یتیم لڑکوں کی ملکیت تھا، اور وہ آپؐ کے ننھیالی رشتہ دار بھی تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اونٹنی سے اترے، ابو ایوب انصاریؓ (خالد بن زید النجّاری الخزرجی) نے فوراً آپ کا سامان اتروایا اور اٹھا کر لے گئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہیں قیام فرمایا، ابو ایوب انصاریؓ نے آپؐ کی میزبانی، ضیافت، خاطر مدارات اور ادب و تعظیم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، بالائی منزل میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بلند ہو کر رہنا ان کو گوارا نہ ہوا وہ نیچے آ گئے، اور حضورؐ سے درخواست کی کہ آپؐ اُوپر تشریف رکھیں، وہ اور ان کے گھر والے نیچے رہیں گے، آپؐ نے ارشاد فرمایا، ابو ایوبؓ ہم کو اور ہمارے ملنے والوں کو اسی میں زیادہ راحت ہوگی کہ ہم نیچے رہیں۔

ابو ایوب انصاریؓ کچھ خوش حال لوگوں میں نہ تھے لیکن آج اپنے گھر میں آپؐ کے قیام سے ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، اور اس سرفرازی اور عزّت (جو اللہ تعالےٰ نے ان کو عطا کی تھی) کے شکر ادا کرنے سے ان کی زبان قاصر تھی، محبّت، خدمت و راحت رسانی کے آداب خود سکھا دیتی ہے، ابو ایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے رات کا کھانا تیار کر کے بھیجتے، اگر آپ کا پس خوردہ واپس آتا تو میں اور اُمِّ ایوبؓ اس طرف سے جہاں سے آپؐ نے کھایا ہوتا یہ بچا ہوا کھاتے اور برکت حاصل کرتے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نیچے کی منزل میں تشریف رکھتے تھے، اور ہم لوگ اوپر تھے، ایک مرتبہ مٹکا جس میں ہم پانی رکھتے تھے ٹوٹ گیا، میں نے اور اُمِّ ایوبؓ نے اپنی چادر سے جس کے علاوہ ہمارے پاس اوڑھنے کی کوئی چیز نہ تھی، اس پانی کو خشک کیا کہ کہیں

خدانخواستہ نیچے نہ ٹپکنے لگے اور آپؐ کو تکلیف ہو۔[۵۱]

مسجد نبوی اور مکانات کی تعمیر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دو لڑکوں کو جو اس کھلیان کے مالک تھے، بُلا بھیجا اور ان سے یہ جگہ مسجد کی تعمیر کے لئے خریدنا چاہی، دونوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ ہماری طرف سے ہدیہ ہے لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس کو اس طرح قبول نہ فرمایا، اور کسی نہ کسی طرح قیمت دے کر یہ قطعۂ زمین حاصل کیا اور وہاں مسجد کی تعمیر کی۔[۵۲]

آپؐ نے مسجد کی تعمیر میں بہ نفس نفیس شرکت فرمائی، آپؐ اینٹیں یہاں پہونچاتے تھے، اور مسلمان آپؐ کی پیروی کرتے تھے، اس موقع پر آپ یہ ارشاد فرماتے تھے۔

اللھم ان الاجر اجر الآخرۃ	فارحم الانصار والمہاجرۃ[۵۳]
اے اللہ اصل اجر تو آخرت کی اجر ہے	پس انصار اور مہاجرین پر رحم فرما۔

مسلمان اس وقت بہت مسرور اور شادماں تھے، شوقیہ اشعار پڑھتے اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابوایوب انصاریؓ کے گھر میں سات ماہ قیام فرمایا،[۵۴]

---

۵۱ ابن اسحاق بروایت ابوایوب انصاریؓ (ابن کثیر ج ۲ ص ۲۷۷) ۵۲ صحیح بخاری باب "مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ الی المدینۃ" ۵۳ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۵۱
۵۴ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۷۹۔ یہ ابن سعد کے نزدیک واقدی کی روایت ہے اور فتح الباری میں ابن حجر نے بھی اس کی توثیق کی ہے اور ابن اسحاق کہتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آنے کے سال میں ربیع الاول سے صفر تک قیام کیا، اور وہاں مسجد (نبوی) تعمیر کی، اور سکونت کے لئے گھر بنائے، اس طرح آپ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا حضرت ابوایوبؓ کے یہاں دس ماہ سے زیادہ قیام رہا۔"

جب آپؐ کی مسجد اور رہائشی مکانات تعمیر ہو گئے تو آپؐ وہاں سے یہاں منتقل ہو گئے۔

مہاجرین آپؐ کے بعد مسلسل مدینہ آتے رہے، یہاں تک کہ مکہ میں صرف دو ہی قسم کے آدمی بچے، یا تو وہ جو کسی فتنہ اور آزمائش میں پڑ گئے، یا وہ جو دشمنوں کی قید میں تھے، اور وہاں سے رہائی کی کوئی سبیل نہ تھی، دوسری طرف انصار کا کوئی گھر ایسا نہ بچا جہاں لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا ہو[۱]۔

مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ کا معاہدہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار میں ایک دوسرے کی غم خواری اور ہمدردی و اعانت کی بنیاد پر بھائی چارہ اور مؤاخات کا ایک معاہدہ بھی کرایا، انصار مہاجرین کے ساتھ بھائی چارہ کے لئے اس طرح ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے کہ قرعہ اندازی کی نوبت آجاتی تھی، وہ مہاجرین کو اپنے مکانات، گھر کے اثاثہ، مال و دولت، زمین جائداد ہر چیز میں اختیار و تصرف دے دیتے تھے، اور ان کو اپنے پر مقدم رکھتے تھے۔

ایک انصاری اپنے مہاجر بھائی سے کہتا، دیکھو میرا نصف مال جتنا ہو تا ہو تم لے لو، میرے پاس دو بیویاں ہیں، ان میں سے جو تم کو پسند آئے بتاؤ تو میں اس کو طلاق دے کر تمھارے حوالہ کروں، مہاجر جواب دیتا، اللہ تعالیٰ تمھارے گھر والوں اور مال و اسباب میں برکت عطا کرے، تم مجھے بس بازار کا راستہ بتا دو (ہم قسمت آزمائی کر لیں گے)

---

[۱] ابن ہشام ج ۱ ص ۴۹۹-۵۰۰

انصار کا کام ایثار تھا، مہاجرین کا استغناء اور خودداری[1]۔

مؤاخاۃ اور اس کی اہمیت

یہ مواخاۃ (بھائی چارہ) اپنی نوعیت کی منفرد اسلامی و عالمی اُخوت کی اساس، ایک صاحبِ دعوت اُمّت کے قیام کا مقدمہ تھی، جو ایک نئی دنیا کی تعمیر کے لئے برپا ہو رہی تھی، اور جو صحیح و معیّن عقائد اور دنیا کو بدبختی و بدنظمی سے نجات دینے والے نیک مقاصد اور ایمان و معنوی اُخوت اور متّحدہ سرگرمی کے تعلقات کے لئے قائم ہو رہی تھی، اس طرح مہاجرین و انصار کے درمیان یہ محدود اخوت دنیائے انسانیت کی نئی زندگی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، اسی لئے اللہ تعالےٰ نے ایک چھوٹے شہر کی ایک چھوٹی سی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ	اگر یہ نہ کرو گے تو زمین میں (بڑا)
وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ (سورۃ الانفال ۷۳)	فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔

حضورؐ کی تحریر اور یہود سے امن و امان کا معاہدہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر مہاجرین و انصار کے لئے ایک تحریر تیار فرمائی، جس میں یہود سے امن و امان کا معاہدہ تھا، اور ان کے

---

[1] صحیح بخاری باب (اخاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین المهاجرین والانصار) اور باب (کیف آخی صلی اللہ علیہ وسلم بین اصحابہ) میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سعد بن الربیعؓ کا واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔

اپنے دین ومذہب پر رہنے اور مال وجائداد کی حفاظت وبقا کا ذمّہ لیا گیا تھا، اور ان کے حقوق اور ذمّہ داریوں دونوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔[1]

اذان کا حکم

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں امن و اطمینان حاصل ہوا اور اسلام کو استحکام نصیب ہوا تو آپؐ نے نماز کے لئے اطلاع ودعوت کے وہ طریقے جو یہود اور نصاریٰ میں رائج تھے، مثلاً ناقوس، گھنٹہ، یا مشعل وغیرہ ناپسند فرمائے اس وقت تک مسلمان بغیر کسی دعوت واعلان کے نماز کے اوقات میں خود جمع ہو جاتے تھے، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اذان سے سرفراز فرمایا، اور خواب میں بعض صحابہ کو اس کا مشاہدہ کرایا گیا، چنانچہ آپ نے اسی اذان کو متعیّن فرما دیا اور شرعی طور پر اس کا اجرا ہو گیا، یہ خدمت حضرت بلال بن رباح حبشیؓ کے حوالہ ہوئی، وہ رسول اللہ

---

[1] ملاحظہ کیجئے ابن ہشام ص۵۰۱۔ اس سیاسی دستاویز کی اہمیت معلوم کرنے کے لئے (جسے دنیا کا قدیم ترین باضابطہ تحریری دستور کہا جا سکتا ہے، جو مکمل شکل میں آج بھی موجود ہے) اور اس گہرے سیاسی، تمدّنی اور جنگی مشغلات حکمتِ نبوی، اور ہدایتِ ربانی اور حالات کے متوازن جائزہ کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد حمید اللہ (سابق استاذ بین الاقوامی قانون، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) کا مقالہ جس کا عربی ترجمہ مؤلف کتاب "نبی رحمت" کے قلم سے "مجموعہ مباحث علمیہ" (ص ۹۸-۱۱۷) دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوا تھا۔

اس دستاویز کا متن "سیرت ابن ہشام" ق ا ص۵۰۱-۵۰۴ (طبع مصطفی البابی، مصر) کتاب الاموال لابی عبید، البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ج ۳ ص ۲۲۴-۲۲۶، اور "مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ"، از ڈاکٹر حمید اللہ (طبع لجنۃ التألیف والترجمۃ والنشر۔ قاہرہ) میں ملاحظہ ہو۔

صلے اللہ علیہ وسلم کے مؤذّن کے لقب سے سرفراز ہوئے، اور قیامت تک کے لئے مؤذّنین کے امام قرار پائے۔

مدینہ میں نفاق اور منافقین کا ظہور

مکہ میں نفاق نہ تھا[1]، اور یہ بات اس لئے تھی کہ اسلام وہاں مغلوب اور مجبور تھا، اس میں صورتِ حال کو بدلنے کی کوئی طاقت نہ تھی، وہ کسی کو نفع یا نقصان بھی نہیں پہونچا سکتا تھا بلکہ اسلام قبول کرنے کے معنی ہی وہاں یہ تھے کہ ہر قسم کے خطرہ اور ضرر کو گوارا کیا جائے، دشمنی مول لی جائے، اور دشمنوں کو جانتے بوجھتے مشتعل کیا جائے، اس کی ہمّت صرف وہی کرتا تھا جو اپنے قول میں سچّا اور ارادہ میں پکّا ہوتا جس کا ایمان مضبوط ہوتا اور وہ اپنی زندگی اور مستقبل کو خطرہ میں ڈالنے پر آمادہ ہوتا۔ وہاں دو برابر کی طاقتیں نہ تھیں، مشرک طاقتور اور غالب تھے اور مسلمان مظلوم اور کمزور، قرآن مجید نے اس صورتِ حال کی اپنے بلیغ انداز میں اس طرح تصویر کھینچی ہے:۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ	اور (اس وقت کو) یاد کرو جب تم
مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ	زمین (مکہ) میں قلیل اور ضعیف
تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ	سمجھے جاتے تھے اور ڈرتے رہتے
(سورۂ انفال۔۲۶)	تھے کہ لوگ تمھیں اڑا نہ لے جائیں
	(یعنی بے خانماں نہ کردیں۔)

---

[1] اکثر مفسّرین و مورخین کی یہی رائے ہے، قرآن مجید کی وہ تمام سورتیں جن میں نفاق یا منافقین کا ذکر کیا گیا ہے مدینہ ہی میں نازل ہوئیں، سورۂ براۃ میں آیا ہے "وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ" (سورۂ براۃ۔۱۰۱)

جب اسلام مدینہ منتقل ہوا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو امن واستحکام کا موقع حاصل ہوا، اسلام کو فروغ ہونے لگا اور اسلامی معاشرہ اپنے سارے شرائط و لوازمات کے ساتھ وجود میں آگیا تو اس وقت صورتِ حال میں ایک خاص تبدیلی واقع ہوئی اور نفاق نے سر نکالا، یہ ایک بالکل فطری اور نفسیاتی بات تھی جس سے مفر ممکن نہ تھا، اس لئے کہ نفاق ہمیشہ وہیں پیدا ہوتا ہے، اور ہاتھ پیر نکالتا ہے، جہاں دو مقابل دعوتیں اور حریف قیادتیں موجود ہوں، اس موقع پر یہ مذبذب اور متردّد گروہ ان دونوں دعوتوں اور قیادتوں کے درمیان ہچکولے کھاتا رہتا ہے، اور متردّد و فکر مند رہتا ہے کہ کس دعوت کو اختیار کرے اور کس کو چھوڑے، کبھی وہ کسی ایک دعوت کو قبول کر لیتا ہے، اور اس کے کیمپ میں چلا جاتا ہے، اور جذباتی لگاؤ اور وفاداری کا تعلق بھی اس سے قائم کر لیتا ہے، لیکن اس کی دنیاوی مصلحتیں اور مقابل دعوت کا فروغ اور اس کا غلبۂ عروج اس کو اپنے صحیح موقف اور پہلی دعوت کے پرچم کے نیچے آجانے کے اعلان سے باز رکھتا ہے، اور وہ اپنے قدیم ماحول سے رشتہ بالکل منقطع نہیں کر پاتا، قرآن مجید نے تردّد اور اضطراب کی اس کیفیت اور حالت کی بہت نازک اور بولتی ہوئی تصویر کھینچ دی ہے، ارشاد ہوتا ہے :-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ	اور لوگوں میں بعض ایسا بھی ہے
عَلٰى حَرْفٍ ج فَاِنْ اَصَابَهٗ	جو کنارے پر (کھڑا ہو کر) خدا کی
خَيْرُ اِطْمَاَنَّ بِهٖ ج وَاِنْ	عبادت کرتا ہے اگر اس کو کوئی
اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِنْقَلَبَ عَلٰى	(دنیاوی) فائدہ پہونچے تو اس کے

وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ○	سبب مطمئن ہو جائے اور اگر کوئی آفت پڑے تو منہ کے بل لوٹ جائے (یعنی پھر کافر ہو جائے) اس نے دنیا میں نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی
(سورۂ حج - ۱۱)	یہی تو نقصان صریح ہے۔

اسی گروہ کی صفت دوسری جگہ یہ بیان کی گئی ہے:۔

مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۔	بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں، نہ ان کی طرف (ہوتے ہیں) نہ
(سورۂ النساء - ۱۴۳)	ان کی طرف۔

ان منافقین کی، جو اوس وخزرج اور یہود سے تعلق رکھتے تھے، سربراہی ورہنمائی عبداللہ بن اُبی بن سلول کے ہاتھ میں تھی "بعاث" کی جنگ کے بعد سب نے متفقہ طور پر اس کو اپنا سردار تسلیم کر لیا تھا، جب اسلام کا یہاں داخلہ ہوا، اس وقت اس کی "تاج پوشی" کی پوری تیاری تھی، جب اس نے دیکھا کہ لوگ بہت بڑی تعداد میں اور سرعت کے ساتھ اسلام قبول کر رہے ہیں تو یہ بات پھانس بن کر اس کے دل میں چبھ گئی، اس کو کسی کل قرار نہیں آتا تھا، ابن ہشام بیان کرتے ہیں کہ "جس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، اس وقت عبداللہ بن اُبی بن سلول مدینہ والوں کا سردار تھا، اوس وخزرج اسلام کی آمد سے قبل اس کے سوا کبھی بھی کسی پر متفق نہ ہو سکے تھے، اور ان دونوں قبیلوں کے کسی ایک شخص کو اپنا سردار بنانے پر راضی نہ تھے، اس کی قوم نے اس کی تاج پوشی کے لئے کوڑیوں کا ایک تاج بھی

تیار کیا تھا اور اس کو بادشاہ بنانے کی تجویز تھی، یہ کیفیت چل رہی تھی کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو یہاں بھیجدیا اور جب اس کی قوم اس کو چھوڑ کر مسلمان ہوگئی تو اس کے دل میں سخت کینہ وحسد پیدا ہوگیا، اور اس کو محسوس ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس سرداری اور اعزاز سے محروم کردیا لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کی قوم کسی حالت میں بھی اسلام کو ترک کرنے والی نہیں وہ بھی بادلِ ناخواستہ داخلِ اسلام ہوا، اور اپنے نفاق، جلن اور کینہ پر بدستور قائم رہا۔[1]

ایسے تمام لوگ اسلام دشمنی پر اتر آئے جن کے دل میں کوئی چور تھا، اور جو سیادت کے خواہاں تھے، وہ اس نئے دین سے گھٹن محسوس کرنے لگے جس نے ان کے منصوبوں کو خاک میں ملادیا اور امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا، اور جس نے مدینہ کا رنگ بدل کر مہاجرین وانصار کی یک دل ویک جان اُمّت تیار کردی تھی، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جان چھڑکتی اور آپؐ کی محبّت کو اپنے باپ بیٹوں اور بیویوں کی محبّت پر بھی ترجیح دیتی تھی، یہ منظر دیکھ کر ان منافقین کے دل غصّے اور حسد سے بھر گئے اور وہ آنحضرتؐ کے خلاف منصوبے بنانے اور سازشیں کرنے لگے، اس طرح مدینے میں اسلامی معاشرے کے اندر ہی ایک مخالف محاذ پیدا ہوگیا جس کی طرف سے مسلمانوں کو ہوشیار رہنا ضروری ہوگیا، کیونکہ یہ گروہ "مارِ آستیں" کی حیثیت رکھتا تھا اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے کھلے دشمنوں سے زیادہ خطرناک تھا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کثرت سے ان کا ذکر کرتا اور ان کے کرتوتوں سے پردہ اٹھاتا ہے، اسلام کا ان کے ساتھ مختلف نوع کا تعلق رہا ہے، اس لئے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۸۴-۵۸۵

سیرت کی کتابوں میں ناگزیر طور پر ان کا ذکر آتا ہے، اور اس کتاب میں بھی آئے گا۔

یہود کی دشمنی کا آغاز

ابتدا میں کسی قدر غیر جانبداری اور خاموشی کے بعد پہلی بار یہود کی دشمنی اور کینہ پروری کی علامتیں ظاہر ہونا شروع ہوئیں، ان کا موقف پہلے مسلمانوں و مشرکوں اور اہلِ مکہ اور اہلِ مدینہ میں غیر جانبداری کا تھا، بلکہ شاید وہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی طرف نسبتاً زیادہ مائل تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ نبوت، رسالت اور روزِ آخرت پر ایمان میں (خواہ بعض تفصیلات میں اختلاف ہو) نیز اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات اور عقیدۂ توحید میں وہ مسلمانوں سے بہت قریب تھے، اگرچہ یہ عقیدہ بھی، جاہلی اقوام کے پڑوس میں ایک طویل عرصہ تک رہنے اور بُت پرستی کے ماحول میں جلاوطنی کی یہ طویل مدّت گزارنے کی وجہ سے بہت کمزور پڑ چکا تھا، اور اس میں غلو اور بعض انبیاء کی تقدیس بھی شامل ہو گئی تھی، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے[1]۔

تمام قرائن یہ بتاتے تھے کہ اگر وہ اسلام کا ساتھ نہیں دیں گے تو کم از کم اس معاملہ میں غیر جانبدار ضرور رہیں گے، اس لئے کہ اسلام ان کی مذہبی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل کے تمام انبیاء پر ایمان کی دعوت دیتے ہیں، قرآن مجید اہلِ ایمان کی زبان سے کہتا ہے:۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ — سب خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور

---

[1] دیکھئے باب "عہدِ جاہلیت"۔

وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔ (سورۂ بقرہ۔ ۲۸۵)

اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔

اگر ایسا ہو سکتا تو آج نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم کا رُخ دوسرا ہوتا' اور اسلامی دعوت کو ان مشکلات و مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑتا جو اسلام و یہودیت کی آویزش اور ان اوّلین مسلمانوں (جو اپنی نشوونما کے دور میں تھے) اور ان یہودیوں (جو طاقتور' بااثر دولت مند اور تعلیم یافتہ تھے) کی کش مکش نے پیدا کر دیئے تھے اس کے صرف دو بنیادی سبب تھے' ایک یہودیوں میں حسد' تنگ دلی اور جمود و تعصّب کا مادّہ' اور دوسرے ان کے عقائد باطلہ' اخلاق رذیلہ اور قبیح عادتیں جن پر قرآن مجید میں جابجا تنقید کی گئی ہے' اور ان کی اس طویل تاریخ کا پردہ چاک کیا ہے جو انبیاء کرام سے برسرِ جنگ ہونے' ان کے پیغام و دعوت کا مقابلہ کرنے' ان کو شہید کرنے کی جسارت' عناد و سرکشی' راہِ حق سے روکنے' اللہ تعالٰے پر بہتان باندھنے' دولت سے عشق' باوجود ممانعت کے سودی کاروبار سے دلچسپی' ناجائز طور پر لوگوں کا مال کھانے' حرام مال کا شوق' توریت میں اپنی حسب مرضی ردّ و بدل اور ترمیم و اضافہ' زندگی سے حد سے بڑھی ہوئی محبّت اور بہت سے ان قومی و نسلی خصوصیات سے بھری ہوئی ہے۔

اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جگہ کوئی سیاسی رہنما ہوتا تو اس پیچیدہ صورتِ حال کا (جو اس وقت مدینہ میں قائم تھی) اندازہ لگا کر اس کی روشنی میں مصلحت آمیز قدم اٹھاتا' وہ اگر یہودیوں کے ساتھ خوشامد اور منہ بھرائی کا معاملہ

نہ کرتا تو کم از کم ان کو مشتعل کرنے اور ان کی دشمنی مول لینے سے ضرور احتیاط کرتا، لیکن آپ تبلیغ رسالت، دینِ حق کے صاف و واشگاف طریقہ پر اعلان حق و باطل کی تمیز اور فساد و گمراہی کے مقابلہ اور سدِ باب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور تھے، اور آپ کو اس کا ذمہ دار بنایا گیا تھا کہ آپ دنیا کی تمام قوموں اور افراد اور جماعتوں کو جن میں یہود و نصاریٰ جیسے اہلِ کتاب بھی شامل ہیں، اسلام کی برملا دعوت دیں، خواہ اس کی آپ کو بڑی سے بڑی قیمت دینی پڑے اور طرح طرح کی مشکلات اٹھانی پڑیں، یہ نبوت کا وہ مزاج اور نہج ہے جس پر سارے انبیاء ہمیشہ کاربند رہے، یہی مزاج اور نہج سیاست اور نبوت کی راہوں کو الگ کرتا اور انبیاء اور قومی زعماء میں بنیادی فرق پیدا کرتا ہے۔

یہود کے عقائد اور ان کی زندگی اور سیرت و کردار پر ان باتوں سے ضرب کاری لگی اور اس نے ان کو اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور دشمنی پر کمربستہ کر دیا، چنانچہ انھوں نے اپنا پرانا رویہ بدل دیا، اور خفیہ و علانیہ دونوں طریقوں سے اسلام کی مخالفت پر اتر آئے اور مقابلہ کے لئے میدان میں آ گئے، یہودی فاضل "اسرائیل ولفنسن" نے اس نزاع و دشمنی کے اسباب پر کسی قدر جرأت اور صفائی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"اگر رسول کی تعلیمات صرف بت پرستی کی مخالفت تک محدود رہتیں اور یہود سے ان کی رسالت تسلیم کرنے کا مطالبہ نہ کیا جاتا تو یہود اور مسلمانوں میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہوتا، اور یہود احترام و تعظیم کی نگاہ سے رسول ؐ کی تعلیمات کو دیکھتے، ان کی حمایت کرتے اور جان و مال سے ان کی مدد کرتے، یہاں تک کہ آپ ان بتوں کو پاش پاش کر دیتے (جن کا جزیرۃ العرب

میں دوز دورہ تھا) اور بُت پرستانہ عقائد کا خاتمہ ہوجاتا جو سارے
عرب میں پھیلے ہوئے تھے، لیکن اس کی شرط یہی تھی کہ وہ ان سے اور ان کے
دین سے کوئی سروکار نہ رکھیں اور نہ ان کو یہ نئی رسالت قبول کرنے پر
مجبور کریں، اس لئے کہ یہودی ذہنیت کسی ایسی چیز کے سامنے نرم نہیں
پڑسکتی جو اس کو اس کے دین سے ہٹانا چاہتی ہو، وہ بنی اسرائیل کے
سوا کسی اور نسل کے کسی نبی کو تسلیم کرنے پر راضی نہیں ہوسکتی"[1]

یہود میں اس بات نے مزید اشتعال پیدا کردیا کہ ان کے بعض عالم جیسے
عبداللہ بن سلام جن کا وہ بڑا احترام کرتے تھے، اسلام لے آئے یہود کو اس کا خیال
بھی نہیں آسکتا تھا کہ ان جیسا شخص مسلمان ہوجائے گا، اس نے ان کے سینہ میں
حسد اور جلن کی آگ اور بھڑکادی[2]۔

یہود نے صرف اسلام کی مخالفت اور اس سے بُعد و وحشت پر اکتفا نہیں کیا،
بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ مشرکوں اور بت پرستوں کو ان مسلمانوں پر کھلی ترجیح دینے
لگے جو عقیدۂ توحید میں یہود کے شریک و ہمنوا تھے، توقع اس کی تھی اور معقولیت کا
تقاضا بھی یہی تھا کہ جب قریش کے مذہب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
لائے ہوئے دین کا موازنہ ہوگا اور ان میں ترجیح و انتخاب کا مسئلہ سامنے آئے گا تو وہ

---

[1] تاریخ الیہود فی بلاد العرب (ولفنسن) ص۱۲۳ [2] یہود کے جو لوگ مسلمان ہوئے اور ان کو شرف
صحبت حاصل ہوا ان کی تعداد ۳۹ تک پہونچتی ہے، اور ان کے نام اور حالاتِ زندگی طبقاتِ صحابہ مثلاً "الاصابۃ"
اور "الاستیعاب" اور "اسد الغابۃ" وغیرہ میں آئے ہیں ان میں بعض بڑے جلیل القدر علماء اور اجلۂ صحابہ شامل
تھے (یہ تعداد مولانا مجیب اللہ ندوی کی کتاب "اہل کتاب صحابہ و تابعین" شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڑھ سے
ماخوذ ہے۔)

مسلمانوں سے اپنے اختلاف کے باوجود شرک وبت پرستی پر اسلام کی حقانیت و برتری کی شہادت دیں گے، لیکن اسلام دشمنی نے ان کو اس کی اجازت نہ دی، چنانچہ جب ایک موقع پر یہودی علماء سردارانِ قریش سے مکہ میں ملنے گئے تو سردارانِ قریش نے کہا کہ آپ لوگ سب سے اول اہلِ کتاب ہیں اور ہمارے اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے درمیان جو اختلاف چل رہا ہے وہ آپ کو معلوم ہے آپ کیا کہتے ہیں، ہمارا مذہب بہتر ہے یا ان کا؟ انھوں نے جواب دیا، آپ لوگوں کا دین ان کے دین سے بہتر ہے اور آپ زیادہ حق پر ہیں۔[1]

یہی یہودی فاضل (ڈاکٹر اسرائیل ولفنسن) اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"لیکن ایک بات جس پر ان لوگوں کو واقعی ملامت کی جاسکتی ہے، اور جس سے ہر اس شخص کو تکلیف پہونچے گی جو خدائے واحد پر ایمان رکھتا ہے خواہ وہ یہودیوں میں سے ہو یا مسلمانوں میں سے، وہ گفتگو ہے جو کچھ یہودیوں اور قریش کے بُت پرستوں میں ہوئی تھی اور جس میں ان یہودیوں نے قریش کے مذہب کو پیغمبرِ اسلام کے لائے ہوئے دین پر ترجیح دی تھی!!

آگے بڑھ کر وہ لکھتے ہیں:۔

"جنگی ضرورتوں نے قوموں کے لئے حیلہ سازی اور دروغ گوئی اور دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے فریب دہی کی مختلف تدبیروں کو جائز قرار دیا ہے، لیکن سب کے باوجود یہودیوں کو اس سنگین غلطی کا ارتکاب ہرگز نہ کرنا چاہئے تھا،

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۴

اور قریش کے ذمہ داروں کے سامنے اس کی صراحت نہ کرنی چاہئے تھی کہ بتوں کی پرستش اسلامی توحید سے بہتر ہے خواہ اس کی وجہ سے ان کے مقاصد پورے نہ ہو پاتے، اس لئے کہ بنی اسرائیل جو طویل صدیوں تک بُت پرست اقوام کے مقابلہ میں اپنے قدیم آباءو اجداد کے نام پر توحید کا پرچم بلند کئے رہے اور جنھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اس عقیدہ کی خاطر ناقابلِ شمار مصائب برداشت کئے اور قتل و خون کے سخت مرحلوں سے گزرے ان کا آج یہ فرض تھا کہ وہ مشرکین کو ناکام و نامراد کرنے کے لئے اپنی متاعِ حیات اور نفیس سے نفیس شے کی قربانی دیں"![1]

قرآن مجید نے اس آیت میں اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا	بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا
مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ	جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا ہے کہ بتوں
وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ	اور شیطان کو مانتے ہیں اور کفّار
كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ	کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (سورۂ نساء ۵۱)	مومنوں کی بہ نسبت سیدھے رستہ پر ہیں۔

قبلہ کی تبدیلی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمان اب تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے، مدینہ تشریف آوری کے بعد ایک سال چار مہینے تک نماز

[1] الیہود فی بلاد العرب ص۱۴۲!

اسی رُخ پر پڑھی جاتی رہی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنا دیا جائے یہ عرب مسلمان بھی (جن کی نشو و نما کعبہ کی محبت اور تعظیم پر ہوئی تھی اور یہ محبت اور تعظیم اور ان کے گوشت پوست اور خون میں پیوست تھی) دل سے یہی چاہتے تھے کہ کعبہ ان کا قبلہ ہوتا، وہ کسی جگہ کو بھی کعبہ اور سیدنا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے قبلہ کے مقابلہ کا نہیں سمجھتے تھے، اور بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا اور اس کو اپنا قبلہ تسلیم کرنا، ان کے لئے ایک شدید امتحان تھا، لیکن بے چون و چرا انھوں نے اس حکم کو تسلیم کیا اور "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" (اور ہم نے سنا اور اطاعت کی) اور "اٰمَنَّا بِہٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا" (ہم ایمان لائے جو کچھ ہے ہمارے رب ہی کی طرف سے ہے) کے سوا ان کی زبان سے کچھ اور نہ نکلا، وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کے علاوہ اور کچھ نہ جانتے تھے، خواہ وہ ان کی خواہش و مرضی اور ان کی عادت اور مذاقِ طبیعت کے موافق ہو یا نہ ہو، جب اللہ تعالےٰ نے ان کے دلوں کا یہ امتحان لے لیا، اور انھوں نے تقویٰ اور اطاعت کا پورا ثبوت دے دیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کا رُخ کعبہ کی طرف کروا دیا گیا، قرآن مجید میں آتا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ	بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا	(آخر الزماں) تم پر گواہ بنیں اور جس
وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ	قبلہ پر تم (پہلے تھے) اس کو ہم نے
عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِـعُ	اس لئے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں کہ
الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى	کون ہمارے پیغمبر کا تابع رہتا ہے اور

عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ (سورۂ بقرہ - ۱۴۳)

کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے اور یہ بات (بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی (وہ اسے گراں نہیں سمجھتے تھے)۔

مسلمانوں نے خدا اور رسول کی اطاعت کرتے ہوئے اپنا رُخ اسی وقت کعبہ کی طرف کرلیا، اور وہی قیامت تک کے لئے مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا، مسلمان (خواہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں) اپنا منھ اسی کی طرف کرکے نماز پڑھنے کے لئے مامور ہیں[1]۔

مدینہ کے مسلمانوں سے قریش کی چھیڑ چھاڑ

جب مدینہ میں اسلام کے قدم جم گئے، اور قریش نے دیکھا کہ اس کی وسعت اور مقبولیت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے اور اگر یہ صورتِ حال کچھ دن اور باقی رہ گئی تو زمام کار ان کے ہاتھ سے بالکل نکل جائے گی، اور اس کے بعد وہ اس کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے، یہ دیکھ کر انھوں نے مخالفت اور دشمنی کے لئے اچھی طرح کمر کس لی اور ہر طرف اس کے خلاف ایک شور و غوغا شروع ہوگیا، لیکن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صبر اور عفو و درگذر کا حکم اور "کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" (اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو) کی تعلیم تھی، اس کا مقصد یہ تھا کہ زندگی اور اس کی لذتیں اور راحتیں ان کی نظر میں ارزاں و بے قیمت ہوجائیں اور اطاعت نفس کی مخالفت اور ایثار و قربانی کا

---

[1] دیکھئے صحاح ستہ اور قرآن مجید کی ان آیات کی تفسیر جن میں تبدیلِ قبلہ کا ذکر ہے۔

مشکل کام ان کے لئے آسان ہو جائے۔

قتال کی اجازت

جب ان کی طاقت کچھ اور بڑھی اور ان کے بازو مضبوط ہو گئے تو اس وقت ان کو قتال کی اجازت دیدی گئی لیکن یہ صرف اجازت تھی اس کو فرض قرار نہیں دیا گیا تھا[1] فرمایا گیا:۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ (سورۂ حج۔ ۳۹)

جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے ان کو اجازت ہے کہ (وہ بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا (ان کی مدد کرے گا) یقیناً وہ ان کی مدد پر قادر ہے۔

عبداللہ بن جحش کا سریّہ اور غزوہ "ابواء"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل، اور علاقوں میں سرایا اور چھاپے بھیجنے کا آغاز فرمایا، ان کی نوعیت اکثر باقاعدہ جنگ کی نہ ہوتی تھی، اس کو ہم کسی قدر طاقت آزمائی یا جھڑپ اور چھاپہ سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کا مقصد مشرکین کو مرعوب و خوف زدہ کرنا اور اسلام کی شان و شوکت اور سرگرمی و فعّالیت کا مظاہرہ کرنا تھا، اور یہ فائدہ ان سرایا اور چھاپوں سے پوری طرح حاصل ہوا۔

اس موقع پر ہم خصوصیت سے عبداللہ بن جحش رضؓ کے سریّہ کا ذکر کریں گے اس لئے کہ

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو زاد المعاد ج ۱ ص ۳۱۴

اس سریّہ کے متعلق ایک آیت بھی نازل ہوئی نیز اس سے اس اہم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کی کسی کوتاہی اور غلطی کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ وہ مختلف قوموں اور جماعتوں کے بارے میں کوئی فیصلہ دینے یا رائے قائم کرنے میں میزانِ عدل ہے جس پر ہر عمل کو تولا جائے گا، یہ واقعہ مختصراً یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحشؓ الاسدی کو رجب ۲ھ میں ایک مُہم پر روانہ فرمایا اور مہاجرین کے آٹھ آدمی ان کے ساتھ کئے، آپ نے ان کو ایک تحریر بھی لکھ کر دی اور یہ حکم فرمایا کہ اس تحریر کو ابھی نہ دیکھیں جب دو دن کی مسافت طے کرلیں تب اس کو کھول کر پڑھیں اور پھر جو کچھ اس میں ہے اس کی تعمیل کریں، لیکن اپنے کسی رفیق کو اس کی تعمیل پر مجبور نہ کریں۔

جب عبداللہ رضؓ بن جحش نے دو دن کی مسافت طے کرلی تو یہ خط کھول کر دیکھا، اس میں لکھا ہوا تھا "جب یہ خط تم دیکھ لینا تو آگے بڑھ کر مکہ اور طائف کے درمیان نخلستان میں اتر جانا، اور وہاں سے قریش کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا اور ان کی خبریں ہمارے پاس بھیجتے رہنا" عبداللہ بن جحش نے خط پڑھ کر کہا "سمعًا وطاعة" آقا کا حکم سر آنکھوں پر، پھر اپنے رفقاء سے کہا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ آگے نخلستان میں اتر کر وہاں سے قریش کی سرگرمیوں پر نظر رکھوں اور اس کی خبریں آپ کو پہونچاتا رہوں، مجھے آپؐ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ میں کسی اور کو اس پر مجبور نہ کروں، اب تم میں سے جس کو شہادت کا شوق ہے وہ ہمارے ساتھ آئے اور جو یہ نہیں چاہتا وہ واپس لوٹ جائے، مجھے بہرحال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرنی ہے، اس کے بعد وہ آگے روانہ ہوگئے اور ان کے سب ہی رفقاء

ان کے ساتھ ہے، ایک آدمی نے بھی پیچھے رہنا گوارا نہ کیا۔

آگے چل کر وہ اور ان کے سب رفقاء نخلستان میں مقیم ہوئے اتنے میں قریش کا ایک قافلہ وہاں سے گذرا اس میں عمرو بن الحضرمی بھی تھا، قریش اس قافلہ کو دیکھ کر ڈر سے گئے، ان کا پڑاؤ بھی قریب ہی تھا اتنے میں عکاشہ بن محصن نے جن کا سر منڈا ہوا تھا، اپنا سر اٹھا کر دیکھا، قریش نے جب ان کو دیکھا تو اطمینان کا اظہار کیا اور کہا، ان سے ڈرنے کی بات نہیں، یہ تو عمرہ والے ہیں[۱]، یہ رجب[۲] ۲ھ کے آخری دن کا واقعہ ہے اس کے بعد مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا اور رائے یہ ہوئی کہ اگر تم نے ان کفار کو اس رات میں چھوڑ دیا تو یہ مسجدِ حرام میں داخل ہو جائیں گے، اور تم کو وہاں جانے سے باز رکھیں گے، اور اگر تم ان سے قتال کرتے ہو تو شہرِ حرام میں جنگ کرنا پڑے گی، اس بات سے لوگوں میں تردُّد کی کیفیت پیدا ہو گئی اور ان کو اس قسم کے اقدام سے ڈر سا محسوس ہوا لیکن پھر انھوں نے اپنے کو اس پر آمادہ کر لیا اور سب کی متفقہ رائے یہ ہوئی کہ ان میں سے جتنے ممکن ہو سکیں ان کو تو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، اور ان کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا جائے، چنانچہ ان میں سے واقد بن عبد اللہ التمیمی نے پہلا تیر چلایا اور عمرو بن الحضرمی کا خاتمہ

---

[۱] عرب ماہ رجب میں عمرہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے [۲] رجب حُرمت کے چار مہینوں میں پہلا مہینہ ہے اشہرِ حرام میں جنگ کرنا ممنوع تھا اور عہدِ جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور میں عرب اس پر کاربند تھے، باقی تین مہینے ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے ہیں، جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت سورۂ براءت کی اس آیت سے منسوخ ہو چکی ہے "فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ" نیز "وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً" سعید بن المسیب سے پوچھا گیا کہ کیا مسلمان شہرِ حرام میں کفار سے جنگ کر سکتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا ہاں۔ اسلامی فتوحات اور معرکہ آرائیوں میں اسی پر عمل تھا، کہیں تاریخ میں نہیں ملتا کہ ہر سال ایک مہینہ رجب یا تین مہینے ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم میں جنگ بند کر دی جاتی ہو، اور اسلامی فوجیں چھاؤنیوں میں واپس آجاتی ہوں۔

کر دیا، دو آدمیوں کو قیدی بنالیا گیا، اور عبد اللہ رضؓ بن جحش اور ان کے ساتھی اس قافلہ اور دو قیدیوں کو لے کر واپس روانہ ہوئے۔

جب مدینہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کی حاضری ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تم کو شہر حرام میں جنگ کرنے کے لئے تو نہیں کہا تھا؟ پھر آپؐ نے ان میں سے کسی چیز کو لینے سے انکار کر دیا، جو مال غنیمت میں لائے تھے۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو ان کے ہاتھ پیر پھول گئے، اور خطرہ ہوا کہ اب ہلاکت یقینی ہے، دوسری طرف مسلمانوں نے بھی ان کو بہت سخت سست کہا اور لعنت ملامت کی، قریش نے کہا کہ لو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے شہر حرام میں بھی جنگ اور خوں ریزی جائز کر دی! اس موقع پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ط قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ط وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ق وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ج وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ط [1] (سورۂ البقرہ۔ ۲۱۷)	(اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم) لوگ تم سے عزت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ ان میں لڑنا بڑا (گناہ) ہے اور خدا کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ میں جانے سے) روکنا، اور اہل مسجد کو اس میں سے نکال دینا (جو یہ کفار کرتے ہیں) خدا کے نزدیک اس سے بھی

[1] سیرت ابن ہشام صـ ۶۰۱-۶۰۵

زیادہ (گناہ) ہے، اور فتنہ انگیزی
خوں ریزی سے بھی بڑھ کر ہے۔

علامہ ابن القیم "زاد المعاد" میں لکھتے ہیں:۔

"اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے دوستوں اور دشمنوں میں عدل وانصاف کا معاملہ فرمایا، اور اپنے مقبول وپسندیدہ بندوں کی ان کے اس فعل میں کہ وہ شہر حرام میں گناہ کے مرتکب ہوئے حمایت نہیں کی، بلکہ اس کو بہت بڑی بات قرار دیا اور ساتھ ہی اس کا بھی اظہار کر دیا کہ اس کے دشمن مشرک تنہا ایک شہر حرام میں ارتکابِ گناہ سے کہیں زیادہ قابلِ مذمت اور سزا کے لائق ہیں، خاص طور پر بایں صورت کہ اس کے مقبول بندوں نے اس میں تاویل سے کام لیا تھا، یا یہ کہنا چاہیئے کہ ان سے اس معاملہ میں ایک طرح کی تقصیر ہوئی تھی جس کو اللہ تعالیٰ ان کے عقیدۂ توحید، طاعت وعبادت، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت اور اللہ کے لئے قربانی کی بدولت معاف کرنے والا ہے"[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غزوۃ الابواء[2] میں جس کو "وَدّان" بھی کہا جاتا ہے، بہ نفس نفیس شرکت فرمائی، یہ آپ کا پہلا غزوہ ہے، لیکن اس میں جنگ کی نوبت نہیں آئی، چنانچہ آپ واپس تشریف لے آئے، اس کے بعد متعدد سرایا اور غزوات پیش آئے۔

روزہ کی فرضیت

جب عقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں خوب راسخ ہوگیا، ان کو نماز سے پوری مناسبت

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۱ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۹۱-۶۰۶

پیدا ہوگئی، اور یہ مناسبت بڑھتے بڑھتے عشق کے درجہ تک پہونچ گئی ان کے اندر احکامِ شرعیہ اور اوامرِ الٰہیہ کی تعمیل کرنے کا ایک ایسا مزاج پیدا ہو گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان احکام کے انتظار میں رہتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے روزہ کا حکم نازل فرمایا۔

یہ ہجرت کے دوسرے سال کا واقعہ ہے، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔

مومنو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔

(سورۂ بقرہ - ۱۸۳)

دوسری آیت یہ نازل ہوئی:-

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ [۱]

(روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا، جو لوگوں کا رہنما ہے جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں، اور جو حق و باطل کو الگ الگ کرنے والا ہے، تو جو کوئی تم میں سے اس مہینہ میں موجود ہو، چاہیے کہ پورے مہینہ کے روزہ رکھے۔

(سورۂ بقرہ - ۱۸۵)

---

[۱] روزے کے اسرار و حکم معلوم کرنے، اس کی مشروعیت کی تفصیلات کے لئے ہماری کتاب "ارکانِ اربعہ" ملاحظہ ہو۔

بدر کی فیصلہ کُن جنگ

(سنہ ۲ھ)

جنگِ بدر کی اہمیت

ہجرت کے دوسرے سال رمضان ہی میں بدر کی وہ فیصلہ کن اور تاریخ ساز جنگ ہوئی جس میں اُمتِ اسلامیہ کی تقدیر اور دعوتِ حق کے مستقبل کا فیصلہ ہوا جس پر پوری نسلِ انسانی کی قسمت کا انحصار تھا۔

اس کے بعد سے آج تک مسلمانوں کو جتنی فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہوئیں، اور ان کی جتنی حکومتیں اور سلطنتیں قائم ہوئیں وہ سب اسی فتح مبین کی رہینِ منّت ہیں جو بدر کے میدان پر اس مٹھی بھر جماعت کو حاصل ہوئی، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس جنگ کو "یوم الفرقان" (فیصلہ کن دن) قرار دیا ہے۔

إِن كُنتُمْ آمَنتُم بِاللَّهِ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ۔

(سورۂ انفال۔ ۴۱)

اگر تم خدا پر اور اس (کی نصرت) پر ایمان رکھتے ہو جو (حق و باطل میں) فرق کرنے کے دن (یعنی جنگِ بدر میں) جس دن دونوں فوجوں میں مٹھ بھیڑ ہو گئی اپنے بندے (محمدؐ) پر نازل فرمائی۔

اس جنگ کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ ابوسفیان شام سے قریش کے ایک بڑے تجارتی کارواں کو لے کر مکہ جا رہا ہے جس میں بڑا مال و اسباب ہے، یہ وہ وقت ہے، جب مسلمانوں اور مشرکوں میں معرکہ آرائی کا سلسلہ جاری تھا، اور قریش نے اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے مقابلہ، راہِ حق میں رکاوٹیں ڈالنے، اور مسلمانوں کے لئے مختلف قسم کی مشکلات پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، انھوں نے اپنے سارے مالی وسائل، سامانِ جنگ اور ضروری اسباب اس کے لئے وقف کر رکھے تھے، اور ان کے جنگی دستے مدینہ کے حدود اور چراگاہوں تک پہونچ جاتے تھے۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ ابوسفیان جو اسلام کا بدترین دشمن تھا، اتنے بڑے قافلے کے ساتھ آرہا ہے تو آپ نے لوگوں کو آگے بڑھ کر اس کا سامنا کرنے کا حکم دیا، لیکن اس کا بہت زیادہ اہتمام اور فکر نہیں کی گئی، اس لئے کہ وہ بہر حال ایک تجارتی قافلہ تھا، کسی لشکر کی فوج کشی نہ تھی۔

اُدھر ابوسفیان کو یہ خبر پہونچی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس قافلہ کے مقابلہ کے لئے مدینے سے روانہ ہو چکے ہیں تو اس نے فوراً اپنا قاصد مکہ بھیجا اور قریش سے فریاد کی کہ وہ اس کی مدد کریں، اور مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکیں، جب یہ فریاد اور پکار مکہ پہونچی تو قریش نے جنگ کی پوری تیاری شروع کر دی، اور بہت تیزی کے ساتھ، ایک لشکرِ جرّار لے کر مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے ان کے سرداروں میں سے کوئی سردار باقی نہیں بچا جو اس میں شریک نہ ہوا ہو، انھوں نے اطراف کے تمام قبائل کو اس میں شریک کر لیا قریش کی مختلف شاخوں کے آدمی اس میں شامل تھے، اور بمشکل کوئی باقی تھا، یہ لشکر بڑی حمیت و نخوت، غیظ و غضب اور انتقامی جذبہ کے ساتھ روانہ ہوا۔

انصار کی پیش کش اور ان کی اطاعت شعاری و جاں نثاری

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ہوئی کہ قریش کا یہ زبردست لشکر روانہ ہو چکا ہے تو آپ نے اپنے اصحابِ کرام رضؓ سے مشورہ فرمایا لیکن اس وقت آپ کا روئے سخن انصار کی طرف تھا اس لئے کہ انھوں نے آپ سے اسی بات پر بیعت کی تھی کہ وہ مدینہ میں آپ کی پوری حفاظت اور مدد کریں گے' جب آپ نے مدینہ سے روانگی کا قصد فرمایا تو آپ نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ اس وقت انصار کیا سوچ رہے ہیں' سب سے پہلے مہاجرین نے اپنی بات کہی اور بہت اچھی طرح آپ کو اپنی حمایت کا یقین دلایا' آپ نے دوبارہ مشورہ کیا' مہاجرین نے پھر آپ کی تائید کی' پھر جب تیسری بار آپ نے دریافت فرمایا تو انصار کو احساس ہوا کہ آپ کا روئے سخن انصار کی طرف ہے' چنانچہ سعد بن معاذؓ نے فوراً اس کا جواب دیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ شاید آپ کا روئے سخن ہم لوگوں کی طرف ہے' اور آپ ہماری بات سننا چاہتے ہیں' یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) شاید آپ کو یہ خیال ہو رہا ہے کہ انصار نے صرف اپنے وطن اور اپنی سرزمین میں آپ کی نصرت کا ذمہ لیا ہے' میں انصار کی طرف سے عرض کرتا ہوں اور ان کی جانب سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ آپ جہاں چاہیں روانہ ہوں جس سے چاہیں تعلق فرمائیں اور جس سے چاہیں ختم کریں ہمارے مال و دولت میں سے جتنا چاہیں لیں' اور ہم کو جتنا پسند ہو عطا فرمائیں' اس لئے کہ آپ جو کچھ لیں گے وہ ہمیں اس سے کہیں زیادہ محبوب ہوگا جو آپ چھوڑیں گے' آپ کوئی حکم دیں گے تو ہماری رائے آپ کے تابع فرمان ہوگی' خدا کی قسم اگر آپ چلنا شروع کریں یہاں تک کہ برکِ غمدان[1]

---

[1] زاد المعاد ج ا ص ۳۴۲ سیرت ابن ہشام میں برک غمدان کے بجائے برک الغماد کا لفظ (باقی ص ۲۸۲ پر)

تک پہونچ جائیں تب بھی ہم آپ کے ساتھ چلتے رہیں گے، اور خدا کی قسم اگر آپ اس سمندر میں داخل ہو جائیں گے تو ہم بھی آپ کے ساتھ اس میں کود جائیں گے۔

مقدادؓ نے کہا ہم آپ سے ایسا نہ کہیں گے جیسا موسیٰؑ کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا "فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ"[1] (جاؤ تم اور تمہارا رب دونوں مل کر جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے) ہم تو آپ کے دائیں لڑیں گے، اور بائیں لڑیں گے، آپؐ کے سامنے آکر لڑیں گے، اور آپؐ کے پیچھے لڑیں گے۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ گفتگو سنی تو روئے انور خوشی سے دمکنے لگا، اور آپ کو اپنے صحابہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر بڑی مسرّت ہوئی، آپؐ نے فرمایا "سیروا وابشروا"[2] (چلو اور بشارت حاصل کرو)۔

لڑکوں میں جہاد و شہادت کا شوق

جب مجاہدین میدان بدر کی طرف روانہ ہوئے تو ایک صاحبزادہ جن کا نام عُمیرؓ بن ابی وقاصؓ تھا، اور جن کی عمر سولہ سال تھی،[3] مجاہدین کے ساتھ روانہ ہوئے،

(باقی ص۲۸۱ کا) آیا ہے، یہ یمن کے علاقہ میں ایک مقام کا نام ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ حِجر (دیار ثمود) کا ایک دور دراز حصہ ہے، سہیلی (سیرت ابن ہشام کے شارح) کہتے ہیں کہ میں نے تفسیر کی بعض کتابوں میں دیکھا ہے کہ وہ حبشہ کا شہر ہے، بہرحال وہ کوئی ایسا مقام تھا جو مدینہ طیبہ سے بہت دور پڑتا تھا، اور بُعدِ مسافت کے لئے ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا، جیسے ہماری زبان میں "کالے کوسوں"، "کالا پانی"، "کوہ قاف" وغیرہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں [1] سورۃ المائدہ۔ ۲۴ [2] زاد المعاد ج ۱ ص۳۴۳-۳۴۲ [3] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص۶۱۴ (باختلاف بعض الفاظ) بخاری نے بسلسلۂ تفسیر "اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ الخ" اور مسلم نے غزوۂ بدر کے باب میں باختصار یہ روایت نقل کی ہے

ان کو ڈر تھا کہ کہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کو چھوٹا سمجھ کر واپس نہ فرمادیں چنانچہ وہ آپ کی نگاہ سے بچ رہے تھے، ان کے بڑے بھائی سعد بن ابی وقاص رضؓ نے ان سے چھپنے کی وجہ دریافت کی تو عمیرؓ نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مجھے کمسن سمجھ کر واپس نہ پلٹادیں، میں اس جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں، شاید اللہ تعالےٰ مجھے بھی شہادت نصیب فرمائے، ان کو جس کا ڈر تھا یہی ہوا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس خیال سے کہ وہ ابھی جنگ کی عمر کو نہیں پہونچے ہیں، ان کو واپس کرنا چاہا تو وہ رونے لگے، یہ دیکھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اثر پڑا، اور آپؐ نے انھیں شرکت کی اجازت دے دی، چنانچہ انھوں نے اسی معرکہ میں جام شہادت نوش کیا اور اپنی مراد کو پہونچے۔[1]

مسلمانوں اور کافروں کی جنگی طاقت کا زبردست فرق

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تیزی کے ساتھ میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے آپؐ کی ہمرکابی میں صرف تین سو تیرہ (۳۱۳) مسلمان تھے، سامان جنگ کی قلت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مجاہدین اسلام کے پاس صرف دو (۲) گھوڑے اور ستر (۷۰) اونٹ تھے، ایک ایک اونٹ پر دو دو (۲) تین تین آدمی باری باری سے بیٹھتے تھے[2] اس میں سپہ سالار اور عام سپاہی اور افسر وماتحت کی کوئی تفریق نہ تھی، اس نظام میں خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما اور اجلۂ صحابہ سب شریک تھے۔

---

[1] دیکھئے اسد الغابہ ج ۴ ص ۱۴۸   [2] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۲

عمومی پرچم جہاد (اللواء) مُصعَب بن عمیرؓ کو مہاجرین کا پرچم (رایۃ) حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور انصار کا پرچم سعد بن معاذؓ کو عطا ہوا۔

جب ابوسفیان کو یہ اطلاع ملی کہ لشکر اسلامی روانہ ہوچکا ہے تو وہ نیچے ساحل سمندر کی طرف آگیا، اور یہ اطمینان کر کے کہ اب اس کو کوئی خطرہ نہیں ہے اور قافلہ بھی محفوظ ہے قریش کو یہ پیغام بھیجا کہ تم لوگ واپس لوٹ جاؤ اس لئے کہ تم قافلہ کی حفاظت کے لئے آئے تھے اور یہ مقصد حاصل ہوچکا ہے یہ سن کر ان لوگوں نے واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن ابوجہل کی ضد نے ان کو واپس جانے سے روک دیا، وہ اس پر کسی طرح تیار نہ ہوا کہ بغیر جنگ کئے واپس چلا جائے[1] قریش کے لشکر کی تعداد ایک ہزار سے اوپر تھی، اور اس میں گن گن کے تمام بڑے سردار، جنگ جو نوجوان، مانے ہوئے شہسوار اور آزمودہ کار سپاہی شامل تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ مکّہ نے آج اپنے سب جگر کے ٹکڑوں کو تمھارے سامنے ڈال دیا ہے۔

مشورہ کی اہمیت

قریش کے لشکر نے بدر پہونچ کر وادی کے ایک طرف پڑاؤ ڈالا مسلمانوں نے دوسری طرف، اسی درمیان میں حُباب بن المُنذرؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا اس منزل پر ہمارا پڑاؤ اللہ تعالٰے کے حکم سے ہے جس میں کوئی ردّ و بدل ہمارے لئے جائز نہیں یا اس کا تعلق

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۳، سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۱۸-۶۱۹

جنگی حکمت عملی اور تدبیر و انتظام سے ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں یہ تدبیر و حکمت کی بات ہے اور اس میں دشمن کو دھوکہ میں ڈالنے کی تمام چیزیں اختیار کی جاسکتی ہیں، انھوں نے کہا یا رسول اللہ پھر میں عرض کروں گا کہ یہاں پڑاؤ اس نقطۂ نظر سے مناسب نہیں ہے، انھوں نے ایک دوسرے مقام کی نشان دہی کی جو جنگ کے لئے زیادہ موزوں اور سازگار تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے معقول بات کہی، اس کے بعد آپ اپنے تمام آدمیوں کے ساتھ اس مقام کی طرف چلے اور اس جگہ قیام کیا جو پانی سے قریب ترین تھی[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رات تک سب سے پہلے پانی کے پاس پہونچ گئے اور اس کے حوض تیار کر لئے، آپ نے کفّار کو بھی اس سے پانی پینے کی اجازت دی۔[2]

اس رات کو اللہ تعالےٰ نے بارش کا انتظام بھی کر دیا جو کفّار و مشرکین کے لئے تو بہت مہنگی پڑی اور ان کی پیش قدمی رک گئی، مسلمانوں کے لئے یہ رحمت کی بارش ثابت ہوئی جس نے ریت کو او رجما دیا اور فضا ان کے حق میں خوش گوار اور سازگار کردی اور ان کے دلوں کو سکون و اطمینان نصیب فرمایا، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ	اور تم پر آسمان سے پانی برسا دیا تاکہ
مَاءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ	تم کو اس سے (نہلا کر) پاک کر دے، اور
عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ	شیطانی نجاست کو تم سے دور کر دے
عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ	اور اس لئے بھی کہ تمھارے دلوں کو
الْأَقْدَامَ ○ (سورۂ انفال۔۱۱)	مضبوط کر دے اور اس سے تمھارے

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۲۰ [2] ایضاً ص ۶۲۲ باختصار۔

پاؤں جمائے رکھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بحیثیت سپہ سالار

اس موقع پر آپ کی غیر معمولی اور بے مثال قائدانہ قابلیت (آپؐ کی ابدی وعالمگیر رسالت کے ساتھ جو اس سب کی بنیاد اور سرچشمۂ الہام وہدایت ہے) پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ ریز تھی، آپؐ کی حکیمانہ صف بندی اور تنظیم خطرات اور اچانک حملوں کے سدِّباب کی تدبیر، دشمن کی جنگی طاقت، اس کی نفری، اس کے پڑاؤ اور مختلف دستوں کی تعیناتی کا صحیح اندازہ، یہ وہ چیزیں ہیں، جن سے آپ کی غیر معمولی جنگی عبقریت کا اندازہ ہوتا ہے، اور اس کی ضروری تفصیلات سیرت کی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں۔[1]

جنگ کی تیاری

آپ کے لئے ایک جگہ جو میدان جنگ کے سامنے ایک ٹیلہ پر تھی چھپر ڈال دیا گیا، اس کے بعد آپؐ میدان میں تشریف لے گئے اور جگہ جگہ اپنے دستِ مبارک کے اشارے سے فرماتے رہے کہ انشاء اللہ یہاں فلاں آدمی مارا جائے گا، یہاں فلاں آدمی ہلاک ہوگا، اس جگہ فلاں شخص قتل کیا جائے گا، چنانچہ ایک جگہ بھی اس کے خلاف

---

[1] جنگ بدر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جو دفاعی وحفاظتی اقدامات اور جو مدبرانہ عسکری انتظامات فرمائے ان کی تفصیل و وضاحت پاکستانی میجر جنرل محمد اکبر خاں کی کتاب "حدیث دفاع" (اردو) میں نیز عراقی جنرل محمود شیت خطّاب کمانڈر انچیف کی کتاب "الرسول القائد" عربی میں دیکھی جا سکتی ہے۔

نہیں ہوا، اور آپ کا فرمانا حرف بحرف صحیح ثابت ہوا، اور اس جگہ میں فرق نہیں پڑا، جو جگہ آپ نے متعین فرمائی تھی۔

جب دونوں لشکر آمنے سامنے آکر کھڑے ہوئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اے اللہ، یہ قریش کے لوگ آج اپنے پورے غرور و تکبر کے ساتھ آئے ہیں، یہ تجھ سے جنگ پر آمادہ ہیں اور تیرے رسول کو جھوٹا ٹھہرا رہے ہیں"۔

یہ جمعہ کی رات تھی اور رمضان کی سترہ تاریخ، صبح نمودار ہوئی تو قریش اپنے تمام جنگی دستوں کے ساتھ سامنے آچکے تھے، اور دونوں فریق صف آرا تھے[1]۔

بارگاہِ الٰہی میں آہ وزاری اور دُعا و مُناجات

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صفیں درست فرمائیں، پھر "عریش" میں واپس تشریف لے آئے آپ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ بھی تھے، اس کے بعد آپؐ نے اللہ کے حضور میں گریہ وزاری اور دعاء و مناجات کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا، آپ خوب جانتے تھے کہ اگر آج مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ تعداد و قوت کے اصول پر ہے تو نتیجہ معلوم ہے، یہ وہی نتیجہ ہے جو ایک طاقت ور اور بڑی جماعت کے مقابلہ میں کمزور اور قلیل التعداد جماعت کے ساتھ ہمیشہ پیش آتا ہے، آپؐ نے جب ترازو کے دونوں پلڑوں پر نظر کی تو آپؐ کو مشرکین کا پلڑہ کھلے طور پر بھاری نظر آیا، دونوں میں کوئی تناسب ہی نہ تھا، آپؐ نے مسلمانوں کے پلڑہ پر وہ پاسنگ رکھدیا جس سے وہ اچانک بھاری ہو گیا، آپ نے اس مالک الملک اور شہنشاہ برحق کے سامنے اپنی فریاد

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۳-۳۴۴

رکھی اور اس سے نصرت وحمایت کے طالب ہوئے جس کے فیصلہ اور حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا، آپؐ نے اس چھوٹے سے اسلامی لشکر (جو ہر قسم کے سازوسامان سے محروم تھا) کے حق میں اللہ تعالیٰ سے سفارش فرمائی، آپؐ نے فرمایا "اللّٰھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لا تعبد بعدھا فی الارض" (اے اللہ! اگر آج تو نے اس مٹھی بھر جماعت کو فنا کر دیا تو پھر روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا) آپ بے خود وارفتہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے، اور یہ فرما رہے تھے کہ "اللّٰھم انجزلی ما وعدتنی، اللّٰھم نصرك" (اے اللہ تو نے مجھ سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے، وہ پورا فرما، اے اللہ! تری مدد کی ضرورت ہے) آپ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا فرما رہے تھے، یہاں تک کہ آپ کی چادر شانۂ مبارک سے گر پڑی، حضرت ابوبکرؓ آپ کو تسلی دے رہے تھے، اور اطمینان دلا رہے تھے، ان سے آپ کی اتنی زیادہ گریہ وزاری اور بے تابی و بے قراری دیکھی نہیں جاتی تھی۔[1]

امّت کا صحیح تعارف اور اس کے اصل مقام وپیغام کا تعیّن

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان چند پاکیزہ نفوس کے لئے اس نازک لمحہ

---

[1] دیکھئے زاد المعاد، اور سیرت کی دوسری کتب، امام مسلم نے کتاب الجہاد والسیر میں یہ روایت حضرت عمر بن الخطابؓ رضی اللہ عنہ کی زبان سے بیان کی ہے، اور اس کے الفاظ یہ ہیں، جب بدر کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے تین سو انیس ۳۱۹ اصحاب کرام اور سرفروشانِ اسلام کے ساتھ وہاں منزل کی تو آپ قبلہ رخ ہو گئے اور اپنے ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا شروع کی کہ اے اللہ تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا فرما، جو تو نے وعدہ کیا تھا وہ مجھے عطا فرما، اے اللہ اگر اہل اسلام کی یہ مختصر سی جماعت آج ختم ہو جاتی ہے تو روئے زمین پر پھر تیری کوئی عبادت کرنے والا نہ ہوگا" (باب الامداد بالملائکۃ فی غزوۃ بدر)

میں جن مختصر الفاظ کے ساتھ دعا کی اس میں آپ کا ناز و اعتماد اضطراب و بے قراری اطمینان قلب اور سکینت اور عجز و احتیاج کے تمام پہلو بیک وقت جلوہ گر تھے یہ اس امت کا بہترین و صحیح تعارف اقوام عالم میں اس کے اصل مقام و پیغام اور دنیا کے بازار میں اس کی قیمت افادیت اور ضرورت کی پوری وضاحت و تعیّن کے ساتھ نشان دہی تھی اور اس بات کا اظہار و اعلان تھا کہ یہ امت جس سرحد یا محاذ کی حفاظت پر مامور ہے وہ دعوت الی اللہ اور اخلاص کے ساتھ اس کی عبادت اور کامل اطاعت کا محاذ ہے۔

اس فتح مبین نے (جس نے تمام اندازوں اور تجربات کو غلط ثابت کر دکھایا) آپ کے ان الفاظ پر ہمیشہ کے لئے مہر تصدیق ثبت کر دی اور اس کا عملی ثبوت فراہم کر دیا کہ یہ بات حرف بحرف درست تھی اور اس امت کی صحیح سچی اور بولتی ہوئی تصویر یہی ہے۔

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لشکر کے سامنے تشریف لائے اور ان کو خدا کے راستہ میں جہاد و شہادت کا شوق دلایا، اسی درمیان میں عُتبہ بن ربیعہ اس کا بھائی شیبہ اور اس کا بیٹا ولید سامنے آئے اور درمیان صف میں آکر کھڑے ہوئے اور مبارز طلبی کی ان کے جواب میں انصار کے تین نوجوان نکلے ان کو دیکھ کر انھوں نے پوچھا، تم کون لوگ ہو؟

انھوں نے کہا، ہم انصار میں سے ہیں۔

کہنے لگے، شریف لوگ ہو، لیکن ہمارے جوڑ کے نہیں ہو، ہمارے مقابلہ کے لئے ہمارے چچا زاد بھائیوں (قریش) میں سے کسی کو بھیجو اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عُبیدہ بن الحارث رض حمزہ رض علی رض! تم تینوں ان کے مقابلہ کے لئے جاؤ۔

ان کو دیکھ کر انھوں نے کہا، ہاں ارے برابر کی جوڑی ہے۔

سب سے پہلے حضرت عُبیدہؓ نے جن کی عمر ان سب سے زیادہ تھی عتبہ کو للکارا حضرت حمزہؓ نے شیبہ کو دعوت مبارزت دی اور حضرت علیؓ نے ولید بن عتبہ سے دو، دو ہاتھ کیے، حضرت حمزہؓ و حضرت علیؓ نے تو دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں کا کام تمام کر دیا، حضرت عبیدہ اور عتبہ میں کچھ ہاتھ ہوئے لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت علی اپنی تلواریں لے کر عتبہ پر حملہ آور ہوئے اور اس کا کام تمام کر کے حضرت عبیدہؓ کو زخمی حالت میں واپس لائے، اور وہ شہادت سے سُرخرو ہوئے۔[1]

آغاز جنگ

اسی وقت دونوں لشکر برسر پیکار ہو گئے اور ایک دوسرے سے بالکل قریب ہو کر جنگ ہونے لگی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چلو بڑھو اس جنّت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔

پہلا شہید

عُمیر بن الحمام انصاریؓ نے یہ جملہ سنا تو کہنے لگے کہ یا رسول اللہ وہ جنّت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں! کہنے لگے واہ واہ! آپؐ نے فرمایا، یہ بات کیا کہہ رہے ہو؟ انھوں نے کہا نہیں یا رسول اللہ اور کوئی بات نہیں یہ میرا اس خیال سے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۲۵

کہہ رہا ہوں کہ شاید میری قسمت میں بھی یہ جنت ہو؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں ہاں تمھیں یہ جنت نصیب ہوگی، اس کے بعد انھوں نے اپنے ترکش سے کچھ کھجوریں نکالیں اور کھانے لگے، پھر اچانک کہنے لگے کہ اگر میں نے ان کھجوروں کے ختم کرنے کا انتظار کیا تو بہت دیر لگا دوں گا، اتنا جینے کی تاب نہیں، یہ کہہ کر جو کھجوریں رہ گئی تھیں، پھینک دیں اور میدان جنگ میں کود پڑے اور شہادت پائی، یہ جنگِ بدر کے پہلے شہید تھے۔[۱]

دوسری طرف مجاہدین اسلام صف بستہ اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح لشکر کفار کے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے تھے، صبر و عزیمت کے پیکر، دل یادِ الٰہی میں مشغول اور زبانیں اس کے ذکر و تسبیح میں زمزمہ سنج رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھرپور طریقہ پر جنگ میں حصہ لیا، آپؐ دشمن سے سب سے زیادہ قریب تھے، اور آپؐ سے زیادہ بہادر اور شجاع اس وقت کوئی دوسرا نظر نہ آتا تھا،[۲] اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کی مدد کے لئے فرشتے بھیجے، اور انھوں نے مشرکین کو تہس نہس کر دیا، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

اِذْ يُوحِي رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ	جب تمھارا پروردگار فرشتوں کو
اَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ	ارشاد فرماتا تھا کہ میں تمھارے
اٰمَنُوْا سَاُلْقِي فِي قُلُوْبِ	ساتھ ہوں، تم مومنوں کو تسلی
الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ	دو کہ ثابت قدم رہیں میں ابھی ابھی
فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ	کافروں کے دلوں میں رعب اور
وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ	ہیبت ڈالے دیتا ہوں تم بھی

[۱] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۵ سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۴۲۱ [۲] سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۴۲۵

بَنَانٍ ○ ان کے سر مار کر، اُڑا دو، اور
(سورۂ انفال ـ ۱۲) ان کا پور پور مار (کر توڑ) دو۔

شوقِ جہاد اور ذوقِ شہادت میں بھائیوں کا مقابلہ اور رسہ کشی

اس شہادت اور سعادت سے بہرہ مند و سرفراز ہوتے میں آج سگے بھائیوں اور جگری دوستوں میں بھی مقابلہ اور رسہ کشی ہو رہی تھی، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں معرکۂ بدر میں اپنے دستہ میں تھا کہ اچانک میری نگاہ اٹھی میں نے دیکھا کہ میرے دائیں اور بائیں دو کمسن نوجوان ہیں، ان دو نوجوانوں کو اپنے دائیں بائیں دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان نہ ہوا[1]، ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے چھپاتے ہوئے میرے کان میں چپکے سے کہا چچا مجھے ذرا ابوجہل کو دکھا دیجیے، میں نے کہا کہ تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ جہاں کہیں بھی اس کو دیکھ لوں گا اس کو ضرور ٹھکانے لگاؤں گا یا اپنی جان دے دوں گا، دوسرے نے بھی میرے کان میں چپکے سے یہی بات کہی، حضرت عبدالرحمن کہتے ہیں کہ میں نے ابوجہل کی طرف اشارہ ہی کیا تھا کہ دونوں عُقاب کی طرح اس پر جھپٹے اور اس کو وہیں ڈھیر کر دیا، یہ دونوں جانباز "عفراء" کے چشم و چراغ تھے[2]۔

جب ابوجہل ہلاک ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ ابوجہل ہے اس اُمت کا فرعون[3]۔

---

[1] کہ اگر کوئی نازک وقت آیا تو یہ دو نوعمر نوجوان میری کیا مدد کر سکیں گے۔ [2] صحیحین، یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں (کتاب المغازی، باب غزوۂ بدر) [3] سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۴۴۲

فتح مبین

یہ جنگ مسلمانوں کی فتح مبین اور مشرکین و کفار کی ذلت آمیز شکست پر ختم ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ اکبر الحمد للہ الذی صدق وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ" (خدا کا شکر ہے جس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور تنہا ساری ٹولیوں اور گروہوں کو شکست دی)

قرآن مجید نے اس کیفیت کی ترجمانی اس آیت میں کی ہے:۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ	اور خدا نے جنگ بدر میں بھی تمہاری
وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ	مدد کی تھی اور اس وقت بھی تم
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○	بے سروسامان تھے پس خدا سے ڈرو
(سورہ آل عمران ۔ ۱۲۳)	(اور ان احسانوں کو یاد کرو) تاکہ شکر کرو۔

آپؐ نے حکم دیا کہ کفار کے سارے مقتولین اسی اندھے کنویں میں ڈال دیئے جائیں، جو وہاں تھا، وہ سب اس میں پھینک دیئے گئے، آپؐ وہاں تشریف لے گئے، اور اوپر کھڑے ہو کر فرمایا، اے کنویں والو! کیا تم کو تمہارے رب کا کہنا سچ نظر آیا؟ میں نے تو اپنے رب کا وعدہ بالکل حق پایا ہے۔

اس جنگ میں کفار کے ستر بڑے نامی گرامی سردار مارے گئے، اور ستر ہی قیدی بنائے گئے[1]

مسلمانوں میں قریش کے چھ اور انصار کے آٹھ آدمی شہید ہوئے[2]

---

[1] صحیح بخاری۔ روایت براء بن عازبؓ (غزوۂ بدر، کتاب المغازی) [2] سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۴۶۳

جنگِ بدر کے اثرات و نتائج

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مُظفّر و منصور مدینہ واپس تشریف لائے، مدینہ اور اس کے اطراف میں آپؐ کے دشمنوں پر اس فتح کے بعد آپؐ کا رُعب و دبدبہ قائم ہو گیا اور بہت بڑی تعداد میں اہلِ مدینہ اسلام لے آئے۔

اس سے پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ نوید مسرّت سنانے کے لئے جن دو خاص نمایندوں کو شہر بھیجا، ان میں عبداللہ بن رواحہ بھی تھے، وہ مدینہ والوں کو خوش خبری دیتے اور کہتے، اے گروہِ انصار! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی وسلامتی اور کفار کا قتل اور گرفتاری تمھیں مبارک ہو، قریش کے جو سردار اور جنگی قائد اس میں مارے گئے وہ اس میں سے ایک ایک کے نام کا اعلان کرتے، اور گھر گھر جا کر یہ مژدہ سناتے، بچّے ان کے ساتھ سرور و شوق میں مختلف اشعار پڑھتے، اور ترانے گاتے، کچھ لوگوں میں کسی کو اس خبر کی صداقت پر یقین تھا کسی کو تردّد کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس مدینہ تشریف لے آئے، اس کے بعد قیدیوں کو لایا گیا ان کے نگراں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے غلام "شقران"[1] تھے، جب آپؐ "روحا" پہونچے تو مسلمانوں نے آگے بڑھ کر آپؐ کا استقبال کیا، اور آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھ جو مسلمان تھے، ان کو اللہ تعالےٰ نے جو فتح نصیب فرمائی، اس کی مبارکباد پیش کی۔

مشرکینِ مکّہ کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی اور مقتولین پر رونا پیٹنا شروع ہو گیا،[2] دشمنانِ اسلام کے دلوں میں رُعب بیٹھ گیا، ابو سفیان نے نذر مانی کہ جب تک رسول اللہ

---

[1] سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۴۷۲-۴۷۳ [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۴۷-۶۴۸

صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے اس کی دوبارہ جنگ نہیں ہوگی، اس وقت تک وہ اپنے سر پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ڈالے گا، مکّہ کے کمزور اور دبے ہوئے مسلمانوں نے اس سے اطمینان کی سانس لی اور انھوں نے اپنے اندر طاقت اور عزّت محسوس کی۔

ایمان کا رشتہ خون کے رشتہ سے بالاتر

اس جنگ میں ابو عزیز بن عُمیر بن ہاشم بھی قیدی بنا کر لائے گئے، یہ مُصعب بن عُمیر رضؓ کے سگے بھائی اور ایک ماں باپ کی اولاد تھے، مُصعب بن عُمیر رضؓ مسلمانوں کے پرچم بردار تھے، اور ان کے بھائی لشکر کفّار کے پرچم بردار۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ جب مُصعب رضؓ ان کے پاس سے گذرے تو اس وقت ایک انصاری ان کے ہاتھ باندھ رہے تھے، مُصعب رضؓ نے انصاری سے کہا کہ ذرا اچھی طرح کسنا، اس کی ماں بڑی مالدار ہے، اس سے فدیہ کی اچھی رقم ہاتھ آنے کی امّید ہے، ابو عزیز نے یہ سن کر اپنے بھائی مصعب کی طرف رُخ کر کے کہا کہ بھائی تم (بھائی ہو کر) یہ صلاح دے رہے ہو؟ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم میرے بھائی نہیں ہو، بھائی وہ ہے جو تمھاری مشکیں کس رہا ہے۔[1]

مسلمانوں نے قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے ساتھ اچھا معاملہ کرنے کی نصیحت فرمائی اور ارشاد ہوا کہ "استوصوا بھم خیرًا" (ان سے اچھا معاملہ کرنا)

---

[1] سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۴۷۵

یہی ابوعزیز راوی ہیں کہ جب وہ مجھے بدر سے قیدی بنا کر لائے تو مجھے انصار کے ایک خاندان میں جگہ ملی وہ دونوں وقت اپنے کھانوں میں سے روٹی تو مجھے دیتے اور خود کھجور پر اکتفا کرتے، یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اسی نصیحت و ہدایت کا اثر تھا کسی کو کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی مل جاتا تو مجھے لاکر دیتا مجھے شرم محسوس ہوتی اور میں اسے لوٹا دیتا لیکن وہ زبردستی مجھے دیتا، اور خود اسے ہاتھ بھی نہ لگاتا۔[۱]

انھیں قیدیوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا عباس بن عبدالمطلب، اور آپ کے چچا زاد بھائی عقیل بن ابی طالب[۲]، آپ کی صاحبزادی حضرت زینب کے شوہر ابوالعاص بن الربیع بھی تھے، ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا گیا، جو معاملہ عام قیدیوں کے ساتھ تھا، وہی ان کے ساتھ بھی تھا۔

بچوں کی تعلیم کے معاوضہ میں قیدیوں کی رہائی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں سے عفو و درگذر کا معاملہ فرمایا اور ان کا فدیہ قبول کیا، جو جتنا دولت مند ہوتا یہ فدیہ اسی کے بقدر اس سے لیا جاتا جس کے پاس دینے کے لئے کچھ نہ ہوتا آپ اس کو اپنی طرف سے رہائی کا حکم فرماتے غرض قریش نے اپنے بہت سے قیدی فدیہ دیکر آزاد کرائے۔

کچھ ایسے قیدی بھی تھے جن کا فدیہ نہیں ہو سکا، ان کا فدیہ آپ نے یہ تجویز کیا کہ وہ انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں[۳]، ایک قیدی پر دس مسلمانوں کی تعلیم ضروری قرار دی گئی[۴]، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اسی طریقہ سے تعلیم حاصل کی تھی اس حکم میں علم کی جتنی قدردانی اور تعلیم کی جو ہمت افزائی مضمر ہے اس کی توضیح کی شاید ضرورت نہیں۔

---

[۱] سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۴۷۵ [۲] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳ [۳] مسند احمد ج ۱ ص ۲۴۷ [۴] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۴

دُوسرے غزوات و سرایا

ابوسفیان نے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے قسم کھائی تھی کہ جب تک مسلمانوں سے بدلہ نہیں لیا جائیگا اس وقت تک وہ اپنے سر پر پانی کا ایک قطرہ نہ پڑنے دیں گے، وہ اپنی قسم پوری کرنے کے لئے قریش کے دو سو سواروں کے ساتھ حملہ کی نیت سے نکلے بنی النضیر کے سردار سلام بن مشکم سے اجازت چاہی، انھوں نے نہ صرف اجازت دی بلکہ ان کی خوب ضیافت و مہمان نوازی کی اور مدینہ کے حالات سے مطلع کیا اور کچھ لوگوں کو بھیجا جنھوں نے انصار میں سے دو آدمیوں کو شہید کر دیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے ساتھ ان کے تعاقب میں نکلے لیکن ابوسفیان اور ان کے ہمراہی مسلمانوں کے پہونچنے سے پہلے نکل بھاگے اور اپنے پیچھے بہت بڑی مقدار میں غلہ اور اجناس جن میں زیادہ تر ستو تھے چھوڑ گئے، اسی لئے اس کو "غزوۂ سویق" بھی کہا جاتا ہے[1][2]

بنی قینقاع کے ساتھ معاملہ

بنو قینقاع پہلے یہودی تھے جنھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے معاہدہ کو توڑا، آپؐ سے جنگ کی مسلمانوں کو اذیت پہونچائی چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کر لیا اور پندرہ[1] راتیں اسی حال میں گزار دیں یہاں تک کہ انھوں نے اپنا سر جھکا دیا، اور آپؐ کے فیصلہ پر راضی ہو گئے، ان کے حلیف عبداللہ بن اُبَیّ (راس المنافقین) نے آپؐ کی خدمت میں ان کی سفارش کی چنانچہ ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا لحاظ کر کے محاصرہ اٹھا لیا[2]، یہ سات سو[3] جنگجو تھے اور زیادہ تر سناری اور دکانداری کا پیشہ کرتے تھے[5]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۴-۴۵ [2] عربی میں ستو کو "سویق" کہتے ہیں [5] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۷-۴۹

[3] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۸

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان یہود کے لئے اس شرط پر عفو عام کا حکم دے دیا، کہ وہ مدینہ سے نکل کر کہیں بھی چلے جائیں۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے اطمینان کے ساتھ شام چلے گئے اور منقولہ سامان بھی اپنے ساتھ لے گئے، بنو قینقاع اپنے تمرد و بد عہدی کی وجہ سے سزائے موت کے منتظر تھے مگر وہ بھی سلامتی کے ساتھ بخیر چلے گئے۔[1]

کعب بن الاشرف بھی جو یہودیوں کا بڑا سردار تھا آپ کو برابر تکلیفیں پہونچاتا رہتا تھا اور مسلمان شریف زادیوں کے بارے میں غزلیہ اشعار کہتا تھا، جنگِ بدر کے بعد اس نے مکہ میں جاکر کفار کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا، اسی حال میں وہ مدینہ پہونچا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی آمد کی خبر پاکر فرمایا، کعب بن الاشرف نے اللہ اور اس کے رسول کو بہت تکلیف پہونچائی ہے، اس کا کوئی انتظام کرسکتا ہے؟ انصار کے کچھ لوگ یہ خدمت انجام دینے کے لئے اسی وقت کھڑے ہوگئے اور اس کا خاتمہ کر دیا۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۸ W. MONTGOMERY WATT اپنی کتاب "MOHAMMAD PROPHET AND STATESMAN" میں لکھتا ہے۔

"بنو قینقاع کا اخراج ایک اہم عامل تھا جس نے آنحضرت کے مرکز کو مضبوط کیا، اس اخراج کا سبب روایات میں یہود قینقاع اور بعض مسلم تاجروں کے درمیان وہ معمولی جھگڑا بتایا جاتا ہے جو مدینہ کے بازار میں واقع ہوا۔ مونٹگمری واٹ کو اس سے اتفاق نہیں کہ اس اخراج کی وجہ سوق بنی قینقاع میں ایک مسلمان عورت پر یہود کی زیادتی تھی، جو سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے، وہ لکھتا ہے کہ "محمد کے یہود کے اخراج کے اقدام کے اسباب ایسے گہرے ہیں جو اس وقتی واقعہ سے منسوب کیے جاتے ہیں، اصل وجہ یہود کا مسلم معاشرہ میں ضم نہ ہونا تھا۔" وہ مزید لکھتا ہے "محمد کو یہود اور اپنے حریف قریش مکہ کے درمیان دوستانہ تعلقات کا بھی علم ہوگا، جو مسلمانوں اور یہود کے درمیان معاہدہ کی روح کے خلاف سمجھے گئے۔"

تفصیل کے ملاحظہ ہو "غزوۂ بنی قینقاع" از استاذ محمد احمد باشمیل۔

[2] زاد المعاد ج ۲ ص ۳۴۸ اختصار کے ساتھ۔

غزوۂ اُحُد

(شوال سنہ ۳ھ)

جاہلی حمیّت اور جذبۂ انتقام

جنگِ بدر میں جب قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور باقی ماندہ فوج نے منتشر ہو کر مکہ کی طرف راہِ فرار اختیار کی تو اس کا مکہ والوں پر بہت بُرا اثر پڑا، یہ واقعہ ان کے لئے ایک عظیم سانحہ سے کم نہ تھا، چنانچہ وہ سب لوگ جن کے باپ بیٹے اور بھائی مارے گئے تھے جمع ہو کر ابو سفیان کے پاس گئے، اور اس سے اور قریش کے اس قافلہ میں جن لوگوں کا حصہ تھا ان لوگوں سے بھی اس معاملہ میں مشورہ کیا اور انھیں کے روپیہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک نئی جنگ کی تیاری شروع کی، شاعروں نے ان کو حسبِ معمول غیرت دلانی شروع کی اور ان کی حمیّتِ جاہلیت کو ابھارا۔

ہجرت کے تیسرے سال ماہ شوال کے وسط میں قریش کا یہ لشکر اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ روانہ ہوا، قریش کے ان نوجوانوں کے ساتھ دوسرے قبائل کے لوگ بھی تھے، جو قریش کو اپنا سردار تسلیم کرتے تھے، ان کے ساتھ عورتیں بھی تھیں جو اپنے محمل میں اس لشکر کے ساتھ اس غرض سے بھیجی گئی تھیں کہ مرد اُن کی وجہ سے راہِ فرار نہ اختیار کر سکیں[1]

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۰-۶۲

قریش کے سردار اپنی بیویوں کے ساتھ تھے، غرض یہ لشکر روانہ ہوا اور اس نے مدینہ کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ رائے تھی کہ مسلمان مدینہ میں ہی رہیں اور ان لوگوں سے کوئی تعرض نہ کریں، اگر وہ خود حملہ کریں تو ان سے قتال کریں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شہر چھوڑ کر اور باہر نکل کر ان سے مقابلہ پسند نہیں فرما رہے تھے، عبداللہ بن اُبَی کی بھی رائے وہی تھی، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تھی لیکن بعض ان مسلمانوں نے جو بدر کی جنگ میں شریک نہیں ہو سکے تھے، اور ان کو اس کی حسرت رہ گئی تھی یہ کہا کہ یا رسول اللہ! آپ باہر نکل کر دشمنوں کا مقابلہ کریں کہیں ان کو یہ محسوس نہ ہو کہ ہم بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے باہر نہیں نکل رہے ہیں، یہ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جب اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دولت کدہ میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے، اس وقت ان لوگوں کو جو باہر نکل کر مقابلہ کے داعی تھے، ندامت ہوئی انھوں نے کہا، یا رسول اللہ ہم نے آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف اس کام پر آمادہ کیا ہے، جو ہمیں نہیں کرنا چاہیے، اگر آپ چاہیں تو تشریف رکھیں اور یہیں رہ کر مقابلہ فرمائیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ مسلح ہونے کے بعد جنگ سے پہلے ہتھیار رکھ دے[1]، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک ہزار صحابیوں کے ساتھ مقابلہ کے لئے تشریف لے چلے، مدینہ سے کچھ دور پہونچے تھے کہ عبداللہ بن اُبَی ایک تہائی آدمیوں کے ساتھ آپ کو چھوڑ کر واپس چلا گیا، اس نے کہا کہ میری بات تو انھوں نے ٹھکرا دی اور نوجوانوں کی بات مان لی[2]۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۳ [2] ایضاً ص ۶۴

اُحُد کے دامن میں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش قدمی کرکے اور پہاڑ کے دامن میں (جو مدینہ منورہ سے تین[۳] کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے) پڑاؤ ڈالا آپؐ نے اپنی پُشت اُحُد کی طرف کی اور لشکر کو بھی اسی حساب سے تعینات کیا[۱] اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک میں حکم نہ دوں کوئی جنگ کا آغاز نہ کرے، پھر آپؐ نے جنگ کی باضابطہ تیاری فرمائی، آپؐ کے ہمراہ اس وقت سات سو[۷۰۰] آدمی تھے، تیراندازوں پر آپؐ نے عبد اللہ بن جبیرؓ کو مامور کیا، ان کی تعداد پچاس[۵۰] تھی، ان کو آپؐ نے صراحت کے ساتھ یہ حکم دیا کہ وہ تیراندازی کے ذریعہ گھوڑ سواروں کی پیش قدمی روکیں اور اس کا خیال رکھیں کہ وہ ہماری پُشت پر نہ آجائیں، خواہ جنگ کا پانسہ ہمارے حق میں ہو یا ہمارے خلاف ہو[۲] آپؐ نے ان کو یہ بھی ہدایت کی کہ وہ اپنی پوزیشن کسی حالت میں نہ چھوڑیں اور اس جگہ سے ہرگز نہ ہٹیں، خواہ چڑیاں مسلمانوں کے لشکر کو اچک لے جائیں[۳]۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر دُہری زرہ پہنی اور اسلامی لشکر کا پرچم مصعب بن عمیرؓ کو عطا فرمایا۔

ہم عمروں میں مقابلہ اور مسابقت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد میں کچھ نوعمر لڑکوں کو ان کی کم عمری

---

[۱] میدانِ جنگ کی صحیح پوزیشن اور جنگی حکمت عملی کو سمجھنے کے لئے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب حیدرآبادی حال مقیم پیرس کی کتاب "عہد نبوی کے میدانِ جنگ" کا مطالعہ کیا جائے۔ [۲] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۶

[۳] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۴۹ نیز صحیح بخاری باب "غزوۂ احد" کتاب المغازی۔

کی وجہ سے واپس فرما دیا تھا، ان میں سمرۃ بن جندبؓ اور رافع بن خدیجؓ بھی تھے، ان دونوں کی عمریں پندرہ ۱۵ سال سے زیادہ نہ تھیں، رافع کے والد نے اپنے لڑکے کی سفارش کرتے ہوئے عرض کیا کہ، یارسول اللہ! میرا لڑکا رافع بڑا تیر انداز ہے آپؐ نے ان کی سفارش قبول فرمائی اور ان کو اس غزوہ میں شرکت کی اجازت دے دی، پھر سمرۃ بن جندبؓ آپ کے سامنے پیش کئے گئے یہ بھی رافع کے ہم سن تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی واپس فرما دیا، سمرۃؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ نے رافعؓ کو اجازت دے دی اور مجھے واپس فرما دیا، حالانکہ اگر میری اُن سے کشتی ہو تو میں ان کو پچھاڑ سکتا ہوں، دونوں میں کشتی ہوئی اور سمرہ نے رافع کو چت کر دیا، اور اس طرح ان کو بھی غزوۂ احد میں شرکت کی اجازت مل گئی۔[1]

لڑائی کا آغاز

لڑائی شروع ہوئی اور دونوں فریق ایک دوسرے سے گتھ گئے، ہند بنت عُتبہ عورتوں میں موجود تھی، عورتیں دف بجا بجا کر مردوں کو جنگ پر آمادہ کر رہی تھیں، یہاں تک کہ جنگ اپنے پورے شباب پر پہونچ گئی، ابو دجانہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تلوار لے کر میدانِ جنگ میں گھس گئے، جو کوئی ان کے سامنے آتا ان کی تلوار سے بچ کر نہ جاتا۔[2]

یہ ہفتہ کے روز، ۷ شوال ۳ھ کا واقعہ ہے۔

حضرت حمزہ اور مُصعب بن عُمیر رضی اللہ عنہما کی شہادت

حضرت حمزہؓ نے بھی اس لڑائی میں اپنی شجاعت کے خوب جوہر دکھائے،

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۶   [2] ایضاً ص ۶۷-۶۸

اور بڑے بڑے سرداروں کو موت کے گھاٹ اتارا کسی کو ان کے سامنے ٹھہرنے کی طاقت نہ تھی لیکن جُبیر بن مُطعِم کا غلام وحشی ان کی گھات میں تھا وہ بھالا پھینک کر اپنے مقابل کو ختم کرنے میں خاص مہارت رکھتا تھا جُبیر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کر دے گا تو اس کو اس کے انعام میں آزاد کر دے گا، اس کا چچا طُعیمہ جنگِ بدر میں مارا گیا تھا اور اس کا ملال بھی اس کے دل میں تھا، دوسری طرف ہند اس کو حضرت حمزہؓ کے قتل پر اُکسا رہی تھی، وہ ان کی شہادت سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی، وحشی نے اپنا بھالا تان کر پوری طاقت سے حضرت حمزہؓ پر حملہ کیا، وہ ان کی ناف سے پار نکل گیا حضرت حمزہ تڑپ کر گرے اور جاں بحق تسلیم ہوئے[1] مُصعب بن عُمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سینہ سپر ہو کر لڑتے رہے اور آپ پر قربان ہو گئے، مسلمانوں نے اس غزوہ میں سرفروشی و جاں بازی کا حق ادا کر دیا، اور راہِ حق کی ہر آزمائش پر پورے اترے[2]۔

مسلمانوں کا غلبہ

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے مدد نازل فرمائی اور اپنا وعدہ پورا فرمایا مشرکین و کفار کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی اور ان کی عورتوں نے جو مردوں کو غیرت دلانے آئی تھیں راہِ فرار اختیار کی، وہ اپنے پائنچے اُٹھا اُٹھا کر بھاگتی نظر آ رہی تھیں[3]۔

مسلمانوں کے خلاف جنگ کا پانسہ کیسے پلٹا؟

جب مشرکین شکست کھا کر بھاگنے لگے اور اب ان کی عورتوں کی بھی باری

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۷۲، یہ پورا واقعہ خود وحشی کی زبان سے صحیح بخاری میں نقل کیا گیا ہے دیکھئے غزوۂ احد باب "قتل حمزۃ رضی اللہ عنہ" [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۷۳ [3] ایضاً ص ۷۷

غزوۂ احد کا میدان جنگ
جبل احد

آگئی تو تیر اندازوں نے یہ دیکھ کر اپنی پوزیشن چھوڑ دی اور لشکر سے آملے، ان کو فتح کا پورا یقین تھا وہاں پہونچ کر انھوں نے نعرہ لگایا، مالِ غنیمت! مالِ غنیمت! اس موقع پر ان کے امیر نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عہد ان کو یاد دلایا لیکن اس جوش میں کسی نے ان کی بات نہ سنی، اور پورا یقین کرتے ہوئے کہ اب مشرکین کو واپس آنا نہیں ہے یہ محاذ انھوں نے خالی کر دیا، اور مسلمانوں کی پشت پر گھوڑ سواروں کی فوج کا راستہ کھل گیا۔[1] مشرکین کے پرچم کو جو لوگ سنبھالے ہوئے تھے مارے گئے، پرچم کے قریب آنے کی کوئی ہمّت نہیں کر رہا تھا، اسی وقت مشرکین نے پیچھے آکر آواز لگائی کہ محمّد (صلے اللہ علیہ وسلم) شہید ہو گئے، یہ سن کر مسلمانوں کا لشکر اچانک پیچھے کی طرف مڑا، اور مشرکین کو دوبارہ حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور اس نازک موقع سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا یہ مسلمانوں کے لئے سخت آزمائش وابتلاء کا دن تھا، اس درمیان میں دشمن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچ گئے ان میں عبد اللہ بن قمئۃ اور عُتبہ بن ابی وقّاص شقاوت اور اس جسارت میں پیش پیش تھے، اس وقت ایک پتّھر آپ کے لگا، یہاں تک کہ آپ دائیں پہلو پر غار میں گر گئے، سامنے والا ایک دانت زخمی ہوا، سر مبارک میں زخم آیا، اور لبِ مبارک خون آلود ہو گئے، خون چہرۂ انور پر بہہ رہا تھا، آپ اس کو پونچھتے جاتے تھے، اور فرماتے تھے، وہ قوم کیسے کامیاب ہو سکتی ہے جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون سے تر کر دیا، جو ان کو ان کے رب کی طرف بلاتا تھا؟[2]

مسلمانوں کو خبر نہ تھی کہ آپ کس جگہ ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو سہارا دیا اور حضرت طلحہ بن عُبَید اللہ رضؓ نے آپ کو اٹھایا، چنانچہ آپ کھڑے ہو گئے،

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۳۵ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۷۸-۸۰

مالک بن سنانؓ نے اس مبارک لہو کو جس سے آپؐ کا روئے انور زخمی ہوگیا تھا جوشِ محبت میں نوش کرلیا۔[1]

یہ دراصل فرار نہ تھا بلکہ جنگی حکمتِ عملی تھی جو ہر فوج کو بوقت ضرورت اختیار کرنی پڑتی ہے پھر سنبھل کر وہ دوبارہ حملہ آور ہوتی ہے، مسلمانوں کو اس موقع پر آزمائش کی جس تلخی کا مزہ چکھنا پڑا، اور ان کو جو جانی نقصان ہوا اور متعدد اجلّۂ صحابہ جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے سرچشمۂ قوت اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حامی و پاسبان تھے، شہید ہوئے وہ سب دراصل ان تیر اندازوں کی لغزش اور چوک کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اس صریح حکم اور ہدایت کی آخری لمحہ تک تعمیل نہ کی اور اپنی اس پوزیشن کو چھوڑ دیا، جہاں ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تعینات فرمایا تھا۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ	اور خدا نے اپنا وعدہ سچا کردیا یعنی
اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا	اس وقت جب کہ تم کافروں کو اس کے
فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ	حکم سے قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ
وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ	جو تم چاہتے تھے خدا نے تم کو دکھادیا
مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ	اس کے بعد تم نے ہمت ہاردی اور حکم
الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ	(پیغمبر) میں جھگڑا کرنے لگے اور اس کی
ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ	نافرمانی کی بعض تو تم میں سے دنیا کے
لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ	خواستگار تھے بعض آخرت کے طالب،
عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ	اس وقت خدا نے تم کو ان کے مقابلہ

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۸۰

عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ○ سے پھیر (کر بھگا) دیا تاکہ تمھاری آزمائش

(سورۂ آل عمران - ۱۵۲) کرے اور اس نے تمھارا قصور معاف کر دیا اور

خدا مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

محبّت اور جاں نثاری کی نئی نظیریں

حضرت ابو عُبیدہ بن الجرّاح رضؓ نے خود کی ایک کڑی کو اپنے دانتوں سے پکڑ کر نکالا تو اسی کے ساتھ ان کا ایک دانت بھی گر پڑا، دوسری کڑی نکالی تو دوسرا دانت بھی اس کے ساتھ آگیا، ابو دجانہؓ ڈھال بن کر آپؐ کے سامنے کھڑے ہوگئے تیر ان پر گرتے رہے لیکن وہ اسی طرح آپ پر جھکے رہے، یہاں تک کہ ان کی پیٹھ تیروں سے چھلنی ہوگئی، سعد بن ابی وقاصؓ اسی جگہ کھڑے حضورؐ کے دفاع میں دشمن پر تیر چلاتے رہے آپ ایک ایک تیر ان کو اپنے دستِ مبارک سے عنایت فرماتے اور ارشاد ہوتا "اِرمِ فداك ابی وامی" تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں، اسی طرح تیر چلاتے رہو۔[1]

قتادہ بن النعمانؓ کی آنکھ پر ایسی ضرب آئی کہ آنکھ نکل کر ان کے رخسار پر آگئی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اسے اسی جگہ کر دیا، وہ آنکھ ایسی اچھی ہوئی کہ اس کی بصارت پہلی آنکھ سے بھی تیز ہوگئی۔[2]

مشرکین آپ کی تلاش میں تھے لیکن تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ کچھ اور تھا جب انھوں نے آپ پر ہجوم کیا تو تقریباً دس آدمی آپؐ کے سامنے آگئے اور سب ایک ایک کر کے آپؐ پر

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۸۲-۸۳ نیز صحیح بخاری بسلسلہ غزوۂ احد باب قول اللہ تعالیٰ "اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا"، [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۸۲

قربان ہوگئے، پھر حضرت طلحہ بن عُبَید اللہ رضؓ نے اپنا ہاتھ سامنے کردیا اور تیروں کو روکنا شروع کیا یہاں تک کہ ان کی سب انگلیاں زخموں سے لہولہان ہوگئیں اور ہاتھ مفلوج ہوگیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وہیں ایک چٹان پر چڑھنا چاہتے تھے لیکن زخموں کی وجہ سے خاصا ضعف ہوگیا تھا اور چڑھنا دشوار ہورہا تھا، یہ دیکھ کر حضرت طلحہؓ آپ کے نیچے بیٹھ گئے اور ان کا سہارا لے کر آپؐ اس چٹان پر تشریف لے آئے نماز کا وقت آیا تو آپؐ نے بیٹھ کر نماز پڑھی[1]

یہ وقت تھا جب لوگ شکست کھاکر منتشر ہونے لگے تھے لیکن انس بن النضر (جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خادم انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا ہیں) نے اس وقت بھی شکست تسلیم نہ کی اور آگے بڑھتے رہے، سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کو راستہ میں ملے اور پوچھا کہ کدھر کا ارادہ ہے؟ کہنے لگے کہ سعد! مجھے جنّت کی خوشبو احد پہاڑ کے اس طرف صاف محسوس ہورہی ہے[2]، انس بن النضرؓ مہاجرین وانصار کے کچھ لوگوں کے پاس سے گذرے اور دیکھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں انھوں نے کہا کہ تم لوگ یہاں بیٹھے کیا کررہے ہو؟ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شہید ہوگئے، انس ابن النضرؓ نے کہا پھر آپؐ کے بعد زندہ رہنے کا کیا فائدہ؟ اٹھو اور جس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جان دی ہے اسی پر تم بھی جان دے دو، یہ کہہ کر آگے بڑھے دشمن سے دو دو ہاتھ کئے اور جان دے دی، ان کے بھتیجے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس دن ہم نے ان کے جسم پر ستّر زخم شمار کئے، زخموں کی کثرت سے ان کو پہچاننا ناممکن ہورہا تھا صرف ان کی بہن نے ان کی انگلی کے ایک پور سے ان کو پہچانا جس پر بچپن کی نشانی تھی[3]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص۸۶ و زاد المعاد ج ۱ ص۳۵۰ [2] زاد المعاد ج ۱ ص۳۵۰، اصل روایت صحیحین میں ہے [3] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص۸۳

زیاد بن السکن رضؓ پانچ انصاریوں کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے لڑ رہے تھے، اور ایک ایک کر کے شہید ہوتے جا رہے تھے یہاں تک کہ یہ زخموں سے چور اور نڈھال ہو کر گر پڑے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو میرے قریب لے آؤ، لوگوں نے اٹھا کر ان کو آپؐ کے سامنے لٹا دیا، آپؐ نے ان کے سر کو اپنے قدمِ مبارک پر رکھ لیا اور اس حالت میں ان کی جان نکلی کہ ان کے رخسار حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر تھے[1]

عمرو بن الجموح رضؓ کے پاؤں میں شدید لنگ تھا، ان کے چار صاحبزادے تھے سب جوان تھے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قربانی و سرفروشی کے ہر موقع پر حاضر بھی رہتے تھے، جب آپؐ غزوۂ احد کے لئے روانہ ہوئے تو عمرو بن الجموح نے بھی چلنے کا ارادہ کر لیا، ان کے بیٹوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لئے رخصت رکھی ہے، اگر آپ تشریف رکھیں تو اچھا ہے ہم لوگ آپؐ کی طرف سے کافی ہیں آپ پر جہاد فرض نہیں ہے۔

عمرو بن الجموح رضؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے بیٹے مجھے جہاد میں شرکت سے روک رہے ہیں، اور خدا کی قسم میری آرزو ہے کہ میں بھی شہادت پاؤں اور جنت میں اسی طرح لنگڑاتا ہوا چلوں، رسول اللہ صلے اللہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۸۱، اس موقع پر مولانا شبلی نے "سیرت النبی" میں فارسی کا، اور قاضی محمد سلیمان صاحب منصورپوری نے "رحمۃ للعالمین" میں اردو کا ایک ایک ایسا منتخب شعر لکھا ہے جس نے واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے، اور جس سے بہتر شعر کا انتخاب مشکل ہے، یہ دونوں شعر علی الترتیب یہ ہیں ؎

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے | کہ بوقتِ جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

سر بوقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے | یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اللہ نے جہاد سے تمھیں معافی دے دی ہے اور ان کے بیٹوں سے ارشاد فرمایا کہ کیا حرج ہے کہ تم ان کو جہاد میں جانے دو (وہ اپنا ارمان نکال لیں) چنانچہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور شہادت کی آرزو و تمنا پوری ہوئی۔[1]

زید بن ثابت رضؓ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے سعد بن الربیع رضؓ کی تلاش میں بھیجا اور فرمایا کہ اگر وہ نظر آجائیں تو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا ہے کہ اس وقت تمھیں کیسا محسوس ہو رہا ہے؟ کہتے ہیں کہ مقتولین کے درمیان میں ان کو تلاش کرتا پھر رہا تھا کہ ایک جگہ وہ مجھے نظر آئے، میں قریب گیا دیکھا تو آخری وقت تھا، ان کے جسم پر نیزہ، تلوار اور تیر کے ستّر زخم تھے، میں نے کہا سعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمھیں سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ مجھے بتاؤ اس وقت تمہاری کیا کیفیت ہے انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سلام عرض کرنا اور کہنا کہ یا رسول اللہ! (صلے اللہ علیہ وسلم) مجھے اس وقت جنّت کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے، اور میری قوم انصار سے یہ کہنا کہ اگر دشمن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچ گئے اور تمھارے دم میں دم رہا تو اللہ تعالےٰ کے لئے تمھارے پاس کوئی عذر نہ ہوگا، یہ کہتے ہی ان کی روح پرواز کر گئی۔[2]

عبداللہ بن جحش رضؓ نے غزوۂ احد کے سلسلہ میں کہا، اے اللہ تجھے تیری قسم کہ میں کل دشمن کا مقابلہ کروں وہ مجھے قتل کر دیں، پھر میرا پیٹ چاک کر دیں اور میرے ناک کان کاٹ ڈالیں پھر تو مجھ سے پوچھے کہ یہ سب کس کے لئے تھا؟ میں جواب دوں تیرے لئے۔[3]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۵۳ [2] ایضاً [3] ایضاً

مسلمانوں کا دوبارہ جماؤ

جب مسلمانوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا تو ان کو نئی زندگی مل گئی اور وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے آپؐ ان کو لے کر دوبارہ وادی کی طرف بڑھے راستہ میں اُبَی بن خلف نے آپؐ کو دیکھا، اور دیکھتے ہی کہنے لگا، محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اگر تم سلامت رہے تو میری خیر نہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس کو جانے دو، لیکن جب وہ آپؐ سے بالکل قریب آگیا تو آپؐ نے ایک صحابی سے نیزہ لے کر اس کی گردن میں مارا نیزہ لگتے ہی اس نے گھوڑے سے گر کر کئی قلابازیاں کھائیں[1] اس موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اپنی ڈھال میں پانی بھر کر لائے اور روئے انور پر جو خون تھا، اس کو دھویا، صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس کو دھوتی تھیں، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ڈھال میں پانی لے کر ڈالتے تھے جب حضرت فاطمہ رضؓ نے دیکھا کہ پانی سے خون کسی طرح بند نہیں ہو رہا ہے، بلکہ اور زیادہ بہنے لگا تو انھوں نے چٹائی کا ایک ٹکڑا لے کر اسے جلایا، اور اس کی راکھ زخم پر باندھ دی، اس سے یہ خون اسی وقت تھم گیا۔[2]

حضرت عائشہ اور اُم سُلیم رضی اللہ عنہما اس غزوہ میں مشکیزے اپنی کمر پہ لاد کر مجروحین کو پانی پلاتیں، جب مشکیزے خالی ہو جاتے تو واپس جا کر انھیں دوبارہ اور

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صہ ۸۴ [2] صحیح بخاری، غزوۂ احد، باب "ما اصاب النبی من الجرح یوم احد" وصحیح مسلم باب غزوۂ احد، معمولی اختلاف کے ساتھ، نیز ابن ہشام ج ۲ صہ ۸۵ وزاد المعاد ج ۱ صہ ۳۵۲

سے بارہ بھرتیں، اور ان لوگوں کی پیاس بجھاتیں[۱]، اُمِّ سلیط اُن کے مشکیزوں میں پانی بھر کر ان کے حوالے کرتی تھیں[۲]۔

ہند بنت عُتبہ نے کچھ اور عورتوں کے ساتھ مسلمان مقتولین کی لاشوں کی بے حرمتی اور ان کا مُثلہ کرنا، اور کان وناک کاٹنا شروع کئے وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر نکال کر اُسے چبانے لگی لیکن وہ اس کے گلے سے اتر نہ سکا، اور اس نے اُسے فوراً اگل دیا[۳]۔

جب ابوسفیان واپس ہوتے لگے تو پہاڑ پر کھڑے ہو کر بہت بلند آواز سے انھوں نے نعرہ لگایا جنگ کا معاملہ ڈانواں ڈول ہے آج اس کی فتح کل اس کی، ہُبل کا نام اونچا رہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عمر کھڑے ہو کر اس کا جواب دو اور کہو کہ اللہ بہت بلند و بالا ہے، اس کے سوا کوئی نہیں، ہمارے مقتولین جنّت میں ہیں، اور تمھارے مقتولین دوزخ میں ہیں[۴]، یہ سُن کر ابوسفیان بولے "لنا العزّٰی ولا عزّٰی لکم" (ہمارے پاس عزیٰ (بُت) ہے تمھارے پاس نہیں)۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کا جواب دو، صحابہ نے عرض کیا کہ ہم کیا کہیں؟ آپ نے فرمایا کہو کہ "اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم" (اللہ ہمارا سرپرست ہے تمہارا کوئی سرپرست نہیں[۵]) جب وہ اپنی طرف چلے اور مسلمان اپنی طرف روانہ ہونے لگے تو انھوں نے پھر آواز لگائی "آئندہ سال بدر میں پھر ہمارا تمھارا مقابلہ ہے"، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے فرمایا کہو ہاں یہ تاریخ ہمارے تمھارے درمیان طے ہے[۶]۔

---

[۱] صحیح بخاری غزوۂ احد باب "اِذْ ھَمَّتْ طَآئِفَتَانِ مِنْکُمْ اَنْ تَفْشَلَا"، ومسلم باب غزوۃ النساء مع الرجال [۲] صحیح بخاری باب ام سلیط رضی اللہ عنہا [۳] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۱

[۴] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۳ [۵] صحیح بخاری باب غزوۂ احد [۶] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۴

لوگوں کو اپنے اپنے مقتولین کا غم تھا اور وہ ان کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر حضرت حمزہؓ کی شہادت کا بڑا اثر تھا جو آپؐ کے چچا اور رضاعی بھائی تھے، اور ہمیشہ آپ کے لئے سینہ سپر رہے۔

ایک مومنہ کا صبر

صفیہؓ بنت عبد المطلب رضی اللہ عنہا جو ان کی حقیقی بہن تھیں، ان کو دیکھنے آئیں تو آپؐ نے ان کے صاحبزادے زبیر بن العوامؓ سے فرمایا کہ ان سے مل کر ان کو واپس لوٹا دو، ان کے بھائی کی نعش کی جو بے حرمتی کی گئی ہے اس پر ان کی نظر نہ پڑے، انھوں نے جا کر کہا کہ اماں! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ آپ واپس جائیں، کہنے لگیں کیوں؟ مجھے معلوم ہے کہ میرے بھائی کا مثلہ کیا گیا ہے لیکن یہ سب اللہ کی راہ میں ہے اس لئے میں انشاء اللہ اجر و ثواب کی نیت رکھوں گی، اور پورے صبر سے کام لوں گی، اس کے بعد وہ وہاں آئیں، اپنے بھائی کو دیکھا انا للہ پڑھا، ان کے لئے دعائے مغفرت کی اور خوب دعائیں دیں، اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی تدفین کا حکم فرمایا، اور وہ اُحد کی ہی شہادت گاہ میں آسودۂ خاک ہوئے۔[۱]

مُصعب بن عُمیرؓ اور دیگر شہدائے احد کس طرح دفن کئے گئے؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پرچم بردار مصعب بن عُمیر رضی اللہ عنہ، اسلام سے پہلے قریش کے بہت ناز پروردہ نوجوان تھے، اور اپنے تجمّل اور خوش پوشاکی میں

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۷

ضرب المثل تھے ان کو ایک چادر کفن میں مل سکی جو اتنی چھوٹی تھی کہ جب سر چھپایا جاتا تو پیر کھل جاتے، پیر چھپائے جاتے تو سر کھل جاتا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کا سر چھپادو اور پیروں پر اِذخِر گھاس ڈال دو۔[۱]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دو، دو شہیدوں کو ایک چادر میں کفن دینے کا حکم دیتے، پھر فرماتے کہ قرآن مجید کے علم و حفظ میں کس کا حصّہ زیادہ ہے جس کسی کی طرف اشارہ کیا جاتا، آپؐ پہلے اس کو لحد میں اتارنے کا حکم دیتے اور فرماتے کہ میں قیامت کے روز ان کا گواہ ہوں گا، آپؐ نے ان کو اسی طرح زخمی حالت میں دفن کرنے کا حکم دیا،[۲] نہ ان کی نماز جنازہ ہوئی نہ غسل دیا گیا۔[۳]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر صحابیات کی جاں نثاری

مسلمان مدینے پہونچے تو راستہ میں بنی دینار کی ایک خاتون کے مکان پر

---

[۱] صحیح بخاری غزوۂ احد [۲] صحیح بخاری باب من قتل من المسلمین یوم احد۔ [۳] شہداء کو غسل نہ دینے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں، ان کو خون میں لتھڑا ہوا اسی طرح دفن کر دیا جاتا ہے کہ خدا کے حضور میں اسی طرح پہونچیں، البتہ نماز جنازہ کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے، امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ کا مذہب نفی کا ہے، امام ابوحنیفہؒ کا اور بعض دوسرے علماء اعلام (اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ اور اسحاق ابن راہویہؒ) اس کے قائل ہیں کہ نماز پڑھی جائے، امام احمدؒ سے بھی اس کی ایک روایت ہے ان کی دلیل بعض وہ روایات ہیں جن میں احد میں شہداء پر نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے، خود عقبہ بن عامرؓ سے امام بخاریؒ وغیرہ نے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن احد تشریف لے گئے اور آپؐ نے وہاں کے شہیدوں پر ایسی نماز جنازہ پڑھی جیسے مرنے والے پر پڑھی جاتی ہے (بخاری کتاب الجنائز) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو شرح معانی الآثار طحاوی، باب الصلوٰۃ علی الشہداء و نصب الرایہ للزیلعی باب احادیث الصلوٰۃ علی الشہید۔

ان کا گذر ہوا جس کے شوہر، بھائی، اور باپ سب اس جنگ میں کام آگئے تھے، جب مسلمانوں نے ان کو یہ خبر سنائی تو انھوں نے سب سے پہلے یہ کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خیریت بتاؤ؟

ان لوگوں نے جواب دیا کہ اے اُمِّ فلاں! الحمد للہ حضورؐ جیسا کہ تمھاری آرزو ہے صحیح سلامت ہیں، کہنے لگیں کہ مجھے آپؐ کو دکھاؤ میں آپؐ کو خود دیکھنا چاہتی ہوں، لوگوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا، انھوں نے پاس آکر چہرۂ مبارک کو دیکھا اور کہا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سلامت ہیں تو ہر مصیبت ہیچ ہے۔[1]

جاں نثاری اور فرماں برداری کی ایک مثال

ادھر دشمنانِ دین اور کفّار مشرکین نے ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنی شروع کی، اور کہنے لگے تم نے کچھ کرکے نہیں دیا، تم نے ایک طرف تو ان کی قوّت اور شوکت کو مجروح کیا، اور ان کا زور توڑا، پھر ان کی پوری سرکوبی کئے بغیر ان کو چھوڑ دیا، اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ دشمنوں کا تعاقب کیا جائے، یہ وہ وقت تھا جب مسلمان زخموں سے چور چور ہو رہے تھے، دوسرے دن یکشنبہ کو صبح کے وقت آپؐ کے منادی نے اعلان کیا کہ لوگ دشمن کے تعاقب کے لئے نکل کھڑے ہوں ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اس تعاقب میں وہی شریک ہو سکتا ہے جو کل اس جنگ میں شریک تھا، حالت یہ تھی کہ کوئی ایک مسلمان بھی ایسا نہ تھا جو کسی نہ کسی زخم اور تکلیف میں مبتلا نہ ہو، لیکن وہ سب کے سب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہو گئے، ایک شخص بھی ان میں سے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۹

پیچھے نہ رہا جب سب لوگ مدینہ سے آٹھ میل کی مسافت پر مقام حمراء الاسد تک پہونچ گئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے وہاں قیام کیا آپ اور تمام مسلمان دوشنبہ سہ شنبہ، چہار شنبہ تین روز وہاں مقیم رہے، اس کے بعد مدینہ واپس تشریف لائے[1]۔

اللہ تعالے نے اس جذبۂ اطاعت اور خوئے تسلیم و وفا کا ذکر اپنی لافانی کتاب میں اس طرح فرمایا ہے :۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ	جنھوں نے باوجود زخم کھانے کے
مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ	خدا اور رسول (کے حکم) کو قبول کیا
لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا	جو لوگ ان میں نیکوکار اور پرہیزگار
اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝ اَلَّذِیْنَ قَالَ	ہیں ان کے لئے بڑا ثواب ہے (جب)
لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ	ان سے لوگوں نے آکر بیان کیا کہ
قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ	کفّار نے تمہارے (مقابلہ کے) لئے
فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا	(لشکر کثیر) جمع کیا ہے تو ان سے
حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ۝	ڈرو تو ان کا ایمان اور زیادہ ہوگیا
فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ	اور کہنے لگے ہم کو خدا کافی ہے اور
وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ	وہ اچھا کارساز ہے، اور پھر وہ خدا
وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ	کی نعمتوں اور اس کے فضل کے
وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ ۝	ساتھ (خوش و خرّم) واپس آئے
اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ	ان کو کسی طرح کا ضرر نہ پہونچا

[1] سیرت ابن کثیر جلد ۳ ص ۹۷

اَوْلِیَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (سورۂ آل عمران ۳-۱۷۲-۱۷۵)	اور وہ خدا کے خوشنودی کے تابع رہے اور خدا بڑے فضل کا مالک ہے یہ (خوف دلانے والا) تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے تو اگر تم مومن ہو تو ان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا۔

جان سے زیادہ عزیز

ہجرت کے تیسرے سال قبیلۂ عضل اور قبیلۂ قارہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ کچھ ایسے لوگ ان کو دیئے جائیں، جو ان کو دین کی تعلیم دے سکیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام میں سے چھ حضرات کا ایک وفد اس کام کے لئے بھیجا جس میں عاصم بن ثابتؓ، خبیب بن عدیؓ اور زید بن الدثنہؓ بھی تھے، جب وہ مقام "رجیع" میں پہونچے جو عسفان اور مکہ کے درمیان واقع ہے تو ان قبائل نے ان کے ساتھ غدّاری کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہم اللہ کے سامنے عہد کرتے ہیں کہ ہم کسی کو جان سے نہ ماریں گے، کچھ مسلمانوں نے کہا کہ ہم مشرک کے کسی عہد کو قبول نہیں کرتے، انھوں نے مقابلہ کیا، اور شہید ہوئے زید بن الدثنہؓ، خبیبؓ بن عدیؓ اور عبداللہ بن طارقؓ نے ہتھیار رکھ دیئے، اور ان کو گرفتار کر لیا گیا، عبداللہ بن طارقؓ راستہ میں شہید کئے گئے، خبیبؓ اور زید بن الدثنہؓ رضی اللہ عنہما کو ان لوگوں نے قریش کے ہاتھ فروخت کر دیا، خبیبؓ کو حجیر بن ابی اہاب نے خرید لیا تا کہ اپنے باپ اہاب کے بدلہ میں قتل کر سکے، زید بن الدثنہؓ کو

صفوان بن امیہ نے اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلہ کے لئے خریدا، زید رضی اللہ عنہ کو حرم سے باہر قتل کے لئے لے جایا گیا تو اس وقت قریش کے بہت سے لوگ جمع تھے، جن میں ابوسفیان بھی تھے انھوں نے حضرت زید سے کہا، زید میں تم سے قسم دلاکر پوچھتا ہوں کیا تم پسند کروگے کہ تم آرام سے اپنے گھر والوں میں ہو اور تمھاری جگہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ہوں انھوں نے جواب دیا کہ مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے گھر میں آرام سے ہوں اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک کانٹا بھی چبھے! ابوسفیان نے اس پر کہا کہ میں نے کسی کو کسی سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محبت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی کرتے ہیں، اس کے بعد ان کو شہید کر دیا گیا۔[۱]

جب یہ لوگ حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ کو سولی دینے کے لئے لائے تو انھوں نے کہا کہ اگر اس میں کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے دو رکعت پڑھ لینے کی اجازت دے دو، انھوں نے کہا ہاں پڑھ لو، انھوں نے دو رکعت اطمینان اور پورے آداب کے ساتھ پڑھیں پھر ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم لوگ اس کو ڈر پر محمول کروگے تو میں ابھی اور نماز پڑھتا، اس کے بعد انھوں نے یہ اشعار پڑھے:۔

فلستُ أبالی حین أُقتَلُ مُسلِمًا ۔۔۔ علی أیّ شِقٍّ کان فی اللہ مصرعی

(جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھ کو اس کی پرواہ نہیں کہ اللہ کی راہ میں کس پہلو پر گر کر جان دوں گا۔)

وذالک فی ذات الالٰہ وان یشاء ۔۔۔ یبارک علی أوصال شلوٍ ممزَّعِ

(یہ جو کچھ ہے خالصًا اللہ کے لئے ہے اگر وہ چاہے گا تو اس پارہ پارہ جسم پر برکت نازل کریگا)

---

[۱] روایت ابن اسحاق، ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۲

یہ شوقیہ اشعار پڑھتے ہوئے راہِ حق میں شہید ہوئے۔[۱]

بئرِ معونہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عامر بن مالک کی درخواست پر ان میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کے لئے ایک جماعت بھیجی جن میں ستّر بہترین و چیدہ مسلمان شامل تھے، یہ لوگ روانہ ہوئے اور بئرِ معونہ میں قیام کیا، یہاں بنی سُلَیم کے قبائل عُصَیّہ، رِعل اور ذکوان نے مل کر پورے قافلہ کو گھیر لیا، جب انھوں نے یہ دیکھا تو تلواریں کھینچ لیں، اور لڑکر سب کے سب شہید ہوگئے، صرف کعب بن زیدؓ باقی بچے جنھوں نے غزوۂ خندق میں شہادت پائی۔[۲]

ایک مقتول کے آخری الفاظ جو قاتل کے قبولِ اسلام کا سبب بن گئے

اسی سریہ میں حرام بن ملحان بھی شہید ہوئے، ان کو جبّار بن سُلمی نے قتل کیا، حرام ابن ملحان نے انتقال کے وقت جو الفاظ کہے وہی ان کے اسلام لانے کا سبب بن گئے، جبّار خود بیان کرتے ہیں کہ مجھے جس چیز نے اسلام کی طرف کھینچا وہ یہ واقعہ ہے کہ میں نے ان کے ایک آدمی کے دونوں شانوں کے درمیان ایک نیزہ مارا، میں نے دیکھا کہ وہ سینہ کے پار ہوگیا ہے، اسی وقت ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے "فزتُ وربِّ الکعبة" ربّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا، میں نے اپنے دل میں حیرت سے کہا کیسی کامیابی؟ کیا میں نے ان کو قتل نہیں کیا! بعد میں میں نے ان کے الفاظ کی تحقیق کی تو لوگوں نے بتایا کہ ان کا مطلب شہادت تھا،

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶۹-۱۶۷- و صحیح بخاری کتاب المغازی۔ باب التوحید والجہاد، معمولی اختلاف کے ساتھ، نیز ابن کثیر ج ۲ ص ۱۲۳-۱۲۵ [۲] بخاری و مسلم و سیرت ابن ہشام۔

میں نے کہا خدا کی قسم وہ کامیاب رہے اس طرح یہ جملہ ان کے اسلام کا سبب بنا[1]۔

بنی النضیر کی جلاوطنی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قبیلہ النضیر کے پاس تشریف لے گئے، جو یہود کا بہت بڑا قبیلہ تھا، وہاں جا کر آپؐ نے ان سے بنی عامر کے دو مقتولین کی دیت میں مدد چاہی، ان کے اور بنی عامر کے درمیان عہد و معاہدہ تھا، انھوں نے اس موقعہ پر تو آپؐ سے بہت میٹھی باتیں کیں اور اچھی امیدیں دلائیں لیکن درپردہ آپ کے خلاف سازش میں مشغول رہے، ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے ایک گھر کی دیوار کے نیچے تشریف فرما تھے، یہ دیکھ کر یہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ اس سے اچھی پوزیشن پھر تم کو ہاتھ نہ آئے گی! اگر ایک آدمی اوپر چڑھ کر ایک بھاری پتھر لڑھکا دے تو ہم سب کی جان چھوٹ جائے گی! آپؐ کے ساتھ اس موقع پر کئی حضرات صحابہ موجود تھے، جن میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، اور حضرت علی رضی اللہ عنہم بھی تھے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان کے ناپاک ارادوں سے آگاہ فرما دیا آپ اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ روانہ ہو گئے، یہاں آکر آپؐ نے ان سے جنگ کی تیاری شروع کی اور ان کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے اور آگے بڑھ کر ان کے قبیلے میں پڑاؤ کیا، یہ ماہ ربیع الاوّل سنہ ۴ھ کا واقعہ ہے آپؐ نے چھ راتوں تک ان کا محاصرہ کیا ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے اتنا رعب ڈالا کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خود درخواست کی کہ آپ ان کو یہاں سے جلاوطن کر دیں لیکن ان کو جان کی امان دے دیں

[1] اس واقعہ کو بخاری میں باب غزوۃ الرجیع (کتاب المغازی) میں بیان کیا گیا ہے، ابن ہشام ج ۲ ص ۱۸۷

اونٹ جتنا لے جا سکیں اُس کے لے جانے کی ان کو اجازت ہوگی البتہ ہتھیار وہ منتقل نہ کر سکیں گے، آپؐ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی اور وہ سارا سامان اپنے ساتھ لے گئے جو اونٹوں پر جا سکتا تھا، پھر یہ منظر دیکھا گیا کہ ایک آدمی اپنا پورا پورا گھر خود اپنے ہاتھ سے گرا رہا ہے، اور جتنا سامان لادنا ممکن ہے، اونٹ پر لاد کر روانہ ہو رہا ہے[1]، اس غزوہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

هُوَ الَّذِيٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	وہی تو ہے جس نے کفار اہلِ کتاب کو
مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ	حشرِ اول کے وقت ان کے گھروں سے
لِاَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ	نکال دیا تمہارے خیال میں بھی نہ تھا کہ
يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ	وہ نکل جائیں گے اور وہ لوگ یہ سمجھے ہوئے
حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ	تھے کہ ان کے قلعے ان کو خدا (کے عذاب)
اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا	سے بچا لیں گے مگر خدا نے ان کو وہاں سے
وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ	آلیا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا،
يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ	اور ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی
وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا	کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں اور
يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ	مومنوں کے ہاتھوں سے اجاڑنے لگے تو
(سورۂ حشر۔۲)	اے بصیرت کی آنکھیں رکھنے والو عبرت پکڑو۔

ان میں سے کچھ لوگ خیبر میں جا بسے کچھ لوگ شام چلے گئے اور مسلمانوں کو مکر و فریب، سازش اور منافقت کے ایک بہت بڑے اڈہ سے نجات ملی اور قتال کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی "وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ" ان کی جلاوطنی کے بعد

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۹۰-۱۹۱

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کا سب مال و دولت مہاجرین اولین میں تقسیم فرما دیا۔

غزوۂ ذات الرّقاع

چوتھے سال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نجد کے علاقہ کی طرف بغرض جہاد رُخ فرمایا، آپؐ کا مقصد بنی محارب اور بنی ثعلبہ (قبیلۂ غطفان) کو سبق دینا تھا، آپؐ روانہ ہو کر مقام "نخل"[1] میں اترے' ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم چھ اشخاص کے درمیان ایک ہی اونٹ تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ پیدل چلنے کی وجہ سے لوگوں کے پیر چھلنی ہو گئے، اور انگلیوں کے ناخن تک گر گئے، اور اس تکلیف سے بچنے کے لئے لوگوں نے اپنے پیروں پر پٹّیاں اور چیتھڑے باندھ لئے، اور اسی لئے اس غزوہ کا نام "غزوۂ ذات الرقاع" یعنی "پٹیوں والا غزوہ" پڑ گیا۔[2]

فریقین ایک دوسرے سے قریب ہوئے لیکن جنگ کی نوبت نہ آئی، لوگ ایک دوسرے سے خائف تھے' اس موقعہ پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ خوف بھی ادا فرمائی۔[3]

اس وقت تمھیں کون بچا سکتا ہے؟

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس غزوہ سے واپس ہوئے تو دوپہر کو آپ نے

---

[1] نجد میں غطفان کے علاقہ میں ایک مقام کا نام ہے۔ [2] صحیح بخاری بروایت حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ "باب غزوۃ ذات الرقاع" امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع خیبر کے بعد پیش آیا، یہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ کا بیان ہے [3] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۰۴

ایسی جگہ آرام فرمایا جہاں ببول کے بہت سے درخت تھے، اور لوگ ان درختوں کی طرف چلے گئے اور خود بدولت (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) ببول کے ایک پیڑ کے نیچے آرام فرمانے لگے، اور اپنی تلوار اسی درخت پر لٹکا دی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ، بیان کرتے ہیں کہ اسی درمیان میں ہماری آنکھ لگ گئی اور ہم تھوڑا سوئے تھے کہ محسوس ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمیں آواز دے رہے ہیں، ہم نے دیکھا کہ ایک اعرابی آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ میں سو رہا تھا کہ اس نے یہ تلوار اٹھائی، میری آنکھ کھلی تو یہ تلوار میرے سر پر کھینچے ہوئے تھا، اس نے مجھ سے کہا کہ اس وقت تجھیں کون بچا سکتا ہے؟ میں نے کہا، اللہ! لو یہ بیٹھا ہوا ہے لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو کوئی سزا نہیں دی۔[1]

کچھ غزوات جن میں قتال کی نوبت نہیں آئی

ہجرت کے چوتھے سال شعبان کے مہینہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کا قصد فرمایا، ابوسفیان نے تاریخ طے کی تھی، آپؐ نے وہاں پہونچ کر منزل کی اور آٹھ راتیں وہاں قیام فرمایا اور ابوسفیان کے انتظار میں رہے، ابوسفیان بھی مقابلہ کے لئے نکلے لیکن واپسی ہی میں اُن کو زیادہ عافیت معلوم ہوئی، انھوں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ یہ قحط اور خشک سالی کا زمانہ ہے میرا لوٹنے کا ارادہ ہے اور تم لوگوں کو بھی لوٹ چلنا چاہیئے، غرض اس طرح لڑنے کی نوبت نہ آسکی، اور اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھا۔

دومۃ الجندل کے غزوہ میں بھی جنگ کی ضرورت پیش نہ آئی اور آپؐ مدینہ تشریف لائے۔[2]

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ ذات الرقاع [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۰۹-۲۱۳

غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب

(شوال ۵ھ)

غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب ماہ شوال ۵ھ میں پیش آیا[1]، یہ ان اہم واقعات اور غزوات میں سے ہے جس کے اثرات اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ دعوت اسلامی کے مستقبل دینِ حق کے فروغ اور اسلام کی پیش قدمی میں بہت دور رس ثابت ہوئے یہ ایک فیصلہ کن لڑائی تھی اور ایسی سخت آزمائش جس کا تجربہ مسلمانوں کو اس سے قبل کبھی نہ ہوا تھا۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ	جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی
اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ	طرف سے تم پر چڑھ آئے، اور جب
الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ	آنکھیں پھر گئیں، اور دل (مارے
الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ	دہشت کے) گلوں تک پہونچ گئے
الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ	اور تم خدا کی نسبت طرح طرح
الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا	کے گمان کرنے لگے، وہاں مومن
شَدِيْدًا ۝ (سورۂ الاحزاب ۱۰-۱۱)	آزمائے گئے اور سخت طور پر ہلائے گئے۔

اس غزوہ کا اصل سبب یہود تھے، واقعہ اس طرح ہے کہ بنی النضیر اور بنی وائل

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۴

کے کچھ لوگ مکہ گئے اور قریش سے مل کر ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف اُکسانا چاہا، قریش کو اس قسم کی جنگوں کا تجربہ تھا اور وہ بہت پہلے سے اُسے بھگتتے ہوئے تھے، اس لئے ان کی ہمت نہ پڑتی تھی لیکن یہودیوں کے وفد نے صورتِ حال کو بہت سازگار اور خوشنما بنا کر ان کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ ہم لوگ سب آپ کے ساتھ ہوں گے، اور جب تک اس دین کو جڑ بنیاد سے ختم نہ کریں گے دم نہ لیں گے، اس بات پر قریش بہت خوش ہوئے اور اس کے بعد انھوں نے جوش و مسرت کے ساتھ ان کی دعوت قبول کی، سب اس پر متحد ہو گئے اور تیاریاں شروع کر دیں، وفد وہاں سے چل کر قبیلۂ غطفان میں آیا اور ان کو بھی اس جنگ میں شرکت کی دعوت دی، ان کے مختلف قبائل میں گھوم پھر کر مدینہ پر حملہ کا یہ نیا منصوبہ تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے رکھا اور قریش کی آمادگی سے بھی ان سب کو باخبر کیا۔[۱]

ان کوششوں کے نتیجہ میں ان کے درمیان ایک فوجی معاہدہ ہو گیا جس کے اہم شرکاء میں قریش، یہود اور غطفان تھے، انھوں نے کچھ اور شرائط پر بھی اتفاق کیا جس میں ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ غطفان اس متحدہ لشکر میں چھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ حصہ لیں گے اس کے معاوضہ میں یہود قبائل غطفان کو خیبر کے باغات کی پورے سال کی فصل دیا کریں گے، الغرض قریش نے چار ہزار جنگجو اس کے لئے اکٹھا کئے، غطفان نے چھ ہزار۔ کل تعداد دس ہزار ہوئی، لشکر کا سپہ سالار ابوسفیان کو مقرر کیا گیا۔[۲]

حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی کہ یہ لوگ اس طرح

---

۱ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۴-۲۱۵ ۲ ایضاً ص ۲۱۹-۲۲۰

متحد ہو کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اور اس کا عزم کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کے وجود کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں گے تو مسلمانوں نے بہت سنجیدگی کے ساتھ اس کا نوٹس لیا اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے، انھوں نے مدینہ میں قلعہ بند ہو کر مدافعانہ جنگ کو ترجیح دی، لشکرِ اسلام اس وقت تین ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا۔[1]

اس موقعہ پر سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے سامنے خندقیں کھودنے کا مشورہ دیا، یہ ایرانیوں کی معروف جنگی حکمت عملی تھی،[2] حضرت سلمانؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ایران میں جب ہم کو گھوڑ سوار لشکر کے حملہ کا خطرہ ہوتا تھا تو ہم لوگ اس کے مقابلہ کے لئے خندقیں کھودتے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے پسند فرمائی، اور مدینہ کے شمال مغرب میں واقع میدان میں خندقیں کھودنے کا حکم فرمایا یہی وہ کھلا حصّہ تھا جہاں سے دشمن کو دراندازی کا موقع مل سکتا تھا۔[3]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خندق کھودنے کا کام اپنے اصحابِ کرام میں اس طرح تقسیم فرمایا کہ ہر دس آدمیوں کے ذمّہ چالیس ہاتھ پڑا،[4] خندق کا طول تقریباً پانچ ہزار ہاتھ تھا، گہرائی سات ہاتھ سے دس تک چوڑائی بالعموم نو سے کچھ اوپر ہوتی تھی۔[5]

مسلمانوں میں ہمدردی و مساوات کی ایک نئی لہر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خندق کھودنے میں مسلمانوں کے ساتھ بنفسِ نفیس

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۴، [2] خندق دراصل لفظ "کندہ" کا معرب ہے، فارسی میں خندک اور کندک اسی معنی میں استعمال ہوتے ہیں (دیکھئے فرہنگ عمید) [3] کھدائی کا کام مدینہ کے شمال مشرق سے شروع ہو کر شمال مغرب تک تمام ہوا، اس کا مشرقی کنارا "حرۃ واقم" سے ملتا تھا، اور مغربی کنارہ "وادی بطحان" کے مغرب ہے جہاں مغربی (حرۃ الوبرۃ) واقع ہے، ملاحظہ ہو (مدینہ طیبہ کے شہر کا نقشہ) مستفاد از "آثار المدینۃ المنورۃ" تالیف الاستاذ عبدالقدوس الانصاری۔ [4] سیرت ابن کثیر جلد ۳ ص ۱۹۲، [5] غزوۃ الاحزاب استاذ احمد باشمیل۔

شریک ہوئے اور سب نے مل کر پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ یہ کام انجام دیا[1]۔
سردی بہت سخت تھی، غذا ان کو اتنی ملتی تھی کہ جسم و جان کا رشتہ قائم رہے، کبھی وہ بھی نہ ملتی تھی، حضرت ابو طلحہ رضؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بھوک کی شکایت کی اور اپنا پیٹ کھول کر دکھایا، جس پر ایک پتھر بندھا ہوا تھا، یہ دیکھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے شکم مبارک سے کپڑا اٹھایا اور ہم نے دیکھا کہ اس میں دو پتھر بندھے ہوئے ہیں[2]۔
اس کے باوجود سب خوش و خرّم تھے، اللہ تعالے کا شکر ادا کرتے تھے، رجز پڑھتے تھے اور اس کی حمد کے ترانے گاتے تھے، اور ایک حرفِ شکایت ان کی زبان پر نہ آتا تھا۔
حضرت انس رضؓ راوی ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خندق کے قریب تشریف لائے، آپؐ نے دیکھا کہ مہاجرین اور انصار صبح سویرے سخت ٹھنڈک میں خندق کھودنے میں مصروف ہیں، ان کے پاس غلام اور ملازم نہ تھے، جو ان کے بجائے یہ کام انجام دیتے، آپؐ نے ان کی اس سخت محنت اور بھوک کو ملاحظہ فرمایا تو آپؐ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے۔

اللھم لا عیش الا عیش الاخرۃ   فاغفر الانصار والمھاجرۃ

(اے اللہ زندگی تو دراصل آخرت کی زندگی ہے، پس معاف فرما انصار کو اور مہاجرین کو۔)

یہ سن کر اس کے جواب میں انھوں نے کہا:۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۶ [2] ترمذی علامہ طیبی شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں کہ عرب میں اس عہد میں رواج تھا کہ جس کو بھوک ستاتی تھی اور پیٹ بالکل چپک جاتا تھا، وہ اپنے کو سیدھا رکھنے کے لئے پیٹ پر ایک پتھر باندھ لیتا تھا، مشکوٰۃ المصابیح مع حواشی ج ۲ ص ۴۴۸

نحن الذین بایعوا محمدًا　　　علی الجہاد ما بقینا ابدًا[1]

ہم وہ ہیں جنھوں نے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے جہاد پر اس وقت تک کے لئے بیعت کی ہے جب تک ہماری جان میں جان ہے۔

وہ بیان کرتے ہیں ایک مٹھی جو کہیں سے مل جاتے تو اس کا ملیدہ بنا لیا جاتا اور اس میں تھوڑی سی چربی شامل کر لی جاتی، حالانکہ اس کا ذائقہ اور بو سب میں فرق آچکا ہوتا۔

تنگی و محاصرہ کی تاریکی میں اسلامی فتوحات کا نور

خندق کی کھدائی میں ایک جگہ ایک بڑی چٹان سامنے آگئی جس پر کدال کام نہیں کر رہی تھی، لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر آپؐ کو اس کی اطلاع کی، آپؐ نے اس کو دیکھا تو خود کدال اٹھائی اور بسم اللہ کہہ کر اس پر ایک ایسی ضرب لگائی کہ اس کا ایک تہائی حصہ ٹوٹ گیا، اس وقت آپؐ نے فرمایا، اللہ اکبر، مجھے شام کی کنجیاں دی گئیں، اس کے بعد دوسرا تہائی حصہ بھی آپؐ نے توڑ ڈالا اور ارشاد فرمایا اللہ اکبر، مجھے فارس کی کنجیاں دی گئیں، خدا کی قسم میں مدائن کا سفید محل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، پھر تیسری بار آپؐ نے بسم اللہ کہہ کر اس پر ضرب لگائی اور باقی ماندہ پتھر بھی پاش پاش ہو گیا، آپؐ نے فرمایا اللہ اکبر، مجھے یمن کی کنجیاں دی گئیں، خدا کی قسم میں اس وقت اسی جگہ صنعاء شہر کے دروازے دیکھ رہا ہوں[2]، یہ ارشاد اس وقت ہوا جب مسلمانوں کو اپنے زندہ سلامت رہنے کا بھی یقین نہ تھا، ایک طرف بھوک ان کو ہلکان کئے ڈال رہی تھی، دوسری طرف ٹھنڈک جان لیوا ثابت ہو رہی تھی، تیسری طرف دشمن سر پر تھا

---

[1] صحیح بخاری بروایت انسؓ (کتاب المغازی باب غزوۃ الخندق) [2] بیہقی بروایت براء بن عازب الانصاری۔ (ابن کثیر ج ۳ ص ۱۹۴)

غزوۂ خندق میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعض معجزات

اس غزوہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کئی معجزات ظاہر ہوئے جب مسلمانوں کو خندق کھودنے میں دشواری ہوتی اور اس طرح کی کوئی چیز رکاوٹ بنتی تو آپ کسی برتن میں پانی طلب فرماتے اس میں اپنا لعابِ دہن ڈال دیتے اور جو کچھ اللہ تعالےٰ آپؐ سے کہلاتا آپؐ دعا فرماتے جب یہ پانی اس پتھر پر چھڑکا جاتا تو وہ ریت کے تودہ کی طرح نرم ہو جاتا۔[1]

کھانے میں ایسی کھلی برکت ہوتی کہ تھوڑا سا کھانا بہت بڑی تعداد کے لئے کافی ہو جاتا، اور نہ صرف کافی ہوتا بلکہ پورا لشکر سیر ہو جاتا۔

جابر بن عبداللہ رضؓ کہتے ہیں کہ ہم خندق کے روز کھدائی کر رہے تھے کہ ایک بڑا اور سخت پتھر سامنے آگیا، سب لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ یہ بہت سخت پتھر سامنے آگیا ہے جو خندق کھودنے میں رکاوٹ بن رہا ہے آپؐ نے فرمایا کہ میں اترتا ہوں پھر آپؐ ایسی حالت میں کھڑے ہوئے کہ آپؐ کے پیٹ پر ایک پتھر بندھا ہوا تھا، اس وقت حالت یہ تھی کہ تین روز سے ہمارے منہ میں کوئی چیز نہ گئی تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کدال اٹھائی اور اس پتھر پر ماری، پتھر ریت کی طرح بھربھرا کر گر گیا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر کے لئے مجھے گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمادیں، گھر پہونچ کر میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھا ہے کہ جس کے دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں، کیا تمھارے پاس کچھ کھانے پینے کا سامان ہے؟

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۷-۲۱۸

انھوں نے کہا ہاں کچھ جو ہے اور ایک بکری کا بچہ ہے میں نے بکری کے بچہ کو ذبح کیا، جو کو پیسا، اور ایک دیگچی میں گوشت چڑھا دیا، جب میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جانے لگا تو اس وقت آٹا گوندھ چکا تھا، دیگچی چولہے پر تھی اور تیار ہونے کے قریب تھی، میں نے واپس آکر عرض کیا کہ میں نے تھوڑے بہت کھانے کا انتظام کیا ہے آپ اور دو ایک آدمی تشریف لے چلیں، آپ نے دریافت فرمایا کتنا کھانا ہوگا میں نے تفصیل بتائی، آپ نے یہ سن کر فرمایا یہ تو بہت ہے اور اچھا ہے، اپنے گھر میں کہنا کہ دیگچی چولہے سے اس وقت تک نہ اتاریں، اور نہ تنور سے روٹیاں نکالیں جب تک میں نہ آجاؤں، پھر آپ نے فرمایا لوگو! بسم اللہ، چنانچہ تمام مہاجرین اور انصار کھڑے ہو گئے اور میں اپنی بیوی کے پاس پہونچا اور کہا کچھ خبر بھی ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سارے مہاجرین اور انصار اور جتنے بھی آدمی آپ کے ساتھ ہیں سب کو لے کر تشریف لا رہے ہیں، کہنے لگیں کیا کھانے کے بارے میں آپ نے کچھ پوچھا؟ میں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا لوگو، اندر داخل ہو اور بھیڑ نہ لگاؤ، آپ روٹی کے ٹکڑے کر کے اس پر گوشت رکھتے جاتے، اور گوشت و روٹی لینے کے بعد دیگچی اور تنور کو ڈھک دیتے تھے، اور اپنے اصحاب کرام کے سامنے کھانا پیش فرماتے تھے، پھر کپڑا اٹھا کر اسی طرح روٹی توڑتے اور گوشت لیتے رہے اور اصحاب کرام کو عنایت فرماتے رہے، یہاں تک کہ سب خوب شکم سیر ہو گئے اور اس کے بعد بھی کھانا بچ رہا، پھر آپ نے جابر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ سے فرمایا اب تم کھاؤ، اور دوسروں کو دو، اس لئے کہ سب لوگ اس وقت بھوک اور فاقہ میں ہیں۔[1]

ایک دوسری روایت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ میں

---

[1] صحیح بخاری (باب غزوۃ الخندق)

آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آہستہ سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے ایک جانور ذبح کیا ہے اور ہمارے پاس تھوڑا سا جو تھا، اس کو پیس لیا ہے آپؐ اور چند حضرات تشریف لے چلیں، آپؐ نے بلند آواز سے کہا کہ خندق والو! جابر نے ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا ہے۔[۱]

کڑی آزمائش

قریش نے آگے بڑھ کر مدینہ کے مقابل پڑاؤ ڈالا، ان کے لشکر کی تعداد دس ہزار (۱۰۰۰۰) تھی غطفان بھی اپنے زیر اثر قبائل کے ساتھ اسی جگہ مقیم ہوئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تین ہزار (۳۰۰۰) مسلمانوں کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے، خندق ان دونوں لشکروں کے درمیان حائل تھی، مسلمانوں اور بنی قُریظہ کے درمیان ایک معاہدہ تھا، حُیّیّ بن اخطب نے جو بنی النضیر کا سردار تھا، اُن کو کہہ سُن کر عہد شکنی پر آمادہ کر لیا، بنی قریظہ نے یہ اقدام قدرے انکار اور تردّد کے بعد کیا، اس کے نتیجے میں خوف و دہشت کی فضا سارے شہر میں چھا گئی، منافقین نے بھی پاؤں نکالے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوا کہ اس وقت قبیلہ غطفان سے اس بات پر صلح کر لینا مناسب ہے کہ مدینہ کے پھلوں کا ہمیشہ ایک تہائی حصہ ان کو دیا جائے گا، یہ خیال انصار کی وجہ سے آپؐ کے دل میں آیا جن پر جنگ کا سب سے زیادہ بوجھ پڑتا تھا، اور اب آپؐ ان کو مزید آزمائش میں ڈالنا نہ چاہتے تھے لیکن اوس و خزرج کے دونوں سردار سعد بن معاذ و سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہما کے عزم و ہمّت، ثابت قدمی اور استقامت کو دیکھ کر آپؐ نے

---

[۱] حدیث میں اس موقعہ پر کھانے کے لئے لفظ "سُور" آیا ہے، اس موقع پر علامہ محمد طاہر پٹنی نے "مجمع بحار الانوار" میں لکھا ہے کہ یہ اصلاً فارسی لفظ ہے اور شادی کی بڑی دعوت کے لئے بولا جاتا ہے۔

اپنی یہ رائے تبدیل فرمادی انھوں نے عرض کیا کہ جس وقت ہم لوگ شرک و بت پرستی کی آلودگیوں میں پڑے ہوئے تھے، نہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے، اور نہ اس کو پہچانتے تھے، اس وقت کھجور کا ایک دانہ بھی (ضیافت اور خرید و فروخت کے علاوہ) ہم ان کو دینے کے روادار نہ تھے، اور اب جب ہم کو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے سرفراز کیا اور ہدایت نصیب کی آپؐ کی ذات اور اسلام سے ہمیں عزت بخشی کیا ہم ان کو اپنا مال دے دیں گے، خدا کی قسم ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں، ہمارے پاس ان کے لئے تلوار کے سوا کچھ نہیں ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے اور ہمارے درمیان فیصلہ فرمادے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر ارشاد فرمایا، جیسی تمھاری رائے ہو!

جاہلیت کے شہسوار اور اسلام کے شہسوار کا مقابلہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھ تمام مسلمانوں نے وہاں قیام کیا، دشمن نے ان کا محاصرہ کرلیا تھا لیکن جنگ کی نوبت نہ آئی تھی، البتہ یہ ہوا کہ دشمن کے کچھ گھوڑسوار تیزی کے ساتھ آگے بڑھے اور خندق کے کنارے تک پہونچ گئے، اور اسے دیکھ کر کہنے لگے یہ ایک نئی تدبیر اور نیا جال ہے جس سے عرب واقف نہیں ہیں پھر تلاش کر کے وہ ایک ایسی جگہ پہونچے جہاں خندق کی چوڑائی بہت کم تھی، یہاں پہونچ کر انھوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی تو وہ گھوڑے اس کو پار کر گئے اور مدینہ کی سرزمین پر دوڑنے لگے، اس دستے میں عرب کا نامی گرامی شہسوار عمرو بن عبدِ وُد بھی تھا جس کا مقابلہ ایک ہزار گھوڑسواروں سے کیا جاتا تھا، ایک جگہ ٹھہر کر اس نے آواز لگائی کہ ہے کوئی مقابلہ کرنے والا؟ یہ سن کر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سامنے آئے اور کہا عمرو! تم نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ قریش کا کوئی شخص

اگر تمھیں دو باتوں کی دعوت دے گا تو ایک تم ضرور قبول کروگے' اس نے جواب دیا کہ ہاں' حضرت علی رضؓ نے کہا ٹھیک ہے میں تمھیں اللہ کی اس کے رسول کی' اور اسلام کی دعوت دیتا ہوں' اس نے کہا کہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں حضرت علی رضؓ نے کہا تو پھر میں تمھیں مقابلہ کی دعوت دیتا ہوں' کہنے لگا کیوں آخر میرے بھتیجے بخدا میں تمھیں قتل کرنا نہیں چاہتا' حضرت علی نے کہا' لیکن خدا کی قسم میں تمھیں ضرور قتل کرنا چاہتا ہوں۔

یہ سن کر عمرو کا خون گرم ہو گیا' وہ اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اس کی کوچیں کاٹ دیں' اس کے چہرے پر غصہ میں ایک طمانچہ مارا' پھر اسی حالت میں حضرت علی رضؓ کی طرف متوجہ ہوا' مقابلہ شروع ہوا' تھوڑی دیر دونوں نے اپنے جوہر دکھائے پھر حضرت علی رضؓ نے اس کو ٹھکانے لگا دیا[1]' ان کے دوسرے شہسواروں میں نوفل بن عبیرہ بھی تھا' یہ دیکھ کر یہ سب شہسوار بھاگ نکلے اور خندق پھاند کر راہِ فرار اختیار کی۔

ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو جہاد اور شہادت پر آمادہ کرتی ہے

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو بنی حارثہ کے قلعہ میں مسلمان عورتوں کے ہمراہ تھیں' اور اس وقت تک پردہ کا حکم نازل نہ ہوا تھا' بیان فرماتی ہیں کہ سعد بن معاذ رضؓ ادھر سے گذرے' وہ ایک اتنی چھوٹی زرہ پہنے ہوئے تھے' کہ ان کا پورا ہاتھ اس سے باہر تھا' وہ رجز پڑھتے جاتے تھے' ان کی والدہ نے دیکھ کر کہا کہ بیٹے تم نے بہت دیر کردی جلدی جاؤ' حضرت عائشہ رضؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ ام سعد بخدا میری خواہش ہے کہ سعد کی زرہ اس سے بڑی ہوتی' چنانچہ وہی ہوا' جس کا خطرہ

---

[1] ابن کثیر ج ۳ ص ۲۰۲-۲۰۳

حضرت عائشہؓ نے ظاہر کیا تھا، اسی کھلے ہوئے ہاتھ پر ایک تیر ایسا آکر لگا کہ اس نے وہاں کی خاص رگ (اکحل) کاٹ دی اور بنی قریظہ کے غزوہ کے موقع پر وہ شہید ہوئے۔[1]

غیبی نصرت

مشرکوں نے مسلمانوں کو اس طرح گھیر لیا کہ جیسے وہ کسی قلعے میں محصور ہو گئے ہوں، یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا اس درمیان ان کو ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اور منافقوں کا نفاق بھی ظاہر ہو گیا چنانچہ بعض لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مدینہ واپس جانے کی اجازت چاہی اور یہ بہانہ کیا کہ ان کے گھر کھلے رہ گئے ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی اور سب گھر محفوظ تھے، یہ صرف راہِ فرار اختیار کرنے کی ترکیب تھی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کرام خوف و پریشانی کی اس کیفیت میں تھے کہ اچانک نعیم بن مسعود غطفانی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہؐ! میں اسلام لا چکا ہوں لیکن میری قوم کو میرے اسلام لانے کا علم نہیں ہے اب جیسا منشا ہو حکم فرمائیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اکیلے آدمی ہو تم وہیں رہ کر ہماری مدد کرو، اس لئے کہ جنگ حیلہ و تدبیر کا نام ہے نعیم بن مسعودؓ وہاں سے رخصت ہوئے بنی قریظہ کے پاس آئے اور ان سے کچھ ایسی باتیں کیں کہ ان کو خود اپنے موقف اور رویے پر شبہ پیدا ہو گیا کہ قریش اور قبائل غطفان سے (جو باہر کے لوگ ہیں) ان کا یہ ربط و ضبط اور مہاجرین اور انصار سے (جو مقامی باشندے اور ان کے پرانے پڑوسی ہیں) ان کی

---

[1] ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۰۷

یہ دشمنی کہاں تک صحیح ہے' انھوں نے ان کو یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ قریش اور غطفان کی حمایت میں لڑنے سے پہلے ان کے کچھ خواص اور سرداروں کو اپنے پاس بطور یرغمال رکھ لیں تاکہ ان کا بھروسہ رہے' انھوں نے یہ سن کر کہا واقعی تم نے بہت اچھی بات سمجھائی' پھر وہاں سے چل کر وہ سرداران قریش کے پاس گئے اور اپنی خیرخواہی اور اخلاص کا مظاہرہ کرنے کے بعد ان سے کہا کہ یہود اپنے اس فعل پر پچھتا رہے ہیں' اور یہ سوچ رہے ہیں کہ قریش کے کچھ شرفاء اور سربرآوردہ لوگ بطور رہن ان کے ہاتھ میں رہیں تاکہ کوئی عہد شکنی کا خطرہ نہ رہے ان کا ارادہ یہ ہے کہ ان سرداروں کو وہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کردیں گے' اور وہ ان کے سر تلوار سے اڑا دیں گے' پھر غطفان کے پاس گئے اور ان سے بھی وہی کہا جو قریش سے کہہ چکے تھے' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے چوکنے اور محتاط ہوگئے اور ان کے دلوں میں یہود کی طرف سے سخت کینہ پیدا ہوگیا' تمام متعلقہ پارٹیوں میں تفرقہ پڑ گیا' اور ہر شخص ایک دوسرے سے خائف رہنے لگا' چنانچہ جب ابوسفیان اور قبیلۂ غطفان کے سرداروں نے ایک فیصلہ کن جنگ کا آغاز کرنا چاہا تو یہود نے ٹال مٹول سے کام لینا شروع کیا اور ان کے کچھ آدمی بطور یرغمال کے طلب کئے' جب یہ بات انھوں نے سنی تو ان کو پورا یقین ہوگیا کہ نعیم بن مسعودؓ نے جو کچھ کہا تھا حرف بحرف صحیح تھا' انھوں نے ان کی یہ درخواست قبول کرنے سے انکار کردیا' دوسری طرف یہود کو بھی اندازہ ہوگیا کہ ان کی بات سچی تھی' اس طرح ان سب کے قویٰ اور ارادوں میں اضمحلال پیدا ہوگیا' اور ان کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ کا کرنا یہ ہوا کہ کفر و شرک کے ان لشکروں اور دشمنانِ دین کی ان فوجوں پر ان سرد و یخ بستہ راتوں میں ایسی تیز ہوا چلی کہ ان کی قیام گاہیں اکھڑ گئیں اور

دیگچیاں الٹ گئیں، یہ منظر دیکھ کر ابوسفیان نے کہا کہ قریش کے لوگو اب یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں رہی، ہمارے خچر اور گھوڑے ہلاک ہوگئے، بنو قریظہ نے ہم سے بدعہدی کی ہے، اور بہت وحشتناک اور تکلیف دہ اطلاعیں ان کی طرف سے ہم کو ملی ہیں، اس آندھی نے جو قیامت ڈھائی ہے وہ بھی تم لوگ دیکھ رہے ہو، دیگچیاں تک ٹھہر نہیں رہی ہیں، آگ جلانا مشکل ہو رہا ہے، ہماری کوئی قیام گاہ اور جائے پناہ محفوظ نہیں رہی، اب یہاں سے چل نکلو، میں بھی واپس جانے کا ارادہ کر چکا ہوں، یہ کہہ کر ابوسفیان اپنے اونٹ کے قریب گئے، جو بندھا ہوا تھا، اس پر بیٹھ گئے اور اس کو ایڑ لگائی، جب اونٹ کھڑا ہو گیا تب اس کی رسی کھولی۔

جب غطفان کو یہ خبر پہونچی کہ قریش کوچ کر گئے تو انھوں نے بھی اپنی جگہ کا رخ کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس وقت نماز پڑھ رہے تھے، حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ (جن کو آپ نے ان متحدہ پارٹیوں میں اپنا مخبر بنا کر بھیجا تھا تاکہ وہ آپ کو ان کی نقل و حرکت سے آگاہ کر سکیں) واپس آئے تو جو کچھ دیکھا تھا، اس سے آپ کو آگاہ کر دیا۔[1]

صبح نمودار ہوئی تو آپ خندق چھوڑ کر مدینہ تشریف لے چلے مسلمان بھی واپس آگئے، اور اپنے ہتھیار رکھ دیئے،[2] قرآن کریم اس واقعہ کے بارے میں کہتا ہے:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا	مومنو! خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ	جو (اس نے) تم پر (اس وقت کی)
جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ	جب فوجیں تم پر (حملہ کرنے کو) آئیں

---

[1] پورا واقعہ صحیح مسلم باب غزوۃ الاحزاب بروایت ابن اسحٰق ملاحظہ کریں۔

[2] تفصیل سیرت ابن کثیر ج ۳ ص ۲۱۴ میں ملاحظہ فرمائیں۔

رِيحًا وَّجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۝
(سورۂ احزاب - ۹)

تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر (نازل کئے) جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے، اور جو کام تم کرتے ہو خدا ان کو دیکھ رہا ہے۔

وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا ۝
(سورۂ احزاب - ۲۵)

اور جو کافر تھے ان کو خدا نے پھیر دیا وہ اپنے غصہ میں (بھرے ہوئے تھے) کچھ بھلائی حاصل نہ کر سکے اور خدا مومنوں کو لڑائی کے بارے میں کافی ہوا اور خدا طاقت ور (اور) زبردست ہے۔

اس طرح جو بادل بڑے زور و شور سے اٹھا تھا وہ گرج چمک کر بغیر برسے نکل گیا اور مدینہ کا مطلع صاف تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سال کے بعد سے اب قریش تم پر چڑھ کر نہ آئیں گے، بلکہ تم ہی ان پر حملہ آور ہو گے۔[1]

غزوۂ خندق میں مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ سات آدمی شہید ہوئے اور مشرکین کے چار آدمی قتل کئے گئے۔

۱؎ سیرت ابن کثیر جلد ۳ ص۲۲۱

غزوۂ بنی قُریظہ

(۵ھ)

بنی قُریظہ کی عہد شکنی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک ایسا عہد نامہ تحریر کرایا جس میں یہود کو امان دی گئی تھی، اور ان سے معاہدہ کیا گیا تھا جس میں ان کے مذہب اور مال واملاک کی حفاظت کی ذمّہ داری لی گئی تھی، کچھ شرطیں ان کے حق میں لگائی گئی تھیں، اور کچھ شرطیں ان پر عائد کی گئی تھیں، اس عہد نامہ کی خاص خاص باتیں یہ تھیں۔

یہود میں سے جو ہمارا ساتھ دے گا اس کے ساتھ تعاون اور مساوات کا معاملہ کیا جائے گا، نہ ان پر ظلم کیا جائے گا، اور نہ ان کے خلاف مدد دی جائے گی، مدینہ کا کوئی مشرک نہ قریش کے جان ومال کو امان اور پناہ دے گا، اور نہ کسی مومن کے مقابلہ میں اس کے لئے سینہ سپر ہوگا، یہود لڑائی میں جب تک شریک رہیں گے، مسلمانوں کی طرح اس کے اخراجات بھی برداشت کریں گے، یہود کے قبائل[1] مسلمانوں کے ساتھ ایک قوم کی طرح رہیں گے، یہودیوں کو اپنے مذہب کی آزادی رہے گی مسلمانوں کو اپنے مذہب کی،

---

[1] اس معاہدہ میں قبائل یہود کے نام یہ دیئے گئے ہیں بنی عوف، بنی ساعدہ، بنی جشم، بنی الاوس اور بنی ثعلبہ۔

وہ اپنے ماتحتوں غلاموں اور اپنے معاملہ میں پوری طرح بااختیار رہوں گے۔

اس میں یہ بھی تھا کہ اس عہدنامہ اور تحریری معاہدہ کی رو سے جنگ میں ایک دوسرے کی مدد کرنا ان پہ لازم ہوگا، جائز امور اور اطاعتِ الٰہی کے حدود کے اندر خیر خواہی خلوص اور صلاح کا رویّہ رکھنا ہوگا، یثرب پر حملہ ہوا تو وہ مشترکہ طور پر اس کا مقابلہ کریں گے[1] لیکن بنی النضیر کے سردار حُیّی بن اخطب یہودی نے بنی قُریظہ کو مسلمانوں سے عہد شکنی اور قریش سے اتحاد و دوستی پر آمادہ کر لیا، حالانکہ ان کے سردار کعب بن اسد القرظی نے کہا تھا کہ "میں نے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) میں سچّائی اور وفاداری کے سوا کوئی اور چیز نہیں دیکھی" بہر حال کعب بن اسد نے اپنا عہد توڑ دیا، اور اس کے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان جو کچھ طے پایا تھا، اس سے اپنے کو بری کر لیا۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان کی اس عہد شکنی کی اطلاع ملی تو آپؐ نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو جو اوس کے سردار تھے، اور اوس بنو قریظہ کے حلیف تھے، اور خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو انصار کے کچھ لوگوں کے ساتھ اس خبر کی تحقیق کے لئے روانہ کیا، وہاں انھوں نے جا کر پتہ لگایا تو جیتا سنا تھا اس سے بدتر حالت پائی، ان لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے نازیبا الفاظ استعمال کئے اور تلخ لہجہ میں کہنے لگے کیسا اللہ کا رسول؟ ہمارے اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے درمیان کوئی عہد معاہدہ نہیں ہے[2] انھوں نے جنگ کی باقاعدہ تیاری بھی شروع کر دی اور مسلمانوں کے پیٹھ پیچھے چھرا گھونپنا چاہا،[3]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۰۱-۵۰۴ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲۰-۲۲۳ [3] منٹگمری واٹ کی کتاب CAMBRIDGE HISTORY OF ISLAM میں ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک بڑا قبیلہ باقی رہ گیا تھا یہ بنی قریظہ کا قبیلہ تھا، جب مشرکوں نے مدینہ کا محاصرہ کیا تھا تو اس وقت یہ مسلمانوں (باقی ص ۳۳۹ پر)

یہ نوعیت کھلے ہوئے حملے اور دو بدو میدان جنگ سے کہیں زیادہ سخت اور خطرناک تھی، اس صورت حال کی تصویر قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں اس طرح پیش کی گئی ہے؟

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ	جب وہ تمھارے اوپر اور نیچے کی
اَسْفَلَ مِنْكُمْ۔ (سورۂ احزاب ۱۰)	طرف تم پر چڑھ آئے۔

مسلمانوں کے لئے یہ بہت سخت حادثہ تھا اور اس کو قدرتی طور پر بہت محسوس کیا گیا، اس کا اندازہ ہمیں اس سے ہو سکتا ہے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (جو ان سے زیادہ سے زیادہ قریب اور مصیبت میں مددگار و غم گسار رہ چکے تھے) غزوۂ خندق کے موقع پر جب ایک تیر ان کے شانہ پر لگا اور اس سے وہاں کی ایک نازک اور اہم رگ کٹ گئی اور ان کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو یہ جملہ کہا کہ "اے اللہ مجھے اس وقت تک موت نہ دے جب تک میری آنکھیں بنی قریظہ کی تباہی دیکھ کر ٹھنڈی نہ ہو جائیں[1]"۔

بنی قریظہ کی طرف پیش قدمی

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمان غزوۂ خندق سے واپس ہوئے اور مدینہ پہونچ کر سب مسلمانوں نے اپنے ہتھیار رکھدیئے تو حضرت جبرئیل تشریف

(باقی ص۳۳۸ کا) کے ساتھ خلوص و دوستی کا مظاہرہ کرتا تھا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ درپردہ مشرکین سے مل چکا تھا اور پشت سے وار کرنے کے لئے اولین موقع کے انتظار میں تھا۔ ج ۱ ص۴۹۔

[1] حضرت سعد کو ایک قریشی کا تیر لگا تھا، بنی قریظہ کے کسی آدمی کے ہاتھ سے انھوں نے زخم نہیں کھایا تھا صحیح بخاری میں اس کا نام ابن العرقہ قریشی بتایا گیا ہے، اس لئے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ اس تیر کی وجہ سے حضرت سعدؓ کو بنی قریظہ پر غصہ تھا اور اسی بنا پر انھوں نے یہ سخت فیصلہ کیا۔

لائے اور کہا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ نے ہتھیار رکھ دیئے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں، اس پر حضرت جبرئیل نے کہا کہ فرشتوں نے ابھی اپنے ہتھیار نہیں رکھے! اللہ عزوجل نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ بنی قُریظہ کی طرف روانہ ہو جائیں، میں بھی وہیں کا ارادہ کر رہا ہوں کہ ان میں تزلزل پیدا کر دوں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک منادی کرنے والے کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ وہ لوگوں میں جا کر اعلانِ عام کرے کہ ہر اس شخص کو جو سننے اور ماننے والا ہے یہ چاہیے کہ نماز عصر بنی قُریظہ میں پڑھے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بنی قُریظہ میں پہونچ کر ان کا محاصرہ کر لیا جس کا سلسلہ پچیس[25] شب و روز جاری رہا، یہاں تک کہ وہ اس محاصرہ سے تنگ آگئے، اللہ تعالےٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔[2]

ابولبابہ کی ندامت اور توبہ کی قبولیت

اس درمیان میں بنی قُریظہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس بنی عَمرو بن عوف کو بھیج دیجئے (یہ لوگ اوس کے حلیف بھی تھے) تاکہ ہم ان سے اپنے معاملہ میں مشورہ کر سکیں، ان کی درخواست پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابولبابہؓ کو وہاں بھیج دیا، ان کو دیکھتے ہی سب لوگ سرو قد کھڑے ہو گئے عورتیں اور

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳۳-۲۳۴ صحیح بخاری میں یہ قصہ کسی قدر تفصیل و اضافہ کے ساتھ باب "مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب، ومخرجہ الی بنی قریظہ ومحاصرتہ ایاھم" میں بیان کیا ہے صحیح مسلم میں کتاب الجہاد والسیر میں باب "جواز قتال من نقض العھد وجواز انزال الحصن علی حکم عادل حکیم اھل للعدل" میں یہ واقعہ درج کیا ہے [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳۵

بچے دھاڑیں مار کر رونے لگے، یہ دیکھ کر ان کا دل کچھ پسیج گیا اس کے بعد یہ سب لوگ کہنے لگے ابولبابہ! کیا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے فیصلہ پر سرِ تسلیم خم کر لیا جائے؟ انھوں نے کہا ہاں، اسی کے ساتھ اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر اس کی طرف اشارہ کیا، ابولبابہؓ کہتے ہیں کہ ابھی میرے قدم بھی وہاں سے نہ ہٹے تھے کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی خیانت کی ہے، چنانچہ وہ فوراً الٹے پاؤں واپس ہوئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے بجائے مسجدِ نبوی کے ایک ستون سے اپنے کو باندھ دیا اور اعلان کر دیا کہ میں اس وقت تک اس جگہ سے نہ ہٹوں گا جب تک اللہ تعالےٰ میرے قصور کو معاف نہ فرما دے گا، انھوں نے اللہ تعالےٰ سے یہ عہد کیا کہ آئندہ وہ بنی قریظہ کے علاقہ میں قدم بھی نہ رکھیں گے، اور اس مقام کی کبھی شکل نہ دیکھیں گے، جہاں انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی خیانت کی تھی۔

جب اللہ تعالےٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور یہ آیت نازل ہوئی:۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (سورۂ توبہ - ۱۰۲)	اور کچھ لوگ ہیں کہ اپنے گناہوں کا (صاف) اقرار کرتے ہیں انھوں نے اچھے اور بُرے عملوں کو ملا جلا دیا تھا قریب ہے کہ خدا ان پر مہربانی سے توجہ فرمائے بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تو فوراً لوگ ان کو کھولنے کے لئے تیزی سے آگے بڑھے انھوں نے کہا نہیں خدا کی قسم جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خود اپنے دستِ مبارک سے مجھے آزاد نہ کریں گے،

میں اسی حالت میں رہوں گا، جب نماز فجر کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور ان کے قریب سے گذرے تو آپؐ نے ان کو کھولا یہ کھجور کے اس تنے سے تقریباً بیس۲۰ رات بندھے رہے، ہر نماز کے وقت ان کی اہلیہ آتیں اور نماز کے لئے ان کو کھول دیتیں پھر وہ دوبارہ اپنے کو اس سے باندھ لیتے۔[1]

سعد بن معاذؓ کی حق پرستی اور بے لاگ فیصلہ

بنو قُریظہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا، لیکن قبیلۂ اوس کے دل میں بنی قُریظہ کی طرف سے نرم گوشہ تھا، وہ تیزی کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے، یا رسول اللہ خزرج کے مقابلہ میں ہمارا ان سے معاہدہ ہے، اور انھوں نے ہمارے بھائیوں کے حلیفوں (یعنی بنی قینقاع) کے ساتھ مل کر جو کچھ کیا ہے، وہ آپ کے علم میں ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ بات سن کر فرمایا، اوس کے لوگو! کیا تم اس پر تیار ہو کہ تمھارا ہی کوئی آدمی اس کا فیصلہ کر دے، انھوں نے کہا ہاں ہم تیار ہیں، آپؐ نے فرمایا میں یہ کام سعد بن معاذ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں، ان کو بلوایا گیا، جب وہ آئے تو ان کے قبیلہ والوں نے ان سے کہا کہ ابو عمرو! اپنے حلیفوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، اس لئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمھارے سپرد یہ معاملہ اسی لئے کیا ہے کہ تم ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرو، جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو انھوں نے کہا کہ سعد کو قسمت سے یہ موقع ملا ہے کہ آج اس کو حکم الٰہی کے سامنے اس وقت کسی کی ملامت کی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۳۶-۲۳۸

پرواہ نہ ہو، سعدؓ نے کہا، میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ ان کے مرد قتل کر دیئے جائیں ان کا مال تقسیم کر لیا جائے، بچے اور عورتیں غلام بنا لئے جائیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔[1]

اسرائیلی شریعت کے مطابق سزا

یہ فیصلہ بنی اسرائیل کی شریعت کے جنگی قوانین کے بھی مطابق تھا اس لئے کہ تورات آیت ۱۱-۱۲-۱۳ میں ہے:۔

"اور جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لئے آپہونچے تو پہلے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص۲۳۹-۲۴۰ مسلم شریف کے الفاظ یہ ہیں "قضیت بحکم اللہ وربما قال بحکم الملك" (تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا اور شاید آپؐ نے یہ فرمایا کہ مالک الملک کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کیا) مشہور روایت کسرہ کے ساتھ ہے اور اس کے معنی وہ ہیں جو مذکور ہوئے بعض روایتوں میں فتحہ کے ساتھ ہے، اس سے حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے فرشتہ جو فیصلہ لے کر آیا تھا اس کے مطابق تم نے فیصلہ کر دیا۔ (صحیح مسلم بابُ جواز قتال من نقض العھد کتاب الجہاد والسیر)

ان مقتولین کی تعداد آٹھ سو سپاہیوں کی تھی جیسا کہ کامل ابن اثیر ج ۲ ص۱۲۷ میں ہے۔

بعض معاصر اہل قلم نے مدینہ جیسے چھوٹے شہر اور نبی رحمتؐ کی کریمانہ سیرت کے پیش نظر تاریخی اسناد کے بجائے قیاس سے کام لیتے ہوئے اس تعداد کو مستبعد بتایا ہے، ملاحظہ ہو ڈاکٹر برکات احمد کی کتاب (MUHAMMAD & THE JEWS)

اس واقعہ کے متعلق (جو یہود کے دینی شعور کو متاثر کرنے والا ہے) یہودی مآخذ بھی خاموش ہیں، ایک یہودی مؤلف سموئیل اسک نے سولہویں صدی مسیحی میں ایک اہم کتاب "مآثر شہداء یہود" لکھی، لیکن اس نے بھی بنو قینقاع اور بنو نضیر کی مدینہ سے جلاوطنی اور بنو قریظہ کے جنگ جوؤں کے قتل کا ذکر نہیں کیا۔

اس سے صلح کا پیغام کر تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور اور دروازے تیرے لئے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جاوے تیری خراج گذار ہوگی اور تیری خدمت کرے گی اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو اس کا محاصرہ کر اور جب خداوند تیرا خدا اسے میرے قبضہ میں کر دیوے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لئے لے" (کتاب استثناء۔ باب ۲۰ آیات ۱۰ تا ۱۴ کتاب مقدس منجانب بائبل سوسائٹی ۱۸۸۲ء)۔

بنی اسرائیل میں قدیم زمانہ میں یہی رواج تھا توریت میں آتا ہے "اور انھوں نے مدیانیوں سے لڑائی کی جیسا خداوند نے موسیٰ کو فرمایا تھا، اور سارے مردوں کو قتل کیا اور انھوں نے ان مقتولوں کے سوا اوی اور راقم اور صور حور اور رابع کو جو مدیان کے پانچ بادشاہ تھے جان سے مارا اور باعور کے بیٹے بلعام کو بھی تلوار سے قتل کیا، اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کی مواشی اور بھیڑ بکری اور مال واسباب سب کچھ لوٹ لیا اور ان کے سارے شہروں کو جن میں وے رہتے تھے، اور ان کے سب قلعوں کو پھونک دیا۔[1]"

موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اسی قانون پر عمل کیا جاتا تھا، اور اس کو ان کی اجازت اور تائید حاصل تھی توریت ہی میں ہے۔

"تب موسیٰ اور العازر کاہن اور جماعت کے سارے سرداران کے استقبال

---

[1] کتاب مقدس، گنتی، باب ۳۱۔ آیت ۷ تا ۱۰ منجانب بائیبل سوسائٹی مطبوعہ ۱۸۸۲ء۔

کے لئے خیمہ گاہ سے باہر گئے اور موسیٰ لشکر کے رئیسوں پر اور ان پر جو ہزاروں کے سردار تھے، اور ان پر جو سیکڑوں کے سردار تھے، جو جنگ کر کے پھرے غصہ ہوا، اور ان کو کہا کہ کیا تم نے سب عورتوں کو جیتا رکھا۔[۱] سعد بن معاذؓ کے اس فیصلہ اور حکم کی تعمیل کی گئی، اور اس طرح مدینہ یہودی سازش، مکر و فریب، اور فتنہ سامانیوں سے محفوظ ہو گیا، اور مسلمانوں کو اطمینان ہو گیا کہ اب پیچھے سے ان پر کوئی حملہ نہ ہوگا اور کسی اندرونی سازش کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے گا۔

خزرج نے سلام بن ابی الحقیق کو بھی قتل کر دیا جس نے مسلمانوں کے خلاف یہ سب پارٹی بندی کی تھی، اور ان کا ناپاک اتحاد قائم کیا تھا، اس سے پہلے "اوس" کعب بن الاشرف کا خاتمہ کر چکے تھے، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عداوت اور آپؐ کے خلاف لوگوں کو اکسانے اور شورشیں برپا کرنے میں سب سے آگے تھا، ان دونوں کے قتل سے مسلمانوں کو فتنہ و فساد کے ان سرغنوں سے نجات ملی جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مستقل اور ہمہ وقت سازش میں مشغول رہتے اور نئی نئی تحریکیں اور تجویزیں کرتے رہتے تھے، اور سب نے اطمینان کی سانس لی۔[۲]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ سے جو معاملہ فرمایا وہ جنگی سیاست اور عرب کے یہودی قبائل کی سرشت اور افتاد طبع کے مطابق تھا، ان کے لئے اسی قسم کی سخت اور عبرتناک سزا کی ضرورت تھی، جس سے عہد شکنی کرنے والوں اور دھوکہ بازوں کو ہمیشہ کے لئے سبق مل جائے اور آئندہ نسلیں اس سے عبرت پکڑیں، R. V. C. BODLEY اپنی کتاب THE MESSENGER—THE LIFE OF MOHAMMAD. میں اس واقعہ پر

---

[۱] ایضاً آیت ۱۳-۱۴-۱۵۔ [۲] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۷۳

روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"محمدؐ بلادِ عرب میں تنہا تھے، یہ ملک رقبہ کے لحاظ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ایک تہائی ہے اور اس کی آبادی پچاس لاکھ ہے، ان کے پاس ایسے لشکر بھی نہ تھے جو لوگوں کو امتثالِ امر اور اطاعت پر مجبور کر سکتے، سوائے ایک مختصر لشکر کے جس کی نفری تین ہزار تھی، یہ لشکر بھی پوری طرح مسلح نہ تھا، اس لحاظ سے اگر محمدؐ اس سلسلہ میں سستی و غفلت سے کام لیتے اور بنی قُریظہ کو ان کی بد عہدی پر کوئی سزا دیئے بغیر چھوڑ دیتے تو جزیرۃ العرب میں اسلام کی بقا مشکل تھی، اس میں شک نہیں کہ یہود کے قتل کا معاملہ بہت سخت تھا لیکن یہ مذاہب کی تاریخ میں کوئی انوکھا اور نیا واقعہ نہ تھا، اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اس کارروائی کا پورا جواز موجود تھا، اس سے دوسرے عرب قبائل اور یہود کسی عہد شکنی اور غداری سے پہلے بار بار سوچنے پر مجبور ہوئے اس لئے کہ وہ اس کا انجام بد دیکھ چکے تھے، اور اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ محمدؐ اپنے فیصلہ کو نافذ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں[1]"

سر اسٹینلی لین پول لکھتا ہے :۔

"یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان لوگوں کا جرم مملکت سے غدّاری تھا، وہ بھی ایک محاصرہ کے دوران جن لوگوں نے تاریخ میں یہ پڑھا ہے کہ ولینگٹن کی فوج جس راستہ سے گذری اس کی نشاندہی مفرور سپاہیوں اور لوٹ مار کرنے والوں کی لاشیں کرتی تھیں، جو درختوں پر لٹکی ہوئی تھیں انھیں ایک غدّار

---

[1] THE MESSENGER—THE LIFE OF MUHAMMAD, (LONDON 1946), P. P. 202-203.

قبیلہ کے ایک سرسری فیصلہ کی رو سے قتل کئے جانے پر متعجب نہیں ہونا چاہیئے[۱]!

مدینہ میں یہود کے اس آخری قلعہ اور مورچہ کے خاتمہ کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ نفاق کا کیمپ قدرتی طور پر کمزور پڑ گیا اور منافقین کی سرگرمیاں سست ہوگئیں ان کے حوصلے پست ہوگئے، اور ان کی بہت کچھ خود اعتمادی اور بڑی بڑی امیدیں جو انھوں نے باندھ رکھی تھیں ختم ہوگئیں، اس لئے کہ یہ ان کے مستحکم قلعوں میں سے آخری قلعہ تھا جو فتح ہوگیا، ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے غزوۂ بنی قریظہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"جہاں تک منافقین کا تعلق ہے بنی قریظہ کی لڑائی کے بعد ان کی آواز پست پڑ گئی اور اس کے بعد ان کے اعمال و اقوال سے کوئی ایسی بات ظاہر نہ ہوئی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے فیصلہ کے خلاف ہوتی جیسا کہ اس سے پہلے توقع کی جا رہی تھی[۲]"!

عفو و درگذر اور سخاوت و دریادلی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نجد کی طرف کچھ سواروں کو ایک مہم پر روانہ فرمایا،

---

[۱] SELECTION FROM THE KORAN INDRO. P. IXV

[۲] الیہود فی بلاد العرب ص۱۵۵۔ استاذ محمد احمد باشمیل نے صحیح لکھا ہے کہ "غزوۂ احزاب" صرف یہودی غزوہ تھا جسے یہود کے سازشی ذہن نے خیبر میں برپا کیا اور اس میں یہودی سرمایہ صرف ہوا جو جنگ چھیڑنے اور یہودی دائرۂ اثر بڑھانے کے لئے ضمانتوں کے حصول کے لئے ہی صرف ہوتا ہے۔

غزوۂ بنی قریظہ، غزوۂ احزاب کی توسیعی شکل تھی کیونکہ یہود بنی قریظہ، قریشی یہودی فوجی اتحاد کا تیسرا بازو تھا، جو مسلمانوں کو بالکلیہ برباد کرنے پر آمادہ تھا، (غزوۂ بنی قریظہ ص۱۴۹-۱۵۵)

یہ لوگ واپس آئے تو اپنے ساتھ بنی حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اثال کو قیدی بنا کر لائے اور ان کو مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُدھر سے گذرے تو آپ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا ثمامہ! کچھ کہنا تو نہیں ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اگر آپ قتل کریں گے تو ایسے شخص کو قتل کریں گے جس کی گردن پر خون ہے، اگر احسان کریں گے تو ایک شکر گذار اور احسان شناس پر احسان کریں گے اور اگر آپ کو مال و دولت مطلوب ہے تو آپ بتائیں آپ جو مطالبہ بھی رکھیں گے وہ پورا کیا جائے گا، آپ یہ سن کر آگے بڑھ گئے دوسری بار جب آپ کا اُدھر سے گذر ہوا تو آپ نے اس سے یہی سوال کیا اور اس نے یہی جواب دیا اور آپ نے وہی رویّہ اختیار کیا جو پہلے کیا تھا، تیسری بار جب آپ اُدھر تشریف لے گئے تو آپ نے حکم دیا کہ ثمامہ کو رہا کرو، چنانچہ اس کو رہا کر دیا گیا، اس کے بعد ثمامہ نے مسجد کے قریب ایک کھجور کے باغ میں جا کر غسل کیا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا اور عرض کیا کہ خدا کی قسم ایک وقت تھا کہ مجھے آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی چہرہ بُرا نہ لگتا تھا لیکن آج آپ کا روئے انور مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے اور خدا کی قسم آپ کے دین سے زیادہ روئے زمین پر مجھے کسی اور دین سے بُغض نہ تھا لیکن آج آپ کا دین سارے ادیان و مذاہب سے زیادہ مجھے عزیز و محبوب ہے، میرا قصہ یہ ہے کہ میں عُمرہ کی نیت سے جا رہا تھا کہ آپ کے سواروں نے مجھے گرفتار کر لیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو بشارت دی اور عمرہ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی، جب ثمامہ قریش سے ملے تو ان لوگوں نے کہا کہ ثمامہ تم بے دین ہو گئے، انھوں نے جواب دیا نہیں خدا کی قسم میں تو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لایا ہوں، بخدا تمھارے پاس یمامہ کے گیہوں کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہ پہونچے گا جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی منظوری

نہ ہوگی، یمامہ مکہ کے غلّہ کی منڈی تھی، اور وہیں سے غلّہ کی رسد آتی تھی، اس کے بعد وہ اپنے علاقہ میں واپس گئے، اور اونٹوں کے کارواں کو جو گیہوں لے کر جاتے تھے، مکہ جانے سے روک دیا، اس کا اثر یہ پڑا کہ قریش کو فاقہ کی نوبت آگئی، اور انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ مبارک میں عرض داشت بھیجی کہ ثمامہ کو غذائی اشیاء اور اجناس کے برآمد کی اجازت دے دیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی[1]

غزوۂ بنی المصطلق اور واقعۂ اِفک

شعبان ۶ھ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ملی کہ بنی المصطلق (جو خزاعہ کی ایک شاخ تھے) جنگ کے لئے جمع ہو رہے ہیں، یہ اطلاع سن کر آپ بھی مقابلہ کے لئے تشریف لے چلے اور منافقین کی اتنی بڑی تعداد آپ کے ساتھ ہو گئی کہ اس سے پہلے کسی غزوہ میں نہ تھی[2]، ان کا سربراہ اور قائد عبد اللہ بن اُبی ابن سلول بھی ساتھ تھا غزوۂ احزاب میں (جس میں قریش نے پورے اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا، اور دوسرے تمام قبائل اپنے ساتھ ملا لئے تھے) مسلمانوں کی فتح و کامرانی نے اس گروہ کو نعل در آتش کر دیا، مسلمانوں کا ستارۂ اقبال برابر عروج پر تھا، پیہم کامیابیاں کفارِ مکہ، مدینہ اور اس کے اطراف میں بسنے والے یہود اور منافقین کے لئے حلق کا ایک ایسا کانٹا بن گئی تھیں جس سے ان کو کسی وقت قرار و سکون نہ ملتا تھا، وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ مسلمانوں کو اب میدانِ جنگ میں اور کثرتِ تعداد

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۷۷ و صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب الامداد بالملائکۃ یوم بدر" [2] ابن سعد اپنی کتاب طبقات میں لکھتے ہیں، آپ کے ساتھ اس غزوہ میں منافقین کی اتنی بڑی تعداد شریک ہوئی جو اس سے پہلے کبھی کسی غزوہ میں شریک نہیں ہوئی تھی (کتاب الطبقات الکبیرات ج ۲ ق ۱ طبع لیڈن ۱۳۲۵ھ ص ۴۵)

اور ساز و سامان سے شکست نہیں دی جا سکتی، اس لئے انھوں نے داخلی محاذ میں رخنہ اندازی اور فتنہ پردازی کا راستہ اختیار کیا، مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے قومی اور قبائلی نخوت کو ہوا دی، مقامِ رسالت کی بے حرمتی اور اس پر مسلمانوں کے اعتماد و یقین کو کمزور کرنے کا منصوبہ بنایا اور کاشانۂ نبوّت کے خلاف زبان درازی اور الزام تراشی کی خطرناک مہم چلانے کا فیصلہ کیا، ان کا خیال تھا کہ اس طرح اس نئے اور مثالی معاشرے کی چولیں ہل جائیں گی جس میں ہر فرد دوسرے کا آئینہ ہے، جب وہ اپنے بھائی کے بارے میں کوئی ناروا اور نازیبا بات سنتا ہے تو پہلے اپنا جائزہ لیتا ہے اگر اپنے نفس کو پاک اور صاف پاتا ہے تو پھر جس طرح اپنے لئے ایسی بے بنیاد بات نہیں کرتا دوسرے کے لئے بھی نہیں کرتا، اسی طرح اگر اہلِ بیتِ نبوّت پر اعتماد نہ رہے تو اس معاشرے میں ایک دوسرے پر سے اعتماد اٹھ جائے گا، کسی شخص پر بھی اعتماد باقی نہ رہے گا، یہ بلاشبہ منافقین کی ایک نہایت خطرناک اور گہری سازش تھی، اور یہ چال اور مکر و فریب کی پالیسی بنی المصطلق کے غزوہ میں جس طرح کھل کر سامنے آئی اتنی کسی اور غزوہ میں نہ آئی تھی۔

آخر کار لڑائی کا وقت آپہونچا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے اور بنی المصطلق کے چشمہ پر جس کو مریسیع[1] کہتے ہیں آپ نے قیام کیا، یہ جگہ ساحل کے رُخ پر مقام "قُدید" کے قریب واقع تھی، یہاں دونوں لشکر باہم دست و گریباں ہوئے، اور انجام کار بنی المصطلق کو شکست ہوئی[2]۔

---

[1] اس نسبت سے اس غزوہ کو غزوۃ المریسیع بھی کہا جاتا ہے (دیکھئے طبقات ابن سعد وغیرہ) [2] غزوۂ بنی المصطلق سیاسی فوجی اور اقتصادی اہمیت کا بھی حامل تھا، اس لئے کہ اس کا صدر مقام مریسیع مکہ کی تجارت کی شاہراہ پر واقع تھا وہ مکہ سے مدینہ کا ایک ذیلی راستہ بھی تھا جس سے مسافر اور تجارتی قافلے گذرتے تھے۔

اسی موقع پر حضرت عمرؓ کا ایک اجیر جو بنی غفار کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، اور جُہَینَہ کا ایک شخص جو خزرج کا حلیف تھا آپس میں لڑنے لگے تو جُہنی نے آواز لگائی اے انصار! اور اجیر نے صدا لگائی اے مہاجرین! عبداللہ بن اُبی بن سلول یہ سن کر بہت غصہ ہوا وہ اس وقت اپنے آدمیوں میں بیٹھا ہوا تھا اس نے کہا کہ اچھا ان مہاجرین کے حوصلے یہاں تک پہونچے؟ انھوں نے ہمارے علاقہ میں آکر ہم سے رسّہ کشی کی اور اپنی تعداد بڑھانے کی کوشش کی، واللہ یہ معاملہ ویسا ہی ہے جیسا اس مثال میں بیان کیا گیا ہے "سمّن کلبك يأكلك" اپنے کتے کو خوب کھلا پلا کے موٹا کرو تم ہی کو کھائے گا، خدا کی قسم جب ہم مدینہ واپس جائیں گے تو وہاں کے باعزّت و سربرآوردہ وہاں کے ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے پھر اپنے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر اس نے کہا یہ سب کچھ تم نے اپنے ہاتھوں کیا ہے، تم نے اپنے وطن میں ان کو جگہ دی، اپنا مال اپنے اور ان کے درمیان تقسیم کیا، خدا کی قسم اگر تم اپنے ہاتھ کو ذرا روک لیتے اور اس قدر فراخ دلی سے کام نہ لیتے تو وہ یقیناً دوسرا گھر دیکھتے۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سنی تو آپؐ نے لشکر کی واپسی کا حکم دیدیا تاکہ لوگ فتنہ میں نہ پڑیں اور شیطان کو وسوسہ اندازی کا موقع نہ مل سکے یہ واپسی آپؐ کے معمول کے خلاف تھی، آپؐ کے حکم پر سب لوگ چل کھڑے ہوئے آپؐ اس روز مسلسل چلتے رہے یہاں تک کہ شام ہوگئی، رات بھر سفر رہا یہاں تک صبح ہوگئی سفر جاری رہا، یہاں تک کہ دن چڑھ گیا، اور سورج کی تمازت سے لوگوں کو تکلیف ہونے لگی، اس وقت آپؐ نے قیام فرمایا، لوگ اس قدر تھک چکے تھے کہ زمین سے ان کی پیٹھ بھی نہ لگی تھی کہ وہ نیند کے آغوش میں پہونچ گئے، عبداللہ بن ابی کے فرزند عبداللہ لشکر سے پہلے مدینہ پہونچ گئے اور راستہ میں اپنے باپ کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے، انھوں نے عبداللہ بن اُبی کو دیکھا تو اپنا اونٹ

بٹھالیا اور کہا کہ میں تمھیں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ اپنی زبان سے تم نہ کہدو کہ میں ذلیل ہوں اور صاحبِ عزت محمد ہیں (صلے اللہ علیہ وسلم) اس درمیان میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اُدھر گذر ہوا آپؐ نے یہ سن کر فرمایا عبداللہ جانے دو! جب تک وہ ہمارے درمیان ہیں ہم ان کے ساتھ اچھا ہی سلوک کریں گے[۱]۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب آپؐ سفر کا ارادہ فرماتے تو ازواجِ مطہرات کے لئے قرعہ ڈالتے جس کا نام نکلتا ان کو اپنے ہمراہ لے لیتے، غزوہ بنی المصطلق میں حضرت عائشہؓ کے نام قرعہ نکلا چنانچہ آپ ان کو اپنے ہمراہ لے گئے، واپسی پر جب مدینہ قریب ہوا تو آپؐ نے قیام فرمایا اور رات کا کچھ حصہ وہیں گذارا، اس کے بعد آپؐ نے کوچ کا اعلان کیا حضرت عائشہ صدیقہؓ قضاء حاجت کے لئے گئیں تو ایک ہار جو ان کے گلے میں پڑا ہوا تھا کسی جگہ ٹوٹ کر گر گیا، اور ان کو پتہ بھی نہ چل سکا جب وہ اپنے محمل میں واپس آئیں تو ان کو معلوم ہوا کہ ان کا ہار غائب ہے، وہ اس کی تلاش کے لئے پھر وہاں گئیں اسی درمیان میں کوچ کا اعلان ہو گیا جن حضرات کے ذمہ ان کی سواری تھی وہ معمول کے مطابق آئے، اور یہ سمجھ کر کہ حضرت عائشہؓ اندر ہوں گی محمل تھام لیا اور روانہ ہو گئے، وہ بہت کمسن اور ہلکی پھلکی تھیں، اس لئے انھیں اندازہ نہ ہو سکا اور اس کا شبہ بھی نہیں ہوا کہ وہ اس کے اندر تشریف نہیں رکھتی ہیں حضرت عائشہ صدیقہؓ واپس آئیں تو یہاں کوئی نہ تھا، سب روانہ ہو چکے تھے انھوں نے اپنی چادر اوڑھی اور وہیں لیٹ گئیں، اسی درمیان میں صفوان بن معطّل اسلمی جو اپنی ایک ضرورت سے قافلہ سے بچھڑ گئے تھے، ادھر آنکلے، ان کو دیکھا تو اِنّا للہ پڑھا اور کہنے لگے کہ یہ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حرمِ محترم ہیں، اس کے بعد انھوں نے اپنا اونٹ اُن کے قریب کر دیا اور خود

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۴۶ طبع لیڈن۔

پیچھے ہٹ گئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس میں سوار ہوگئیں تو انھوں نے اونٹ کی نکیل تھامی اور تیز رفتاری کے ساتھ قافلہ کے تعاقب میں روانہ ہوئے جب وہ قافلے کے قریب پہونچے تو قافلہ منزل پر پڑاؤ کر چکا تھا لیکن اس واقعہ سے لوگوں میں کسی قسم کی سنسنی پیدا نہیں ہوئی اس لئے کہ صحرا کی زندگی اور قافلوں کی آمد و رفت میں وہ ان باتوں کے عادی تھے[1]، عزت و ناموس کی حفاظت ان کے خمیر میں تھی، اور اس قسم کی پست خیالی سے ان کے عربی اوصاف کو کوئی واسطہ نہ تھا جاہلیت اور اسلام دونوں میں اسی اصول پر کاربند تھے ایک جاہلی شاعر کہتا ہے:۔

وأغضُّ طرفي ان بدت لي جارتي　　حتى يواري جارتي مأواها

(دیوان الحماسہ)

"اگر میرے پڑوس کی کسی خاتون پر میری نظر کبھی پڑ جاتی ہے تو میں اپنی نظریں نیچی کر لیتا ہوں، یہاں تک کہ اس کا نشیمن اس کو اپنے اندر چھپالے۔"

---

[1] اسی طرز عمل کی ایک جھلک ام سلمہؓ کے واقعہ میں بھی ہمیں نظر آتی ہے، جب ان کو اپنے شوہر کے ساتھ مدینہ ہجرت کرنے سے بجبر روک دیا گیا چنانچہ روزانہ وہ جا کر اس جگہ بیٹھ جاتیں، اور شام تک روتی رہتیں تقریباً ایک سال تک ان کا یہ حال رہا، یہاں تک کہ ان سنگدلوں کا دل پسیجا، اور انھوں نے ان کو مدینہ جانے کی اجازت دے دی انھوں نے اپنا اونٹ تیار کیا اور اللہ کا نام لے کر اس پر بیٹھ گئیں اور روانہ ہوگئیں، راستہ میں انھیں عثمان بن طلحہ ملے اور ان کی یہ حالت دیکھ کر از راہ ہمدردی ان کی نکیل تھام لی اور مدینہ تک ان کے ساتھ رہے، ام سلمہ کہتی ہیں کہ ان سے زیادہ کسی شریف عرب سے میرا سابقہ نہیں پڑا، ان کا حال یہ تھا کہ جب کوئی منزل آتی تو وہ اونٹ کو بٹھا کر پیچھے چلے جاتے میں اتر جاتی تو آتے اور سامان اتار کر اس کو ایک درخت سے باندھ دیتے آگے کہتی ہیں کہ جب تک مجھے مدینہ نہیں پہونچا دیا وہ برابر یہی کرتے رہے، (سیرت ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱۵-۲۱۷) یہ اس وقت کی بات ہے جب عثمان بن طلحہ اسلام نہیں لائے تھے اس لحاظ سے صفوان بن المعطل السلمی اس پاک نفسی اور اخلاقِ عالیہ کے زیادہ حقدار تھے اس لئے کہ وہ بہت پہلے اسلام قبول کر چکے تھے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت کا شرف ان کو حاصل تھا۔

دوسری طرف صحابۂ کرام کا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تعلق وہ تھا جو باپ بیٹے کے درمیان ہوتا ہے، آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ اُمّہات المومنین کا درجہ رکھتی تھیں؟ آپؐ ان کی نظر میں حقیقی باپ اور ساری دنیا سے زیادہ محبوب تھے، صفوان بن المعطّلؓ بھی دینداری صلاح و تقویٰ اور حیا و عفّت میں نیک نام تھے، یہ بھی ذکر آتا ہے کہ ان کو عورتوں سے کوئی دلچسپی اور سروکار نہ تھا۔

غرض کہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس کی طرف لوگوں کو التفات بھی ہوتا لیکن عبداللہ بن اُبیّ نے اس کو بالکل اپنا لیا اور مدینہ واپس آکر اس کا خوب چرچا کیا، منافقین نے جو اس کے منتظر تھے، اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کی اچھی طرح تشہیر کی، ان کے نزدیک یہ ایک ایسا حربہ تھا جس سے مسلمان آسانی کے ساتھ فتنہ میں پڑ سکتے تھے، اور مقام رسالت اور اہلِ بیت کے ساتھ ان کی تعظیم اور محبت کا رشتہ کمزور کیا جا سکتا تھا، اس سے مسلمانوں کا باہمی اعتماد اور ایک دوسرے پر بھروسہ بھی مجروح ہوتا تھا، اس سازش کے کچھ ایسے سادہ دِل مسلمان بھی شکار ہو گئے جن کو زیادہ باتیں کرنے کا شوق تھا اور جو بغیر تحقیق کے بات نقل کرنے کے عادی تھے۔[1]

جب حضرت عائشہ رضؓ کو مدینہ میں اچانک اس کی خبر ہوئی تو وہ سنّاٹے میں آگئیں اور رنج و غم سے ان کا یہ حال ہو گیا کہ آنسو تھمتے نہ تھے، راتوں کی نیند اُڑ گئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ معاملہ بہت سخت اور سنگین تھا، آپ کو جب علم ہوا کہ بات

---

[1] اسی بات کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے "اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ" (جب تم اپنی زبانوں سے اس کا ایک دوسرے سے ذکر کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہتے تھے جس کا تم کو کچھ علم نہ تھا اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے تھے، اور خدا کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات تھی۔) (سورۃ النور۔ ۱۵)

کہاں سے چلی تھی تو اس وقت آپؐ تشریف لائے اور عبداللہ بن اُبی کے سلسلہ میں کچھ کہنے کی اجازت لی، آپؐ منبر پر تشریف رکھتے تھے، چنانچہ آپؐ نے فرمایا، اے مسلمانو! مجھے کون اس شخص کے معاملہ میں کچھ کہنے کی اجازت دیتا ہے جس کی میرے گھر والوں کے بارے میں ایذا رسانی کا مجھے پتہ چلا ہے، خدا کی قسم مجھے اپنے اہلِ خانہ کے بارے میں جو کچھ علم ہے، وہ اطمینان بخش ہی ہے، لوگوں نے اس معاملہ میں جن صاحب کا ذکر کیا ہے، ان کے بارے میں بھی مجھے اچھی ہی بات معلوم ہے، وہ جب کبھی میرے گھر آتے تو میرے ہمراہ آتے تھے، "اوس" کے کچھ لوگ یہ سن کر غیظ و غضب سے بھر گئے اور کہنے لگے کہ جس نے اتنی بڑی بات زبان سے نکالی ہے ہم اس کی گردن اڑا دینے کے لئے تیار ہیں خواہ وہ اوس کا آدمی ہو یا خزرج کا، عبداللہ بن ابی کا خزرج سے تعلق تھا، اس کی یہ گفتگو سن کر قبائلی حمیت پیدا ہونے لگی اور دونوں قبیلے جوش میں آگئے قریب تھا کہ شیطان کا جادو ان پر چل جائے اور وہ باہم دست و گریبان ہو جائیں لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فہم و تدبّر اور حلم و بُردباری کی برکت سے یہ بات وہیں ختم ہو گئی، اِدھر حضرت عائشہؓ کو اپنی بے گناہی کا پورا یقین تھا، اس لئے ان کے رویّہ میں اعتماد، خودداری اور عزتِ نفس کی پوری جھلک نظر آرہی تھی، ان کا حال اس بے گناہ اور معصوم صفت ہستی کا تھا جو ہر شک و شبہ اور الزام سے بالاتر ہوتی ہے، ان کو پورا یقین تھا کہ اللہ تعالےٰ ان کو بالآخر صاف بری کر دے گا، اور دامانِ رسالت پر بدگمانی اور تہمت کا یہ داغ ہرگز باقی نہ رہے گا، لیکن ان کو یہ خیال نہ تھا کہ اللہ تعالےٰ اس کے لئے خاص طور پر وحی نازل فرمائے گا، اور یہ آیتیں قرآن مجید کا جزء بن کر قیامت تک پڑھی جاتی رہیں گی ان کو زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑا کہ ان کے بارے میں قرآن کی حسب ذیل

آیتیں نازل ہوئیں اور سات آسمانوں کے اوپر سے ان کی برأت کا اعلان کیا گیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِیْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۝ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ۝ (سورۂ نور۔ ۱۱۔۱۲)	جن لوگوں نے بہتان باندھا ہے تم ہی میں سے ایک جماعت ہے اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھنا بلکہ وہ تمہارے لئے اچھا ہے ان میں سے جس شخص نے گناہ کا جتنا حصہ لیا اس کے لئے اتنا وبال ہے اور جس نے ان میں سے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے اس کو بڑا عذاب ہوگا جب تم نے وہ بات سنی تو مومن مردوں اور عورتوں نے کیوں اپنے دلوں میں نیک گمان نہ کیا اور کیوں نہ کہا کہ یہ صریح بہتان ہے۔

اس طرح اس زبردست فتنہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا اور یہ بات اس طرح ختم ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی مسلمان معمول کے مطابق اسی جوش اور ولولۂ کار کے ساتھ اپنے ان عظیم کاموں کی تکمیل میں مشغول ہوگئے جن پر نہ صرف ان کی بلکہ پوری انسانیت کی فلاح و کامرانی کا انحصار تھا۔[1]

---

[1] یہ واقعہ سیرت ابن ہشام سے ماخوذ ہے ج ۲ ص ۲۸۹۔۳۰۲ نیز حدیث عائشہ بروایت بخاری۔

صُلح حُدیبیہ

(ذی القعدہ سنہ ۶ھ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خواب اور مکہ میں داخلہ کے لئے مسلمانوں کی تیاری

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ مکہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کا طواف کیا۔

یہ رویائے صادقہ تھا لیکن اس میں زمانہ، مہینہ اور سال کا کوئی تعین نہ تھا[۱]، آپ نے صحابۂ کرام کو مدینہ میں یہ خواب سنایا، یہ خوش خبری سن کر سب لوگ بہت مسرور ہوئے، مکہ اور کعبہ (جس کی محبت و عظمت ان کے خمیر میں شامل اور ان کے رگ و ریشہ میں پیوست تھی) مدت ہوئی ان سے چھوٹ چکا تھا، ان کے دل میں طواف کا بڑا اشتیاق تھا اور وہ بہت بے چینی سے اس دن کے منتظر تھے، جب یہ سعادت ان کو دوبارہ حاصل ہو، مہاجرین میں مکہ کا اشتیاق قدرتی طور پر بہت زیادہ تھا، اس لئے کہ وہ وہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے، اور اس کی محبت گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی، بایں ہمہ عرصۂ دراز سے وہ اس کے دیدار اور زیارت سے محروم تھے، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ خبر دی تو ان کو اس میں ذرا بھی شبہ نہ ہوا کہ اس خواب کی تعبیر اسی سال

---

[۱] ملاحظہ ہو تفسیر سورۃ الفتح ۲۷۔ از ابن کثیر (لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ الآیہ)

نکل آئیے گی اس بات نے ان کی آتش شوق کو اور بھڑکا دیا اور وہ سب کے سب آپؐ کے ساتھ روانہ ہونے کے لئے آمادہ ہوگئے شاذ و نادر ہی کوئی اس سے مستثنیٰ تھا، عمرہ کا احرام بھی آپؐ نے باندھ لیا تھا تاکہ لوگوں کو اس کا علم ہو جائے کہ آپ صرف زیارت بیت اللہ کی غرض سے تشریف لے جا رہے ہیں[۱]۔

وہاں پہونچ کر آپؐ نے قبیلہ خزاعہ کے ایک مُخبر کو قریش کا پتہ لگانے کے لئے متعین کیا جب آپ مقام عسفان[۲] کے قریب پہونچے تو اس مُخبر نے آپؐ کو اطلاع دی کہ قبیلۂ کعب بن لوی نے آپؐ کے مقابلہ اور پیش قدمی روکنے کے لئے احابیش[۳] کو اکٹھا کر رکھا ہے، اور خاصی بڑی فوج منظم کر لی ہے ان کا ارادہ ہے کہ جنگ کر کے آپؐ کو بیت اللہ تک پہونچنے سے باز رکھیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش قدمی جاری رکھی جب آپؐ اس گھاٹی پر پہونچے جہاں سے ان کی طرف اتار شروع ہوتا ہے تو آپؐ کی اونٹنی "قصواء" بیٹھ گئی لوگوں نے یہ دیکھ کر کہنا شروع کیا قصواء اَڑ گئی، قصواء اَڑ گئی آپؐ نے فرمایا قصواء اَڑی نہیں، اور یہ اس کا شیوہ نہیں، اس کو ہاتھیوں کے روکنے[۴] والے نے روکا ہے، اور قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، وہ لوگ کوئی بھی ایسا منصوبہ پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا پہلو مدنظر رکھا جاتا ہے، اور مجھ سے صلۂ رحمی کا سوال کرتے ہیں تو میں ان کا سوال ضرور پورا کروں گا، پھر آپؐ نے اونٹنی کو ڈانٹا وہ اسی وقت اچھل کر کھڑی ہوگئی لیکن اپنا رخ بدل کر

---

[۱] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۳۸۰ نیز ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۳۰۸ [۲] مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک موضع ہے۔ [۳] جنگ جو افراد جو مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ [۴] آپ کا اشارہ "ابرہہ" کے ہاتھی کی طرف تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے مکہ میں داخل ہونے سے باز رکھا۔

حدیبیہ کی طرف روانہ ہوگئی، اور اس کے آخری کنارہ پر ایک پانی کے گڑھے کے پاس جس میں ذرا سا پانی تھا رک گئی، لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پیاس کی شکایت کی، آپؐ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور حکم دیا کہ اس کو اس گڑھے میں ڈال دیا جائے اس کو ڈالتے ہی پانی اس میں جوش مارنے لگا اور سب لوگ اچھی طرح سیراب ہوگئے۔[1]

مسلمانوں کے مکّہ میں داخلہ سے قریش کی پریشانی

قریش کو جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور اس جگہ قیام کی خبر ملی تو ان کو سخت گھبراہٹ ہوئی آپؐ نے اس موقع پر مناسب سمجھا کہ اپنے اصحاب کرام میں سے کسی ایک کو بھیج کر ان کو اطمینان دلا دیا جائے چنانچہ وہاں بھیجنے کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا وہ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) مکہ میں بنی عدیّ بن کعب کا ایک آدمی بھی موجود نہیں ہے جو ان کے درپئے آزار ہونے پر میری حمایت کر سکے، آپؐ عثمانؓ کو وہاں جانے کا حکم فرمائیں کہ ان کا پورا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ پیغام رسانی کا فریضہ بھی اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں، آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو بلوا کر قریش کے پاس بھیجا اور فرمایا کہ ان سے جا کر کہدو کہ ہم جنگ کرنے کے لئے نہیں بلکہ عُمرہ کا ارادہ کر کے یہاں آئے ہیں، ان کو اسلام کی بھی دعوت دینا، آپؐ نے ان کو یہ بھی ہدایت کی کہ مکہ میں جو اہلِ ایمان مرد و عورتیں ہیں ان کے پاس جا کر ان کو فتح کی بشارت دیں اور ان کو یہ خوش خبری سنائیں کہ اللہ تعالے مکہ میں اپنے دین کو غالب کرنے والا ہے یہاں تک کہ ایمان کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔[2]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۸۱ [2] ایضاً

عشق و وفا کا امتحان

حضرت عثمانؓ روانہ ہوئے مکہ پہونچ کر وہ ابوسفیان اور قریش کے سربرآوردہ اشخاص کے پاس گئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام ان کو پہونچایا، جب وہ اپنی بات کہہ چکے تو انھوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ اگر تم طواف کرنا چاہتے ہو تو طواف کر لو، انھوں نے جواب دیا جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طواف نہ کر لیں گے، میں اس وقت تک طواف نہیں کر سکتا۔[1]

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ واپس آئے تو مسلمانوں نے کہا ابوعبداللہ تم تو بڑے مزے میں رہے تم نے تو طواف کر کے اپنے دل کا ارمان نکال لیا ہوگا، کہنے لگے تم لوگوں نے بڑی بدگمانی سے کام لیا، قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر مجھے ایک سال بھی وہاں ٹھہرنا پڑتا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف فرما ہوتے تب بھی میں اس وقت تک طواف نہ کرتا جب تک کہ حضور طواف نہ کر لیتے، مجھے تو قریش نے طواف کی دعوت بھی دی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا۔[2]

بیعتِ رضوان

اُدھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے، آپؐ نے لوگوں کو بیعت کی دعوت دی تمام لوگ جوش و وارفتگی کے ساتھ آپؐ کے چاروں طرف جمع ہو گئے آپ اس وقت ایک درخت کے نیچے تشریف رکھتے تھے، آپؐ نے اس پر بیعت کی کہ کوئی راہ فرار نہ اختیار کرے گا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنا دستِ مبارک تھاما اور فرمایا یہ عثمانؓ کی طرف سے ہے[3] یہ وہی بیعت رضوان تھی جو حدیبیہ میں

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۱۵ [2] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۸۲ [3] ایضاً۔

ببول کے ایک درخت کے نیچے انجام پائی اور اس کا ذکر قرآن مجید کی حسب ذیل آیات میں کیا گیا:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ	(اے پیغمبر) جب مومن تم سے درخت
اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ	کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا اُن
فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ	سے خوش ہوا، اور جو (صدق و خلوص)
السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ	ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے
فَتْحًا قَرِيْبًا ۝	معلوم کر لیا تو ان پر تسلّی نازل فرمائی
(سورہ فتح۔ ۱۸)	اور انھیں جلد فتح عنایت کی۔

مذاکرات، ثالثی اور صلح کی کوشش

یہ صورتِ حال ابھی قائم تھی کہ اچانک بُدیل بن ورقاء الخزاعی خُزاعہ کے کچھ آدمیوں کے ساتھ وہاں پہونچا اس نے ان معاملات پر گفتگو کرنا چاہی اور دریافت کیا کہ آپؐ کی آمد کا مقصد کیا ہے؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم لوگ کسی سے جنگ کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں ہم صرف عُمرہ کی نیت سے یہاں آئے ہیں قریش کو جنگ نے پہلے ہی چور چور کر رکھا ہے اگر وہ چاہیں تو میں کچھ مدت اُن سے طے کر لوں اور وہ میرے اور لوگوں کے درمیان کا راستہ چھوڑ دیں، اور اگر وہ چاہیں تو اسی گروہ میں شامل ہو جائیں جس میں اور لوگ شامل ہوئے ورنہ انھیں کچھ مدت آرام کا موقع تو مل ہی جائے گا لیکن اگر جنگ کے علاوہ کوئی صورت ان کو قبول نہیں تو اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں اپنے اس معاملہ (دین) کے سلسلہ میں جنگ کروں گا یہاں تک کہ میرا سر تن سے جُدا ہو جائے، یا اللہ اپنے دین کو غالب فرمائے۔

جب بُدیل نے ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہونچایا تو عُروۃ بن مسعودؓ الثقفی نے کہا کہ انھوں نے بہت سمجھ داری کی تجویز رکھی ہے میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو مان لو اور مجھے ان سے مل لینے دو، سب نے کہا ہاں جاؤ بات کرلو، عُروہ بن مسعود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آکر ملے اور آپؐ نے ان سے گفتگو شروع فرمائی عُروہ کنکھیوں سے صحابۂ کرام کو دیکھتے جاتے تھے جن کا حال یہ تھا کہ اگر آپؐ تھوکتے تو کوئی نہ کوئی اس کو ہاتھ پر لے لیتا اور اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتا، آپؐ کوئی حکم فرماتے تو ہر شخص تعمیل کے لئے لپکتا، وضو فرماتے تو وضو کے پانی پر جان نثار اس طرح ٹوٹتے کہ لڑائی کا خطرہ ہونے لگتا، آپؐ کلام فرماتے تو سب ہمہ تن گوش ہو جاتے فرطِ تعظیم اور ادب کی وجہ سے کوئی آپؐ سے نظریں ملانے کی ہمت نہ کرتا، عُروہ نے واپس جاکر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اے قوم! میں بادشاہوں کے دربار میں گیا ہوں میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کی شان و شوکت بھی دیکھی ہے لیکن خدا کی قسم میں نے نہیں دیکھا کہ کسی بادشاہ کے درباری و مصاحبین ایسا ادب اور اس درجہ تعظیم کرتے ہوں جیسے کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی کرتے ہیں انھوں نے جو کچھ یہاں دیکھا اس کی تفصیل ان کو بتائی اور کہا کہ انھوں نے بہت اچھی تجویز رکھی ہے تم لوگ اس کو مان لو۔[1]

معاہدہ و صلح نامہ

اس درمیان میں بنی کنانہ کا ایک اور شخص (جس کا نام مکرز بن حفص تھا) بھی وہاں پہونچا اور دونوں نے اپنے چشم دید واقعات قریش کے سامنے بیان کئے قریش نے سہیل بن عمرو کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا آپؐ نے ان کو دیکھتے ہی فرمایا کہ ان کو

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۸۲

بھیجنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صلح کے خواہشمند ہیں، آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ معاہدہ کی تحریری دستاویز تیار کرو۔[1]

حِلم و حکمت کی جامعیّت کی ایک مثال

آپؐ نے معاہدہ کی تحریر کے لئے کاتب (جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے) طلب فرمایا اور ارشاد ہوا لکھو "بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم" سہیل نے کہا جہاں تک رحمان کا تعلق ہے بخدا ہم اس سے واقف نہیں ہیں، اسی پرانے دستور کے مطابق باسمک اللّٰھُمّ لکھو، آپؐ نے فرمایا کہ لکھ دو باسمک اللّٰھُمّ مسلمان یہ دیکھ کر بول اٹھے کہ نہیں ہم تو بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم لکھیں گے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا باسمک اللّٰھم ہی لکھو۔

پھر آپؐ نے فرمایا کہ لکھو یہ وہ ہے جس کا اللہ کے رسولؐ نے معاہدہ کیا یہ سن کر سہیل نے کہا کہ خدا کی قسم اگر ہمارا اس پر ایمان ہوتا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپؐ کو بیت اللہ سے روکتے ہی کیوں؟ اور آپؐ سے جنگ ہی کیوں کرتے آپؐ اس کی جگہ محمّد بن عبداللہ لکھیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اللہ کا رسولؐ ہوں خواہ تم جھٹلاؤ، لکھو محمد بن عبداللہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اس کے مٹانے کا حکم دیا حضرت علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم مجھ سے یہ کام نہیں ہو سکتا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس کی جگہ دکھاؤ انھوں نے آپؐ کو یہ جگہ دکھائی تو آپؐ نے اس کو خود مٹا دیا۔[2]

صلح اور آزمائش

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے رسول نے یہ معاملہ اس پر کیا ہے کہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۱۶ نیز صحیح بخاری باختلاف بعض الفاظ ملاحظہ ہو کتاب المغازی باب عمرة القضاء۔ [2] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب صلح الحدیبیہ۔

تم لوگ ہمارے اور بیت اللہ کے درمیان حائل نہ ہوا ور ہم اس کا طواف کرلیں سُہیل نے
کہا کہ ہمیں ڈر ہے کہ عربوں میں ایسا چرچا ہونے لگے کہ یہ معاہدہ ہم نے دب کر کیا ہے،
آئندہ سال آپ طواف کر سکتے ہیں آپؐ نے یہ دفعہ بھی معاہدہ میں شامل کرلی۔

سُہیل نے کہا کہ یہ بھی لازم ہوگا کہ اگر ہمارے یہاں سے کوئی شخص آپؐ کے یہاں
چلا جائے خواہ وہ آپ ہی کے مذہب پر ہو تو آپؐ اس کو ہمیں پلٹا دیں گے، مسلمانوں نے کہا سبحان اللہ
اگر کوئی مسلمان ہو کر ہمارے پاس آتا ہے تو ہم اس کو مشرکوں کے حوالے کیسے کر سکتے ہیں؟

یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ اچانک ابو جندل بن سُہیل بیڑیوں میں گرتے پڑتے پہونچے
وہ مکہ کے نشیب سے آئے تھے، اور کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو مسلمانوں تک پہونچا دیا تھا، سُہیل
نے کہا اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) یہ پہلا شخص ہے جس کی واپسی کا مطالبہ (عہد نامہ کی
رو سے) میں آپؐ سے کرتا ہوں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابھی تو ہم نے تحریر بھی
مکمل نہیں کی، اس نے جواب دیا، اگر ایسا ہے تو پھر میں کسی بات پر آپ سے معاملہ کرنے پر تیار
نہیں ہوں، آپؐ نے فرمایا میرے کہنے سے انھیں اجازت دیدو، اس نے کہا میں آپؐ کے
کہنے سے اجازت نہیں دے سکتا، آپؐ نے فرمایا کہ اچھا جو تمھارا جی چاہے کرو، اس نے کہا
مجھے کچھ نہیں کرنا ہے، یہ سب سن کر ابو جندل بولے مسلمانو! میں مسلمان ہو کر آیا ہوں، اور پھر
مشرکوں کو واپس کیا جا رہا ہوں، کیا تم لوگ دیکھتے نہیں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟
انھوں نے اللہ کے راستے میں سخت تکلیفیں اٹھائی تھیں[1]، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس
مطالبہ پر ان کو واپس فرما دیا، فریقین میں یہ بھی معاہدہ ہوا کہ دس سال تک دونوں
کشت و خون سے پرہیز کریں گے، تاکہ لوگ امن و اطمینان کے ساتھ رہ سکیں، اور کوئی کسی پر

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صـ ۳۸۳ صحیح بخاری میں یہ واقعہ "باب الشروط فی الجہاد" کے تحت آیا ہے۔

دست درازی نہ کرسکے دوسری بات یہ طے ہوئی کہ اگر قریش سے کوئی شخص اپنے ولی وسرپرست کی اجازت کے بغیر محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس آ نکلا تو وہ اس کو واپس کردیں گے، اور اگر محمدؐ کے ساتھیوں میں سے کوئی شخص قریش کے پاس آنکلا تو وہ اس کو واپس نہ کریں گے، نیز یہ کہ جو شخص محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے معاہدہ اور جوار (حفاظت) میں داخل ہونا چاہے ہوسکتا ہے اسی طرح جو قریش کے معاہدہ اور جوار میں آنا چاہے اس کو اس کی اجازت ہوگی۔[1]

مسلمانوں کا امتحان

جب مسلمانوں نے یہ صلح اور واپسی کی بات سنی اور انھوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اس کو برداشت کیا تو یہ بات ان کے لئے اتنی روح فرسا ثابت ہوئی کہ ان کی جان پر بن گئی، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ بیت اللہ جائیں گے اور طواف کریں گے؟ انھوں نے کہا ہاں فرمایا تھا لیکن کیا انھوں نے تم سے یہ کہا تھا کہ تم اسی سال بیت اللہ بھی جاؤ گے اور طواف بھی کرو گے۔[2]

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس صلح نامہ سے فارغ ہوئے تو آپ قربانی کے جانوروں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کو جا کر ذبح کیا اس کے بعد حلق کرایا مسلمانوں کے لئے یہ بات کسی سانحہ سے کم نہ تھی، اس لئے کہ مدینہ سے نکلتے وقت ان کے دل میں اس کا وسوسہ بھی نہیں تھا کہ انھیں مکہ جانے اور عمرہ کرنے کا موقع نہ مل سکے گا، لیکن جب انھوں نے آپ کو قربانی کرتے اور حلق کراتے دیکھا تو سب اسی وقت تیزی سے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۱۷-۳۱۸ [2] صحیح بخاری، باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب

کھڑے ہوگئے اور آپؐ کی اتباع کرتے ہوئے قربانی اور حلق میں مشغول ہوگئے۔[1]

ذلّت آمیز صلح یا کھلی ہوئی فتح؟

اس کے بعد آپؐ مدینہ تشریف لائے اور راستہ ہی میں اللہ تعالےٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝	اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم کو
لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ	فتح دی صریح وصاف تاکہ خدا تمہارے
ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ	اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے اور تم پر اپنی
عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا	نعمت پوری کردے اور تمھیں سیدھے
مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ	راستہ پر چلائے، اور خدا تمھاری
نَصْرًا عَزِيْزًا ۝ (سورۂ فتح ۱-۳)	زبردست مدد کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہی فتح ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں![2]

بصورت ناکامی، بحقیقت کامیابی

جب آپؐ مدینہ تشریف لے آئے آپؐ کے پاس قریش کا ایک آدمی پہونچا جس کا نام "ابوبصیر" عتبہ بن اُسید تھا، اس کی تلاش و تعاقب میں انھوں نے دو شخص بھیجے اور وہ معاہدہ آپ کو یاد دلایا، چنانچہ آپ نے اس شخص کو ان دونوں کے حوالے کیا، اور یہ دونوں اسے ساتھ لے کر واپس آگئے، لیکن راستہ میں یہ شخص کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا، اور سمندر کے ساحل پر آگیا، دوسری طرف ابوجندل بن سہیل بھی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھیں زاد المعاد ج ۱ ص ۳۸۳ [2] دیکھئے صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب "صلح الحدیبیہ"

کسی طرح ان کی زد سے نکل آئے اور ابوبصیر سے آملے اور اب یہ ہونے لگا کہ قریش کا جو بھی مسلمان مکّہ سے جان اور ایمان بچا کر نکلتا تو وہ سیدھا ابوبصیر سے جا ملتا، رفتہ رفتہ ان کی پوری جمعیّت تیار ہوگئی، یہ لوگ یہ کرتے کہ قریش کا جو بھی قافلہ شام جانے والا انھیں ملتا یہ اس کا راستہ روک کر اس کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیتے اور سب قافلے والوں کو قتل کر ڈالتے، عاجز آ کر قریش نے اللہ کا واسطہ اور رشتہ داری اور قرابت کی دہائی دے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ ان لوگوں کو ضرور بُلوا بھیجیں، اب جو بھی آپؐ کے پاس پہونچے گا، وہ مامون و محفوظ رہے گا۔[1]

یہ صلح فتح وظفر میں کیسے تبدیل ہوئی؟

آخر میں پیش آنے والے واقعات نے یہ ثابت کر دکھایا کہ صلح حُدیبیہ سے (جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے موقف سے بہت کچھ اُتر کر معاہدہ فرمایا تھا اور قریش کا مطالبہ مان لیا تھا، اور انھوں نے بھی اس کو اپنی بڑی جیت اور نفع کا سودا سمجھا تھا اور مسلمانوں نے اس کو اپنی ایمانی قوت اور نبی کی کامل اطاعت کے جذبہ سے برداشت کر لیا تھا) دراصل اسلام کے اقبال وظفر مندی کا ایک نیا دروازہ کھل گیا اور اس کی وجہ سے اسلام کو جزیرۃ العرب میں اس قدر تیزی کے ساتھ فروغ ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا، اس نے فتح مکہ کا بھی دروازہ کھولا اور اسی کے نتیجے میں قیصر و کسریٰ مقوقس نجاشی اور امراء عرب کو دعوتِ اسلام دی گئی اللہ تعالےٰ نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا ہے:

وَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا شَيْـًٔا وَهُوَ   مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۳۸۴

خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا	اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور
شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ	عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور
وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ○	وہ تمہارے لئے مضر ہو اور (ان باتوں کو)
(سورۂ بقرۃ-۲۱۶)	خدا ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اس صلح کے بہترین فوائد و نتائج میں ایک یہ بات بھی تھی کہ قریش نے مسلمانوں کی حیثیت اور مرتبہ کو تسلیم کیا اور ایک باعزت اور طاقت ور فریق کی حیثیت سے جس کے ساتھ معاہدے کئے جاتے ہیں اور مذاکرات ہوتے ہیں ان کو ان کی جائز جگہ دی اور شاید اس صلح کا سب سے بہتر ثمرہ وہ جنگ بندی اور امن کی فضا تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو (جو عرصہ سے جنگوں کے ایک طویل سلسلے میں الجھے ہوئے تھے، اور جس نے ان کی ساری توانائی اور قوت نچوڑ لی تھی) اطمینان کی سانس لینے اور کسی قدر آرام کرنے، نیز اس پرسکون اور پرامن وقفہ میں یکسوئی اور جمعیت خاطر کے ساتھ اس کی دعوت پہونچانے اور فریضۂ تبلیغ ادا کرنے کا بہترین موقع مل گیا۔

اس صلح نے مسلمانوں اور مشرکوں کو جو اب تک باہم دست و گریباں تھے ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع بھی فراہم کیا اور اس کی وجہ سے اسلام کے وہ محاسن مشرکین کے سامنے آئے جو اب تک اس قدر حسن و زیبائی کے ساتھ سامنے نہ آئے تھے، مثلاً شرک و بت پرستی کی نجاست سے یکسر نجات، دشمنی و عداوت، انسانی خون کی پیاس اور قتل و غارت گری سے مکمل نفرت جو قومی شیوہ بن گیا تھا، اخلاقی قلب ماہیت و انقلاب جو پندرہ[۱۵] سال کی قلیل مدت میں ان لوگوں کی زندگی میں رونما ہوا تھا جو کسی دوسری قوم کے افراد یا کسی غیر ملک کے باشندے نہ تھے، انھیں کے ہم قوم ہم رنگ و ہم زبان تھے، انھیں کی طرح مکہ میں پیدا ہوئے تھے، اور ان کی ایک عمر انھیں کے ساتھ بسر ہوئی تھی،

پھر یہ کس چیز کا کرشمہ تھا کہ وہ ان چند برسوں میں مٹی سے اکسیر اور پتھر سے پارس بن گئے تھے؟ اسلام کی تعلیمات اور صحبتِ نبوی کے سوا کوئی چیز اہلِ مکہ اور ان مہاجرین کے درمیان فرق کرنے والی نہ تھی چنانچہ ایک سال بھی اس صلح پر نہ گذرا تھا، اور مکہ بھی ابھی فتح ہونا باقی تھا کہ عربوں کی اتنی بڑی تعداد حلقہ بگوشِ اسلام ہوئی کہ گذشتہ پندرہ[۱۵] برسوں میں اس قدر نہ ہوئی تھی۔

امام ابن شہاب زُہری (م ۱۲۴ھ) کہتے ہیں "اسلام کو اس سے پہلے اتنی بڑی کوئی فتح حاصل نہیں ہوئی جب فریقین (قریش اور مسلمان) میں صلح ہوئی، جنگ بندی کا اعلان ہوا، اور لوگ بلا خوف و خطر ایک دوسرے سے ملنے لگے، اور ان کو ساتھ رہنے اور بات چیت کرنے کا موقعہ ملا جس سمجھ دار آدمی سے اسلام کے بارے میں گفتگو کی گئی وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ تنہا ان دو برسوں میں اتنے آدمی داخل اسلام ہوئے جتنے اب تک ہوئے تھے، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ[۱]"۔

ابن ہشام کہتے ہیں "زُہری کے قول کی مزید دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حُدیبیہ میں (بروایت جابر بن عبداللہ) چودہ سو آدمی تھے اس کے دو سال بعد فتح مکہ کے موقع پر آپؐ کے ساتھ دس ہزار صحابہ کی جمعیت تھی[۲]"۔

اس جنگ بندی اور صلحنامہ کی بدولت ان مسلمانوں کو فائدہ پہونچا جو مکہ میں اپنی مجبوری و بےلبسی کی وجہ سے باقی رہ گئے تھے، اور قریش کے استہزاء و اہانت کا ہدف بنے ہوئے تھے، اور ابو جندل کے ہاتھ پر قریش کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا، اسلام کے اس نئے داعی اور مبلغ کی یہ کوشش اور اسلام کا مکہ میں فروغ مشرکین کے لئے ایک دردِ سر بن گیا۔

یہ سب لوگ ابو بصیر کے کاروانِ حق سے آملے اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کی دعوت

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۲ [۲] ایضاً۔

وقوت وشوکت کا ایک بڑا مرکز تعمیر ہو گیا قریش کو اس کی بڑی فکر دامن گیر ہوئی انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو مدینہ بلالیں چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور اس طرح جس تنگی و مصیبت میں یہ لوگ گرفتار تھے اس سے ان کو نجات ملی یہ سب دراصل اسی صلح کی برکت اور جنگ بندی کے اسی معاہدہ کا نتیجہ تھا۔[1] اس مصالحانہ اور امن پسندانہ رویہ کا جو آپ نے اس موقع پر اپنایا، نیز جنگ سے عدم دلچسپی صلح جوئی کے جذبہ اور بردباری واعتدال کے جس طرز عمل کا آپ سے اظہار ہوا اس کا ایک فائدہ یہ بھی نکلا کہ وہ عرب قبائل جو ابھی اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے، اس نئے دین اور اس کے داعی کو نئی نظر سے دیکھنے لگے ان کے دلوں میں اسلام کی عظمت اور اس کا وہ احترام اور محبت پیدا ہوگئی جو اس سے پہلے نہ تھی یہ ایک ایسا تبلیغی و دعوتی فائدہ تھا، جس کو معمولی نہیں کہا جا سکتا، اگرچہ اس کی کوئی کوشش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے نہیں کی تھی۔

خالد بن ولید اور عمرو بن العاص رضؓ

صلح حدیبیہ دلوں کی فاتح ثابت ہوئی، چنانچہ خالد بن الولید نے (جو قریش کے سواراَفواج کے سپہ سالار تھے اور جنھوں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے) صلح حدیبیہ کے بعد ہی اسلام قبول کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انھیں سیف اللہ (خدا کی تلوار) کا لقب مرحمت فرمایا وہ راہِ خدا میں ہر طرح کامیاب و بامراد اور سرخرو و سرفراز ہو کر نکلے اور اللہ تعالےٰ نے ان کے ہاتھوں سے شام کا علاقہ فتح کروایا۔

عمرو بن العاص رضؓ نے بھی جو ایک بڑے سپہ سالار اور جرنیل تھے، اور بعد میں فاتح مصر کی حیثیت سے سامنے آئے اسی زمانہ میں اسلام قبول کیا، دونوں صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ طیبہ حاضر ہو کر دولتِ اسلام سے سرفراز ہوئے اور مراتب علیا حاصل کئے۔[2]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۸۸-۳۸۹ [2] دیکھئے سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۷۷-۲۷۸

سلاطین و امراء کو دعوتِ اسلام

(اواخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ)

حکیمانہ طرزِ دعوت

صلح ہونے کے بعد حالات قدرتی طور پر پُرسکون ہو گئے، دعوتِ اسلامی کو سانس لینے کا موقع ملا، اور ترقی و پیش قدمی کی نئی راہیں کشادہ ہوئیں اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سلاطینِ عالم اور امراءِ عرب کو متعدد خطوط لکھے اور ان کو بڑے حکیمانہ انداز میں اسلام کی دعوت دی[1] اس کے لئے آپ نے بڑا اہتمام فرمایا اور ہر بادشاہ کے لئے ایسے ایلچی کا انتخاب کیا جو اس کے مرتبہ و حیثیت کے مطابق گفتگو کر سکے اور وہاں کی زبان نیز ملک کے حالات سے واقف ہو[2]۔

---

[1] قابلِ ترجیح قول یہ ہے کہ یہ خطوط صلح حدیبیہ کے بعد ماہ ذی الحجہ ۶ھ میں بھیجے گئے جیسا کہ واقدی کی رائے ہے، یہ ۶۲۸ء کے مطابق ہے اس لئے کہ ان سلاطین میں بسر فہرست ایرانی شہنشاہ خسرو دوئم پرویز تھا اور وہ مارچ ۶۲۸ء میں مارا گیا۔ ہرقل کو جو خط لکھا گیا اگر اس کا سنہ بھی ۶۲۸ء تسلیم کیا جائے تو اس کا اس کے ہاتھ میں پہونچنا محل نظر ہے، اس لئے کہ وہ اسی سال آرمینیا کے دورہ پر جا چکا تھا، دیکھئے عربوں کی فتح مصر (ترجمۂ عربی) از الفرڈ بٹلر ص ۱۳۹-۱۴۰ اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ یہ خطوط عیسوی تقویم کے مطابق ۶۲۷ء میں روانہ کئے جا چکے تھے اور وہ ۶ھ کے مطابق ہے۔

[2] ابن سعد نے طبقات (جلد ۲ ص۲۳) میں اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اور سیوطی نے اپنی کتاب الخصائص الکبریٰ (جلد ۲ ص۱۱) میں اس موضوع پر جو کلام کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات خارقِ عادت طریقہ پر بطور معجزہ ظاہر ہوئی تھی

(باقی ص ۳۷۲ پر)

صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ یہ لوگ کسی ایسے خط کو تسلیم نہیں کرتے جس پر مہر نہ ہو، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے ایک خاص مہر بنوائی جس کا حلقہ چاندی کا تھا، اور درمیان میں محمد رسول اللہ اسی طرح نقش تھا۔[۱]

وہ تحریریں بتاتی ہیں کہ یہ دین عربوں کا یا جزیرۃ العرب کا نہیں بلکہ نوعِ انسانی کا دین تھا چنانچہ وہ عرب سے باہر کی متمدن اور با اثر حکومتوں کے لئے چیلنج ثابت ہوئیں، اور اس صورت میں انھیں اپنا زوال نظر آنے لگا کہ وہ خود اس دعوت کو قبول نہ کریں یا کم از کم اپنی رعایا کو اس دعوت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا موقعہ نہ دیں۔

(باقی ص۳۷۱ کا) ان دو نوں نے جو روائتیں نقل کی ہیں، اس میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ "ان میں ہر ایک اس ملک کی زبان جہاں وہ بھیجا گیا تھا، خود بخود بولنے لگا" مصنف کو اس معجزہ کے امکان و وقوع میں کوئی اشکال نہیں ہے، اس لئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور انبیاء کی سیرت اس قسم کے معجزات اور خارقِ عادات واقعات سے بھری ہوئی ہے تاہم اس کے نزدیک یہ بات بالکل ممکن اور قرین قیاس ہے کہ یہ دراصل رسول اللہ کی حکمت و دانش اور حسن انتخاب پر بھی مبنی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ رومی، فارسی زبانیں نیز مصر کے قبطی باشندوں کی اور اہل حبشہ کی زبان عربوں سے ان کے مسلسل میل جول اور آمد و رفت کی وجہ سے ان کے لئے کوئی انوکھی بات نہ تھی مثلہ صرف ان چار زبانوں کا تھا، جزیرۃ العرب کے دوسرے امراء اور سرداران قبائل کے سلسلے میں کوئی دشواری نہ تھی اور عربی زبان میں ان کو دعوتِ اسلام دی گئی، اس لئے یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ اس مہم کے لئے انھیں لوگوں کا انتخاب کیا گیا ہو جو رومی، فارسی، قبطی اور حبشی زبان پہلے سے جانتے ہوں اور ایسے لوگوں سے عرب کی سرزمین خالی نہ تھی جو ان ملکوں میں بار بار جانے اور عرصہ تک رہنے کی وجہ سے ان چاروں زبانوں سے آشنا اور ان کے ذریعہ سے سفارت کا فرض انجام دینے پر قادر ہوں۔ [۱] ملاحظہ ہو صحیح بخاری کتاب الجہاد باب "دعوۃ الیہود والنصاریٰ و علیٰ ما یقاتلون الخ" و شمائل ترمذی۔

مکاتیبِ نبوی

ان سلاطین میں جن کے نام یہ خطوط روانہ کئے گئے، رومی شہنشاہ ہرقل، ایرانی شہنشاہ کسریٰ پرویز، حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور مصر کے بادشاہ مقوقس کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہرقل کو آپؐ نے اپنا مکتوب دحیۃ الکلبی کے ہاتھ ارسال فرمایا اور انھوں نے "بُصریٰ" کے رئیس اور سردار کے ذریعہ اس مکتوبِ گرامی کو ہرقل تک بھجوایا اس مکتوب کا متن یہ ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم. من	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم. محمدؐ کی طرف سے
محمد عبد اللہ ورسولہٗ إلیٰ	جو خدا کا بندہ اور رسول ہے، یہ خط
"ھرقل" عظیم الرومؐ سلام علی	ہرقل کے نام ہے جو روم کے رئیس اعظم
من اتبع الھدیٰ، أما بعد فإنی	ہیں، ان کو سلامتی ہو جو ہدایت کا
أدعوك بدعایة الإسلام أسلم	پیرو ہو، اس کے بعد میں تم کو
تسلم یُؤتِك اللہ أجرك مرتین،	اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا
فإن تولیت فإن علیك إثم	ہوں، اسلام لاؤ، تم سلامت رہوگے
الیریسیین "یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ	خدا تم کو دُگنا اجر دے گا اور اگر
تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا	تم نے نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تمھارے
وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ	اوپر ہوگا، اے اہلِ کتاب! ایک ایسی
وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ	بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں
بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ	یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔[1]

کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو (خدا کو چھوڑ کر) خدا نہ بنائے، اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔

کسریٰ پرویز کے نام آپ نے حسب ذیل خط بھیجا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس، سلام علی من اتبع الھدیٰ، وآمن باللہ ورسولہ وشھد ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ الی الناس کافۃ لینذر من کان حیا، اسلم تسلم، فان ابیت فعلیک اثم المجوس۔[2]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد پیغمبر خدا کی طرف سے کسریٰ رئیس فارس کے نام، سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہوا اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، اور یہ گواہی دے کہ خدا صرف ایک خدا ہے اور یہ کہ خدا نے مجھ کو تمام دنیا کا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا ہے تاکہ وہ ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلائے، تم اسلام قبول کرو تو سلامت رہو گے، ورنہ مجوسیوں کا وبال تمہاری گردن پر ہوگا۔

نجاشی کے نام یہ مکتوب تھا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمدؐ کی طرف سے

---

[1] صحیح بخاری باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم [2] الطبری ج ۳ صفحہ ۹۰

من محمد رسول اللہ الی النجاشی	جو اللہ کا رسول ہے یہ خط نجاشی
عظیم الحبشۃ، سلام علی من	کے نام ہے جو حبشہ کا امیر اعظم ہے
اتبع الھدی، امابعد، فانی	سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا
احمد الیک اللہ الذی لا الٰہ	پیرو ہو، امابعد، میں حمد بیان کرتا
الا ھو الملک القدوس السلام	ہوں تم سے اس اللہ کی جس کے سوا
المومن المھیمن، واشھد ان	کوئی معبود نہیں، جو بادشاہ ہے
عیسی بن مریم روح اللہ	قدوس ہے، سلام ہے، مومن اور
وکلمتہ القاھا الی مریم	مہیمن ہے، اور گواہی دیتا ہوں،
البتول الطیبۃ الحصینۃ	اس بات کی کہ عیسیٰ بن مریم اللہ کی
فحملت بعیسی من روحہ	روح اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے
ونفخہ کما خلق آدم بیدہ،	پاک نفس و پاکباز مریم البتول میں
وانی ادعوک الی اللہ وحدہ	پھونکا تھا پس اس کی روح اور اس کے
لا شریک لہ والموالاۃ علی	نفخ سے عیسیٰ ان کے بطن میں قرار پائے،
طاعتہ وان تتبعنی وتؤمن	جیسے اس نے آدم کو اپنے ہاتھ سے
بالذی جاءنی، فانی رسول اللہ	بنایا تھا، میں تم کو دعوت دیتا ہوں
وانی ادعوک وجنودک	ایک اللہ پر ایمان لانے کی جس کا کوئی
الی اللہ عزوجل وقد	شریک نہیں، اور اس کی طاعت،
بلغت ونصحت فاقبل	موالات کی اور یہ کہ تم میری اتباع
نصیحتی والسلام علی	کرو، اور جو کچھ میرے اوپر وحی آئی ہے

من اتبع الھدیٰ[1]

اس پر ایمان لاؤ، پس بے شک میں اللہ کا رسول ہوں، اور میں تم کو اور تمہارے لشکروں کو اللہ عزوجل کی طرف بلاتا ہوں، میں نے اپنا پیغام کہہ دیا اور نصیحت پوری کر دی پس یہ نصیحت قبول کرو، اور سلام ہو اس پر جو ہدایت کا پیرو ہو۔

قبطیوں کے سردار اور بادشاہ مقوقس کے نام یہ مضمون تھا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد عبد اللہ ورسولہ الی "المقوقس" عظیم القبط سلام علی من اتبع الھدیٰ، اما بعد! فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم، واسلم یؤتک اللہ اجرک مرتین، فان تولیت فان علیک اثم اھل القبط "یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ

خدائے رحمٰن ورحیم کے نام سے محمد رسول خدا کی طرف سے مقوقس رئیس قبط کے نام اس کو سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے اس کے بعد میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں اسلام لے آؤ سلامت رہو گے خدا تم کو دگنا اجر دے گا اگر تم نے نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تمہارے اوپر ہو گا، اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۵

اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا	تم میں یکساں ہے وہ یہ ہے کہ ہم خدا
وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا	کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا	ہم میں سے کوئی کسی کو (خدا کو چھوڑ
فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ [1]	کر) خدا نہ بنائے اور تم نہیں مانتے
	تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔

[1] مواہب لدنیہ ج ۳ ص ۲۴۷-۲۴۸۔ اس وقت تک پانچ نامہ ہائے مبارک کے اصل نسخے دریافت ہو چکے ہیں ان کی تصویریں بھی بہت سے اسلامی رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔

جہاں تک مقوقس کے نام سے فرمان مبارک کا تعلق ہے، فرانسیسی مستشرق BARTHELEMY کو مصر کے مقام اخمیم کے ایک قدیم دیر میں ۱۸۵۰ء میں ہرن کی جھلی (رق) پر لکھی ہوئی ایک تحریر ملی مطالعہ و تحقیق کے بعد ثابت ہوا کہ یہ وہ فرمان مبارک ہے جو مقوقس کے نام بھیجا گیا تھا (ایشیاٹک جرنل ۱۸۵۴ء اور رسالہ "الہلال مصر" نومبر ۱۹۰۴ء)

اسی طرح نجاشی اور کسریٰ کے نام کے فرمان کی اصل بھی مل چکی ہے۔

رومی بادشاہ ہرقل کو بھیجا جانے والا مکتوب گرامی اسپین میں ساتویں صدی ہجری تک محفوظ تھا، جس کا پتہ چھٹی صدی کے مشہور محدث و مورخ علامہ سہیلی نے دیا ہے۔

ابوالعباس شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی (م ۹۲۳ھ) نے ارشاد الساری شرح صحیح البخاری کے جزء اول ص۔ پر لکھا ہے کہ:۔

"کہا جاتا ہے کہ الملک المنصور قلاؤن الصالحی کے زمانہ میں شاہ افرنگ نے سیف الدین قلیج کے سامنے ایک مطلّا صندوق کھولا اور اس میں سے ایک سنہرا لفافہ نکالا پھر اس میں سے ایک خط نکالا جس کے اکثر حروف مٹ گئے تھے اور کہا کہ یہ تمہارے نبی کا مکتوب میرے (باقی ص ۳۷۸ پر)

فرامین نبوی میں مکتوب الیہم کے مابہ الامتیاز حالات کی رعایت

ذہین قاری وہ باریک فرق محسوس کرلیں گے جو حکمتِ دعوت و رسالت کے پیشِ نظر نمایاں ہیں، اور جن میں ان بادشاہوں کے امتیازی عقائد اور ذہنی کیفیات کا لحاظ کیا گیا ہے، چنانچہ ہرقل و مقوقس کُلّی یا جزئی طور پر الوہیتِ مسیح کے قائل تھے، اور انھیں "ابن اللہ" مانتے تھے تو ان کے نام خطوط میں نبی کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ "عبد اللہ" کا لفظ ہے، اور بسم اللہ کے بعد دونوں خط اس طرح شروع ہوتے ہیں۔

"من محمد عبد اللّٰہ ورسولہ الی ھرقل عظیم الروم" اور "من محمد عبد اللّٰہ ورسولہ الی المقوقس عظیم القبط" جبکہ کسریٰ پرویز کے نام مکتوب گرامی کا سرنامہ اس طرح تھا "من محمد رسول اللّٰہ الی کسریٰ عظیم فارس" ہرقل و مقوقس کے نام کے خطوط میں یہ آیت کریمہ لکھی گئی :-

قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی	آپ فرمادیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ
کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ	ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے
اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ	اور تمھارے درمیان برابر ہے کہ بجز
بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا	اللہ تعالےٰ کے ہم کسی اور کی عبادت

(باقی ص۳۷۷ کا) دادا قیصر کے نام تھا جسے ہم بحفاظت رکھتے چلے آرہے ہیں، اور ہمارے اجداد نے ہمیں یہ وصیت کی ہے کہ جب تک یہ مکتوب ہمارے پاس رہے گا تب تک ہماری بادشاہت بھی رہے گی اس لئے ہم لوگ اس کی حفاظت کرتے ہیں (تازہ اطلاع کے مطابق یہ مکتوب شریف شاہ حسین ملک شرق اردن کے پاس موجود ہے)

بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	نہ کریں اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا	کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے
بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝	کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے
(سورۂ آل عمران - ۶۴)	خدا تعالےٰ کو چھوڑ کر پھر اگر وہ لوگ
	اعراض کریں تو تم لوگ کہدو کہ تم
	اس کے گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں۔

لیکن کسریٰ پرویز کے خط میں یہ آیت درج نہیں ہے، کیونکہ اس کے مخاطب وہ اہل کتاب ہیں، جو الوہیت مسیح کے قائل ہیں، اور جنھوں نے اللہ کے علاوہ اپنے احبار و رہبان اور مسیحؑ کو بھی اپنا رب بنا لیا تھا، ہرقل بیزنطی سلطنت کا سربراہ تھا اور مقوقس مصر کا بادشاہ تھا، دونوں اس عہد کی مسیحی دنیا کے قائد اور (حضرت مسیحؑ کے بارے میں ایک طبیعت یا دو طبیعتوں کے معمولی اختلاف کے سوا) مسلّم مذہبی رہنما بھی تھے[1]۔

کسریٰ پرویز اور اس کی قوم چونکہ آفتاب پرست اور آتش پرست تھی، اور دو خداؤں، خدائے خیر "یزداں" اور خدائے شر "اہرمن" کو مانتی تھی، اور نبوّت اور آسمانی رسالت کے صحیح مفہوم سے ناآشنا تھی، اس لئے ایرانی بادشاہ کے نام کے نامۂ مبارک میں یہ عبارت لکھی گئی:-

وانّی رسول اللہ الی الناس	اور میں تمام لوگوں کے لئے اللہ کا

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں مصنف کی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" ص ۳۸-۳۹ (دار القلم تیرھواں ایڈیشن) یا اردو ترجمہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"۔

کَافَّۃً لِیُنذِرَ مَن کَانَ حَیًّا۔ ایسا رسول ہوں جو شعوری طور پر زندہ لوگوں کو آگاہ کرے۔

یہ سلاطین کون تھے؟

ہمیں اس پیغمبرانہ اقدام کی اہمیت و عظمت کا (جو ان خطوط کے ذریعہ کیا گیا) اس وقت تک اندازہ نہیں ہو سکتا جب تک ان چاروں اشخاص ہرقل کسریٰ، نجاشی اور مقوقس کے معاصر تاریخ میں مرتبے اور حیثیت، ان کی سلطنتوں کے رقبہ و وسعت اور ان کے شوکت اور دبدبے کا ہمیں علم نہ ہو، اگر کوئی شخص ساتویں صدی مسیحی کی سیاسی تاریخ سے واقف نہیں ہے، اور اس کو ان ملکوں کے متعلق ضروری معلومات حاصل نہیں ہیں تو وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ خطوط چند مقامی حکام اور والیانِ ریاست[1] کے نام لکھے گئے ہیں، جو ہر زمانہ میں اور ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

اس کے برخلاف جو شخص اس عہد کے سیاسی نقشہ میں ان بادشاہوں کی اہمیت جانتا ہے، ان کی تاریخ اور سیرت و کردار سے واقف ہے، اور ان کی قوت و اقتدار اور رعب و دبدبہ کو اچھی طرح سمجھتا ہے، وہ محسوس کرے گا کہ یہ عظیم اقدام اور جرأت وہی نبی کر سکتا تھا جو خدا کی طرف سے اس کام پر مامور کیا گیا ہو، اس پر اس دعوت و پیغام کی پوری ذمہ داری ہو، اس پر ضعف اور خوف کا سایہ بھی نہ پڑا ہو اور آسمانوں اور زمینوں کے حقیقی بادشاہ اور مالک الملک کی اس پر ایسی تجلّی ہو کہ تاج و سریر کے مالک اس کو گڑیا گڈے یا بے جان پتلے معلوم ہوتے ہوں، جن کو بادشاہوں کی پوشاک میں آراستہ

---

[1] مثلاً برطانوی عہد کے نظام حیدرآباد، نواب بھوپال یا مہاراجہ سندھیا (گوالیار) مہاراجہ گیکواڑ (بڑودہ) کے نام تبلیغی خطوط لکھے جائیں۔

کر کے تختِ حکومت پر بٹھا دیا گیا ہو، اس لئے یہاں معاصر تاریخ اور معتبر مورخوں کی شہادتوں کی مدد سے ان کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

قیصرِ روم ہرقل اوّل (۶۱۰-۶۴۱ء)

بازنطینی شہنشاہ قیصرِ روم ہرقل اوّل ایک وسیع و عریض شہنشاہی کا مالک تھا، جس نے ایرانی شہنشاہی کے ساتھ مل کر اس عہد کی ساری متمدن دنیا کو آپس میں تقسیم کرلیا تھا اور جس کا سکہ آدھی دنیا میں چل رہا تھا۔ تین براعظموں یورپ، ایشیا اور افریقہ میں اس کے خوش حال، دولت مند اور ترقی یافتہ و متمدن مقبوضات اور نو آبادیاں (DOMINIONS) تھیں یہ سلطنت رومۃ الکبریٰ کی جانشین تھی، جس کے زیر نگیں تقریباً پوری متمدن قدیم دنیا رہ چکی تھی۔[1]

یہ بادشاہ ایک یونانی خاندان کا فرد تھا، کپوڈیشیا میں پیدا ہوا اور قرطاجنہ کا دیج (CARTHAGE) میں پرورش پائی، وہ افریقہ کے ایک حاکم (EXARCH OF AFRICA) کا لڑکا تھا، اس میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس سے اس کی غیر معمولی ذہانت، حوصلہ مندی اور قائدانہ صلاحیت کا اظہار ہوتا جب فوقس (PHOCUS) نے غاصبانہ طور پر بازنطینی سلطنت کے شہنشاہ موریقس "ماریس" (MAURICE) کو (جس کے کسریٰ پرویز پر احسانات تھے) ۶۰۲ء میں قتل کیا تو ایرانیوں کو بازنطینی سلطنت پر فوج کشی کا بہانہ مل گیا۔ اور انھوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اس عظیم الشان بازنطینی سلطنت کی

---

[1] اس شہنشاہیت کے حدود اور اس کی ریاستوں اور صوبوں کی تفصیل جو پورے ایشیا اور افریقہ میں پھیلے ہوئے تھے کتاب کے باب اول میں "مشرقی رومی سلطنت" کے عنوان سے ہم بیان کر چکے ہیں۔

(کارٹوگرافی از محمود اختر)

آخری سانسیں تھیں[1] کہ ہرقل کو قرطاجنہ سے طلب کیا گیا، اس نے فوقس کو قتل کیا اور ۶۱۰ء میں[2] زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی، اس وقت پورا ملک موت وزیست کی کشمکش میں گرفتار تھا، اور خشک سالی، وبائی امراض، غربت اور مالی نقصانات سے دیوالیہ ہوچکا تھا ہرقل نے اپنی حکومت کے ابتدائی سال ایک پُرسکون اور عافیت پسند انسان کی طرح گذارے اور کوئی بڑا کام انجام نہیں دیا لیکن ۶۱۶ء میں اس کے اندر اچانک ایک انقلاب برپا ہوگیا (یہ وہ سال ہے جس میں قرآن مجید نے چند برسوں کے اندر غلبۂ روم کی پیشین گوئی کی تھی[3]) اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے عیش پرست اور آرام طلب بادشاہ سے ایک پُرجوش اور غیرت مند قائد اور جرنیل میں تبدیل ہوگیا، یہ خیال اس کے اعصاب پر پوری طرح سوار ہوگیا، اس کے اندر غیرت قومی نے جوش مارا چنانچہ اس نے ایران کے قلب کا رخ کیا، اپنی چھینی ہوئی زمین اور کھوئی ہوئی عزت واپس لی، ایران کے مشہور شہروں پر قبضہ کرلیا، ایران کے قلب وجگر میں اتر کر مرکزِ سلطنت میں اپنے جھنڈے گاڑ دیئے اور عظیم اور قدیم ایرانی شہنشاہی کی عزت وعظمت کو خاک میں ملادیا، اور اس کو زخموں سے اس قدر چور چور کردیا کہ معلوم ہونے لگا کہ اب سلطنت کا دمِ واپسیں ہے اور آل ساسان کے تخت کی چولیں بالکل ہل چکی ہیں، یہ فاتح واپس آکر ۶۲۵ء میں قسطنطنیہ میں فتح مندانہ داخل ہوا، اور ۶۲۹ء میں

۱؎ اس کی تفصیلات (GIBBON) کی کتاب (DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) اور آرتھر کرسٹن سین کی کتاب "ایران بعہد ساسانیاں" میں ملاحظہ فرمائیں۔ ۲؎ اس واقعہ کے ایک سال بعد جزیرۃ العرب میں حضور کی بعثت ہوئی۔ ۳؎ دیکھئے سورۂ روم کی ابتدائی آیات؛ نیز راقم سطور کا مقالہ "قرآن مجید میں غلبۂ روم کی پیشین گوئی" مندرجہ کتاب "مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی"

صلیب مقدس (جس کو ایرانی اٹھالے گئے تھے) وہاں دوبارہ نصب کرنے اور اپنی نذر پوری کرنے کے لئے بیت المقدس کے لئے روانہ ہوا، لوگ تعظیم و احترام کے اظہار کے لئے اس کے راستے میں فرش و قالین بچھاتے تھے، اور گل پاشی و عطر بیزی کرتے تھے[1] صلیب کے دوبارہ نصب کئے جانے کی خوشی میں وہاں جشنِ عظیم کا انتظام کیا اور اس فتح کی خوشیاں منائی گئیں، یہ وہ وقت تھا جب ہرقل کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک ملا جس میں اس کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی[2]

لیکن اس کے بعد ہی ہرقل اپنی سستی و غفلت اور آرام طلبی و عیش پرستی کے اسی حال میں آ گیا جس میں پہلے تھا، یہاں تک کہ مجاہدین اسلام نے اس سلطنت کے زوال کا فیصلہ کر دیا، اور ایشیاء و افریقہ سے اس کا خاتمہ ہو گیا، اور یہ وسیع سلطنت صرف یورپ و ایشیائے کوچک میں منحصر ہو کر رہ گئی، بہر حال اپنے زمانے کے عظیم شہنشاہوں میں اس کا شمار تھا، سلطنت کے رقبہ و وسعت، جنگی طاقت اور تمدن و ترقی میں اگر کوئی اس کا ہمسر و ہم مرتبہ تھا تو وہ ایرانی شہنشاہ خسرو دوم تھا، ۶۴۱ء میں اس کا قسطنطنیہ میں انتقال ہوا، اور وہیں مدفون ہوا۔

کسریٰ پرویز (خسرو پرویز دوم ۵۹۰ - ۶۲۸ء)

یہ ہرمز کا چوتھا بیٹا اور خسرو اول معروف بہ نوشیرواں عادل کا پوتا تھا، عرب

---

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۲۱ [2] ہرقل کو نامۂ مبارک پہونچنے میں برخلاف کسریٰ کے جو تاخیر ہوئی اس کا سبب یہ تھا کہ یہ خط اولاً بصریٰ کے سربراہ کے حوالہ کیا گیا کہ وہ اسے قیصر کے حوالہ کرے، وہ قیصر کی جنگی مصروفیات اور دار السلطنت سے دوری کی وجہ سے غالباً یہ خط بروقت اس کے حوالہ نہ کر سکا، دوسرے یہ کہ مغربی ماخذ میں اس کا ذکر ہے کہ ہرقل کو ۶۲۸ء میں ایک بغاوت کو فرو کرنے کے لئے آرمینیا جانا پڑا اور اسی لئے وہ اپنی نذر ۶۲۹ء میں پوری کر سکا۔

اس کو کسریٰ پرویز کے نام سے یاد کرتے ہیں اس کے باپ کے قتل کے بعد ۵۹۰ء میں اس کی تاج پوشی ہوئی، بہرام چوبین نے اس کے خلاف بغاوت کی خسرو نے شکست کھائی اور ساسانی مملکت کو چھوڑ کر بازنطینی فرماں روا موریقیس (MAURICE) سے پناہ طلب کی اور اپنے ملک کی بازیافت میں اس کی مدد چاہی، موریقیس نے زبردست فوجوں کے ساتھ اس کی مدد کی، ان خون آشام جنگوں کے بعد بہرام کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور خسرو اپنے آباؤ اجداد کے تختِ حکومت پر دوبارہ قابض ہو گیا، ۶۱۲ء میں خسرو نے بازنطینی سلطنت پر اپنے معنوی باپ اور ولی نعمت موریقیس کا بدلہ اس کے قاتل اور تختِ قیصری کے غاصب فوقس (PHOCUS) سے لینے کا تہیہ کر لیا، فوقس کے قتل نے بھی اس کو مزید پیش قدمی سے باز نہ رکھا، اور وہ قسطنطنیہ تک بڑھتا چلا گیا اور اپنی قدیم حریف سلطنت کی اس طرح اینٹ سے اینٹ بجا دی کہ اس کی کوئی مثال پہلے نہیں ملتی، ۶۱۵ء تک اس کی فتوحات اور اقبال مندی کا ستارہ پورے عروج پر پہونچ گیا، یہاں تک کہ ہرقل نے ایرانیوں کو ان کے ملک سے بے دخل کر دیا اور ساسانی مملکت کے قلب و جگر پر حملے کئے، خسرو کو اپنا ملک خیرباد کہہ کر ایک محفوظ اور دور دراز علاقہ میں پناہ لینی پڑی، لیکن جلد ہی ۶۲۸ء کی بغاوت میں اس کا کام تمام ہو گیا۔

مورخین ایران کا اتفاق ہے کہ خسرو دوم، ایران کا سب سے عظیم اور شان و شوکت رکھنے والا شہنشاہ تھا، اس کے عہد میں مملکت ساسانیہ اپنی ترقی و خوش حالی، پُر تکلف زندگی، لوازمِ تعیش اور آرائش و زیبائش کے نقطۂ عروج پر تھی، ہندوستان کی شمال مغربی ریاستوں تک اس کا سکہ رواں تھا،[۱] اس کے نام کے ساتھ یہ شاندار تمہید ہوتی تھی،

---

[۱] ایران بعہد ساسانیان ص ۶۰۲

"خداؤں میں انسان غیر فانی" اور "انسانوں میں خدائے لاثانی" اس کے نام کا بول بالا آفتاب کے ساتھ طلوع کرنے والا، شب کی آنکھوں کا اجالا[1] اس کے عہد میں ملک نے جتنی ترقی کی تھی، اور اس کو جو شان و شوکت حاصل ہوئی تھی، اس کے متعلق مشہور مؤرخ طبری کے الفاظ یہ ہیں:۔

"یہ بادشاہ سب سے زیادہ سخت گیر، سب سے زیادہ قوت فیصلہ اور دور رس نگاہ رکھنے والا تھا، شجاعت و بہادری اور فتح و ظفر کے کارناموں، دولت کی فراوانی اور تقدیر کی ہمزبانی اور زمانہ کی مساعدت کے اسباب جتنے اس کے لئے مہیا تھے کسی اور بادشاہ کے لئے نہ تھے، اس کا لقب پرویز پڑ گیا جس کے معنی عربی میں مظفر یعنی فاتح و اقبال مند ہوتے ہیں"[2] تہذیب و تمدن کی جدت طرازیوں اور نکتہ آفرینیوں میں اس کا کوئی جواب نہ تھا، ماکولات و مشروبات کے شعبے میں اس نے نئی نئی چیزیں ایجاد کی تفصیل[3] عطریات و خوشبو وغیرہ میں بھی وہ آخری منزل پر تھا، اس کے عہد میں پر تکلف و متنوع کھانوں اعلیٰ قسم کی شرابوں اور بہترین عطریات کا لوگوں میں ایک خاص ذوق پیدا ہوگیا تھا، نغمہ و سرود اور فن موسیقی نے اس کے عہد میں بڑا عروج حاصل کیا تھا لوگوں کو ان چیزوں سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی، اس کو دولت جمع کرنے اور نوادرات اور نفیس اشیاء اکٹھا کرنے کا بڑا شوق تھا جب اس کا خزانہ (۶۰۷ء تا ۶۰۸ء) میں قدیم عمارت سے طیسفون (مدائن) کی نئی عمارت میں منتقل کیا گیا تو اس کی مقدار ۴۶۸ ملین (یعنی چھیالیس کروڑ اسی لاکھ) مثقال سونا تھی، جو سینتیس کروڑ پچاس لاکھ

---

[1] ایران بعہد ساسانیان ص ۶۰۴ ماخوذ از تھیوتی لیکٹس [2] تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۳۵ المطبعۃ الحسینیۃ الطبعۃ الاولی (مصر) [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ طبری ص ۹۹۵

طلائی فرنک کے برابر ہوتا ہے اس کی تخت نشینی کے تیرہویں سال اس کے خزانۂ شاہی میں ۸۰۰ ملین (یعنی اٹھاسی کروڑ) مثقال سونا موجود تھا[1]۔ اس نے ۳۷ سال حکومت کی اور اس کے بعد اس کا بیٹا شیرویہ تخت حکومت پر بیٹھا۔

مقوقس

یہ اسکندریہ کا گورنر اور مصر میں بازنطینی شہنشاہی کا نائب سلطنت VICEROY تھا، عرب مؤرخ زیادہ تر اس کو مقوقس کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس کے اصلی نام اور کنیت میں بڑا اختلاف ہے، مؤرخ ابو صالح جنھوں نے چھٹی صدی ہجری (۱۲۰۰ء) میں اپنی تاریخ قلم بند کی تھی، اس کا ذکر "جریج بن مینا المقوقس" کے نام سے کیا ہے، ابن خلدون نے لکھا ہے کہ وہ قبطی تھا، مقریزی نے اس کو "المقوقس الرومی" لکھا ہے، جب ایرانیوں نے مصر پر حملہ کیا تو بازنطینیوں کے مقرر کردہ گورنر نے راہِ فرار اختیار کی اس کا نام (JOHN THE ALMONER) تھا، یہ اسکندریہ سے بھاگ کر قبرص پہنچا، اور وہیں اس کی موت ہوئی، اس کے بعد ہرقل نے اس کی جگہ دوسرے نائب سلطنت کو جس کا نام جارج تھا، مقرر کیا اور شاید یہ وہی شخص ہے جس کو عرب جریج کہتے ہیں، اس نے اس کو ملکانی کلیسا کا سربراہ بھی مقرر کیا، بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس کی تقرری ۶۲۱ء میں ہوئی، الفرڈ بٹلر (ALFRED J. BUTLER) لکھتا ہے:۔

"عربوں کا خیال تھا کہ جو حاکم بازنطینی حکومت کی طرف سے ایران پر فتح یابی کے بعد مصر کا گورنر مقرر ہوا، اس کا لقب مقوقس تھا، اور وہ ایک وقت میں

---

[1] ایران بعہد ساسانیان ص ۶۱۱

ملک کا حاکم اور کلیسا کا سربراہ اور مذہبی پیشوا بھی ہوتا تھا چنانچہ انھوں نے جارج کے لئے (جو وہاں نائب سلطنت تھا) یہ لقب تجویز کیا، وہ اس کو ترجیح دیتا ہے کہ مقوقس اس کا اصل نام نہیں بلکہ لقب ہے، جو قدیم قبطی زبان کا لفظ ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ایرانیوں کے مصر پر غلبہ اور اقتدار کے وقت کسی قبطی لاٹ پادری نے کلیسا کی سربراہی اور زمامِ اقتدار دونوں اپنے ہاتھ میں لے لی ہوگی، تاہم صلحنامہ ۶۲۸ء میں لکھا گیا، اس لئے ممکن ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی مقوقس کے نام اسی وقفہ میں پہونچا ہو، جب مصر کا حاکم تقریباً خود مختار تھا۔"[1]

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے نام کے ساتھ "عظیم القبط" قبطیوں کے رہنما اور سردار کے الفاظ بھی لکھے۔

مصر بازنطینی شہنشاہی کی سب سے زرخیز ریاست تھی، اور پیداوار اور آبادی دونوں کے لحاظ سے سب سے آگے تھی، غذائی اجناس دارالسلطنت میں یہیں سے سپلائی ہوتی تھیں، فاتح مصر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے نامۂ مبارک ارسال کرنے کے چودہ[14] برس بعد وہاں فاتحانہ داخل ہوئے تھے، امیرالمومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے نام اپنے خط میں مصر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

"مصر کی سرزمین بہت سرسبز و شاداب ہے، اس کا طول ایک مہینہ کی مسافت اور عرض دس[10] دن کی مسافت کے بقدر ہے[2]" اس کی آبادی اور کثرتِ تعداد کا اندازہ

---

[1] دیکھئے APPENDIX-C. PP. 508-540 ملاحظہ ہو "عربوں کی فتح مصر" الفرڈ بٹلر، مصر کے اس گورنر کا نام بعض کتابوں میں الجدکیروس یا قیدرس بتایا گیا ہے۔ [2] النجوم الزاہرۃ، ابن تغری بردی ج ۱ ص ۳۴

اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب عمرو بن العاص رضؓ نے سنہ ۲۰ھ مطابق ۶۴۰ء میں فتح مصر کے بعد یہ شمار کرایا کہ جزیہ کے مستحق کون کون لوگ ہیں تو ان کی تعداد ساٹھ لاکھ سے زیادہ نکلی،[1] رومیوں کی تعداد اس میں ایک لاکھ تھی حضرت عمرو بن العاصؓ کے خط میں یہ بھی ہے

"میں نے ایک ایسا شہر فتح کیا ہے جس کی تعریف میں صرف اتنا لکھتا ہوں کہ مجھے وہاں چار ہزار بلند و مستحکم مقامات نظر آئے جہاں چار ہزار حمام تھے یہودیوں کی تعداد چالیس ہزار تھی، بادشاہوں کے لئے چار سو تفریح گاہیں تھیں۔"[2]

نجاشی

یہ ملک قدیم زمانہ سے حبشہ (ABYSSINIA) ایتھوپیا ETHIOPIA کہلاتا ہے یہ مشرقی افریقہ کا حصہ ہے، اور بحر احمر کے جنوب مغرب میں واقع ہے، جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس وقت اس کے حدود کیا تھے، اس کا تعین اس وقت آسان نہیں یہاں کی حکومت بھی دنیا کی قدیم ترین حکومتوں میں تھی، یہودی ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکۂ سبا حبشہ ہی میں رہتی تھیں، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد آج تک حبشہ کی حکمراں ہے، یہود نے ہیکل سلیمانی کی تباہی کے بعد یہاں آباد ہونا شروع کیا، عیسائیت کو چوتھی صدی عیسوی سے وہاں فروغ ہوا، اور جب یمن کے بادشاہ نے اپنے ملک میں عیسائیوں پر مظالم شروع کئے تو جسٹینین اول نے حبشہ کے بادشاہ

---

[1] دائرۃ معارف القرن العشرین از محمد فرید وجدی، دیکھئے مادہ "مصر" مصنف کو مختلف ملکوں میں اضافۂ آبادی کے تناسب کو دیکھتے ہوئے اس تعداد میں شبہ ہے اس لئے کہ مصر کے باشندوں کی تعداد اس وقت بھی چالیس ملین سے زائد نہیں۔ [2] حسن المحاضرۃ للسیوطی۔

سے عیسائیوں کی مدد کرنے اور ان مظالم کا سدِّ باب کرنے کا مطالبہ کیا، چنانچہ ۵۲۵ء میں اس نے یمن پر قبضہ کر لیا، اور یمن پر حبشی اقتدار تقریباً ۵۰ سال تک قائم رہا، اسی زمانہ میں حبشہ کی طرف سے یمن کے بادشاہ ابرہہ نے بیت اللہ پر فوج کشی کی اور واقعۂ فیل کا ظہور ہوا۔

حبشہ کا دار السلطنت "AXUM" تھا، یہ ایک آزاد اور خود مختار حکومت تھی، جو کسی غیر ملکی حکومت کے تابع نہ تھی، اور نہ کسی کو خراج اور ٹیکس وغیرہ دیتی تھی، بازنطینی شہنشاہی سے اس کا تعلق صرف مذہبی رشتۂ عیسائیت کی بنیاد پر تھا، اس کا ثبوت صاف طور پر اس سے ملتا ہے کہ بازنطینی فرمانروا جسٹینین نے چھٹی صدی کے وسط میں "JULIAN" نامی ایک شخص کو حبش کے دربار شاہی میں اپنا سفیر نامزد کیا۔[1]

"DE LACY O'LEARY" اپنی کتاب ARABIA BEFORE MOHAMMAD میں لکھتا ہے:

"حبشہ ۵۲۲ء سے لے کر ظہورِ اسلام تک مشرقی بحرِ احمر اور افریقہ کی ساری تجارت پر مسلسل قابض رہا، بلکہ شاید وہ ہندوستان کی تجارت پر بھی قابض تھا۔"[2]

حبشہ کے بادشاہ کو ہمیشہ نجاشی (NAGUSA NAGASHI) کہا جاتا تھا، البتہ اس نجاشی کے تعیّن اور نشاندہی میں مختلف اقوال اور روائتیں آئی ہیں جس کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نامۂ مبارک بھیجا تھا، اور اس کو اسلام کی دعوت دی تھی، اس سلسلے میں ہمارے سامنے دو مستقل بالذّات اور ایک دوسرے سے ممتاز شخصیتیں ہیں، پہلی وہ شخصیت ہے، جس کے عہد میں مکہ کے مسلمانوں نے ہجرت کی تھی، اور جن میں جعفر بن ابی طالب بھی تھے، یہ نبوت کے پانچویں سال کا

---

[1] A. H. M. JONES & ELIZABETH MONROE: A HISTORY OF ABYSSINIA (OXFORD. 1935) PP. 63.

[2] ARABIA BEFORE MOHAMMAD (LONDON, 1927) P. 120

واقعہ ہے، یہ بات بہت خلافِ قیاس ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ مکتوب روانہ فرمادیا ہو، اس لئے کہ اس وقت کے حالات اس کی بالکل اجازت نہیں دیتے تھے، اور اس کام کا وقت ابھی نہ آیا تھا، آپؐ نے ہجرت سے قبل کسی بادشاہ کو کوئی مکتوب روانہ فرمایا ہو اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ہو اس کا کوئی سُراغ ہمیں نہیں ملتا، زیادہ سے زیادہ جو بات ملتی ہے وہ یہ کہ اس موقع پر آپؐ نے اس سے ان مسلمانوں کو پناہ دینے کی فرمائش کی، جو قریش کے مظالم سے تنگ آچکے تھے، ابن ہشام اور دوسرے مصنفین نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ ایمان اس کے دل میں اتر چکا تھا، اور وہ اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ عیسیٰ ابن مریم علیہ الصلاۃ والسلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور اس کا حکم ہیں، جو اس نے مریمؑ پر القاء کیا تھا۔

جہاں تک اس نجاشی کا تعلق ہے جس کو آپؐ نے دعوتِ اسلام پر مشتمل اپنا مکتوب روانہ فرمایا، وہ حافظ ابن کثیر کے رجحان کے مطابق وہ نجاشی ہے، جو ان مسلم نجاشی کے بعد والی ہوا، جن سے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو سابقہ پڑا تھا، ابن کثیر کہتے ہیں "یہ بات اس وقت پیش آئی، جب آپؐ نے فتح مکہ سے قبل روئے زمین کے سلاطین کو خطوط لکھے، اور ان کو دینِ حق کی دعوت دی" ہمارے نزدیک قابلِ ترجیح قول یہی ہے کہ یہی وہ نجاشی تھا جس نے اسلام قبول کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس کی وفات کی خود اطلاع فرمائی، اور اس کے لئے دعائے مغفرت کی، اُمّی نے واقدی اور دوسرے سیرت نگاروں سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ وہی نجاشی ہے، جس کے لئے آپؐ نے دعائے مغفرت فرمائی" یہ واقعہ

تبوک سے واپسی پر رجب ۹ھ میں پیش آیا تھا۔

اس طرح ان مختلف روایات کی تصدیق ہو جاتی ہے اور قرائن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، واللہ اعلم۔

ان سلاطین نے نامہائے مبارک کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟

"ہرقل" "نجاشی" اور "مقوقس" ان تینوں نے مکاتیب نبوی کے ساتھ ادب کا معاملہ کیا، ان کی طرف سے ان کے جواب میں تواضع اور احترام تھا، نجاشی اور مقوقس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قاصدوں کا بہت اکرام کیا، مقوقس نے آپ کو ہدایا بھی بھیجے، ان میں دو باندیاں بھی تھیں جن میں ایک کا نام ماریہؓ تھا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم ان ہی کے بطن سے تھے۔

جہاں تک کسریٰ پرویز کا تعلق ہے اس نے نامۂ مبارک سنتے ہی چاک کر ڈالا، اور بولا "میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے"[2]، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا: "اللہ اس کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے"[3]۔

---

[1] حاشیۂ صحیح مسلم طبع مصر ج ۵ ص ۱۶۶ [2] نظامی گنجوی نے جو ایران کے با ایمان مسلمان شاعر تھے شاہ ایران کی اس گستاخی کو اپنے اس شعر میں بڑی لطافت کے ساتھ ادا کیا ہے، وہ کہتے ہیں:-

در یداں نامۂ گردن شکن را   نہ نامہ بلکہ نام خویشتن را

[3] صحیح بخاری باب "کتاب النبی صلے اللہ علیہ وسلم الیٰ کسریٰ و قیصر" کسریٰ کے نام کا فرمان مبارک جو دستیاب ہوا ہے، اس میں چاک کا نشان اب بھی موجود ہے جو درمیان میں سے اوپر سے نیچے کی طرف دائیں طرف جھکتا ہوا ہے، اور اس کو سی دیا گیا ہے، یہ فرمان مبارک شیشہ میں فریم کیا ہوا حکومت لبنان کے ایک سابق وزیر ہنری فرعون کے پاس محفوظ ہے، (مقالہ ڈاکٹر عز الدین ابراہیم پیش کردہ سیرت کانفرنس، دوحہ، ربیع الاول ۱۴۰۰ھ بحوالہ مقالہ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد شامل جریدہ "الحیاۃ")

کسریٰ نے یمن کے حاکم باذان کو اس کا حکم دیا کہ آپؐ کو حاضر کیا جائے، اس نے بابویہ کو آپؐ کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ شہنشاہ کسریٰ نے باذان کو ہدایت کی ہے کہ کسی کو بھیج کر آپ کو وہاں حاضر کیا جائے انھوں نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ آپؐ میرے ساتھ چلیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو یہ اطلاع دی کہ "اللہ تعالیٰ نے کسریٰ پر اس کے بیٹے شیرویہ کو مسلّط کر دیا ہے جس نے اس کو قتل کر دیا ہے"[1] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو خبر دی تھی وہ حرف بحرف صحیح نکلی کسریٰ کے تخت پر اس کا لڑکا "قباذ" جس کا لقب "شیرویہ" تھا، قابض ہوا کسریٰ اسی کے اشارے پر ۶۲۸ء میں قتل کیا گیا، اس کی موت کے بعد ملک کا شیرازہ منتشر ہو گیا، اور حکمراں خاندان کے ہاتھ سلطنت ایک کھلونا بن گئی، شیرویہ بھی چھ ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا، اور اس کے تخت پر چار[2] سال کے اندر یکے بعد دیگرے دس بادشاہ متمکّن ہوئے سلطنت کی چولیں ہل گئیں آخر میں یزدگرد پرسب کا اتفاق ہوا، اور اس سلطنت کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا، یہ ساسانی خاندان کا آخری فرمانروا تھا، اور اسی کو اسلامی افواج کا سامنا کرنا پڑا تھا جنھوں نے بالآخر سلطنت آل ساسان کی قسمت پر مہر لگا دی اور اس سلطنت کا جس کا چار سو سال تک دنیا میں ڈنکا بجتا رہا چراغ گل ہو گیا، یہ واقعہ ۶۳۷ء میں پیش آیا اور اس طرح یہ پیشین گوئی آٹھ سال کے اندر اندر پوری ہو گئی، اور آپؐ کی پیشین گوئی کا دوسرا جزو بھی پورا ہوا کہ "اذا هلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعده"[3]

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایران کا وارث و حاکم بنا دیا، اہلِ ایران کو اسلام کی ہدایت دی،

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۹۱   [2] ایران بعہد ساسانیان تلخیص از باب نہم و باب دہم "ساسانی سلطنت کا دورِ آخر" [3] یہ اس روایت کے الفاظ ہیں جو مسلم نے ابن عیینہ سے نیز امام شافعی نے اپنی سند سے بیان کی ہے۔ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۳

ان میں علم و دین کے بڑے بڑے امام اور اسلام کی غیر معمولی شخصیتیں پیدا ہوئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا بالکل صحیح ثابت ہوا کہ :۔

لو کان العلم بالثریا لتناوله	اگر علم ثریا پر بھی ہوگا تو کچھ ایرانی
اناس من ابناء فارس[1]	نژاد لوگ حاصل کر کے رہیں گے۔

ہرقل اور ابوسفیان کا مکالمہ

ہرقل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے اور صحیح حقائق سے آگاہ ہونے کی کوشش کی اور کسی ایسے شخص کی جستجو کی جو آپ کے بارے میں صحیح رپورٹ دے سکے حسن اتفاق سے ابوسفیان اس وقت غزہ میں موجود تھے، اور تجارت کی غرض سے آئے ہوئے تھے ان کو شاہی دربار میں لایا گیا، بادشاہ کے سوالات ایک ایسے دانشمند، واقف اور تجربہ کار شخص کے سوالات تھے جو تاریخِ مذاہب، انبیاء کے خصائص اور سیرت، ان کی قوموں کا ان سے معاملہ اللہ تعالیٰ کی سنّت سے بخوبی واقف ہو ابوسفیان نے بھی قدیم عربوں کی طرح اس شرم سے کہ لوگ ان کو غلط بیانی کرنے والا نہ کہیں، ان سوالات کا بالکل صحیح صحیح جواب دیا۔

یہ مکالمہ درج ذیل ہے :۔

ہرقل : ان کا نسب کیسا ہے ؟

ابوسفیان : وہ ہم میں عالی نسب سمجھے جاتے ہیں۔

ہرقل : کیا جو بات وہ کہتے ہیں ان سے پہلے بھی کسی نے کہی تھی۔

---

[1] مسند امام احمد ج ۲ ص ۳۹۹

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: اس خاندان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: کیا صاحبِ اثر لوگوں نے ان کا اتباع کیا ہے یا کمزوروں نے؟

ابوسفیان: کمزور لوگوں نے۔

ہرقل: ان کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان: بڑھتے جاتے ہیں۔

ہرقل: کیا کوئی ان کے دین میں داخل ہونے کے بعد دین کو ناپسند کر کے پھر بھی جاتا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: کیا ان کے اس دعوے سے پہلے بھی تم نے کبھی ان پر جھوٹ کا تجربہ کیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

ہرقل: کیا وہ عہد و قرار کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں؟

ابوسفیان: ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب جو نیا معاہدۂ صلح ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتے ہیں یا نہیں؟

ہرقل: تم لوگوں نے ان سے کبھی جنگ بھی کی؟

ابوسفیان: ہاں!

ہرقل: نتیجۂ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان: جنگ کا پانسہ ہمارے اور اُن کے درمیان پلٹتا رہتا ہے کبھی ہم غالب

آتے ہیں، کبھی وہ۔

ہرقل: وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟

ابوسفیان: وہ کہتے ہیں کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلہ رحمی کرو۔

ہرقل نے مترجم سے کہا کہ ان سے کہو کہ ہم نے تم سے ان کے نسب کی بابت دریافت کیا تو تم نے بتایا کہ وہ تم میں شریف النسب ہیں، پیغمبر ہمیشہ اچھے ہی خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں ـــــ میں نے تم سے دریافت کیا کہ کیا اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوّت کا دعویٰ کیا تھا، تو تم نے کہا کہ نہیں، اگر ان سے پہلے کسی نے یہ دعویٰ کیا ہوتا تو میں کہتا کہ وہ اسی کی نقل کر رہے ہیں ـــــ میں نے تم سے پوچھا کہ کیا ان کے خاندان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے تم نے کہا نہیں، اگر کوئی بادشاہ گذرا ہوتا تو میں کہتا کہ اپنے خاندان کی بادشاہت کے طالب ہیں ـــــ میں نے دریافت کیا کہ کیا تم ان کو اس دعوے سے پہلے بھی کبھی جھوٹا کہتے تھے تم نے کہا نہیں، میں جانتا ہوں کہ یہ ناممکن تھا کہ وہ لوگوں سے تو جھوٹ نہ بولیں اور اللہ پر جھوٹ باندھیں ـــــ میں نے تم سے دریافت کیا کہ شرفاء و بااثر لوگ اُن کے متبع ہیں یا غریب اور کمزور، تم نے کہا کمزوروں نے ہی اُن کی پیروی کی ہے، پیغمبروں کے (ابتدائی) پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں ـــــ میں نے تم سے دریافت کیا کہ اُن کے پیرو بڑھتے جاتے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں تم نے کہا کہ بڑھتے جاتے ہیں، ایمان کا یہی معاملہ ہے (کہ بڑھتا جاتا ہے) یہاں تک کہ کمال کو پہونچ جائے ـــــ میں نے تم سے پوچھا کہ کوئی ان کے دین سے ناراض ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے تم نے کہا نہیں، ایمان کا حال یہی ہوتا ہے جب دلوں کو اس کی چاشنی حاصل

ہو جاتی ہے تو وہ نکلتا نہیں ہے ـــــ میں نے تم سے پوچھا کہ کیا وہ عہد و پیمان کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں، تم نے کہا نہیں، پیغمبر اسی طرح خلاف ورزی نہیں کرتے، اور میں نے تم سے دریافت کیا کہ وہ کیا سکھاتے ہیں، تم نے بتایا کہ وہ تم کو یہ سکھاتے ہیں کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، اور تم کو بتوں کی پوجا سے روکتے ہیں، نماز، سچائی، پاکدامنی کی تعلیم دیتے ہیں، اگر تمہارا کہا سچ ہے تو عنقریب اس وقت جہاں میرے قدم ہیں، وہاں تک ان کا قبضہ ہو جائے گا، مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہو گا، اگر میں وہاں جا سکتا تو ضرور ان کی ملاقات کے لئے جاتا، اور اگر میں ان کے پاس ہوتا تو ان کے پاؤں دھوتا۔[۱]

ہرقل نے ارکان سلطنت اور اعیان قوم کو محل میں طلب کیا، اور دروازے بند کروا دیئے، پھر حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر اس نے کہا: اے اہل روم! کیا تم خیر و فلاح چاہتے ہو؟ اور چاہتے ہو کہ تمہارا ملک باقی رہے اگر ایسا ہے تو تم اس نبی کے ہاتھ پر ایمان لے آؤ، حاضرین تیزی سے دروازوں کی طرف بھاگے تو ان کو بند پایا، جب ہرقل نے اُن کی یہ بے رخی دیکھی، اور اُن کے ایمان لانے سے مایوس ہو گیا تو اس نے حکم دیا کہ ان کو واپس لاؤ، اور کہا کہ ابھی میں نے جو بات کہی تھی، وہ اس لئے کہی کہ اپنے دین پر تمہاری مضبوطی کا امتحان لوں، میں نے یہ دیکھ لیا تو سب نے اُس کے سامنے پیشانی ٹیک دی، اور اُس سے خوش ہو گئے۔[۲]

غرض ہرقل نے سعادت و نجات کا یہ زریں موقع کھو دیا اور اس ابدی دولت پر فانی سلطنت کو ترجیح دی، جس کا انجام یہ ہوا کہ عہد فاروقی میں اس کو اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔[۳]

۱-۲-۳ الجامع الصحیح للبخاری، ج ۱، باب "کیف کان بدأ الوحی إلی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم"۔

اریسی کون تھے؟

"اریسین" یا "یریسین" کا لفظ روایات کے اختلاف کے باوجود صرف اس خط میں آیا ہے، جو ہرقل کے نام لکھا گیا، اس کے علاوہ جتنے مکاتیب سلاطین کو آپؐ نے روانہ فرمائے کسی میں یہ لفظ ہمیں نہیں ملتا، علماء حدیث اور علماء لغت کا اس لفظ کے اصلی مفہوم کے بارے میں خاصا اختلاف ہے، مشہور قول یہ ہے کہ "اریسین" "اریسی" کی جمع ہے، اور وہ خدمتگاروں، شاگرد پیشہ اور کاشتکاروں کے لئے آتا ہے۔[۱]

ابن منظور نے بھی "لسان العرب" میں اس کو کاشتکاروں کے ہم معنی قرار دیا ہے، اور اس کو امام لغت ثعلب سے نقل کیا ہے، ابن الاعرابی کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے بھی اس مادہ کے یہی معنی لکھے ہیں، اور ابو عُبَیدہ کا قول نقل کیا ہے کہ "میرے نزدیک اریس سردار اور بڑے کو کہتے ہیں، جس کے حکم کی تعمیل کی جائے اور جب وہ اطاعت چاہے تو اس کی اطاعت کی جائے۔"[۲]

اس موقع پر ایک پڑھا لکھا آدمی جس کی ان ملکوں کے خصائص و حالات پر نظر بھی، یہ سوال کر سکتا ہے کہ اگر اریسین سے مراد کاشتکار تھے تو شہنشاہ ایران کسریٰ پرویز اس کا زیادہ مستحق تھا کہ اس کو ان کے بارے میں اس کی ذمہ داری سے آگاہ کیا جاتا اور یہ لفظ اس خط میں آتا جو کسریٰ کے نام بھیجا گیا، اس لئے کہ

---

[۱] دیکھئے "شرح مسلم للنووی" اور "مجمع بحار الانوار" از علامہ محمد طاہر پٹنی۔

[۲] دیکھئے "لسان العرب" مادہ "ارس"۔

کاشتکاروں کا طبقہ سلطنتِ ساسانی میں بازنطینی سلطنت کے مقابلہ میں زیادہ وسیع اور نمایاں تھا، اور ایران کی قومی آمدنی اور ذرائع معیشت کا زیادہ تر انحصار زراعت پر تھا، جیسا کہ ازہری نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اور ابن منظور نے ان کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:۔

"سوادِ عراق کے لوگ جو کسریٰ کے دین پر تھے، زراعت پیشہ اور کاشتکار تھے، اہلِ روم ساز و سامان کی تیاری اور صناعی کا پیشہ کرتے تھے، اور اس لئے وہ مجوس کو اریسین کہتے تھے، اریس کی طرف نسبت کرتے ہوئے جس کے معنی کاشتکار کے ہیں، عرب بھی ایرانیوں کو "فلاحین" کاشتکار کے لقب سے یاد کرتے تھے۔"[1]

ان سب وجوہ سے ہمارے نزدیک ترجیح اس قول کو ہے کہ اریسیین سے مراد اریوس مصری (ARIUS, 280-336) کے پیرو ہیں، جو ایک ایسے مستقل مسیحی فرقہ کا بانی تھا، جس نے مسیحی عقائد اور اصلاح کے شعبہ میں ایک خاص کردار ادا کیا، اس فرقے نے بازنطینی سلطنت اور مسیحی کلیسا کو عرصۂ دراز تک پریشان رکھا تھا "اریوس" وہ شخص ہے، جس نے توحید کا نعرہ بلند کیا اور خالق و مخلوق (عیسائیوں کے الفاظ میں) "باپ بیٹے" کے درمیان فرق کرنے کی دعوت دی، اس نے اس موضوع پر بحث و مباحثہ کا دروازہ کھولدیا اور عیسائی معاشرہ میں صدیوں تک یہی موضوع رہا، اس کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ خدائے واحد کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ زمین پر ظاہر ہو، اس لئے اس نے حضرت مسیحؑ کو قوت اور

---

[1] ایضاً

کلامِ الٰہی سے بھر دیا خدا کے بنیادی صفات میں وحدانیت اور ابدیت ہے اور اس نے اپنی ذات سے براہ راست کسی کو پیدا نہیں کیا (جنا نہیں) بیٹا خود "خدا" نہیں ہے بلکہ امرِ رب کی حکمت کا ایک مظہر ہے اور اس کی الوہیت اضافی ہے نہ کہ مطلق[۱]۔

جیمس میکینن (JAMES-MACKINON) اپنی کتاب "مسیح سے قسطنطین تک" میں لکھتا ہے :-

"اریوس" کا اصرار تھا کہ تنہا اللہ کی ذات قدیم ہے ازلی ابدی ہے اس کا کوئی شریک نہیں، وہی ہے جو بیٹے کو عدم سے وجود میں لایا، اس لئے بیٹا ازلی نہیں ہے، اللہ ہمیشہ سے باپ نہیں ہے، چنانچہ ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ بیٹے کا وجود ہی نہ تھا، بیٹا اپنی ایک مستقل حقیقت رکھتا ہے، جس میں اللہ اس کا شریک نہیں، وہ تبدیلیوں اور انقلابات سے متأثر بھی ہوتا ہے اور وہ صحیح معنی میں خدا کہلانے کا مستحق نہیں، ہاں اس کو کامل قرار دیا جا سکتا ہے لیکن وہ بہرحال ایک کامل مخلوق ہے[۲]"۔

دوسری طرف اسکندریہ کا کلیسا چوتھی صدی عیسوی میں حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا مطلق طریقہ سے قائل تھا، اور اس کے نزدیک خالق و مخلوق اور باپ بیٹے میں کوئی فرق نہ تھی۔ اس کو مصری کلیسا کے لاٹ پادری الیگزنڈر (ALEXANDER) نے ۳۲۱ء میں اسکندریہ کے کلیسا سے بے دخل کر دیا، "اریوس" شہر چھوڑ کر چلا گیا، لیکن اس کی بے دخلی

۱ه تفصیل کے لئے دیکھئے، انسائیکلوپیڈیا مذاہب و اخلاق جلد ۱ مقالہ (ARIANISM) ص ۷۷۶

۲ه "FROM CHRIST TO CONSTANTINE"— (LONDON, 1936)

سے یہ جھگڑا ختم نہیں ہوا شہنشاہ قسطنطین نے اس نزاع کو ختم کرانے کی کوشش کی، لیکن اس کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی ۳۲۵ھ میں اس نے نیقیہ NICAEA میں ایک کانفرنس بلائی جس میں دو ہزار تیس[۲۰۳۰] پادری شریک ہوئے شہنشاہ کا رجحان الوہیت مسیح کی طرف تھا، اس لئے اس نے اریوس کے خلاف فیصلہ دیا، اس کے باوجود نمائندوں کی اکثریت اریوس کی مؤید تھی اور صرف تین سو اٹھارہ[۳۱۸] پادری بادشاہ کے ساتھ تھے تاہم اس نے اریوس کو الیریا (ILLYRIA) میں جلاوطن کر دیا، اور اس کی سب تحریریں جلا دی گئیں جس کے پاس اس کی کوئی تحریر ملتی اس کو سخت سزا دی جاتی لیکن ان کوششوں سے اریوس کی اہمیت اور لوگوں میں اس کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت ختم نہ کی جا سکی۔

آخر کار قسطنطین ہی کو اپنا رویہ نرم کرنا پڑا، اور اس نے اس کے عقیدہ سے پابندی اٹھالی، اپنے سب سے بڑے حریف و رقیب الیکزنڈر کی موت اور اس کے جانشین ATHANASIUS کی جلاوطنی کے بعد اریوس اسکندریہ پھر واپس آ گیا قریب تھا کہ قسطنطین اس کو مصری کلیسا کا سربراہ مقرر کر دے اور اس کا مذہب قبول کر لے لیکن موت نے اس کا موقع نہیں دیا۔[۱]

"ڈریپر" نے اپنی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" میں لکھا ہے کہ تیرہ[۱۳] مسیحی مجالس نے چوتھی صدی عیسوی میں اریوس کے خلاف فیصلہ دیا تھا، پندرہ[۱۵] مسیحی مجالس نے اس کی تائید کی تھی، سترہ[۱۷] مسیحی مجالس نے جو رائے ظاہر کی وہ اس کی رائے کے بہت قریب تھی، اس طرح ۴۵ مسیحی مجالس اس مسئلہ پر غور و فیصلہ کرنے کے لئے منعقد کی گئیں۔

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا مذہب و اخلاق مقالہ "ARIANISM"

واقعہ یہ ہے کہ مسیحی دنیا میں چوتھی صدی سے قبل عقیدۂ تثلیث کا عام رواج نہیں ملتا "نیو کیتھولک انسائیکلوپیڈیا" میں آتا ہے کہ :۔

"عقیدۂ تثلیث کی تشکیلِ جدید اور اس کے راز سے پردہ صرف انیسویں صدی کے نصفِ ثانی میں ہی اٹھ سکا مطلق عقیدۂ توحید پر اگر کوئی گفتگو کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسیحی تاریخ کے آغاز سے چوتھی صدی کی آخری چوتھائی تک منتقل ہو جاتا ہے یہ کہ ایک معبود کے تین مظاہر ہیں، مسیحی دنیا میں یہ نظریہ اسی مخصوص تاریخی وقفہ میں پھیلا تھا۔"[1]

یہ عقیدہ ودعوت الوہیتِ مسیح کی کھلی ہوئی دعوت کے ساتھ ہمیشہ برسرپیکار رہی، کبھی اس کا پلڑا بھاری ہوتا کبھی اس کا، بازنطینی مملکت کی مشرقی ریاستوں میں عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد اریوس کے عقیدہ کی حامل تھی، یہاں تک کہ تھیوڈوسس THEOSODIUS THE GREAT نے قسطنطنیہ میں عیسائی کانفرنس طلب کی، جس نے الوہیتِ مسیح اور ان کے خدا کا بیٹا ہونے کے عقیدہ کو باقاعدہ منظور کرلیا، اور اس کے اعلان کے بعد اریوس عقیدہ کی دعوت ختم ہوگئی، اور یہ تحریک نظروں سے اوجھل ہوگئی، تاہم عیسائیوں کی ایک جماعت اس کے بعد بھی اس سے وابستہ رہی، اور یہ لوگ "فرقۂ اریسیہ" یا "اریسیین" کے نام سے مشہور ہوئے۔

اس لئے قابلِ ترجیح اور قرینِ قیاس یہی قول ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس جملہ سے "فان تولیت فان علیك اثم الأریسیین" سے مرادیہی ہے اس لئے کہ اس وقت کی مسیحی دنیا میں جس کی زمامِ قیادت عظیم بازنطینی مملکت کے ہاتھ میں تھی،

---

[1] "THE NEW CATHOLIC ENCYCLOPAEDIA" مقالہ "تثلیث مقدس" ج ۱۴ ص ۲۹۵

اور جس کا سربراہ ہرقل تھا، یہی فرقہ نسبتاً توحید کا حامل اور اس پر اب تک قائم تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ عصر اول کے بعض جلیل القدر علماء اسلام نے بھی اسی رجحان کا اظہار کیا ہے امام طحاوی (م ۳۲۱ھ) اپنی کتاب "مشکل الآثار" میں لکھتے ہیں:۔

"بعض حقائق آگاہ علماء نے بیان کیا ہے کہ ہرقل کی جماعت میں ایک فرقہ تھا جس کو "اریسیہ" کہتے تھے، یہ توحید الٰہ اور حضرت مسیحؑ کی عبدیت کا قائل تھا، نصاریٰ مسیحؑ کی ربوبیت کے بارے میں جو کچھ کہتے تھے، یہ فرقہ اس کو تسلیم نہیں کرتا تھا، یہ دینِ مسیحؑ پر قائم تھا، اور انجیل میں جو کچھ تھا، اس پر عمل پیرا تھا، نصاریٰ اس سے آگے بڑھ کر جو کچھ کہتے تھے، وہ اس پر ایمان نہ رکھتا تھا اگر یہ بات صحیح ہے تو اس فرقہ کو "اریسیون" رفع کے ساتھ اور "اریسین" نصب اور جر کے ساتھ کہنا دونوں جائز ہے، جیسا کہ علماء حدیث کا خیال ہے[۵۱]۔"

اسی کے قریب قریب رائے امام نووی شارح مسلم (م ۶۷۶ھ) نے بھی ظاہر کی ہے، وہ کہتے ہیں:۔

"دوسرا قول یہ ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ ہیں، جو عبداللہ بن اریس[۵۲] کے ماننے والوں میں تھے، جس کی طرف اروسیت کو منسوب کیا جاتا ہے[۵۳]۔"

مکاتیب بنام اُمرائے عرب

امرائے عرب میں آپؐ نے منذر بن ساوی (حاکم بحرین[۵۴]) جیفر بن الجلندا،

---

۵۱ مشکل الآثار ج ۲ ص ۳۹۹ ۵۲ یہ امام نووی کی فروگذاشت معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ ظہور اسلام سے تین سو برس قبل اس کا وجود تھا، اور اس کا نام بھی کوئی اسلامی عربی نام نہ تھا۔

۵۳ شرح صحیح مسلم للنووی ج ۲ ص ۹۸ ۵۴ بحرین نجد کے اس خط کو کہتے ہیں جس کا نام اب "الاحساء" ہے، حضرت ابو عبیدہ کی قیادت میں جو لشکر بھیجا گیا تھا، اور جس میں (باقی ص ۴۰۳ پر)

عبد بن الجلندا[1] ازدی (امرائے عمان) اور ہوذہ بن علی[2] (حاکم یمامہ) اور حارث بن شمر[3] الغسانی کے نام مکاتیب ارسال کئے[4]، منذر بن ساوی نیز جلندا کے دونوں بیٹوں جیفر اور عبد نے اسلام قبول کر لیا، ہوذہ بن علی حاکم یمامہ نے رسول اللہ صلے اللہ

(باقی ص۴۰۲ کا) عظیم مچھلی کے ہاتھ آنے کا واقعہ پیش آیا، وہ اسی سمت روانہ کیا گیا تھا، اور احادیث صحیحہ میں اس موقع پر "البحرین" ہی کا لفظ آتا ہے، یہیں سے بڑی مقدار میں مال غنیمت بھی آیا تھا، جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے، اب یہ نام یہاں سے منتقل ہو کر جزیرۃ العرب کے اس حصہ کی طرف منتقل ہو گیا، جو خلیج کی ریاستوں میں ایک ریاست ہے جو بحرین کے نام سے مشہور ہے، اس کے زیادہ تر باشندے بنی عبد القیس، بنی بکر بن وائل اور تمیم کے قبائل سے تھے، ان مکتوبات کی تحریر کے وقت وہاں کا والی اور حاکم منذر بن ساوی تھا، جو بنی تمیم کے قبیلہ کا فرد تھا، ان مکتوبات کے متن کے لئے جو ملوک و امرائے عرب اور رؤسائے قبائل کو تحریر کئے گئے اور ان کے نامہ بروں اور مکتوب الیہم کے بارے میں معلومات کے لئے ملاحظہ ہو کتاب: "إعلامُ السّائلین عن کتب سید المرسلین" (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تالیف امام محمد بن طولون دمشقی (۸۸۰-۹۵۳ھ) طبع مؤسسۃ الرسالۃ۔ [1] مؤرخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ الجلندا کسی خاص شخص کا نام نہیں تھا، وہ ایک لقب تھا جس کے معنی اہل عمان کی زبان میں سردار یا مذہبی پیشوا کے تھے، ان میں اول الذکر بادشاہ عمر میں اپنے بھائی سے بڑا تھا (ملاحظہ ہو "نہایۃ الادب" و "تاریخ العرب قبل الاسلام") [2] (ہوذہ بن علی الحنفی) یمامہ کا بادشاہ تھا اور دین عیسائیت پر تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سلیط بن عمرو کو اسی کے پاس بھیجا تھا، یمامہ کے حدود اس وقت مشرق میں بحرین سے ملتے تھے، اور مغرب میں حجاز سے جا ملتے تھے، یمامہ کے مقامات میں (منفوحہ) بھی ہے، جو اعشیٰ جاہلی شاعر کا وطن ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بنو حنیفہ وہاں کے نمایاں قبائل میں تھے، انھیں میں مسیلمہ بن حبیب (باقی ص۴۰۴ پر)

علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اس کو اقتدار میں شریک کیا جائے، آپ نے انکار فرمایا اور اس کے بعد جلد اس کی موت ہوگئی۔[1]

غزوہ بنی لحیان اور غزوۂ ذی قرد

صلح حدیبیہ (سنہ ۶ھ) اور غزوۂ خیبر کے درمیان، غزوۂ بنی لحیان اور غزوۂ ذی قرد واقع ہوئے[2] جن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے، اور ابن مکتوم کو مدینہ کا والی مقرر کیا، پہلے غزوہ کا سبب واقعہ رجیع کے افراد خُبیب بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے خون کا مطالبہ وجواب تھا، اور دوسرے کا سبب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جنگل میں چرنے والی اونٹنیوں پر مشرکین کی غارتگری، بنی غفار کے ایک آدمی کا قتل اور ان کی بیوی کا اغوا تھا۔[3]

(باقی ص ۴۰۳ کا) پیدا ہوا تھا جس کا لقب دعوائے نبوت کی وجہ سے کذّاب پڑ گیا۔ ۳؎ تاریخ طبری ج ۳ ص ۸۴-۸۵

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۵۸ [2] صحیح مسلم میں سلمۃ بن الاکوع کی روایت جسے ابن حجر نے فتح الباری میں ترجیح دی ہے، اصحاب سیر متفق ہیں کہ غزوۂ ذی قرد صلح حدیبیہ سے پہلے ہوا ہے۔

[3] سیرت ابن ہشام ق ۲ ص ۲۷۹-۲۸۹

غزوۂ خیبر
(۷ھ)

اللہ کا انعام

اللہ تعالیٰ نے حدیبیہ میں بیعتِ رضوان کے شرکاء کو جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی تھی، اور اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارشاد کو اپنی خواہشِ نفس، اپنی رائے اور فہم پر مقدم رکھا تھا، فتحِ قریب اور مالِ کثیر کی بشارت دی اور ارشاد ہوا:۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ وَاَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ۝ وَّمَغَانِمَ کَثِیْرَۃً یَّاْخُذُوْنَھَا ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ۝ (سورۃ الفتح ۱۸-۱۹)

(اے پیغمبر) جب مؤمن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو (صدق و خلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا، ان پر تسلی نازل فرمائی انھیں جلد فتح عنایت کی، اور بہت سی غنیمتیں جو انھوں نے حاصل کیں اور خدا غالب حکمت والا ہے۔

ان فتوحات کا مقدمہ اور پیش خیمہ غزوۂ خیبر تھا، "خیبر" ایک یہودی نوآبادی تھی جس میں بڑے مستحکم قلعے تھے[1]، یہ یہود کا جنگی مستقر اور جزیرۃ العرب میں ان کا آخری قلعہ تھا، یہ یہودی مسلمانوں کے خلاف برابر ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے، اور اس بات کو کسی وقت نہ بھولتے کہ ان کے دوسرے بھائیوں کے ساتھ کیا ہوا ہے، وہی سب کچھ ان کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے، وہ قبیلۂ غطفان کے ساتھ مل کر مدینہ طیبہ پر حملہ کی سازش کر رہے تھے[2]، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ارادہ فرمالیا کہ اب ان سے اور ان کی سازشوں سے نجات حاصل کرلی جائے، اور اس محاذ کی طرف سے

---

[1] ان قلعوں میں ناعم، قموص، اور حصن الشق، حصن نطاۃ، حصن السلام، حصن الوطیح، حصن الکتیبہ زیادہ مشہور تھے، یعقوبی نے لکھا ہے کہ خیبر میں پچیس ہزار ۲۵۰۰۰ جنگجو موجود تھے (ج ۲ ص ۵۶ منقول از کتاب "صحابہ و تابعین" از مولوی مجیب اللہ ندوی، ناشر دار المصنفین اعظم گڑھ)

[2] مشہور انگریز مستشرق W. MONTGOMERY WATT اپنی کتاب "MOHAMMAD PROPHET AND STATESMAN" (محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) بحیثیت پیغمبر اور سیاستداں) میں لکھتا ہے کہ "خیبر کے یہود اور خاص طور پر قبیلہ بنی النضیر کے وہ سردار جن کو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے مدینہ سے جلاوطن کر دیا تھا محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے خلاف اپنے دل میں سخت کینہ رکھتے تھے، یہی لوگ تھے جنھوں نے عرب کے دوسرے قبائل کو اپنی دولت کے ذریعہ اکسا کر مسلمانوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور یہی وہ بنیادی سبب تھا جس کی وجہ سے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے خیبر پر لشکر کشی کی" ص ۱۸۹ (لندن ۱۹۶۱ء) اس غزوہ کا مقصد صرف یہودیوں کی اس قوت کا توڑنا ہی نہیں تھا جو خیبر میں مجتمع ہو گئی تھی بلکہ حجاز و نجد کے درمیان شمال اور جزیرۃ العرب کے وسط کے ایک بڑے طاقتور قبیلۂ غطفان کی طرف سے بھی اطمینان حاصل کرنا تھا جو عربی قبائل کا ایک نہایت جنگجو اور طاقتور مجموعہ تھا، اس کی طرف سے اطمینان کئے بغیر مکہ کی طرف باطمینان فوج کشی ممکن نہ تھی۔

اطمینان اور یکسوئی حاصل ہو، یہ علاقہ مدینہ کے شمال مشرق میں ۸۰ میل کی مسافت پر واقع تھا۔

لشکرِ اسلام نبی کی قیادت میں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حُدَیبیہ سے نکل کر مدینہ میں ذی الحجہ کا پورا مہینہ اور محرم کا کچھ حصہ قیام فرمایا اور اس کے بعد خیبر کی طرف رخ کیا۔

عامر بن الاکوع رضی اللہ عنہ لشکر کے ساتھ تھے، اور یہ رجز یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے:

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا　　ولا تصدّقنا ولا صلّینا

خدایا اگر تو ہدایت نہ کرتا تو نہ ہم ہدایت پاتے نہ خیرات دیتے نہ روزہ رکھتے

إنّا اذا قوم بغوا علینا　　وإن أرادوا فتنة أبینا

ہم وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی قوم ہم پر یورش کرتی ہے اور آمادۂ فساد ہوتی ہے تو ہم اس سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔

فأنزلن سکینة علینا　　وثبّتِ الأقدام إن لاقینا[۱]

تو ہمارے اوپر سکینت کا نزول فرما اور مقابلہ کے وقت ہمارے قدموں کو جمائے رکھ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اس ایمانی لشکر کو لے کر یہاں تشریف لائے، اُن کی تعداد ایک ہزار چار سو تھی، اور اُن کے ساتھ دو سو گھوڑے تھے، آپ نے اس کو اس میں شرکت کی اجازت نہ دی جو حُدیبیہ کے موقع پر پیچھے رہا تھا، ان صحابیات کی تعداد جو مریضوں کے علاج و معالجہ، زخمیوں کی مرہم پٹی اور پانی و غذا کے انتظام

---

[۱] سیرت ابن کثیر ج ۳ ص ۳۴۴-۳۴۵ و صحیح مسلم باب "غزوۂ خیبر" بعض الفاظ اور اشعار کے اختلاف کے ساتھ۔

کی ذمہ دار تھیں، مبنی[2] تھی۔

آپؐ نے رجیع کے مقام پر جو یہود اور قبیلۂ غطفان کے درمیان واقع تھا لشکر کو پڑاؤ کا حکم دیا، مقصد یہ تھا کہ ان کے اور اہلِ خیبر کے درمیان سلسلۂ رسد و مواصلات ختم ہو جائے اس لئے کہ وہ ان سے ملے ہوئے اور ان کے حامی تھے، نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور یہ لوگ ان کی حمایت اور امداد نہ کر سکے، اپنے گھر بار اور کاروبار میں لگے رہے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اہلِ خیبر کے لئے انھوں نے راستہ صاف کر دیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لشکر کے لئے غذا فراہم کرنے کا حکم دیا تو صرف ستّو حاصل کئے جا سکے، چنانچہ اسی پر اکتفا کیا گیا[1]، جب آپؐ خیبر کے سامنے تشریف لائے تو آپؐ نے اللہ تعالےٰ سے دعا فرمائی فتح خیبر کا سوال کیا، اور اس جگہ کے شر سے اور یہاں کے لوگوں کے شر سے پناہ مانگی، آپؐ کی عادت مبارک تھی کہ جب آپؐ کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو رات کو حملہ نہ کرتے، بلکہ صبح تک انتظار کرتے، اگر اذان کی آواز آپؐ کے کانوں میں آتی تو آپؐ توقّف فرماتے اور حملہ نہ کرتے، اسی طرح آپؐ نے یہاں بھی رات گذاری، صبح ہوئی تو اذان کی آواز نہ سنائی دی، یہ دیکھ کر آپؐ نے حملہ کی نیت سے پیش قدمی کی، راستہ میں خیبر کے کسان مزدور اپنے پھاوڑے اور چھابے لئے نظر آئے، جب انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور لشکر کو دیکھا تو انھوں نے نعرہ لگایا کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور لشکر آ گیا، اور راہ فرار اختیار کی، آپؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا "اللہُ اکبر، خربت خیبر" اللہ کی شان خیبر برباد ہوا "انا اذا نزلنا بساحۃ قوم فساء صباح المنذرین" ہم جب کسی قوم پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ان کی صبح بُری ہوتی ہے،

---

[1] ابن کثیر ج ۲ ص ۳۴۵-۳۴۶ نیز صحیح بخاری باب غزوۂ خیبر باختصار۔

(ان کی شامت آجاتی ہے) جنھیں پہلے ہی ڈرایا اور آگاہ کیا جا چکا ہے۔[۱]

مظفر و منصور قائد

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے خیبر کے قلعوں کی طرف توجہ کی او ایک ایک کر کے ان قلعوں کو فتح کرنا شروع کیا، ان قلعوں میں ایک قلعہ ایسا تھا، جو نامور یہودی شہسوار مرحب کا تخت گاہ تھا،[۲] اس کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے سر کیا، اس کا واقعہ یہ ہے کہ یہ قلعہ مسلمانوں کے لئے بہت سخت و دشوار گذار ثابت ہو رہا تھا، اور ان کا قابو اس پر نہیں چل پا رہا تھا حضرت علیؓ کی آنکھیں اس وقت آشوب کر آئی تھیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "کل پرچم وہ شخص لے گا، جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کو محبت ہے، اس کے ذریعہ یہ قلعہ فتح ہوگا" اس منصب عظیم کے بڑے بڑے صحابہ امیدوار تھے، اور ہر شخص یہ خیال کرتا کہ شاید اس کو یہ سعادت حاصل ہو آپؐ نے حضرت علیؓ کو طلب فرمایا، ان کی آنکھوں میں تکلیف تھی، وہ آئے تو آپؐ نے اپنا مبارک لعابِ دہن ان کی آنکھوں میں لگایا، اور ان کے حق میں دعا کی وہ اسی وقت ایسے اچھے ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کو درد ہی نہ تھا، آپؐ نے پرچم ان کے حوالے کیا،[۳] انھوں نے کہا کہ "کیا یہود سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں؟" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یہاں سے روانہ ہو یہاں تک کہ ان کے سامنے پڑاؤ ڈالو پھر ان کو اسلام کی دعوت دو، اور اللہ تعالے

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۹-۳۳۰ [۲] روایات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام قلعہ قموص تھا۔ [۳] صحیح بخاری، صحیح مسلم باب "غزوۂ خیبر"

کا اس سلسلہ میں ان پر جو حق ہے، اس سے ان کو آگاہ کرو، خدا کی قسم اگر تمہارے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے۔"[1]

شیرِ خدا اور ایک نامور یہودی شہسوار کا مقابلہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ پرچمِ اسلام اور لشکرِ اسلام کے ساتھ خیبر پہونچے تو نامور یہودی شہسوار "مرحب" رجز پڑھتا ہوا مقابلہ پر آیا، اس سے آپ کے دو دو ہاتھ ہوئے۔

حضرت علیؓ نے پہلے اس پر ایک ہی سخت ضرب لگائی جو اس کے خود اور سر کو پھاڑتی چلی گئی، اور داڑھ تک اتر گئی، اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔[2]

محمد بن مسلمہؓ نے بھی اس معرکہ میں اپنی ہمت اور بہادری کے جوہر دکھائے اور متعدد شہسواروں اور پہلوانوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔

محنت کم، اُجرت زیادہ

خیبر کے ایک حبشی غلام نے جو اپنے مالک کی بکریاں چرانے پر مامور تھا یہ دیکھا کہ اہلِ خیبر نے ہتھیار اٹھا لئے ہیں، اور جنگ کے لئے تیار ہیں تو اس نے پوچھا کہ آپ لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟

---

[1] صحیح بخاری باب "غزوۂ خیبر" نیز صحیح مسلم و نسائی، سرخ اونٹ عرب میں بڑی دولت اور ایک نایاب چیز سمجھی جاتی تھی۔ [2] بعض اہلِ سیر نے یہ واقعہ قلعۂ ناعم کی فتح کے سلسلے میں نقل کیا ہے، اور بعض نے قلعۂ قموص کے سلسلہ میں، بخاری میں اس کے مختلف ٹکڑے آئے ہیں مگر قلعہ کے نام کا تعین نہیں ہے، ابن ہشام وغیرہ میں محمد بن مسلمہؓ کو مرحب کا قاتل بتایا گیا ہے لیکن صحیح مسلم کی روایت میں حضرت علیؓ کے نام کی تصریح اور ان کے رجزیہ اشعار بھی مذکور ہیں (مسلم حدیث نمبر ۱۸۰۷ کتاب الجہاد والسیر)

انھوں نے کہا کہ ہم اس شخص سے جنگ کرنے جارہے ہیں جو نبوت کا مدّعی ہے، نبوت کے ذکر نے اس کے دل پر خاص اثر کیا وہ اپنی بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ اور کس چیز کی دعوت دے رہے ہیں، آپ نے جواب دیا کہ میں اسلام کی طرف بلاتا ہوں، اور یہ کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں خدا کا رسول ہوں، اور اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، غلام نے کہا کہ اگر میں یہ گواہی دوں اور اللہ عزّ وجل پر ایمان لے آؤں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا کہ "اگر تمھاری اس عقیدہ پر موت آئی تو تمھارے لئے جنّت ہے، وہ یہ سن کر اسلام لے آیا اور پھر کہنے لگا، اے اللہ کے نبی میرے پاس یہ بکریاں امانت ہیں (ان کا کیا ہوگا)؟ آپ نے فرمایا تم ان کو حصباء کے میدان میں لے جا کر چھوڑ دو، اللہ تمھاری یہ امانت ادا کردے گا، اس نے یہی کیا، خدا کا کرنا کہ یہ بکریاں اپنے مالک کے پاس خود واپس چلی گئیں، اور یہودی کو علم ہوگیا کہ اس کا غلام مسلمان ہوچکا ہے، اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور لوگوں کو خطاب فرمایا، ان کو نصیحت فرمائی، اور جہاد کا شوق دلایا، جب دونوں فریق برسرِ پیکار ہوئے تو شہداءِ اسلام میں سیاہ فام غلام بھی تھا، مسلمان اسے اٹھا کر اپنے خیمہ میں لائے، بعض روایتوں میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے شامیانہ پر نظر ڈالی پھر اپنے اصحاب کرام کی طرف رُخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالےٰ نے اس غلام کے ساتھ بہت اکرام کا معاملہ فرمایا، اور اس کو خیبر پہنچایا، میں نے دیکھا کہ اس کے سرہانے جنّت کی دو حوریں موجود ہیں، حالانکہ اس نے اللہ تعالےٰ کے لئے ایک سجدہ بھی نہیں کیا تھا"[1]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۹۳

آپ کی رفاقت میں نے اس لئے نہیں کی تھی

ایک اعرابی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، ایمان لایا، اور آپؐ کی اتباع و پیروی قبول کی، اور کہا کہ میں بھی آپؐ کے ساتھ ہجرت کروں گا، آپؐ نے اس کو بعض صحابہ کرام کے حوالہ کیا اور فرمایا کہ اس کا خیال رکھیں، غزوۂ خیبر کے موقع پر کچھ مال غنیمت آپؐ نے تقسیم فرمایا، یہ اعرابی اس وقت چراگاہ میں گیا ہوا تھا، جب وہ واپس آیا تو اس کو حصۂ رسدی دیا گیا، اس نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے اس کو بتایا کہ یہ تمھارا حصہ ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمھیں دیا ہے، وہ اسے لے کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "یہ تمھارا حصہ ہے" اس نے کہا کہ میں اس کی خاطر آپؐ کے ساتھ نہیں ہوا تھا، میں نے تو اس لئے آپؐ کی اتباع کی تھی کہ مجھے اس جگہ ـــــ اپنے حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا ـــــ دشمن کا کوئی تیر لگے، میری موت ہو جائے اور میں جنت میں پہونچ جاؤں، آپؐ نے فرمایا "اگر تمھاری نیت صحیح ہے تو اللہ ایسا ہی کرے گا!"

خیبر کے موقع پر جب دشمن سے جنگ ہوئی، اور شہداء رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے گئے تو اس میں یہ خوش نصیب بھی تھا، آپؐ نے دریافت فرمایا کیا یہ وہی شخص ہے؟ صحابہ کرام رضؓ نے جواب دیا کہ جی ہاں، آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ اس نے سچائی کا معاملہ کیا تو اللہ تعالےٰ نے بھی اس کی خواہش کو سچ کر دکھایا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے جبۂ مبارک میں اس کو کفن دیا، پھر اس کی نماز جنازہ

پڑھی، اور اس کے لئے یہ دعا فرمائی کہ "اے اللہ تیرا یہ بندہ تیرے راستہ میں ہجرت کے لئے نکلا تھا، یہ تیری راہ میں شہید ہوا ہے، اور میں اس کا گواہ ہوں"۔[۱]

خیبر میں قیام کی شرط

غرض اس طرح یکے بعد دیگرے قلعہ پر قلعہ فتح ہوتا گیا، اور کئی کئی دن مسلسل جنگ اور محاصرہ میں گذرنے لگے، یہاں تک کہ اس صورتِ حال سے عاجز ہو کر یہودیوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے صلح کی پیش کش کی، لیکن آپؐ کا ارادہ ان کو وہاں سے بے دخل اور جلا وطن کرنے کا تھا، انھوں نے کہا کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہم کو آپؐ اسی جگہ قیام کی اجازت دے دیجئے، زمین کی دیکھ بھال اور کھیتی باڑی میں ہم مشغول رہیں گے، اس لئے کہ آپؐ لوگوں سے زیادہ ہم اس فن سے واقف ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحابِ کرامؓ کو کاشتکاری کا تجربہ نہ تھا، اگر وہ یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو سارا وقت اسی کی نذر کرنا پڑتا، چنانچہ آپؐ نے خیبر میں قیام کی اجازت ان کو اس شرط پر دے دی کہ تمام پیداوار غلہ اور پھلوں کا آدھا مسلمانوں کو ملے گا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب تک چاہیں گے معاہدہ کو برقرار رکھیں گے۔[۲]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پیداوار کی تقسیم کے لئے اُن کے پاس عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا کرتے تھے، وہ اندازہ کر کے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے پھر اُن سے کہتے کہ ان میں سے جو حصہ چاہیں لے لیں، وہ لوگ یہ دیکھ کر کہتے کہ اسی ادا (انصاف) پر آسمان اور زمین تھمے ہوئے ہیں۔[۳]

---

۱ زاد المعاد ج ۱ ص ۳۹۴ ۲ زاد المعاد ج ۱ ص ۳۹۴-۳۹۵ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں سنن ابی داؤد "باب المساقاۃ"۔ ۳ فتوح البلدان از بلاذری ص ۳۴

مذہبی رواداری اور کشادہ قلبی

غزوۂ خیبر میں جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا، اس میں توریت کے متعدد نسخے تھے، یہودیوں نے درخواست کی کہ وہ ان کو عطا کر دیئے جائیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ یہ سب صحیفے ان کے حوالے کر دیئے جائیں[1]۔

یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"اس واقعہ سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان مذہبی صحیفوں کا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے دل میں کس درجہ احترام تھا، آپؐ کی اس رواداری اور فراخدلی کا یہودیوں پر بڑا اثر پڑا، وہ آپؐ کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے کہ آپؐ نے ان کے مقدس صحیفوں کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہیں کیا، جس سے ان کی بے حرمتی لازم آتی ہو، اس کے مقابلہ میں ان کو یہ واقعہ بھی خوب یاد ہے کہ جب رومیوں نے یروشلم کو ۷۰ئہ قبل مسیح میں فتح کیا تو انھوں نے ان مقدس صحیفوں کو آگ لگا دی، اور ان کو اپنے پاؤں سے روندا، اسی طرح متعصب نصرانیوں نے اندلس میں یہود پر مظالم کے دوران توریت کے صحیفے نذر آتش کئے، یہ وہ عظیم فرق ہے، جو ان فاتحین (جن کا بھی اوپر ذکر گذرا ہے) اور اسلام کے نبی کے درمیان ہمیں نظر آتا ہے[2]۔"

جعفر بن ابی طالبؓ کی آمد

اسی غزوہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی جعفر بن ابی طالب

---

[1] تاریخ الخمیس ج ۲ صفحہ ۶۰ [2] تاریخ الیہود فی بلاد العرب صفحہ ۱۷۰

اور ان کے رفقاء آپؐ سے آکر ملے، آپ کو اس سے بے حد مسرت ہوئی، بہت بشاشت اور شوق کے ساتھ آپؐ نے ان کا استقبال کیا، ان کی پیشانی کو بوسہ دیا، اور فرمایا "بخدا میں نہیں جانتا کہ کس چیز سے میں زیادہ خوش ہوں، خیبر کی فتح سے یا جعفرؓ کی آمد سے"[1]

یہود کی ایک مجرمانہ سازش

اسی غزوہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو زہر دیا گیا، سلام بن مشکم کی یہودی بیوی زینب بنت حارث نے آپؐ کو زہر ملا کر ایک بھنی ہوئی بکری کا تحفہ دیا، پہلے اس نے دریافت کیا کہ اس کا کون سا حصہ آپؐ کو زیادہ مرغوب ہے، آپؐ نے فرمایا دست، یہ سن کر اس نے دست میں خاص طور سے زہر ملایا، آپؐ نے جب دست سے کچھ حصہ توڑ کر نوش فرمایا تو خود اس گوشت نے آپؐ کو اطلاع دی کہ اس میں زہر ملا ہے، چنانچہ آپؐ نے اُسی وقت اُس لقمہ کو اُگل دیا۔

اس کے بعد آپؐ نے یہودیوں کو جمع کیا، اور فرمایا کہ اگر میں تم سے کچھ پوچھوں تو کیا تم صحیح صحیح جواب دو گے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس بکری میں زہر ملایا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ملایا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ تم کو اس پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے سوچا کہ اگر آپؐ (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں تو آپؐ سے چھٹی مل جائے گی، اور اگر واقعی نبی ہیں تو زہر آپؐ پر اثر نہ کرے گا، اس کے بعد اس عورت کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر کیا گیا، اس نے بھی

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۹۷

اعترافِ جرم کرلیا اور کہا کہ میں نے آپ کی جان لینے کا ارادہ کیا تھا، آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر تمھیں قابو نہیں دے سکتا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجازت چاہی کہ اس عورت کو قتل کردیں، آپؐ نے فرمایا: نہیں، اس وقت آپؐ نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، اور اس کو کوئی سزا نہ دی، اور نہ قتل کرنے کی اجازت دی، بعد میں جب اس زہر خورانی کے نتیجہ میں بشر بن البراء بن معرور کا انتقال ہوگیا، جو اس کھانے میں شریک تھے، تو اس کو قتل کردیا گیا۔[1]

غزوۂ خیبر کے اثرات

غزوۂ خیبر اور اس میں مسلمانوں کی شاندار فتح کا عرب کے ان قبائل پر جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے، بہت خوشگوار اثر پڑا، ان کو خیبر میں یہودیوں کی جنگی طاقت ان کی دولت مندی، وفارغ البالی، غذائی اشیاء کی فراوانی، سامانِ جنگ کی کثرت قلعوں کے استحکام اور حملہ آور فوجوں اور تجربہ کار جرنیلوں کے لئے اس کے سخت اور دشوار گذار اور ناقابلِ تسخیر ہونے کا بخوبی اندازہ تھا، اور یہ معلوم تھا کہ ان میں "مرحب" اور حارث ابی زینب جیسے تجربہ کار شہسوار اور تربیت یافتہ ماہرینِ جنگ موجود ہیں، چنانچہ اس فتح نے ان کے تمام اندازے غلط ثابت کئے، اور ان کے عزائم اور بعد کے واقعات پر اس کا گہرا اثر پڑا۔

ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون غزوۂ خیبر اور تاریخ اسلام پر اس کے اثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

---

[1] بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ سے مختصراً اس روایت کو نقل کیا ہے (باب الشاة التی سمت للنبی صلے اللہ علیہ وسلم بخیبر)

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلامی فتوحات کی تاریخ میں غزوۂ خیبر کی بہت بڑی اہمیت ہے یہی وجہ ہے کہ عرب کے تمام قبیلے بہت فکرمندی کے ساتھ اس کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے، اور اس کا فیصلہ انصار و یہود کی تلوار کی جھنکار پر ہونا تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بہت سے دشمن جو عرب کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں تھے، اس غزوہ سے بڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے"۔[۱]

مالِ غنیمت

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فتحِ خیبر سے فارغ ہوئے تو آپ نے فدک (جو ایک آباد قصبہ اور حجاز کے بالائی حصہ میں دوسرے قصبات اور قریوں کی طرح ایک مستقل ریاست تھی[۲]) کی طرف توجہ فرمائی یہودیوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نصف نصف پر مصالحت کرنی چاہی، آپ نے ان کی پیش کش کو قبول فرمایا، اس سے جو حاصل ہوتا آپ اس کو اپنے اور مسلمانوں کے مفاد میں جہاں مناسب سمجھتے تقسیم فرما دیتے[۳]۔

اس کے بعد آپ وادی القریٰ[۴] تشریف لے گئے، یہ خیبر اور تیماء کے درمیان ایک نوآبادی تھی جس کو یہود نے اسلام سے قبل آباد کیا تھا، اور اس نے ان کے مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی، عرب کے کچھ لوگ بھی ان کے ساتھ آکر شامل ہو گئے تھے، ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام دی، اور ان سے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیں گے، تو ان کا مال و جان سب محفوظ رہے گا، اور ان کا حساب اللہ تعالےٰ کے ذمہ ہوگا۔

---

[۱] تاریخ الیہود فی بلاد العرب ص۱۶۲ [۲] اس قصبہ کی آبادی یہود بنی مرہ اور بنی سعد بن بکر کے قبائل کے افراد پر مشتمل تھی۔ (نہایۃ الارب ۔ ۲۰۹/۱۷) [۳] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص۳۶۸ [۴] وادی القریٰ اس وادی کو کہتے ہیں جس میں بہت سے گاؤں ہوں، یہاں عرب اور یہودی آباد تھے، اس کا شمار جزیرۃ العرب کے سرسبز و شاداب علاقوں میں ہے، اس میں چشمے اور کنویں بھی پائے جاتے ہیں۔

اس غزوہ میں کئی مقابلے ہوئے، جن میں زبیر بن العوامؓ کی بہادری کے جوہر ظاہر ہوئے اور فتح و کامیابی کا سہرا ان کے سر رہا، چنانچہ دوسرے ہی روز سے یہود نے جو کچھ اُن کے ہاتھ میں تھا، وہ مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دیا، مسلمانوں کو ان غزوات میں بڑا مالِ غنیمت ہاتھ لگا، اور بہت وافر سامان ملا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس ساری دولت کو صحابۂ کرام میں تقسیم فرما دیا، آراضی اور کھجور کے باغات یہود کے ہاتھ میں چھوڑے گئے اور ان پر معاملہ ہو گیا۔

جب تیماء[1] کے یہودیوں کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اہلِ خیبر، اہلِ فدک و وادی القریٰ سے یہ معاملہ فرمایا ہے تو انھوں نے آپؐ سے مصالحت کر لی اور ان کا مال و جائیداد انہی کے قبضے میں رہی، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لے آئے۔[2]

مہاجرین کی پاک نفسی و احتیاط

جب مسلمان مدینہ واپس آگئے تو مہاجرین نے انصار کو ان کے وہ عطیات واپس کرنا چاہے جو انھوں نے ان کی پریشاں حالی اور عُسرت کے زمانہ میں انھیں کھجور کے درختوں اور باغوں کی شکل میں دیئے تھے، اس لئے کہ خیبر میں وہ خود صاحبِ جائداد ہو گئے تھے اور ان کے پاس بھی باغات تھے، ام سُلیمؓ (جو انسؓ بن مالک کی والدہ تھیں) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس زمانے میں کچھ کھجور کے درخت پیش کئے تھے، آپؐ نے اپنی آزاد شدہ باندی ام ایمن کو عنایت فرما دیئے تھے، فدک کے حاصل ہونے کے بعد آپؐ نے ام سُلیمؓ کو یہ درخت واپس فرما دیئے

---

[1] یہ وادی القریٰ اور شام کے درمیان، شام سے قریب تر ایک قصبہ ہے، قدیم زمانہ میں شام سے آنے والے حجاج کے راستہ میں پڑتا تھا، یہیں سموال (یہودی شاعر) کا مشہور قلعہ "الابلق الفرد" کہتے ہیں، واقع تھا [2] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۰۵ تلخیص کے ساتھ۔

تھے، اور اُم ایمن کو کھجور کے ہر درخت کے بدلہ میں باغِ فدک سے دس درخت عنایت فرمائے۔[1]

خیبر کے بعد بھی بہت سے سرایے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات پر بھیجے اور جلیل القدر صحابہ کو اس کا امیر مقرر فرمایا، ان میں سے کچھ سریوں میں جنگ ہوئی اور کچھ میں جنگ کی نوبت نہیں آئی۔[2]

عمرة القضاء

دوسرے سال ۷ھ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمان عمرۃ القضاء کی نیت سے تشریف لے چلے قریش نے کوئی مزاحمت نہیں کی آپ کو مکہ جانے دیا اور اپنے گھروں میں تالے ڈال کر جبل قعیقعان[3] پر چلے گئے، آپ نے تین روز وہاں قیام فرمایا، اور عمرہ سے فراغت کی، اللہ تعالےٰ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے :۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا	بے شک خدا نے اپنے پیغمبر کو سچا (اور)
بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ	صحیح خواب دکھایا کہ خدا نے چاہا تو
اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ	مسجد حرام میں اپنے سر منڈوا کر اور
رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ	اپنے بال کترواکر امن و امان سے داخل ہوگے
فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ	اور کسی طرح کا خوف نہ کروگے، جو بات
مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝	تم نہیں جانتے تھے اس کو معلوم تھی،
(سورۃ الفتح ـ ۲۷)	سو اس نے اس سے پہلے ہی جلد فتح کرادی۔

---

[1] زاد المعاد ج ا صفحہ ۴۰۶، مسلم نے اس قصہ کو مفصل طور پر "کتاب الجہاد والسیر" میں باب "رد المہاجرین الی الأنصار منائحہم من الشجر والثمر حین استغنوا عنہا بالفتوح" درج کیا ہے اسی میں قریظہ و نضیر کی فتح کا بھی ذکر ہے [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو زاد المعاد ج ا صفحہ ۴۰۹ـ۴۱۰ [3] صحیح بخاری (باب عمرۃ القضاء)

لڑکیوں کی پرورش و تربیت میں مقابلہ اور حقوق میں مساوات

اسلام کے اثر سے ان لوگوں کے دل و دماغ میں انقلاب عظیم واقع ہو چکا تھا وہ لڑکی جو پہلے خاندان کے لئے اور اشراف و روٴساء قوم کی نگاہ میں باعث ننگ و عار تھی (اور بعض قبیلوں میں اس کو زندہ درگور کر دینے تک کا رواج تھا) آج ایسی عزیز و محبوب بن چکی تھی جس کی پرورش اور تربیت کے لئے آپس میں مقابلہ کی نوبت آجاتی تھی، مسلمان سب برابر تھے، اور مساویانہ حقوق رکھتے تھے، کسی کو کسی پر اگر فوقیت تھی تو کسی فضیلتِ علمی و عملی اور کسی معقول بنیاد پر، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے واپسی کا قصد کیا تو سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی چھوٹی بچی "اُمامہ" چچا چچا پکارتی ہوئی آپ کے پیچھے ہولی، حضرت علیؓ نے اسے لے لیا اور حضرت فاطمہؓ کے حوالے کیا اور کہا کہ ــــ دیکھو ــــ یہ چچا کی لڑکی ہے، اب حضرت علی، زید، جعفر رضی اللہ عنہم کے درمیان اس مسئلہ پر کشمکش ہونے لگی حضرت علیؓ نے کہا کہ اسے میں لیتا ہوں، یہ میری چچازاد بہن ہے، حضرت جعفرؓ نے کہا کہ میری بھی چچازاد بہن ہے اور اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے، حضرت زیدؓ نے کہا (اسلام کے رشتہ سے) یہ میری بھتیجی ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کے حق میں فیصلہ دیا کہ چونکہ بچی کی خالہ ان کے گھر میں ہے، اور خالہ ماں کی جگہ پر ہوتی ہے (اس لئے اس کو وہاں زیادہ آرام ملے گا) حضرت علیؓ سے آپ نے بطور دلداری فرمایا کہ "تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں" حضرت جعفرؓ سے فرمایا "تم سیرت و صورت دونوں میں مجھ سے مشابہ ہو" حضرت زیدؓ سے ارشاد ہوا کہ "تم میرے بھائی ہو اور ہمارے مولیٰ ہو"[۱]

---

[۱] صحیح بخاری کتاب المغازی باب "عمرۃ القضاء"

غزوۂ موتہ[1]

(جمادی الاولیٰ ۸ھ)

مسلمانوں کے سفیر کا قتل اور اس کا شاخسانہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حارث بن عمیر الازدیؓ کو اپنے مکتوب عالی کے ساتھ بصریٰ کے حاکم شرجبیل بن عمرو الغسانی کے پاس بھیجا جو رومی سلطنت کے تابع تھا، شرجبیل نے حکم دیا کہ ان کو باندھ دیا جائے، اس کے بعد ان کو سامنے بلوا کر شہید کر دیا۔[2] سفراء اور قاصدوں کے قتل کرنے کا کبھی بھی دستور نہ تھا، خواہ کتنا ہی شدید اختلاف ہو، یا خط کا مضمون کتنا ہی ناگوار ہو، یہ ایسا واقعہ تھا کہ جس سے چشم پوشی کسی طرح جائز نہ تھی، یہ عام قاصدوں اور سفیروں کے لئے خطرہ کی بات اور مکتوب اور صاحبِ مکتوب دونوں کی اہانت تھی، اس لئے اس طرح کی گستاخی کرنے والے کی سرکوبی اور مظلوم کا بدلہ ضروری تھا، تاکہ کسی کو آئندہ اس کی

---

[1] موتہ شرق اردن کے شہر کرک کے جنوب میں بارہ کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے، مدینہ اور موتہ کا فاصلہ تقریباً گیارہ سو کلو میٹر کا ہے، اس فاصلہ کو مسلمانوں نے اونٹوں اور گھوڑوں پر اس طرح طے کیا کہ اس کا سلسلہ بالکل منقطع ہو چکا تھا، مرکز سے خبر رسانی کا بھی کوئی انتظام نہ تھا، اور پورا سفر گویا دشمنوں کے جبڑوں کے درمیان تھا۔ [2] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۴۱۴

جرأت نہ ہوسکے سفراء کا خون اس طرح ارزاں نہ ہو اور اس قسم کا المناک واقعہ دوبارہ پیش نہ آئے۔

رومی قلمرو میں پہلی اسلامی فوج

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہونچی تو آپ نے ایک لشکر بصریٰ بھیجنے کا ارادہ فرمایا یہ واقعہ جمادی الاولیٰ ۸ھ کا ہے۔

تین ہزار مجاہدوں پر مشتمل ایک فوج اس کے لئے تیار ہوئی آپ نے باوجود اس کے کہ اس لشکر میں بڑے بڑے جلیل القدر اور عالی مرتبہ انصار و مہاجرین موجود تھے، زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا، جو آزاد کردہ غلام تھے، اسی کے ساتھ آپ نے ہدایت فرمائی کہ اگر وہ شہید یا زخمی ہو جائیں تو جعفرؓ ابن ابی طالب کو امیر مقرر کیا جائے ان کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آئے تو عبد اللہ بن رواحہؓ کو امیر مقرر کیا جائے، جب روانگی کا وقت قریب ہوا تو لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعین کردہ امراء کو رخصت کیا، اور ان کو اپنا سلام پیش کیا[1] ان کے سامنے ایک طویل اور پُر مشقت سفر تھا، اور ایسے دشمن سے واسطہ تھا جس کو اس زمانہ کی سب سے بڑی سلطنت کی پشت پناہی حاصل تھی۔

یہ اسلامی فوج روانہ ہوئی اور آگے بڑھ کر اس نے مقام "معان" پر پڑاؤ ڈالا یہاں مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ ہرقل "بلقاء" میں ایک لاکھ رومی فوج کے ہمراہ مقیم ہے، اور اس کے ساتھ بہت بڑی تعداد میں عرب قبائل لخم، جذام، بلقین، بہرا اور بلی آملے ہیں، مسلمانوں نے دو راتیں اس مقام "معان" پر گذاریں اور صورتِ حال

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۷۳

پر غور کرتے رہے، رائے ٹھہری کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خط روانہ کیا جائے اور دشمن کی تعداد سے آپ کو مطلع کر دیا جائے، پھر یا تو آپ ہمارے لئے کمک روانہ فرمادیں، یا مقابلہ کا حکم فرمائیں تو اس کی تعمیل کی جائے۔[1]

ہم دشمن سے تعداد اور قوّت کی بنیاد پر نہیں لڑتے

اسی موقع پر عبد اللہ بن رواحہ رضؓ نے مجاہدینِ اسلام کو ہمّت دلائی اور کہا کہ خدا کی قسم آج تم اس چیز کو ناگوار اور تلخ محسوس کر رہے ہو جس کے لئے تم نکلے تھے، اور جو تمھاری دلی مراد تھی یعنی شہادت۔ انھوں نے کہا کہ ہم دشمن کا مقابلہ تعداد اور قوّت کی بنیاد پر نہیں کرتے ہم تو اس کا مقابلہ اس دین کی طاقت سے کرتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے ہم کو سرفراز کیا ہے، اس لئے چل کھڑے ہو اور یاد رکھو! دونوں صورتوں میں ہمارا فائدہ ہے جیت ہو تب بھی اور شہادت ہو تب بھی، یہ سن کر سب لوگ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور روانہ ہو گئے۔

مجاہدین سر بکف

جب اسلامی لشکر بلقاء کے قریب پہونچا تو رومیوں اور عربوں کا ایک لشکرِ جرّار ان کے سامنے تھا، یہ لشکر "مشارف" کے مقام پر تعینات تھا، مسلمانوں کو دیکھ کر یہ قریب ہوا، مسلمانوں نے ایک گاؤں میں جس کا نام موتہ تھا، مورچہ سنبھال لیا، اور جنگ کا آغاز ہو گیا۔[2]

زید بن حارثہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے (جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۱۵ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۷۷-۳۷۸

پرچم ہاتھ میں لئے تھے) جنگ کا آغاز کیا اور آخر کار شہید ہوئے، نیزوں نے ان کے سارے جسم کو چھلنی کر دیا، ان سے پرچم جعفرؓ نے لے لیا، اور لڑتے رہے، جب لڑائی کا دباؤ بڑھا تو گھوڑے سے اتر گئے اور اس کی اگلی ٹانگیں کاٹ دیں، اور پیادہ پا لڑنا شروع کیا، اتنے میں ان کا داہنا بازو کٹ گیا، انھوں نے پرچم اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا، بایاں ہاتھ بھی کٹ گیا تو پرچم کو انھوں نے اپنے دونوں زخمی اور کٹے ہوئے بازوؤں سے جکڑ لیا، یہاں تک کہ شہادت سے سرخرو ہوئے اس وقت ان کی عمر ۳۳ سال تھی[۱] ان کے سینے اور بازوؤں کے درمیان اور سامنے کے حصہ میں نوّے ۹۰ زخم تھے، جو تلوار اور نیزہ کے تھے، کوئی زخم پشت کی طرف نہ تھا[۲] غرض اس طرح یہ باہمت نوجوان جنت کی نعمتوں کے ترانے گاتا ہوا اور دشمن کی کثرتِ تعداد اور قوت و شوکت اور سامان اور دنیا کی ظاہری زیب و زینت کو پیروں سے روندتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہوا۔

جعفرؓ کی شہادت کے بعد عبداللہ ابن رواحہؓ نے پرچم اپنے ہاتھ میں لیا اور آگے بڑھے، انھوں نے بھی اپنا گھوڑا چھوڑ دیا، اسی درمیان میں ان کے ایک چچازاد بھائی ایک ہڈی جس میں ذرا سا گوشت لگا ہوا تھا لے کر آئے اور کہا کہ اس کو پیٹ میں ڈال لو تاکہ کچھ توانائی آجائے تم نے کئی روز سے کچھ کھایا نہیں ہے، عبداللہ بن رواحہؓ نے ان ہی کے ہاتھ سے ذرا گوشت اپنے منہ میں لیا، پھر اس کو پھینک دیا، تلوار اپنے ہاتھ میں لی، آگے بڑھ کر دشمن سے دو دو ہاتھ کئے، اور

---

[۱] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۱۵ باختصار [۲] ابن کثیر ج ۳ ص ۲۴۴ و زاد المعاد ج ۱ ص ۴۱۵ صحیح بخاری میں ہے کہ ہم نے ان کو مقتولین میں دیکھا تو ان کے جسم پر نوّے ۹۰ سے اوپر زخم کے نشان نظر آئے، جو نیزہ اور تیر کے تھے (باب غزوہ موتہ)

جامِ شہادت نوش کیا۔[1]

حضرت خالدؓ کی ماہرانہ قیادت

ان کے بعد لوگوں نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت پر اتفاق کر لیا، اور انھوں نے پرچمِ اسلام اپنے ہاتھ میں لیا، وہ بہت بہادر اور جنگ سے واقف اور تجربہ کار شخص تھے، انھوں نے اسلامی لشکر کو جنوب کی طرف موڑ لیا، دشمن شمال کی طرف چلا گیا،[2] دوسری طرف رات نے اپنے سیاہ پردے ڈال دیئے، اور دونوں فریقوں نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور ان کو سلسلۂ جنگ جاری نہ رکھنے میں عافیت نظر آئی۔

یہ حقیقت ہے کہ پسپائی کا عمل (جیسا کہ عراقی جنرل شیت خطاب کہتے ہیں) پسپائی کے شکست میں بدل جانے کے احتمال کے سبب مشکل ترین فوجی عمل ہوتا ہے، اور شکست ایسی مصیبت ہوتی ہے، جو شکست خوردہ کے لئے عموماً بڑے نقصانات کا سبب بن جاتی ہے، اس لئے مُوتہ میں مسلمانوں کے معمولی نقصانات اس فوجی فائدہ کے مقابلہ میں ناقابلِ لحاظ ہیں کہ اس سے رومی فوجی طاقت، ان کی تنظیم اور اسالیبِ جنگ کی معلومات حاصل ہوئیں، جو بعد کی جنگوں میں مسلمانوں کے کام آئیں۔[3]

حضرت خالدؓ نے اپنے آدمیوں کی اچھی خاصی تعداد اپنے لشکر کے عقب میں

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۱۴ وسیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۷۹ [2] ایضاً [3] شیت خطاب "الرسول القائد" ص ۲۰۶-۲۰۷ مُوتہ کے بارے میں ملاحظہ ہو۔ ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM : ART. MUTA

تعینات کردی' ان لوگوں نے صبح کے وقت اتنی بلند آواز سے نعرے لگائے اور شور برپا کیا کہ دشمن کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ شاید مدینہ سے نئی کمک آگئی ہے' اس کی وجہ سے رومیوں پر مسلمانوں کا بڑا رعب پڑا، اور وہ آپس میں کہنے لگے کہ جب تین ہزار کے لشکر نے یہ آفت ڈھائی ہے تو جب ان کے پاس نئی کمک پہنچ گئی ہے' جس کی تعداد اور قوت کا اندازہ ہی نہیں تو اس وقت یہ لوگ ہمارے ساتھ کیا کریں گے؟ یہ سوچ کر رومیوں کی ہمت پست ہوگئی' اور انھوں نے مقابلہ کا ارادہ ترک کر دیا اور اس طرح اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو لڑائی کی زحمت و تکلیف سے محفوظ رکھا۔[1]

آنکھوں دیکھا حال

ادھر مسلمان میدان جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھا رہے تھے' اور ادھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں صحابۂ کرام سے اس معرکہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان فرما رہے تھے' انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ' جعفر اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی اطلاع مدینہ خبر پہونچنے سے قبل ہی دے دی تھی' آپؐ نے فرمایا کہ اب زیدؓ نے پرچم لیا وہ شہید ہوئے جعفرؓ نے لیا، وہ بھی شہید ہوئے' ابن رواحہ نے لیا وہ بھی شہید ہوئے (اس وقت آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے) یہاں تک کہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (سیف اللہ خالد بن الولیدؓ) نے پرچم اپنے ہاتھ میں لیا، اور اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔[2]

---

[1] المغازی للواقدی   [2] صحیح بخاری باب غزوۂ موتہ۔

جعفرِ طیّار

جعفر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دونوں بازوؤں کے بدلہ ان کو دو شہپر عطا کئے ہیں جن سے وہ جنّت میں جہاں چاہیں پرواز کرتے ہیں۱ اسی لئے اُن کا لقب جعفر طیارؓ (اڑنے والے) اور ذی الجناحین (دو بازوؤں اور پروں والے) پڑ گیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبّت و دلداری

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کی اہلیہ سے فرمایا کہ جعفر کے بچّوں کو ہمارے پاس لانا، جب وہ آئے تو آپؐ نے ان کو اپنے روئے انور سے ملایا، اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر آپؐ نے اُن کی شہادت کی خبر سنائی جب محاذِ جنگ سے شہادت کی اطلاع آگئی تو آپؐ نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو اس حادثہ نے اُن کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ کھانا پکانے کی طرف توجہ کریں آپ کے چہرۂ مبارک سے بھی رنج و غم کا اثر ظاہر ہو رہا تھا۲

حملہ کرنے والے، نہ کہ بھاگنے والے

جب لشکر واپس ہوتے ہوئے مدینہ کے قریب پہونچا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا، بچّے بھی ان کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سواری پر تھے آپ نے فرمایا "بچّوں کو اپنے ساتھ بٹھالو اور جعفرؓ کا بچہ مجھے دیدو"

---

۱ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمرؓ جب حضرت جعفرؓ کے صاحبزادے ملتے تو کہتے "السلام علیک یا ابن ذی الجناحین" (دو پروں والے کے لڑکے تم پر سلام ہو) (باب غزوۂ موتہ) و زاد المعاد ج ۱ ص ۴۱۵

۲ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۸۰-۳۸۱

آپؐ کے پاس ان کے بچے عبداللہ کو لایا گیا، آپؐ نے اس کو اپنی گود میں بٹھا لیا، (مسلمان چونکہ میدان جنگ سے ہٹ آنے کے عادی نہ تھے' یہ ان کے لئے پہلا واقعہ تھا) اس لئے وہ ان غازیوں پر مٹی پھینکتے تھے' اور کہتے تھے' بھاگنے والو کیا اللہ کے راستہ سے بھاگے ہو؟ آپؐ نے فرمایا، بھاگنے والے نہیں ہیں' انشاء اللہ حملہ کرنے والے ہیں۔[1]

غزوۂ مُوتہ اور فتح مکّہ کے درمیان

غزوۂ مُوتہ اور فتح مکہ کے درمیان ایک سریّہ ذات السلاسل کے نام سے جمادی الاخریٰ ۸ھ میں بھیجا گیا، یہ مقام وادی القریٰ کی پشت پر تھا، اور قبیلۂ قضاعہ کے علاقہ میں واقع تھا، اسلامی لشکر نے اس موقع پر دشمن کا پوری طرح صفایا کر دیا' دوسرا سریّہ سریّۃ الخبط تھا، اس کے امیر ابوعُبَیدہ ابن الجرّاح رضی اللہ عنہ تھے' یہ رجب ۸ھ میں بھیجا گیا، اس میں مہاجرین وانصار کے تین سو آدمی شریک تھے' آپؐ نے ان کو جُہَینہ کے ایک قبیلہ کی سرکوبی کے لئے سمندر کے قریب روانہ فرمایا، راستہ میں ان مجاہدین کو سخت بھوک اور فاقہ کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ درختوں کے پتوں پر گذر اوقات ہونے لگی' اس وقت سمندر نے ان کے لئے عنبر نام کی ایک بہت بڑی مچھلی فراہم کر دی جس سے نصف ماہ تک ان کا کام چلا یا اس کا تیل بھی انھوں نے نکالا اور خوب فائدہ اٹھایا، اس کی وجہ سے ان کی صحت وقوت بحال ہو گئی' اور جسم تروتازہ ہو گئے، حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جب یہ واقعہ سنا تو فرمایا کہ یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے تمھاری مہمانی تھی' آپؐ نے اس کا کچھ گوشت بھی نوش فرمایا۔[2]

---

[1] بروایت امام احمد بن حنبل ۔ [2] زاد المعاد ج ا ص ۴۱۷ صحیح بخاری میں یہ روایت "باب غزوۃ سیف البحر" میں بیان کی گئی ہے۔

فتح مکہ

(رمضان ۸ھ[1])

فتح مکہ کا پس منظر

جب دینِ حق اور مسلمانوں کی دینی تربیت کی بنیادیں خدا کے حکم سے اچھی طرح مستحکم ہوگئیں، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آزمالیا اور ان کے دلوں اور نیتوں کا پورا امتحان کرلیا، قریش کے ظلم و سرکشی، قبولِ حق سے انکار، راہِ حق میں رکاوٹیں کھڑی کرنے اور مسلمانوں کو مسلسل ایذا پہونچانے اور طرح طرح کے الزامات لگانے اور ستانے کا جام لبریز ہوگیا، بلکہ چھلکنے لگا تو مشیتِ الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ اب اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مکہ میں فاتح بن کر داخل ہوں، کعبہ کو بتوں کی آلائش جھوٹ اور فحش کلامی کی گندگی و ناپاکی سے پاک و صاف کریں، مکہ کو اس کی پرانی حیثیت اور مرتبہ پر واپس لائیں، بیت اللہ کو پوری انسانیت عامہ کے لئے سرچشمۂ ہدایت و برکت بنائیں، اور اس کے فیضانِ رحمت کو دنیا کے تمام انسانوں کے لئے عام کردیں۔

---

[1] مطابق جنوری سنہ ۶۳۰ء

بنی بکر اور قریش کی عہد شکنی

اللہ تعالیٰ نے اس فتح مبین کے لئے خاص اسباب پیدا فرمائے اور خود قریش کو نادانستہ طور پر اس کا باعث اور محرک بنا دیا، اور ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا، جس نے فتح مکہ کو نہ صرف جائز بلکہ ناگزیر اور ضروری کر دیا "وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (اور اللہ تعالیٰ کے قبضے میں آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں۔)

صلح حُدَیبیہ کے معاہدہ کی ایک دفعہ تھی کہ جو شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد و پناہ میں آنا چاہے' وہ ایسا کر سکتا ہے' اور جو شخص قریش کی پناہ اور عہد قبول کرنا چاہے' وہ اس میں آزاد ہوگا، چنانچہ بنو بکر نے قریش کو ترجیح دی' اور ان کی حمایت اور پشت پناہی قبول کی اور خُزاعہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حمایت اور پشت پناہی پسند کی۔[1]

بنو بکر اور خُزاعہ میں بہت پرانی دشمنی تھی' اور انتقامی کارروائیوں کا ایک سلسلہ جاری تھا، اور بعثت کے پہلے سے تھا، اسلام نے آکر ان دونوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی' اور اس معاملہ کے سوا کسی اور چیز پر غور کرنے کی فرصت لوگوں کے پاس نہ ہوئی، جب یہ صلح ہوئی اور یہ دونوں قبیلے دو مخالف کیمپوں میں تقسیم ہو گئے، تو بنو بکر نے اس موقع کو غنیمت جان کر خزاعہ سے اپنا حساب بے باق کرنا چاہا، بنو بکر کے کچھ لوگوں سے ساز باز کر کے خزاعہ پر اس وقت شبخون مارا جب وہ پانی کے ایک چشمہ کے پاس مقیم تھے' لڑائی ہوئی اور خزاعہ کے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۸۹

متعدد آدمی مارے گئے۔

قریش نے بنی بکر کی ہتھیاروں سے مدد کی، اور رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، قریش کے بڑے سردار اس جنگ میں شریک ہوئے، یہ لوگ خزاعہ کو ڈھکیلتے ہوئے حرم تک پہونچ گئے، حرم پہونچ کر قریش کے بعض لوگوں نے کہا، اب ہم حرم میں داخل ہو گئے ہیں، اپنے معبود کا خیال کرو، اپنے معبود کا خیال کرو، جواب ملا کہ آج کے دن کوئی معبود نہیں، بنی بکر آج بدلہ چکا لو اس کے بعد تمھیں موقع نہیں ملے گا۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے فریاد

اس موقع پر عمرو بن سالم الخزاعی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آکر ملے، اور آپؐ کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ اشعار پڑھے، اور اس میں آپؐ کے اور خزاعہ کے درمیان جو عہد و پیمان تھا، اس کا واسطہ دے کر آپ کی حمایت و اعانت کے طالب ہوئے، نیز آپ کو اس کی اطلاع کی کہ قریش نے عہد شکنی کی ہے، اور آپؐ کے عہد نامہ اور میثاق کو ختم کر دیا ہے، اور اس حالت میں جب وہ پانی پر تھے، انھوں نے ان پر شبخون مارا، اور رکوع و سجود کی حالت میں ہم لوگ قتل کئے گئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: عمرو بن سالم! تمھاری ضرور مدد ہو گی۔

آخری طور پر اتمام حجت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مناسب سمجھا کہ اس خبر کی مزید تصدیق کر لی جائے،

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۱۹ وسیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۹

تاکہ قریش کے پاس کہنے کے لئے کوئی بات باقی نہ رہے، آپؐ نے ان کے پاس ایک آدمی کو بھیجا، اور اس کو یہ ہدایت کی کہ ان کے سامنے تین صورتیں رکھے، ایک یہ کہ وہ خزاعہ کے مقتولین کا "خوں بہا" دیں، یا جس نے اس معاہدہ کو توڑا ہے اور خزاعہ پر حملہ کیا ہے اس سے بے تعلقی کا اعلان کریں، یہ لوگ بنی بکر کی شاخ بنو نفاسہ سے تعلق رکھتے تھے، یا پھر جیسا انھوں نے کیا ہے، وہی ان کے ساتھ کیا جائے گا، ان کے بعض سرداروں نے کہا کہ ہاں ہم برابر کا جواب پسند کریں گے، اس طرح قریش کی ذمہ داری سے مسلمان بری الذمہ ہو گئے، اور ان پر حجت قائم ہو گئی۔[1]

معاہدہ کی تجدید کے لئے قریش کی کوشش

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہونچی تو آپؐ نے فرمایا کہ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ ابوسفیان معاہدہ کی توثیق اور اس کی مدت میں توسیع کے لئے تمہارے پاس آئے ہیں، اور ایسا ہی ہوا، قریش نے جو کچھ کیا تھا، اس سے ان کو ایک قسم کا اندیشہ لاحق ہوا، اور اس سخت جواب کو ناپسند کیا جو بعض کم عقل لوگوں نے دیا تھا، اور ان کو اس پر پچھتاوا ہوا، انھوں نے ابوسفیان ہی کو اس معاہدہ کی توثیق اور اس کی مدت میں توسیع کے لئے روانہ کیا۔[2]

ماں باپ اور اولاد پر حضورؐ کو ترجیح

ابوسفیان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے مدینہ آئے تو اپنی لڑکی

---

[1] زرقانی نے مواہب میں ابن عائذ سے ابن عمر کے حوالہ سے یہ بیان کیا ہے کہ جن صاحب کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کام کے لئے بھیجا تھا، ان کا نام ضمرہ تھا، اور قریش کے جس شخص نے اس کا جواب دیا تھا اس کا نام قرظ بن عمرو تھا، (دیکھئے شرح المواہب اللدنیہ للزرقانی ج ۲ ص ۲۴۹)

[2] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۰ وسیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۹۵-۲۹۶

ام حبیبہؓ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ) کے گھر گئے، اور آپؐ کے بستر مبارک پر بیٹھنا چاہا، لیکن ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے ان کو روک دیا، انھوں نے کہا کہ بیٹی! میں نہیں سمجھ پایا کہ تم نے اس بستر کو میرے لائق نہیں سمجھا، یا مجھ کو اس بستر کے لائق نہیں سمجھا؟

انھوں نے جواب دیا کہ اصلی بات یہ ہے کہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے، اور آپ مشرک و ناپاک ہیں، میں یہ پسند نہیں کرتی کہ آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھیں، انھوں نے جواب دیا، خدا کی قسم ہم سے جدا ہونے کے بعد تم تو بہت بدل گئیں۔[1]

ابوسفیان کی پریشانی اور ناکامی

اس کے بعد ابوسفیان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے، اور آپ سے گفتگو کی، لیکن آپؐ نے ان کو کوئی جواب نہ دیا، پھر وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے، اور ان سے خواہش کی کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ان کی طرف سے بات کرلیں، انھوں نے جواب دیا کہ یہ کام میں نہیں کرسکتا، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہم ان سب کو بہلانے پھسلانے کی انھوں نے کوشش کی، لیکن ان حضرات میں سے کسی نے بھی اس کی ہامی نہ بھری، اور کہا کہ مسئلہ اتنا اہم اور سنگین ہے کہ ہم لوگ بول نہیں سکتے، ان کی حیرانی اور پریشانی اس قدر بڑھی کہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ سے کہا کہ اے بنت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کیا تم اپنے اس بچے کو (یہ کہتے ہوئے،

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۰ و سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۹۶ اصل عربی کے الفاظ ہیں "واللہ لقد اصابك بعدی شر" یعنی نیا دین قبول کرنے کے بعد تو اب پہچان ہی نہیں رہتیں، اور اپنے دین و ایمان کے سامنے اپنے باپ کا بھی کچھ خیال نہیں۔

انھوں نے حضرت حسنؓ بن علیؓ کی طرف اشارہ کیا جو پانچ سال کے خورد سال بچے تھے، اور کھیل رہے تھے) اشارہ کرسکتی ہو کہ یہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ میں نے فریقین میں بیچ بچاؤ کرادیا، یہ کہہ کر وہ قیامت تک کے لئے عربوں کا سردار بن جائے گا، انھوں نے جواب دیا کہ میرا بچہ ابھی اس قابل نہیں ہوا کہ ایسے اہم معاملات میں دخل دے اور فریقین میں بیچ بچاؤ کرے) پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آپ کی مرضی کے خلاف کوئی بھی صلح صفائی پر آمادہ نہیں کرسکتا، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ، نے ان کی پریشانی دیکھی، اور ان کو اندازہ ہوا کہ وہ کس کرب اور مصیبت میں ہیں تو انھوں نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ اس وقت کوئی چیز بھی تمھارے کام آسکتی ہے تم بنی کنانہ کے سردار ہو کھڑے ہو اور خود لوگوں میں صلح صفائی کراؤ، پھر اپنے گھر کی راہ لو انھوں نے جواب دیا کہ کیا تمھارے خیال میں اس سے کچھ فائدہ ہو سکتا ہے؟ انھوں نے کہا بخدا میں تو ایسا نہیں سمجھتا لیکن میں تمھارے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہیں دیکھتا، یہ سن کر ابو سفیان مسجد میں کھڑے ہوئے اور اعلان کیا لوگو! میں نے صلح کرادی اس کے بعد اونٹ پر سوار ہوئے، اور اپنا راستہ لیا[1]۔

جب قریش نے یہ قصہ سنا تو کہنے لگے تم تو کوئی بات لے کر نہیں آئے، یہ کارروائی نہ ہمارے لئے مفید ہے نہ تمھارے لئے۔

مکہ کی تیاری اور حاطب ابن ابی بلتعہ کا خط

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جہاد کی تیاری کا حکم فرمایا، اور اس کا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۳۹۵-۹۶

اہتمام کیا کہ ساری باتوں کو خفیہ رکھا جائے، اس کے بعد آپؐ نے اپنی مکہ روانگی کا اعلان کیا، اور لوگوں کو تیار رہنے اور سامان تیار رکھنے کی ہدایت کی، آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اے اللہ اس کا انتظام فرمادے کہ قریش کا کوئی جاسوس، اور مخبر اپنا کام نہ کرسکے، اور ہم اچانک قریش کے سر پر پہونچ جائیں[1]۔

مدینہ کا اسلامی معاشرہ بہرحال ایک انسانی اور بشری معاشرہ تھا، اور اس میں انسانی جذبات واحساسات اور خواہشات کی زندہ حقیقت اور واقعات کی وہ جھلکیاں موجود تھیں، جو کسی زندہ، فطری اور غیر مصنوعی معاشرہ میں ہوتی ہیں، اس لئے وہ صحیح کام بھی کرتے تھے، اور ان سے غلطیاں بھی ہوتی تھیں، ہوسکتا ہے وہ اپنے فیصلوں اور اقدامات میں بعض اوقات کسی تاویل سے بھی کام لیتے ہوں، اور اس تاویل میں وہ حق پر بھی ہوں، دراصل یہ ان تمام انسانی معاشروں کا خاصہ ہے، جن میں آزادی اور باہمی اعتماد کی فضا پائی جاتی ہو، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگر ان کے کسی اقدام کو غلط سمجھتے تو ان کے لئے عذر تلاش کرتے، اور ان کے ساتھ رعایت و تسامح کا معاملہ فرماتے، ان غلطی کرنے والوں کے لئے آپؐ کا سینۂ مبارک بہت کشادہ تھا، اور ان کی فضیلت اور دعوت وجہاد میں ان کے کارناموں، اور اسلام کے لئے ان کی سابقہ خدمات کا آپ کو ہمہ وقت احساس رہتا تھا، حدیث، سیرت اور تاریخ اسلام نے ایسے کثیر بلکہ نادر واقعات بھی محفوظ کردیئے ہیں، جو بجائے خود ان کتابوں کی امانت و دیانت اور حق گوئی اور انصاف پسندی کی شہادت اور سند ہیں۔

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صـ۴۲۱ وسیرت ابن ہشام ج ۲ صـ۳۹۶

ان واقعات میں حاطب ابن ابی بلتعہ کا واقعہ بھی ہے، یہ ان لوگوں میں ہیں، جنھوں نے مکہ سے ہجرت کی اور جنگ بدر میں شریک ہوئے، روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ روانگی کے ارادے سے صحابہ کرام کو باخبر کیا، اور خاموشی کے ساتھ اس کی تیاریاں شروع ہوگئیں تو حاطب بن ابی بلتعہ نے ایک خط لکھا جس میں ان لوگوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی روانگی کی اطلاع تھی، انھوں نے یہ خط ایک عورت کے حوالہ کیا، اور اگر وہ اس کو بحفاظت قریش تک پہونچا دے تو اس کے لئے کچھ معاوضہ کا بھی وعدہ کیا، اس نے اس خط کو اپنے بالوں کے جوڑے میں چھپالیا اور روانہ ہوگئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب غیبی طریقہ سے اطلاع ملی تو آپ نے حضرت علی و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو اس کے تعاقب میں روانہ فرمایا اور ارشاد ہوا کہ تم لوگ جاؤ جب تم روضۃ الخاخ (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے) کے قریب پہونچو گے تو تم کو وہاں ایک مسافر عورت ملے گی جس کے پاس قریش کے نام یہ خط ہوگا، یہ دونوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے وہاں پہونچے اسی جگہ یہ عورت ان کو ملی، انھوں نے اس کو سواری پر سے اترنے پر مجبور کیا اور کہا کہ تمھارے پاس کوئی خط ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے، انھوں نے اس کے سامان واسباب کی تلاشی لی، لیکن کچھ نہ ملا، حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ میں خدا کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بات غلط نہیں ہوسکتی، نہ ہم غلط کہتے ہیں، بخدا تجھے یہ خط نکالنا پڑے گا، ورنہ ہم تیری جامہ تلاشی لیں گے، جب اس نے دیکھا کہ یہ لوگ اس پر اڑے ہوئے ہیں، تو اس نے کہا کہ منہ ادھر کرلو، انھوں نے منہ ادھر کرلیا، اس نے اپنے جوڑے کو کھول کر یہ خط نکالا، اور ان کے حوالے کیا،

یہ دونوں حضرات خط لے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے، یہ حاطب رضؓ بن ابی بلتعہ کا خط تھا، جس میں قریش کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی روانگی کی اطلاع تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حاطب رضؓ کو طلب فرمایا، انھوں نے حاضر ہو کر کہا کہ یا رسول اللہ آپؐ عجلت نہ فرمائیں، خدا کی قسم میں اللہ اور رسولؐ پر ایمان رکھتا ہوں، نہ میں نے اپنا دین تبدیل کیا ہے، نہ اپنی وفاداری لیکن میرا قریش سے ویسا تعلق نہیں، جیسا ان مہاجرین کا ہے، جن کی ان میں قرابتیں اور خاندانی تعلقات ہیں، جو ان کے عزیزوں کے پشت پناہ بن سکتے ہیں، میرا معاملہ یہ ہے کہ میں صرف ان کا حلیف ہوں، میرے گھر کے لوگ اور بچے تو وہاں ہیں لیکن ان کو خاندانی طور پر کوئی حمایت و پشت پناہی حاصل نہیں[1]، میں نے سوچا کہ جب مجھے یہ چیز حاصل نہیں ہے تو میں ان پر کوئی ایسا احسان کر دوں جس سے میرے خاندان کے لوگ محفوظ رہیں، حضرت عمر رضؓ نے یہ سن کر کہا یا رسول اللہؐ مجھے اجازت دے دیجئے میں اسی وقت اس کی گردن اڑا دوں، اس لئے کہ اس نے

---

[1] حاطب ابن ابی بلتعہ کا تعلق قبیلۂ لخم سے تھا، جو شمالی حجاز اور شام کے عربی قبائل میں سے ہے، وہ قریش میں کس کے حلیف تھے، اس کے بارے میں کئی اقوال ہیں، ایک یہ کہ وہ بنی اسد ابن عبد العزیٰ کے حلیف تھے، کوئی ان کو حضرت زبیر رضؓ کا حلیف بتاتا ہے، کسی کا بیان ہے کہ عبد اللہ بن حمید اسدی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ (ملاحظہ ہو "الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ" للعلامہ احمد ابن حجر العسقلانی ج ۱ صفحہ ۳۰۰)

مشہور روایت کے مطابق مقوقس شاہ مصر کے نام حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا خط لے کر وہی گئے تھے، مرزبانی نے "معجم الشعراء" میں ان کو جاہلیت میں قریش کے شہسواروں اور شعراء میں شمار کیا ہے، مدائنی کے بیان کے مطابق سنہ ۳۰ھ میں زمانۂ خلافت حضرت عثمان رضؓ میں ان کا انتقال ہوا۔

اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ خیانت کی ہے اور منافق لوگوں میں ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ بدر میں شریک تھے اور عمر تمھیں کیا معلوم کہ کہیں اللہ تعالےٰ نے اہلِ بدر کو مخاطب کر کے فرمادیا ہو کہ تم جو چاہو کرو میں نے تمھارے سب قصور معاف کر دیئے ہیں، یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے انھوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ زیادہ جانتے ہیں[1]۔

غرض رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رمضان میں مدینہ سے روانہ ہوئے لشکرِ اسلام دس ہزار صحابیوں پر مشتمل تھا[2] "مرّ الظہران" میں آکر اس نے منزل کی، اس نقل و حرکت سے اللہ تعالےٰ نے قریش کو بالکل بے خبر رکھا، اور وہ خوف و بے یقینی اور انتظار کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہو گئے۔

پروانۂ معافی

راستہ میں آپ کو آپ کے چچا زاد بھائی ابوسفیان (ابن الحارث بن عبدالمطلب) ملے آپؐ نے ان سے منہ پھیر لیا، اس لئے کہ انھوں نے آپؐ کو بڑی ایذا پہونچائی تھی، اور آپؐ کی ہجو کہی تھی، انھوں نے حضرت علیؓ سے اس بات کا شکوہ کیا، انھوں نے کہا کہ تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے روئے مبارک کے سامنے کی طرف آؤ، اور وہ کہو جو برادرانِ یوسف نے یوسف علیہ السلام سے کہا تھا "تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ"[3] (خدا کی قسم خدا نے تم کو ہم پر فضیلت بخشی ہے اور بے شک ہم خطاکار تھے) اس لئے کہ آپ یہ پسند نہیں فرماتے کہ اچھی اور نرم بات کہنے میں آپ سے

---

[1] زاد المعاد ج ا ص۴۲۲، صحاح میں بھی یہ قصہ مروی ہے، ترجمہ کے وقت صحیح بخاری کے الفاظ پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ [2] باب غزوۃ الفتح فی رمضان، صحیح بخاری۔ [3] سورۂ یوسف۔۹۱

کوئی پڑھ جائے، انھوں نے یہی کیا اور سامنے آکر یہ آیت پڑھی، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ "[1] (آج تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ تعالے انھیں معاف فرمائے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحیم ہے) اس کے بعد بہت اچھے اور راسخ مسلمانوں میں ان کا شمار ہوا، لیکن اسلام لانے کے بعد پھر کبھی انھوں نے شرم کے مارے آپؐ سے آنکھیں چار نہیں کیں[2]۔

ابوسفیان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ آگ کے الاؤ روشن کئے جائیں، چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی، اسی وقت ابوسفیان بن حرب جاسوسی کی غرض سے اور حالات کا اندازہ کرنے کے لئے اُدھر سے گذرے اور ان کے منہ سے نکلا کہ اس شان کا لشکر اور اس طرح کی روشنی تو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، حضرت عباسؓ (بن عبد المطلب) اس سے پہلے ہجرت کر چکے تھے، اور اس لشکر میں موجود تھے انھوں نے ابوسفیان کی آواز پہچان لی، اور کہا دیکھو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں میں تشریف فرما ہیں، کل قریش کا انجام کتنا ہولناک ہوگا، پھر یہ سوچ کر کہ کوئی مسلمان ان کو دیکھ لے گا تو فوراً ان کا کام تمام کر دے گا، اپنے خچر کے پیچھے انھیں بٹھا لیا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک ان پر پڑی تو آپؐ نے فرمایا ابوسفیان تمھارا بھلا ہو، کیا ابھی تک اس کا

---

[1] سورۂ یوسف ۔ ۹۲ [2] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۱

وقت نہیں آیا کہ تم اس پر ایمان لاؤ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟

انھوں نے کہا میرے ماں باپ آپؐ پر قربان آپؐ کتنے حلیم اور کتنے کریم ہیں! اور کس قدر صلہ رحمی کرنے والے ہیں، خدا کی قسم میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور معبود کا وجود ہوتا تو آج میرے کچھ کام آتا، آپؐ نے فرمایا ابو سفیان! خدا تمھیں سمجھ دے کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا کہ تم اس بات کا اقرار کرو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟!

ابو سفیان نے کہا میرے ماں باپ آپؐ پر قربان آپ کتنے حلیم، کتنے کریم اور کتنے صلہ رحمی کرنے والے ہیں لیکن جہاں تک اس معاملہ کا تعلق ہے اس بارے میں مجھے ابھی کچھ شبہ ہے۔

حضرت عباسؓ نے فرمایا "بندۂ خدا قبل اس کے کہ تمھاری گردن تلوار سے اڑا دی جائے اسلام قبول کر لو، اور گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، یہ سن کر ابو سفیان اسلام لائے اور شہادت دے کر اس فریضہ سے عہدہ برآ ہوئے۔[1]

معافی کی صدائے عام

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے معافی اور امن و حفاظت کا دائرہ اس روز وسیع فرما دیا کہ اہل مکہ میں سے صرف وہی شخص ہلاک ہو سکتا تھا جو خود معافی و سلامتی کا خواہشمند نہ ہو اور اپنی زندگی سے بیزار ہو، آپ نے فرمایا کہ جو ابو سفیان

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۰۳ و زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۲

کے گھر میں داخل ہو جائے گا، اس کو پناہ ملے گی، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے گا، وہ محفوظ ہے جو مسجد (حرام) میں داخل ہوگا اس کو امن ہے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اہل لشکر کو ہدایت فرمائی کہ مکہ داخل ہوتے وقت صرف اس شخص پر ہاتھ اٹھائیں جو ان کی راہ میں حائل ہو اور ان کی مزاحمت کرے، آپ نے اس کا بھی حکم فرمایا کہ اہل مکہ کی منقولہ و غیر منقولہ جائداد کے معاملہ میں مکمل احتیاط برتی جائے، اور اس میں مطلق دست درازی نہ کی جائے۔[2]

ابوسفیان فتح کے جلوس کا نظارہ کرتے ہوئے

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ہدایت کی کہ ابوسفیان کو ایسی جگہ لے جائیں جہاں سے اسلامی دستوں کی پیشقدمی کا نظارہ ہو سکے۔

یہ فاتحانہ دستے سمندر کی موجوں کی طرح متلاطم نظر آتے تھے، مختلف قبائل اپنے اپنے جھنڈوں کے ساتھ گذر رہے تھے، جب کوئی قبیلہ گذرتا تو ابوسفیان عباس رضی اللہ عنہ سے اس کا نام دریافت کرتے، اور کہتے کہ مجھے اس قبیلہ سے کیا سروکار ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس ایک مسلح دستے میں تشریف لائے، جو سبز معلوم ہو رہا تھا، یہ مہاجرین و انصار کا ایسا آہن پوش دستہ تھا کہ ان کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔

ابوسفیان نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ خدا کی شان، عباسؓ یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۰۹ یہ روایت صحیح بخاری میں مختصر طور پر آئی ہے، باب "أین رکز النبی ﷺ الرأیۃ یوم الفتح"۔ [2] ایضاً۔

جواب دیا یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں جو مہاجرین و انصار کے جلو میں تشریف لے جا رہے ہیں انھوں نے کہا ان میں سے کسی کو اس سے پہلے یہ طاقت اور شان و شوکت حاصل نہ تھی، خدا کی قسم اے ابوالفضل! تمھارے بھتیجے کا اقتدار آج کی صبح کتنا عظیم ہے انھوں نے کہا کہ ابوسفیان یہ نبوّت کا معجزہ ہے۔

اس کے بعد ابوسفیان نے بلند آواز سے اعلان کیا کہ اے قریش کے لوگو! یہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اتنی طاقت کے ساتھ تمھارے پاس آئے ہیں جس کا تم کو کبھی تجربہ نہ ہوا ہوگا، اب جو ابوسفیان کے گھر میں آجائے گا اس کو امان دی جائے گی لوگ یہ سن کر کہنے لگے، اللہ تم سے سمجھے تمھارے گھر کی حقیقت ہی کیا ہے کہ ہم سب کو اس میں پناہ مل سکے؟ پھر انھوں نے کہا جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے گا اس کو امان ملے گی، جو مسجد (مسجد حرام) میں چلا جائے گا، اس کو امان ملے گی، چنانچہ لوگ منتشر ہوگئے، اپنے اپنے گھروں اور مسجد حرام میں پناہ گیر ہوئے۔[1]

نیاز مندانہ، نہ کہ فاتحانہ داخلہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ سر مبارک عبدیت و تواضع کے غلبہ سے بالکل جھک گیا تھا قریب تھا کہ آپؐ کی ٹھوڑی اونٹنی کے کجاوہ سے لگ جائے آپؐ داخل ہوتے وقت سورۂ فتح پڑھ رہے تھے۔[2]

---

[1] ایضاً ص۴۰۴ و زاد المعاد ج ا ص۴۲۳ [2] ابن کثیر ج ۳ ص۵۵۳ صحیح بخاری میں معاویہ بن قرّہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کے دن اس حالت میں دیکھا کہ آپ اپنی اونٹنی پر تشریف رکھتے تھے، اور سورۂ فتح ترجیع کے ساتھ تلاوت فرما رہے تھے۔

مکہ کے اس فاتحانہ داخلہ میں (جو جزیرۃ العرب کا قلب و جگر اور روحانی وسیاسی مرکز تھا) عدل و مساوات تواضع اور اظہار عبدیت کا کوئی انداز نہ تھا جس کو آپؐ نے اختیار نہ فرمایا ہو، اسامہؓ کو جو آپ کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) حضرت زید کے صاحبزادہ تھے، آپؐ نے اپنی سواری کے پیچھے جگہ دی بنی ہاشم اور اشراف قریش میں سے جن کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی، یہ شرف کسی کو حاصل نہ ہوا، یہ واقعہ جمعہ کی صبح ۲۱ رمضان کا ہے۔[1]

فتح کے روز ایک شخص نے آپؐ سے گفتگو کی تو اس پر کپکپی طاری ہو گئی، آپؐ نے فرمایا ڈرو نہیں اطمینان رکھو میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں میں تو قریش کی ایک ایسی عورت کا لڑکا ہوں جو گوشت کے سوکھے ٹکڑے کھایا کرتی تھی۔[2]

معافی ورحم کا دن ہے خونریزی کا نہیں

جب سعد بن عبادہؓ جو انصار کے دستہ کے امیر تھے، ابوسفیان کے پاس سے گذرے، انھوں نے کہا "الیوم یوم الملحمۃ، الیوم تُستحلّ الکعبۃ، الیوم أذلّ اللّٰہ قریشا" (آج گھمسان کا رن ہے، اور خونریزی کا دن ہے آج کعبہ میں سب جائز ہوگا، آج اللہ تعالیٰ نے قریش کو ذلیل کیا ہے) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستہ میں ابوسفیان کے پاس سے گذرے تو انھوں نے آپؐ سے اس کی شکایت کی، اور کہا کہ یا رسول اللہ آپؐ نے سنا، سعد نے ابھی کیا کہا؟ آپؐ نے فرمایا کیا کہا ہے؟ انھوں نے وہ سب دہرا دیا، سعد کے جملہ کو آپؐ نے ناپسند فرمایا اور فرمایا "الیوم یوم

---

[1] ابن کثیر ج ۳ ص ۵۵۶ [2] صحیح بخاری کتاب المغازی "باب حجۃ الوداع"

المرحمة، الیوم یعز اللہ قریشا، ویعظم اللہ الکعبة" (نہیں آج تو رحم و معافی کا دن ہے آج اللہ تعالیٰ قریش کو عزت عطا فرمائے گا، اور کعبہ کی عظمت بڑھائے گا)[1]

آپؐ نے حضرت سعدؓ کو بلوا بھیجا اور اسلامی پرچم ان سے لے کر ان کے صاحبزادے قیسؓ کے حوالہ کیا، آپؐ نے یہ خیال فرمایا کہ ان کے صاحبزادے کو پرچم دینے کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ گویا پرچم ان سے واپس نہیں لیا گیا ہے۔[2]

اس طرح ایک حرف کی تبدیلی (الملحمہ کے بجائے المرحمہ فرما دینے) اور ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے تبدیل کر دینے سے (جن میں سے ایک باپ کا ہاتھ تھا، دوسرا بیٹے کا) آپؐ نے سعد بن عُبادہ (جن کے ایمانی اور مجاہدانہ کارنامے اظہر من الشمس تھے) کی ادنیٰ دلشکنی کے بغیر ابوسفیان کی (جن کو تالیفِ قلب کی ضرورت تھی) دلجوئی کا سامان ایسے حکیمانہ بلکہ معجزانہ طریقہ پر انجام دے دیا، جس سے بہتر طریقہ پر تصوّر میں آنا مشکل ہے، باپ کے بجائے، ان کے بیٹے کو یہ منصب عطا کر دیا، جس سے ابوسفیان کے زخم خوردہ دل کی تسکین منظور تھی، دوسری طرف آپ سعد بن عبادہ کو بھی آزردہ خاطر نہیں دیکھنا چاہتے تھے، جنھوں نے اسلام کے لئے بڑی خدمات انجام دی تھیں۔

---

[1] ابن اموی نے مغازی میں اس روایت کا ذکر کیا ہے (دیکھئے فتح الباری ج ۸ ص۸) صحیح بخاری میں یہ واقعہ الفاظ کے تھوڑے اختلاف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اس میں سعد بن عبادہ کے سوال اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جواب کا ذکر ہے، اموی کا پورا نام یحیٰی بن سعید بن ابان ہے، اور ان کا شمار معتبر رُواۃ میں ہے جس کے لئے حدیث کی اصطلاح میں صدوق کا لفظ آتا ہے، اصحابِ صحاح نے ان سے روایت کی ہے، ان کی وفات ۱۹۴ھ میں ہوئی [2] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۳

معمولی جھڑپیں

اس موقع پر صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمرو اور خالد بن ولید کے ساتھیوں کے درمیان کچھ جھڑپیں ہوئیں، جن میں تقریباً ایک درجن مشرکین مارے گئے، اس کے بعد انھوں نے شکست قبول کر لی، اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلامی لشکر کے سالاروں کو یہ ہدایت فرما دی تھی کہ جب وہ مکہ میں داخل ہوں تو صرف اس پر ہاتھ اٹھائیں جو ان پر ہاتھ اٹھائے۔[1]

حرم سے بتوں کی صفائی

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں اپنے مقام پر پہونچ گئے اور لوگ بھی مطمئن ہو گئے تو اس وقت آپ باہر تشریف لائے، بیت اللہ کی طرف روانہ ہوئے، وہاں جا کر بیت اللہ کے گرد طواف کیا، اس وقت آپؐ کے دست مبارک میں ایک کمان تھی، کعبہ میں تین سو ساٹھ[3٦٠] بُت تھے آپؐ اس کمان سے ان بتوں کو کونچتے تھے، اور فرماتے تھے :-

جَاۤءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ — حق آگیا اور باطل مٹ گیا،

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ — اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی۔

(سورۂ اسراء - ۸۱)

اسی کے ساتھ یہ تمام ایک ایک کر کے منہ کے بل گرتے جاتے۔[2]

آپؐ کو کعبہ میں کچھ تصویریں اور شبیہیں بھی نظر آئیں اور آپ کے حکم سے

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۰۷-۴۰۸ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۱۷ و زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۴

ان کو بھی توڑ پھوڑ دیا گیا۔[1]

آج حسن سلوک اور پاسِ وفا کا دن ہے

جب آپؐ نے طواف پورا فرمالیا تو عثمانؓ بن طلحہ کو جو کعبہ کے کلید بردار تھے بلوایا، کعبہ کی کلید اُن سے لی دروازہ کھولا گیا، اور آپؐ کعبہ میں داخل ہوئے، اس سے پہلے جب آپؐ نے مدینہ ہجرت سے قبل ایک دن یہ کلید طلب فرمائی تھی، تو انھوں نے سخت جواب دیا تھا، اور آپؐ سے اہانت آمیز گفتگو کی تھی، اور آپؐ نے حلم اور بُردباری سے کام لیتے ہوئے یہ فرمایا تھا، عثمانؓ! تم یہ کلید کسی وقت میرے ہاتھ میں دیکھو گے، اس وقت میں جسے چاہوں گا اُسے یہ دوں گا" اس کے جواب میں انھوں نے کہا تھا، اگر ایسا ہوا تو وہ دن تو قریش کی بڑی ذلت وتباہی کا ہوگا" آپؐ نے فرمایا "نہیں اس دن وہ آباد اور باعزت ہوں گے" یہ الفاظ عثمان بن طلحہ کے دل نشین ہوگئے اور انھوں نے محسوس کیا کہ جیسا آپؐ نے فرمایا ہے ویسا ہی ہوگا۔[2]

جب آپؐ کعبہ سے باہر تشریف لائے تو کنجی آپؐ کے دستِ مبارک میں تھی، آپؐ کو دیکھتے ہی حضرت علیؓ کھڑے ہوگئے اور عرض کیا، اللہ آپؐ پر درود وسلام بھیجے آپؐ سقایہ (پانی پلانے کا انتظام) کے ساتھ حجابہ (بیت اللہ کی دربانی) بھی ہمیں عطا فرمائیں، آپؐ نے فرمایا عثمان بن طلحہ کہاں ہیں؟ ان کو بلایا گیا،

---

[1] زاد المعاد ج ا صـ۴۲۴ نیز ملاحظہ ہو صحیح بخاری باب (این رکز النبی صلے اللہ علیہ وسلم الرأیۃ یوم الفتح) [2] زاد المعاد ج ا صـ۴۲۵ صحیح بخاری میں بھی یہ واقعہ آیا ہے۔

آپؐ نے فرمایا عثمان! لو یہ تمھاری کنجی ہے، آج حسنِ سلوک اور پاسِ وفا کا دن ہے، یہ کنجی لو جو تمھارے پاس ہمیشہ ہمیشہ رہے گی، اور ظالم کے سوا کوئی تم سے اس کو چھین نہ سکے گا۔[1]

توحیدِ حق اور وحدتِ انسانی کا دین

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب کعبہ سے نکلنے کے لئے اس کا دروازہ کھولا تو قریش پورے حرم میں صف بستہ کھڑے تھے، اور منتظر تھے کہ اب آپؐ کیا کرنے والے ہیں، آپؐ نے دروازے کے دونوں بازو تھام لئے، تمام لوگ آپؐ کے نیچے تھے، پھر آپؐ نے فرمایا:۔

لا إله الا الله وحدہٗ	ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں
لا شریك لهٗ صدق وعدہ	ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس نے
ونصر عبدہٗ وهزم الاحزاب	اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندہ کی مدد
وحدہٗ، اَلَا کُلُّ مأثرة ومال	کی اور تمام جتھوں کو تنہا شکست
ودم فهو تحت قدمیَّ هاتين	دی، یاد رکھو کہ تمام مفاخر، تمام
الاسدانة البيت وسقاية	انتقامات، خون بہا سب میرے
الحجاج، یامعشر قریش	قدموں کے نیچے ہیں، صرف کعبہ کی
إن الله قد اذهب عنکم	تولیت اور حجاج کی آب رسانی
نخوة الجاهلية وتعظمها	اس سے مستثنیٰ ہیں، اے قوم قریش،

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۵ طبقات ابن سعد کے حوالہ سے۔

بالآباء، الناس من آدم وآدم من تراب۔

اب جہالت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا، تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی :۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

(سورۂ حجرات ۱۳)

لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھاری قوم اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو، اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے، بے شک خدا سب کچھ جاننے والا (اور) سب سے خبردار ہے۔

نبیِ رحمتؐ

اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، اے قریشیو! تمھیں کیا توقع ہے کہ اس وقت میں تمھارے ساتھ کیا کروں گا، انھوں نے جواب دیا ہم اچھی ہی امید رکھتے ہیں، آپ کریم النفس و شریف بھائی ہیں، اور کریم و شریف بھائی کے بیٹے ہیں، آپؐ نے ارشاد فرمایا میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔

لہ زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۴

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔[1] آج تم پر کوئی الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

اس کے بعد آپؐ نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ کعبہ پر چڑھ کر اذان دیں، قریش کے سب سرداران اور اشراف نے یہ اعلان سنا اور وادی مکہ اذانِ حق سے گونج اٹھی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُم ہانی (بنت ابی طالب) کے گھر تشریف لے گئے غسل فرمایا اور اللہ تعالے کے شکرانہ میں آٹھ رکعتیں صلاۃ الفتح (فتح کی نماز) کی ادا فرمائیں۔[2]

حدود شرعیہ کے اجراء میں کوئی امتیاز روا نہیں

بنی مخزوم کی ایک عورت نے جس کا نام فاطمہ تھا، اس غزوہ میں چوری کی، اس کی برادری کے لوگ اسامہ بن زیدؓ کے پاس اس خیال سے کہ وہ رسول اللہؐ کو بہت عزیز ہیں، حاضر ہوئے اور سفارش کرانا چاہی، انھوں نے جب اس معاملہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی تو آپؐ کے روئے مبارک کا رنگ بدل گیا، آپؐ نے فرمایا کہ تم مجھ سے اللہ تعالے کی مقرر کردہ حدود میں کسی حد کے متعلق بات کرتے ہو؟ اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ آپؐ میرے لئے اللہ تعالے سے مغفرت چاہیں، شام کے وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سب لوگوں سے خطاب فرمایا پہلے اللہ تعالے کی حمد و ثنا بیان کی جو اس کی شان کے لائق ہے پھر فرمایا۔

اما بعد۔ تمھارے پہلے لوگ اس لئے ہلاک ہوئے تھے کہ ان میں سے جب کوئی شریف اور ذی حیثیت آدمی چوری کرتا تھا، تو وہ اس کو چھوڑ دیتے تھے ضعیف کمزور

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۴، [2] صحیح بخاری باب (منزل الرسول صلے اللہ علیہ وسلم یوم الفتح) و زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۵

شخص چوری کرتا تھا تو اس پر حد جاری کرتے تھے، اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمدؐ نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کے ہاتھ کاٹ دیتا۔

پھر اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ اس عورت کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں چنانچہ اس کے ہاتھ کاٹے گئے، خلوص دل سے اس نے اس عمل بد سے توبہ کی اس کے حالات سدھر گئے اور اس نے شادی بھی کرلی۔[1]

اپنے دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک

جب فتح مکمل ہوگئی اور سب لوگوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے امان عطا فرمائی، سوائے نو آدمیوں کے جن کے قتل کا حکم ہوا خواہ وہ کعبہ کے پردوں کے اندر ملیں ان میں کوئی وہ تھا، جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہوگیا، کسی نے فریب دے کر کسی مسلمان کو قتل کیا تھا، کسی نے آپؐ کی ہجو کو تفریح طبع کا سامان بنالیا تھا، اور اس کو لوگوں میں پھیلاتا تھا، ان میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح بھی تھا، جو مرتد ہوگیا تھا، عکرمہ بن ابی جہل تھا، جو اسلام کے غلبہ اور اس کے دور دورہ سے نفرت کی بنا پر اور جان کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر یمن چلا گیا تھا، اس کی بیوی نے اس کے فرار کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کے لئے امان طلب کی آپؐ نے یہ جانتے ہوئے کہ وہ روئے زمین پر آپؐ کے بدترین دشمن کا لڑکا ہے اس کو امان دی اور خوشی اور استقبال میں اس طرح اس کی طرف لپکے کہ چادر بھی جسم اطہر سے ہٹ گئی تھی۔

عکرمہ اسلام لائے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت مسرت ہوئی اسلام میں ان کو خاص مقام حاصل ہوا، ارتداد کی جنگوں اور شام کے معرکوں میں انھوں نے بڑی خدمات انجام دیں۔

ان میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا سیدنا حمزہ کے قاتل

---

[1] بخاری و مسلم، دیکھئے بخاری میں (باب مقام النبی صلے اللہ علیہ وسلم بمکۃ زمن الفتح)

(جُبیر ابن مُطعِم کے غلام) وحشی بھی تھے (جن کا خون رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مباح کردیا تھا) لیکن وہ اسلام لائے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کا اسلام قبول فرمایا۔

ان میں ہبّار بن الاسود بھی تھا جس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پہلو پر نیزہ سے حملہ کیا، یہاں تک کہ وہ اونٹ سے ایک چٹان پر گر پڑیں اور اسقاط حمل کا واقعہ پیش آیا، اس کے بعد وہ بھاگ گیا، بعد میں اس نے اسلام قبول کرلیا، اور سارہ اور دو ایک ورگانے والیوں (جو آپؐ کی ہجو میں کہے گئے اشعار کو گاتی تھیں) کے سلسلے میں بھی آپؐ سے امان چاہی گئی، آپؐ نے ان دونوں کو امان دی اور وہ دونوں مسلمان ہوگئیں۔[1]

ہند بنت عُتبہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مکالمہ

مکّہ میں ایک مجمع آپؐ سے اسلام پر بیعت کرنے کے لئے اکٹھا ہوگیا، آپؐ ان کو بیعت کرنے کے لئے کوہِ صفا پر تشریف لائے اور وہاں بیٹھ کر ان سے اللہ و رسول کی سمع وطاعت پر (جہاں تک ان کے اندر اس کی قوت ہو) بیعت لی۔

جب مردوں کو بیعت کرکے آپؐ فارغ ہوگئے تو آپؐ نے عورتوں سے بیعت لی اُن میں ابوسُفیان کی بیوی ہند بنت عُتبہ بھی تھیں، وہ نقاب میں تھیں اور سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ انھوں نے جو کچھ کیا تھا اس کی وجہ سے اپنے کو ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس پر مجھ سے بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ تم کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گی "ہند" نے کہا خدا کی قسم آپؐ ہم سے وہ اقرار لے رہے ہیں جو آپؐ نے مردوں سے نہیں لیا ہے

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۵

"اور چوری نہ کروگی" ہند نے پھر کہا کہ میں نے ابوسفیان کے مال میں سے اکثر تھوڑا تھوڑا لیا ہے، میں نہیں جانتی تھی کہ ایسا کرنا حلال ہے یا حرام، ابوسفیان نے یہ سن کر جو اس وقت موجود تھے کہا کہ جہاں تک گذشتہ کا تعلق ہے تم اس سے آزاد ہو وہ تمہارے لئے حلال ہے، اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا تم عُتبہ کی بیٹی ہند ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں، آپؐ جو کچھ گذشتہ قصور سرزد ہوئے ہیں ان کو معاف کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے، پھر آپؐ نے فرمایا "اور زنا نہ کروگی" اس نے کہا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیا کوئی شریف عورت بھی زنا کرسکتی ہے؟[۱]

اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا "اپنی اولاد کو قتل نہ کروگی"! یہ سن کر انھوں نے کہا جب تک وہ بچے رہے ہم نے انھیں پالا جب بڑے ہوئے تو آپؐ نے انھیں قتل کیا اب آپؐ جانیں اور وہ جانیں!

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ کوئی کھلا ہوا بُہتان نہ باندھوگی" ہند نے کہا، بخدا بُہتان تراشی بہت معیوب اور قبیح بات ہے، اور بعض مواقع پر چشم پوشی اور درگذر زیادہ بہتر ہے آپؐ نے فرمایا "اور میری نافرمانی نہ کروگی" اس نے کہا ہاں اچھی باتوں میں![۲]

تمھارے ہی ساتھ جینا ہے اور تمھارے ہی ساتھ مرنا ہے

جب اللہ تعالیٰ نے مکہ کے دروازے اللہ کے رسولؐ کے لئے کھول دیئے جو آپؐ کی جائے پیدائش اور اصلی وطن تھا تو انصار نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کا دیس اور وطن فتح فرما دیا ہے، اب آپؐ یہیں قیام

---

[۱] سیرت ابن کثیر ج ۳ ص ۶۰۱، [۲] ابن کثیر ج ۳ ص ۶۰۲-۶۰۳ ابن کثیر کے سوا دیگر مصادر سے معمولی اضافہ کے ساتھ۔

فرمائیں گے، مدینہ واپس نہ ہوں گے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انصار سے دریافت فرمایا کہ تم لوگ کیا بات کرتے تھے، اس بات کو ان کے سوا کوئی اور نہ جانتا تھا، یہ لوگ اس پر بہت شرمندہ ہوئے، اور آخر میں اعتراف کرلیا، آپؐ نے فرمایا "معاذ اللہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے، جینا بھی تمہارے ساتھ ہے، اور مرنا بھی تمہارے ساتھ ہے"۔[1]

دشمنوں نے آنکھیں بچھائیں اور فاسق و فاجر متقی و پرہیزگار بن گئے!

فُضالہ بن عُمیر کی نیت خراب ہوئی اور اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طواف میں مشغول ہوں تو اس وقت وہ کام کرلیا جائے جو کسی شقی سے نہیں ہو سکا تھا، جب وہ اس ارادے سے آپؐ کے قریب آیا تو آپؐ نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا فضالہ! اس نے کہا جی یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے دل میں اس وقت کیا آرہا تھا، اس نے کہا کچھ نہیں اللہ کو یاد کررہا تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ سن کر ہنسے پھر فرمایا، اللہ سے معافی چاہو، پھر اپنا دست مبارک اس کے سینہ پر رکھا اس کا دل اسی وقت پُرسکون ہوگیا، فضالہ بیان کرتے تھے کہ آپؐ نے اپنا ہاتھ میرے سینہ سے ہٹایا بھی نہیں تھا کہ اللہ تعالٰی کی ساری مخلوق میں میرے لئے آپؐ سے زیادہ محبوب کوئی اور نہ تھا۔

انھوں نے کہا کہ اس کے بعد میں اپنے گھر کی طرف چلا راستہ میں مجھے وہ عورت ملی جس سے میں کچھ باتیں کیا کرتا تھا، اس نے کہا کہ آؤ فضالہ بیٹھیں کچھ بات کریں، فضالہ کا جواب تھا، اللہ اور اسلام اب اس کی اجازت نہیں دیتا۔[2]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۱۶ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۱۷ و زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۶

جاہلیت کے آثار اور بت پرستی کے نشانات کا خاتمہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے چاروں طرف جتنے بُت تھے' ان کو ختم کرنے کے لئے سرایا بھیجے اور یہ سارے کے سارے بُت پاش پاش کر دیئے گئے، ان میں "لات وعزیٰ" اور "منات" کے بُت بھی شامل تھے' اس کے بعد آپؐ کے مُنادی نے مکہ میں اعلان کر دیا کہ ہر وہ شخص جو اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتا ہے' اس کو چاہئے کہ اپنے گھر کے ہر بُت کو توڑ دے' آپؐ نے اصحاب کرام میں سے کچھ آدمیوں کو مختلف قبائل میں بھیجا اور انھوں نے وہاں جا کر بُت شکنی کا یہ مُقدس فریضہ انجام دیا۔

جریر روایت کرتے ہیں کہ "جاہلیت میں ایک بت خانہ تھا جس کا نام "ذوالخلصہ" تھا، اسی طرح "الکعبۃ الیمانیہ" اور "الکعبۃ الشامیہ" کے نام سے بُت خانے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ کیا تم اس "ذوالخلصہ" کو پاش پاش کر کے مجھے راحت نہ پہونچاؤ گے؟ جریر کہتے ہیں کہ "میں ڈیڑھ سو شہسواروں کو لے کر (جو احمس کے تھے' اور یہ لوگ شہسوار مانے جاتے تھے) وہاں گیا، اس بُت کو بھی توڑ ڈالا اور جتنے لوگ اس وقت اس بُت کے پاس حاضر تھے' ان کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا، اس کے بعد میں نے واپس آکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر سنائی آپؐ نے ہمارے لئے اور احمس کے لئے دعا فرمائی"[۱]

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں کھڑے ہو کر اس کی حُرمت وعظمت کا اعلان کیا اور ارشاد فرمایا کہ "کسی شخص کے لئے جو اللہ اور آخرت کے دن پر

---

[۱] صحیح بخاری باب غزوۃ ذی الخلصۃ۔

ایمان لا چکا ہے، یہ جائز نہیں کہ اس میں خون بہائے یا یہاں کے کسی درخت کو کاٹے آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ نہ مجھ سے پہلے کسی شخص کے لئے یہاں ایسا کرنا جائز تھا اور نہ میرے بعد کبھی کسی کے لئے جائز ہوگا" اس کے بعد آپؐ مدینہ تشریف لے آئے۔[۱]

فتح مکہ کے اثرات

فتح مکہ کا عربوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر پڑا اللہ تعالٰے نے ان کے دل قبولِ اسلام کے لئے کھول دیئے اور انھوں نے وفدوں اور جماعتوں کی شکل میں آ آ کر بکثرت اسلام قبول کرنا شروع کیا، کچھ ایسے قبیلے تھے، جو قریش کے ساتھ کسی نہ کسی معاہدہ سے وابستہ تھے، اور اس معاہدہ کی پابندی ان کے قبولِ اسلام میں رکاوٹ بن رہی تھی، کچھ قبیلے قریش سے ڈرتے تھے، اور قریش کی بڑائی و عظمت ان کے دل میں گھر کر چکی تھی، جب انھوں نے دیکھا کہ خود قریش نے اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں، اور سر تسلیم خم کر دیا ہے، تو ان کو بھی اس کا شوق پیدا ہوا، اور یہ رکاوٹ دور ہوگئی۔

بعض قبیلے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ مکہ میں کوئی ظالم و جابر داخل نہیں ہو سکتا ہے نہ اس کو بری نیت سے فتح کر سکتا ہے، ان میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کے سامنے واقعۂ فیل پیش آیا تھا، اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ابرہہ کا کیا انجام ہوا، وہ کہتے تھے جانے دو، ان کے اور ان کی قوم کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں، اگر وہ ان پر غالب آئے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ وہ نبی برحق ہیں[۲] جب اللہ تعالٰے نے اپنے نبی کے ہاتھ پر مکہ کو فتح فرمایا، اور قریش خواستہ یا

---

[۱] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۲۵-۴۲۶، [۲] صحیح بخاری روایت عمرو بن سلمہ رض (باب مقام النبی بمکہ زمن الفتح)

نخواستہ اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوئے تو عربوں کا اسلام کی طرف ایسا رجوعِ عام ہوا کہ اس سے پہلے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ان کی بڑی بڑی جماعتیں اور قبیلے آپ ؐ کے پاس حاضر ہوتے اور اپنے نصیبِ خفتہ کو بیدار کرتے اسی موقع کے لئے اللہ تعالے نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے:۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ	جب اللہ کی مدد آپہونچی اور فتح
وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ	(حاصل ہوگئی) اور تم نے دیکھ لیا کہ
فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا[۱]	لوگ غول کے غول خدا کے دین میں
(سورۃ النصر۔ ۱۔۲)	داخل ہو رہے ہیں۔

کمسن امیر

مکہ کو الوداع کہنے سے پہلے آپ ؐ نے عتّاب بن اُسید کو مکہ کے معاملات اور حج کے انتظامات کی دیکھ بھال کے لئے امیر مقرر کیا[۲]، ان کی عمر اس وقت بیس[۲] سال کے لگ بھگ تھی، حالاں کہ ان سے زیادہ سن رسیدہ بزرگ اور اربابِ فضل و کمال اس وقت موجود تھے، یہ اس بات کی علامت تھی کہ عہدے اور منصب اہلیت اور قوت و صلاحیت کی بنیاد پر ملتے ہیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں ان کو اس عہدے پر بدستور باقی رکھا[۳]۔

---

[۱] استفادہ از "رحمۃ للعالمین" مؤلفہ مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری۔

[۲] ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۴۴۰ [۳] الاصابۃ واسد الغابۃ۔

غزوۂ حُنین

(شوال ۸ھ)

شمع اسلام کو پھونکوں سے بجھانے کی ایک اور ناکام کوشش

جب فتح مکّہ کی تکمیل ہو گئی اور لوگوں نے بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کیا تو اس وقت گرد و پیش کی آبادی نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا دیا، یہ دراصل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ اور جزیرۃ العرب میں اسلام کے فروغ اور اشاعت کو روکنے کی ایک مایوسانہ کوشش تھی۔

ہوازن کا اجتماع

قبیلۂ ہوازن قریش کے بعد نمبر دو کی طاقت سمجھی جاتی تھی، ان کے اور قریش کے درمیان رقابت اور مقابلہ کا جذبہ پہلے سے موجود تھا چنانچہ قریش نے اسلام کی اُبھرتی ہوئی طاقت کے سامنے ہتھیار رکھ دیئے اور اپنی شکست تسلیم کر لی لیکن ہوازن نے اپنا سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا، بلکہ اس کے اندر یہ جذبہ اور شوق پیدا ہو گیا کہ اسلام کی بیخ کنی کا سہرا اُس کے سر بندھے اور عرب میں

اس کے اس کارنامہ کی شہرت ہو اور لوگ کہیں کہ جو کام قریش نہ کر سکے اس کو ہوازن نے کر دکھایا۔

قبیلہ کے سردار مالک بن عوف النصری نے اعلانِ جنگ کیا، خود ان کے قبیلے ہوازن کے ساتھ پورے قبیلہ ثقیف اور قبائل "نصر و جشم" اور سعد بن بکر نے ان کی آواز پر لبیک کہا، کعب اور کلاب نے ان کی حمایت نہیں کی، سب نے مل کر صف آرائی کر کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف پیش قدمی کا پروگرام بنایا اور مال و متاع، عورتیں اور بچے لشکر کے ساتھ رکھے تاکہ گھر والوں کی عزّت و ناموس کے خیال سے وہ پامردی سے مقابلہ کریں اور راہ فرار اختیار نہ کر سکیں۔

اس معرکہ میں دُرید بن الصمّہ بھی شریک تھا، جو ایک سن رسیدہ اور تجربہ کار شخص تھا، اور بہت عقلمند اور صائب الرائے سمجھا جاتا تھا، ان کا یہ لشکر "اوطاس"[۱] میں اُترا، حالت یہ تھی کہ اونٹوں کی بلبلاہٹ گدھوں، خچروں کی چیخ پکار، بکریوں کے ممیانے اور بچوں کے رونے چلانے سے لشکر کے اندر ایک شور برپا تھا، مالک بن عوف (سردار قبیلہ) نے اپنے سپاہیوں کو ہدایت کی کہ تم مسلمانوں کو دیکھنا تو اپنی تلواروں کے نیام توڑ دینا اور ایک ساتھ پوری طاقت سے حملہ کرنا۔[۲]

دوسری طرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کے دو ہزار مسلمان تھے جن میں سے کچھ لوگ نئے نئے اسلام لائے تھے کچھ لوگوں کے ابھی اسلام قبول کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی اس کے علاوہ آپؐ کے اصحاب کرامؓ اور فدائیانِ اسلام کی

---

[۱] قبیلۂ ہوازن کے علاقہ میں طائف کے نزدیک ایک مقام ہے جہاں غزوۂ حنین پیش آیا۔

[۲] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۳۷-۴۳۹

دس ہزار فوج آپؐ کے ساتھ تھی، جو مدینہ سے آپؐ کے ساتھ نکلے تھے، اس طرح ان کی تعداد اب تک کے تمام غزوات سے زیادہ تھی، یہ دیکھ کر کچھ مسلمان کہنے لگے کہ آج ہم قلتِ تعداد کی وجہ سے شکست نہیں کھا سکتے، کثرت تعداد پر ان کو ایک طرح کا ناز سا ہو گیا۔[1]

اس موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن اُمیہؓ سے (باوجود اس کے کہ وہ مشرکین میں سے تھے) کچھ زرہیں اور ہتھیار وغیرہ مستعار لئے اور ہوازن کے معرکہ کی نیت سے تشریف لے چلے۔[2]

اب بُت پرستی واپس نہیں آسکتی خواہ کسی شکل میں ہو!

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس لشکر میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جو ابھی ابھی تازہ تازہ جاہلی زندگی کو ترک کر کے اسلام میں داخل ہوئے تھے، قصہ یہ تھا کہ عرب میں بعض قبائل کو ایک بڑے اور سرسبز درخت سے جس کا نام "ذات انواط" تھا خاص عقیدت تھی، وہ اس میں اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے، قربانیاں کرتے تھے، اور ایک دن اس کے نیچے قیام کرتے تھے، چنانچہ جب دوران سفر میں یہ درخت انھیں نظر آیا تو جاہلیت کی اُن قدیم رسموں اور باتوں کو یاد کر کے اور ان زیارت گاہوں کو دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا اور بے ساختہ کہنے لگے یا رسول اللہؐ! جیسا ان لوگوں کا "ذات انواط" تھا ویسا ہی ایک ہمارے لئے بھی مرکزِ عقیدت تجویز فرما دیجیے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] تفسیر طبری ج ۱۰ ص ۶۲-۶۳ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۴۰

یہ سن کر فرمایا، اللہ اکبر! اس کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے تم نے مجھ سے ایسی فرمائش کی ہے، جیسے موسیٰ کی قوم (یہود) نے موسیٰؑ سے کی تھی اور کہا تھا "اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۚ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ"[1] (آپ ہمارے لئے بھی ایک معبود بنا دیجئے جیسے ان کے بہت سے معبود ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ تم بڑی جہالت کی باتیں کرنے والی قوم ہو) پھر آپؐ نے فرمایا "بے شک تم اپنی پیشرو قوموں کی ایک ایک بات اور طریقہ کی پیروی کرو گے"[2]

وادیٔ حُنَین میں

جب مسلمان وادیٔ حُنین میں پہونچے تو شوال کی دسویں تاریخ (۸ھ) تھی، انھوں نے صبح کے دھندلکے میں نشیب کی طرف اترنا شروع کیا، ہوازن ان سے پہلے اس وادی میں پہونچ چکے تھے، اور اس کی گھاٹیوں، تنگ راستوں اور آڑوں میں کمین گاہیں اور مورچے بنا لئے تھے، مسلمانوں کو صرف اتنا نظر آیا کہ انھوں نے ان کو اپنے تیروں پر رکھ لیا ہے اور تلواریں بے نیام ہیں، انھوں نے ایک ساتھ اور ایک وقت میں بھرپور حملہ کیا، وہ مانے ہوئے تیر انداز تھے[3]

اکثر مسلمان اس اچانک حملے سے گھبرا کر پیچھے کی طرف پلٹے کوئی کسی کو دیکھتا نہ تھا کہ وہ کہاں ہے[4] یہ ایک خطرناک اور فیصلہ کن لمحہ تھا، اور قریب تھا کہ جنگ کا پانسہ مسلمانوں کے خلاف پلٹ جائے، پھر اس کے بعد ان کو سنبھلنے اور اپنا مرکز قائم رکھنے کی بھی گنجائش

---

[1] سورۂ الاعراف - ۱۳۸ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۴۲، اصل روایت صحاح میں بھی ہے۔
[3] ابن ہشام ص ۴۴۲-۴۴۳-۴۴۴ [4] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۴۶

نہ لے، یہاں جو کچھ ہوا وہ غزوۂ احد سے بہت مشابہ تھا، جب یہ مشہور ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں، اور وہاں مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے تھے۔

دشمنوں کی شماتت اور ضعیف الایمان لوگوں کی لغزشیں

مکہ کے اکھڑ لوگ جو آپ کے ہمراہ اس لشکر میں تھے، اور جن کے دلوں میں ابھی ایمان اُترا نہ تھا، ہزیمت کی یہ شکل دیکھ کر مختلف باتیں کرنے لگے، دلوں کا چھپا ہوا کینہ اس وقت ان کی زبانوں پر آ گیا، انھوں نے کہا اب سمندر سے اِدھر ان کی ہزیمت کا سلسلہ ختم نہ ہوگا، بعض لوگ کہنے لگے آج ان کا جادو ٹوٹ گیا۔[۱]

فتح اور سکینت

مسلمانوں کو جس قدر تادیب اور تنبیہ اللہ تعالےٰ کو منظور تھی وہ ہو گئی، اور کثرتِ تعداد پر خوش ہونے کی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے ان کو فتح کی حلاوت کے بعد پھر شکست کی تلخی کا مزہ بھی چکھایا تا کہ ان کا ایمان مضبوط ہو اور فتح سے ان کے اندر کوئی اترا ہٹ اور ہزیمت سے کسی قسم کی مایوسی پیدا نہ ہو تو اس نے پھر ان کو حملہ کی پوزیشن میں پہونچا دیا، اور اپنے رسول اور تمام مسلمانوں پر ایک قسم کی سکینت نازل فرمائی، جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس وقت اپنے سفید رنگ خچر (شہباء) پر اپنی جگہ اسی طرح بے خوف و بے تردّد تشریف فرما تھے، آپ کے ساتھ مہاجرین، انصار اور اہلِ بیت کے بہت کم افراد باقی رہ گئے تھے، عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ

---

[۱] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۴۲-۴۴۴ اختصار کے ساتھ۔

آپ کے خچر کی لگام تھامے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے جاتے تھے۔

انا النبیُّ لا کَذِبْ ــــــــ انا ابنُ عبد المُطَّلِبْ[1]

میں پیغمبر صادق ہوں ــــــــ میں فرزند عبد المطلب ہوں

اس حالت میں جب مشرکین کے دستے آپؐ کے سامنے آئے تو آپؐ نے ایک مٹھی مٹی لے کر دشمنوں کی آنکھوں میں دور تک اس طرح پھینک دی کہ وہ ان کی آنکھوں میں بھر گئی۔ جب آپؐ نے ملاحظ فرمایا کہ ہر شخص اپنی فکر میں ہے تو ارشاد ہوا کہ عباس یہ آواز دو کہ "یامعشر الأنصار یا أصحاب السمرۃ" (اے انصار اے "ببول" کے درخت والو[2]) انھوں نے سنتے ہی کہا لبیک! لبیک! ان کی آواز بہت بلند تھی جب اُن کی آواز کسی آدمی تک پہونچی تو وہ اسی وقت اپنے اونٹ سے کود پڑتا اور اپنی تلوار اور ڈھال لے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو جاتا، جب ایک جماعت اس طرح تیار ہو گئی تو انھوں نے کفار سے مقابلہ شروع کر دیا اور دونوں فریق گتھ گئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے دستہ کے ساتھ بلندی پر تشریف لائے آپؐ نے دیکھا کہ دونوں فریق برسرپیکار ہیں یہ منظر دیکھ کر آپؐ نے فرمایا اب تنور گرم ہو گیا ہے (زور کا رن پڑا ہے[3]) اس کے بعد آپؐ نے کچھ کنکریاں لے کر کفار کی طرف پھینکدیں عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں برابر دیکھتا رہا کہ دشمن کی تیزی ماند پڑ رہی ہے، اور وہ پسپا ہوتے نظر آرہے ہیں۔[4]

---

[1] صحیح بخاری (باب قولہ تعالیٰ "اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ") اس روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ ابو سفیان بن الحارث آپؐ کے سفید خچر کی باگ تھامے ہوئے تھے، یہ روایت صحیح مسلم باب غزوۂ حنین میں بھی ہے [2] اس سے مراد وہ درخت ہے، جس کے نیچے انھوں نے حُدَیبیہ میں بیعت رضوان کی تھی عربی میں ببول کے درخت کو سمرۃ کہتے ہیں اس لئے اصحاب السمرۃ کا لقب دیا گیا۔ [3] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۴۴۵ حمی الوطیس تنور گرم ہو گیا ہے، اس موقع پر اس عربی محاورہ کا استعمال سب سے پہلے آپؐ کی زبان مبارک سے ہوا ہے [4] صحیح مسلم

دونوں فریق اچھی طرح لڑے اور ابھی شکست کھا کر لوگ پوری طرح واپس بھی نہیں ہوئے کہ ان کے قیدی جن کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر نظر آئے[1]، اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کے فرشتے نازل فرمائے اور پوری وادی اُن سے بھر گئی[2]، اس طرح ہوازن کی شکست اتمام تک پہونچی۔

لَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِىۡ مَوَاطِنَ	خدا نے بہت سے موقعوں پر تم کو مدد دی ہے
كَثِيۡرَةٍ‌ ۙ وَّيَوۡمَ حُنَيۡنٍ‌ ۙ اِذۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ	اور (جنگ) حنین کے دن جب کہ تم کو اپنی
كَثۡرَتُكُمۡ فَلَمۡ تُغۡنِ عَنۡكُمۡ شَيۡـًٔا	(جماعت کی) کثرت پر غرّہ تھا تو وہ
وَّضَاقَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا	تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین
رَحُبَتۡ ثُمَّ وَلَّيۡتُمۡ مُّدۡبِرِيۡنَ‌ ۚ	باوجود (اتنی بڑی) فراخی کے تم پر تنگ
ثُمَّ اَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَـتَهٗ عَلٰى	ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر پھر گئے پھر خدا نے
رَسُوۡلِهٖ وَعَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ	اپنے پیغمبر پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے
وَاَنۡزَلَ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا ۚ	تسکین نازل فرمائی اور (تمھاری مدد
وَعَذَّبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا‌ ؕ وَذٰ لِكَ	کو فرشتوں کے) لشکر جو تمھیں نظر نہیں
جَزَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ‏ ۝	آتے تھے (آسمان سے) اتارے اور کافروں
(سورۃ التوبہ ۲۵-۲۶)	کو عذاب دیا اور کفر کرنے والوں کی یہی سزا ہے

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف آخری جنگ

عربوں کے سینہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو آگ سلگ رہی تھی وہ

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۴۵ [2] ایضاً ص ۴۴۹ صحیح مسلم میں کتاب الجہاد والسیر کے تحت غزوۂ حُنین کے باب میں یہ واقعہ بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔

غزوۂ حُنین کے بعد ٹھنڈی پڑ گئی، اس لئے کہ اس لڑائی نے ان کی باقی ماندہ طاقت بھی ختم کر دی اور ان کے ترکش کے سارے تیر بیکار کر دیئے، ان کی جمعیت ذلیل اور پراگندہ ہو گئی، اور ان کے دل قبولِ اسلام کے لئے کھل گئے۔

اوطاس میں

ہوازن کی شکست کے بعد ان کے ایک گروہ نے جس میں سردارِ قبیلہ مالک بن عوف بھی تھا، طائف میں جا کر پناہ لی، اور وہاں اپنے کو قلعہ بند کر لیا ایک دوسرے دستہ نے چل کر "اوطاس" میں پڑاؤ ڈال دیا، اُن کے تعاقب کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک سریّہ ابو عامر الاشعری کی سرکردگی میں روانہ فرمایا جس نے ان سے جہاد کیا اور ان کو شکست دی[1] حُنین کا مالِ غنیمت اور باندیاں وغیرہ آپؐ کے پاس پہونچیں تو آپؐ نے ان سب کو جعرانہ[2] بھجوا دیا اور ان کو وہاں حفاظت و حراست میں کر لیا گیا۔[3]

غلاموں اور باندیوں کی تعداد چھ ہزار تھی، اونٹ چوبیس ہزار، بکریاں چالیس ہزار سے زیادہ، اس کے علاوہ چار ہزار اوقیہ چاندی، اس میں شامل تھی، یہ سب سے بڑا مالِ غنیمت تھا جو اب تک مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حُنین میں اپنے اصحاب کرام اور رفقائے جہاد کو یہ حکم صادر فرمایا کہ کسی بچہ، عورت، مرد، یا غلام پر جو کام کاج کے لئے ہو ہاتھ نہ اٹھایا جائے آپؐ نے ایک عورت کے قتل پر جو حُنین میں ماری گئی تأسف کا اظہار فرمایا۔[4]

---

[1] ابن کثیر ج ۳ ص ۶۴۶ [2] جعرانہ مکۂ معظمہ سے شمال مشرق راستہ پر ایک اہم منزل ہے۔

[3] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۵۹ [4] سیرت ابن کثیر ج ۳ ص ۶۳۸

غزوۂ طائف

(شوال ۸ھ)

ثقیف کے باقی ماندہ دستے

ثقیف کے باقی ماندہ دستے طائف چلے آئے، اور یہاں آکر شہر کے دروازے بند کرلئے قلعہ کے اندر انھوں نے ایک سال کے غلہ کا انتظام کرلیا، اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کی سرکوبی کے ارادہ سے طائف کی طرف تشریف لے چلے اور اس کے قریب پہونچ کر پڑاؤ ڈالا لیکن مسلمان اس میں داخل نہ ہوسکے اس لئے کہ تمام دروازے پہلے ہی سے بند کرلئے گئے تھے، ثقیف نے مسلمانوں پر سخت تیر اندازی شروع کی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تیر نہیں ٹڈیوں کا لشکر ان پر ٹوٹ پڑا ہے ثقیف کے لوگ اچھے تیر انداز سمجھے جاتے تھے۔

طائف کا محاصرہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر لشکر کو دوسری طرف منتقل کردیا اور کوئی پچیس تیس دن تک ان کا محاصرہ رکھا، اس درمیان میں ان سے سخت لڑائی ہوتی رہی ادھر دونوں طرف سے خوب تیر اندازی ہوئی، اس محاصرہ میں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار منجنیق (ایک قسم کی توپ) استعمال کی، محاصرہ بہت سخت تھا، مسلمانوں کے کئی آدمی کفار کے تیروں سے شہید ہوئے[1]۔

میدانِ جنگ میں رحم دلی

جب محاصرہ اور جنگ نے طول کھینچا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ثقیف کے انگور کے باغات کاٹ ڈالنے کا حکم دیا، انہی باغات پر ان کی معیشت کا سارا دارومدار تھا، لوگوں نے ان کو کاٹنا شروع کیا تو انھوں نے آپؐ سے درخواست کی، اللہ کے لئے اور رشتہ[2] کا خیال کر کے ان باغات کو چھوڑ دیں، آپؐ نے فرمایا، بے شک میں اس کو اللہ کے لئے اور رشتہ کی بنیاد پر چھوڑتا ہوں۔

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ منادی کروادی کہ جو غلام قلعے سے اتر کر ہمارے پاس آجائے گا وہ آزاد ہے، چنانچہ یہ پکار سن کر دس سے کچھ اوپر آدمی نکلے جن میں ابوبکرہ بھی تھے، جو حدیث کے ایک بڑے راوی اور عالم صحابی ہیں، آپؐ نے ان سب کو آزاد فرمایا اور ہر آدمی کو ایک مسلمان کے حوالے کیا اور اس کے کھانے پینے کی ذمہ داری اس پر ڈال دی، یہ بات طائف والوں کو بہت گراں گذری[3]۔

محاصرہ کا خاتمہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو طائف فتح کرنے کا حکم اللہ تعالےٰ کی طرف سے

لہ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۴۸۳-۴۷۸ باختصار ۔ ۲ہ شاید قبیلہ بنی سعد کی طرف اشارہ ہو جس میں آپؐ نے اپنی رضاعت کے دن گذارے تھے ۳ہ زاد المعاد ج ۱ ص ۴۵۷ بہ روایت ابن اسحاق۔

نہیں ہوا، اس لئے آپؐ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ واپسی کا اعلان کر دیں انھوں نے واپسی کا اعلان کیا تو لوگوں میں بہت شور ہوا، اور وہ کہنے لگے کہ ہم بغیر طائف فتح کئے کیسے چلے جائیں؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا قتال کے لئے چلو انھوں نے قتال کا آغاز کیا اور اس کے نتیجے میں ان کو سخت چوٹیں پہونچیں، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ ہم کل صبح انشاء اللہ واپس چلیں گے مسلمان یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور سفر کی تیاری کر کے روانہ ہونے لگے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ منظر دیکھ کر ہنسنے لگے۔[1]

حُنَین کے باندی غلام اور مالِ غنیمت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جعرانہ میں قیام کیا اور ہوازن کو اس کا موقع دیا کہ دس بیس دن کے اندر اسلام قبول کر لیں، اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، پھر آپؐ نے مال غنیمت کو تقسیم فرمانا شروع کیا، اور مؤلفۃ القلوب (یعنی وہ لوگ جن کو دلداری اور تالیف قلب کے لئے حصہ دیا جاتا تھا) کا حق سب سے پہلے آپؐ نے عنایت فرمایا، ابوسفیان اور ان کے دونوں بیٹوں یزید و معاویہ کو آپؐ نے دل کھول کر عنایت فرمایا، حکیم بن الحزام، نضر بن الحارث، علاء بن الحارثہ اور ان کے علاوہ سردارانِ قریش کو بھی بہت فیاضی کے ساتھ اور کثیر مقدار میں عطا فرمایا پھر آپؐ نے

---

[1] بحوالہ سابق ۔۔۔۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی یہ واقعہ تھوڑے حذف و اضافہ کے ساتھ آیا ہے ہنسنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ کل جب واپسی کے لئے کہا گیا تھا تو لوگوں کو تردد ہوا اب جب کہ زخم پہونچے تو خوشی خوشی تیار ہو گئے، آپ کو فطرت انسانی کی اس نیرنگی پر ہنسی آئی۔

عام مالِ غنیمت منگوایا اور تمام لوگوں کو طلب فرما کر ان میں اس کو تقسیم کر دیا۔[1]

انصار کی محبت اور ان کا ایثار

اس تقسیم پر جس میں قریش کے سرداروں اور مؤلفۃ القلوب کا بہت بڑا حصہ تھا، اور انصار کا بہت معمولی، کچھ انصاری نوجوانوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر انصار کو ایک احاطہ میں جمع کیا اور ان کے سامنے ایک ایسا مؤثر اور طاقتور خطبہ دیا کہ ان کے دل کے تار جھنجھنا اٹھے آنکھیں اشکبار ہو گئیں، اور محبت و شوق کا ایک چشمہ ان کے دلوں میں اُبل پڑا۔

آپ نے فرمایا "کیا میں تمھارے پاس اس حالت میں نہیں آیا تھا کہ تم سب گمراہ تھے، پھر میرے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے تمھیں ہدایت نصیب فرمائی، تم غریب اور مفلس تھے، اللہ تعالےٰ نے میرے ذریعہ تمھیں دولتمند کیا، تم سب ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ تعالےٰ نے تمھارے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا؟"

ان سب نے جواب دیا "اللہ اور اس کے رسول کا فضل و احسان سب سے زیادہ ہے، جب وہ خاموش ہوئے، آپ نے فرمایا:۔

اے انصار! کیا تم مجھے اس سوال کا جواب دو گے؟

انھوں نے کہا کہ "یا رسول اللہ ہم اس بات کا آپ کو کیا جواب دے سکتے ہیں، سارا فضل و احسان اللہ اور اس کے رسول کا ہے"!

آپ نے فرمایا "نہیں! خدا کی قسم اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو اور تم جو کہو گے سچ ہوگا،

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۴۸ اختصار کے ساتھ۔

اور میں اس کی تائید کروں گا کہ آپؐ ہمارے پاس اس حالت میں آئے کہ آپؐ کو جھٹلایا جا چکا تھا، اس وقت ہم نے آپؐ کی تصدیق کی اور آپؐ کو سچا تسلیم کیا، سب نے آپؐ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، ہم نے آپؐ کی مدد کی، آپؐ کو لوگوں نے بے خانماں کر دیا تھا ہم نے آپؐ کو پناہ دی، آپؐ کا ہاتھ خالی تھا ہم نے آپؐ کے ساتھ ہمدردی اور آپؐ کی تسلّی و غمخواری کی۔"

پھر آپؐ نے ان کی طرف رخ کر کے ایک ایسی بات فرمائی جس میں ناز و اعتماد بھی تھا، اور اس تقسیم و عطا کے فرق کی حکمت بھی بیان کر دی گئی تھی۔

آپؐ نے فرمایا "اے جماعت انصار! کیا دنیا کی چند روزہ سرسبزی و شادابی کے لئے جو میں نے ان کی تالیفِ قلب کے لئے انھیں دی ہے تاکہ وہ اس کی وجہ سے اسلام پر ثابت قدم رہیں اور تمھیں تمھارے اسلام کے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا، تمھارے دل کے اندر میرے بارے میں کچھ خیال آتا ہے؟"

پھر اس کے بعد آپؐ نے ان سے ایک ایسی بات کہی جس کو سن کر وہ اپنے قابو میں نہیں رہے، اور ایمانی محبت کے سوتے ان کے دلوں میں بے ساختہ پھوٹ پڑے۔ آپؐ نے فرمایا:-

"اے جماعت انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ اپنے ساتھ بھیڑ اور بکریاں لے کر آئیں، اور تم اپنے خیموں میں اللہ کے رسولؐ کو ساتھ لے کر جاؤ (صلے اللہ علیہ وسلم) قسم اس کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے تم جس چیز کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے وہ اس سے کہیں بہتر ہے، جو وہ لے کر جائیں گے اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا، اگر لوگ کسی ایک راستہ اور وادی میں چلتے اور انصار کسی دوسری وادی میں تو میں انصار

ہی کی وادی میں چلتا، انصار تو شعار (استر) ہیں (وہ کپڑا جو جسم پر براہ راست ہوتا ہے) دوسرے لوگ دثار ہیں (یعنی وہ کپڑے جو اوپر پہنے ہوتے ہیں اور جسم سے مس نہیں کرتے) اے اللہ انصار پر رحم فرما، انصار کی اولاد پر رحم فرما اور انصار کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما"۔

یہ سن کر تمام انصاری بے ساختہ رو پڑے اور ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں، وہ کہنے لگے ہم اس پر راضی اور خوش ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے حصہ اور نصیب میں آئیں۔[1]

قیدیوں کی واپسی

ہوازن کا ایک وفد جو چودہ[14] آدمیوں پر مشتمل تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آ کر ملا، اور آپؐ سے درخواست کی کہ ازراہِ احسان آپ ان قیدیوں اور مال و اسباب کو انھیں واپس فرما دیں آپؐ نے فرمایا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ کون کون ہیں، مجھے سب سے زیادہ وہ بات پسند ہے، جو سچی ہو اب یہ بتاؤ کہ تمھاری اولاد اور تمھاری عورتیں تمھیں زیادہ محبوب ہیں یا تمھارا مال و اسباب؟"

انھوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھتے آپؐ نے فرمایا "کل صبح کی نماز کے بعد تم لوگ کھڑے ہو کر یہ کہنا کہ ہم مسلمانوں کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سفارشی بناتے ہیں، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسلمانوں کو سفارشی بنا کر پیش کرتے ہیں کہ آپ ہمارے غلام باندی

---

[1] اصل روایت صحیحین میں ہے، صاحبِ زاد المعاد نے اس روایت کو زیادہ جامع اور مفصل سیاق میں بیان کیا ہے، اور ہم نے اسی کو نقل کر دیا ہے، دیکھئے صحیح بخاری، باب غزوۃ الطائف۔

واپس فرما دیں، جب آپؐ نے نمازِ صبح سے فراغت کی تو انھوں نے کھڑے ہو کر ایسا ہی کہا اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے حصہ اور بنی عبد المطلب کے حصہ میں جو کچھ ہے، وہ تمھارے حوالے ہے، دوسرے لوگوں سے میں تمھارے لئے سفارش کرتا ہوں اس پر مہاجرین وانصار نے کہا "ہمارے حصہ کا جو کچھ ہے، وہ سب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہے"۔

بنی تمیم، بنی فَزارہ، اور بنی سُلَیم کے تینؔ آدمی اپنے حصہ سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں ہو رہے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ یہ لوگ مسلمان ہو کر آئے ہیں، میں نے ان کا انتظار بھی کیا اور ان کو اختیار دیا لیکن انھوں نے اپنی اولاد اور بیویوں کے برابر کسی اور چیز کو قرار نہیں دیا، اس لئے اگر کسی کے پاس ایسے قیدی ہوں اور وہ ان کو خوش دلی سے دینا چاہے تو اس کا راستہ کھلا ہوا ہے، اور اگر اپنے حق کو چھوڑنا نہ چاہے تو یہ ان کو دے دے اس شخص کو ہر حصہ کے بدلے میں چھؔ حصے اس پہلے مالِ غنیمت سے ملیں گے جو اللہ تعالےٰ ہمیں عنایت فرمائے گا"۔

لوگوں نے کہا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خاطر ہم خوش دلی سے حاضر کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا "ہمیں معلوم نہیں کہ تم میں سے کون اس پر راضی ہے، اور کون راضی نہیں ہے، اس وقت تم لوگ واپس جاؤ، تمھارے سردار اور چودھری تمھارے صحیح صحیح معاملہ سے ہمیں آگاہ کریں، غرض سب نے ان کی عورتوں اور بچوں کو واپس کر دیا اور ایک شخص بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہا، ہر قیدی کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پوشاک بھی عطا فرمائی۔[1]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۴۴۹ صحیح بخاری میں یہ واقعہ قول اللہ تعالیٰ "وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ الآیہ" میں الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ آیا ہے۔

نرم دلی اور کریم النفسی

مسلمانوں نے اس ہنگامے میں دوسرے غلاموں، باندیوں کے ساتھ جو تعداد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجی ان میں حلیمہ سعدیہ کی لڑکی شیماء بھی تھیں، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن تھیں، مسلمان ان سے واقف نہ تھے، اس لئے انھوں نے لے جانے میں سختی سے کام لیا، انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ خدا کی قسم تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں تمھارے سردار کی دودھ شریک بہن ہوں، انھوں نے ان کی بات پر یقین نہیں کیا اور ان کو آپؐ کی خدمت میں پہونچا دیا۔

جب وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپؐ سے کہا کہ یا رسول اللہؐ! میں آپؐ کی رضاعی بہن ہوں، آپؐ نے فرمایا اس کی پہچان کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! جس وقت میں آپؐ کو گود میں لئے تھی آپؐ نے میری پیٹھ میں دانت سے کاٹ لیا تھا، اس کا نشان موجود ہے، آپؐ نے نشان پہچانا، اپنی چادر مبارک ان کے لئے پھیلادی اور ان کو اس پر بٹھایا، اور ان کو اختیار دیتے ہوئے کہا کہ اگر تم چاہو تو بہت محبّت اور عزّت کے ساتھ میرے ساتھ رہ سکتی ہو، اور اگر چاہو تو میں تحائف و سامان کے ساتھ تم کو رخصت کردوں، اور تم اپنے قبیلہ میں پہونچ جاؤ، انھوں نے کہا کہ آپؐ مجھے جو کچھ دینا چاہیں عنایت فرمادیں اور مجھے میری قوم میں واپس فرمادیں آپؐ نے انھیں عطا فرمایا، اور انھوں نے اسلام بھی قبول کرلیا، آپؐ نے تین غلام ایک باندی اور کچھ بکریاں انھیں عطا فرمائیں۔[1]

عمرۂ جعرّانہ

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غزوۂ حُنین سے فارغ ہوئے اور

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۴۹

جعرّانہ میں غلاموں اور مالِ غنیمت کی تقسیم کا کام مکمل ہوگیا تو آپؐ نے عمرہ کے لئے احرام باندھ لیا، یہ اہل طائف کا میقات تھا، اور مکہ سے ایک منزل پر تھا، عُمرہ سے فراغت کے بعد آپؐ مدینہ تشریف لائے[1] یہ ماہ ذی قعدہ[2] ۸ھ کا واقعہ ہے۔

اپنی رضا و رغبت سے

جب مسلمان طائف سے واپس آئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہو "آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون" صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ آپؐ ثقیف کے لئے بددعا کریں، آپؐ نے دعا کی کہ "اے اللہ ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو یہاں لا"

عُروہ بن مسعود الثقفیؓ مدینہ پہونچنے سے قبل راہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اسلام لائے اور وہیں سے اسلام کی دعوت دینے کے لئے اپنی قوم میں واپس گئے ان کو اپنی قوم میں بہت قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور وہ بہت ہر دلعزیز اور محبوب تھے، لیکن جب انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا اور اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی تو ان کو تیروں کا نشانہ بنایا گیا، اور انھوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

ان کے قتل کے بعد ثقیف نے کئی ماہ توقّف کیا اور آپس میں مشورہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچے کہ موجودہ صورتِ حال میں ان سب عربوں سے لڑنے کی ان میں طاقت نہیں جنھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکے ہیں چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک وفد بھیجنا طے کیا۔

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۵۰۰ [2] صحیح بخاری باب غزوۃ الحدیبیہ۔

بُت پرستی کے ساتھ کوئی سمجھوتہ اور رعایت نہیں

یہ لوگ جب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں ان کے لئے خیمہ لگوایا، انھوں نے اسلام قبول کیا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ ان کے خاص بُت "لات" کو تین۳ سال تک آپؐ نہ توڑیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انکار کیا اور وہ برابر ایک ایک سال نیچے اترتے رہے، اور آپؐ انکار فرماتے رہے، آخر بات یہاں تک پہونچی کہ ان کے آنے کے ایک ماہ بعد تک اس کو نقصان نہ پہونچایا جائے، آپؐ نے انکار فرمایا اور دو۲ افراد ابوسفیان رضؓ اور مغیرہ بن شعبہ رضؓ (جو اُسی قبیلہ کے تھے) کو حکم دیا کہ وہ دونوں جاکر اس بُت کو پاش پاش کرڈالیں، پھر انھوں نے درخواست کی کہ نماز سے ان کو معاف کردیا جائے، آپؐ نے فرمایا "جس دین میں نماز نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں"۔

جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوئے اور اپنے وطن کا رخ کیا تو آپؐ نے ان کے ساتھ ابوسفیان اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما کو بھی روانہ فرمایا، مغیرہؓ نے بُت شکنی کا فرض انجام دیا، اس کے بعد اسلام ثقیف میں عام ہوگیا، اور اہلِ طائف کا ایک ایک آدمی اسلام کی نعمت سے سرفراز ہوا[1]۔

کعب بن زُہیر کا قبول اسلام

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم طائف سے واپس تشریف لائے، تو آپؐ کی

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صفحہ ۴۵۸-۴۵۹ تلخیص کے ساتھ۔

خدمت میں کعب بن زُہیر (جو شاعر بھی تھے اور شاعرزادہ بھی) آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے' انھوں نے آپؐ کی بہت ہجو کی تھی لیکن پھر زمین ان پر تنگ ہوئی اور وہ خود اپنے سے بیزار ہونے لگے تو ان کے بھائی بُجیر نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تائب اور نادم ہو کر حاضر ہوں اور اسلام لے آئیں' انھوں نے ان کو ڈرایا کہ اگر ایسا انھوں نے نہ کیا تو ان کا انجام بہت بُرا ہوگا' اس پر انھوں نے آپؐ کی مدح و منقبت میں وہ مشہور قصیدہ کہا جو قصیدۂ بانت سُعاد کے نام سے مشہور ہے۔

غرض وہ مدینہ آئے اور صبح کے وقت جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز فجر کے بعد تشریف فرما تھے' خدمت مبارک میں حاضر ہوئے' آپؐ کے قریب بیٹھ گئے اور اپنا ہاتھ آپؐ کے دست مبارک میں دے دیا' رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے صورت آشنا نہ تھے' چنانچہ انھوں نے کہا کہ کعب بن زُہیر تائب اور مسلمان ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہے' اور آپؐ سے امان کا خواستگار ہے' کیا آپؐ اس کی توبہ قبول کریں گے؟ یہ سن کر ایک انصاری اس کی طرف لپکے اور کہا یا رسول اللہ! مجھے اللہ کے دشمن سے نمٹ لینے دیں' میں اسی وقت اس کی گردن مار دیتا ہوں' آپؐ نے فرمایا "نہیں رہنے دو' وہ توبہ کر کے اور اپنی حرکتوں سے باز ہو کر یہاں آئے ہیں" پھر کعب نے اپنا مشہور قصیدۂ لامیہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے:۔

بانت سعادُ فقلبی الیوم متبولُ

متیّم اِثرها لم یُفدَ مکبولُ

سعاد جدا ہو گئی' میرا دل آج مریض محبت ہے' اور اس کے پیچھے ایسا گرفتار ہے' جس کے پیروں میں بیڑی ڈال دی گئی ہے اور اس کو رہا کرانے کی خاطر فدیہ بھی نہیں دیا گیا۔

پھر اس قصیدہ کا مدحیہ شعر پڑھا:۔

ان الرَّسول لنُورٌ یُّستَضاءُ بہ
مُهنَّدٌ من سیوف الله مسلول

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بلاشبہ ایک نور ہیں جن سے اُجالا ہے اور وہ اللہ کی ایک تیز و بے نیام تلوار ہیں۔

یہ شعر سن کر آپؐ نے اپنی چادر مبارک اتار کر ان کو عطا فرمائی۔[1]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ صـ ۴۶۶ ـ ۴۶۸

قسطلانی نے مواہب میں ابوبکر بن الانباری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب وہ اس شعر پر پہونچے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر اتار کر ان پر ڈالدی، یہ وہی چادر ہے جس کو حضرت معاویہؓ نے دس ہزار دینار میں خریدنا چاہا لیکن انھوں نے جواب دیا کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی چادر کے لئے کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، کعبؓ کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء سے معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو بیس ہزار دے کر حاصل کرلیا، وہ کہتے ہیں کہ یہ وہی چادر ہے جو سلاطین اسلام کے پاس رہی (الزرقانی علی المواہب ج ۳ صـ ۵۰)

غزوۂ تبوک

(رجب ۹ھ)

غزوۂ تبوک کا نفسیاتی اثر اور اس کے اسباب

دشمن کے دل میں رعب و ہیبت قائم کرنے اور ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے میں (جو یہ سمجھنے لگے تھے کہ اسلام کا شعلہ بھڑک کر عنقریب بجھ جائے گا، یا وہ بادل کے ایک ٹکڑے کی طرح ہے، جو دیکھتے ہی دیکھتے چھٹ جائے گا) غزوۂ تبوک کا وہی اثر پڑا جو فتح مکہ کا پڑا تھا، یہ غزوہ دراصل اس زمانے کی سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑی سلطنت سے ٹکراؤ کے مترادف تھا جو عربوں کی نگاہ میں بڑی پُرہیبت اور عظیم سلطنت تھی؛ چنانچہ جب ابوسفیان نے دیکھا کہ رومی شہنشاہ ہرقل نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی کو کیا اہمیت دی' اور اس سے وہ کتنا متأثر ہوا تو ان کی زبان سے

لہ تبوک مدینہ منورہ اور دمشق کے درمیان نصف فاصلہ پر ہے' اور ایلہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے' یاقوت نے "معجم البلدان" میں ابوزید کے حوالے سے لکھا ہے کہ "تبوک حِجر اور شام کی سرحد کے درمیان حِجر سے چار منزل پر واقع ہے' کہا جاتا ہے کہ اصحاب الایکہ جن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی' یہیں آباد تھے" انتہیٰ' تبوک بحرِ قلزم سے چھ منزل کے فاصلہ پر "حسمی" اور "شَروی" دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے (از دائرۃ المعارف للبستانی باختصار) اس وقت یہ ایک اہم سعودی چھاؤنی ہے' جو مدینہ کے انتظامیہ (امارت) کے ماتحت ہے' جس کا فاصلہ مدینہ سے سات سو کلو میٹر ہے

یہ فقرہ نکلا (اور جس کو پڑھ کر ہرقل نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ جزیرۃ العرب میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہونے والا ہے) محمد بن عبداللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا معاملہ تو زور پکڑ گیا[ع] ان سے یہ رومیوں کا بادشاہ بھی ڈرنے لگا، وہ کہتے ہیں، جب سے مجھے برابر یقین رہا کہ وہ غالب آئیں گے یہاں تک کہ اللہ نے میرے دل میں اسلام ڈالا"

عرب اس زمانہ میں رومیوں سے جنگ اور ان پر حملہ آور ہونے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، بلکہ ان کو خود اندیشہ تھا کہ کہیں انھیں کی طرف سے ان پر حملہ نہ ہو جائے، اور صحیح بات یہ ہے کہ وہ اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی ان کی طرف توجہ کرے، اور ان کو اپنا نشانہ بنائے، مدینہ کے مسلمانوں پر جب کوئی ناگہانی آفت آتی اور کوئی بڑا خطرہ درپیش ہوتا تو ان کا ذہن زیادہ سے زیادہ غسّان کی عیسائی عرب ریاست کی طرف منتقل ہوتا تھا، جو رومی شہنشاہ قیصر کے ماتحت تھی۔

واقعہ ایلاء میں جو ۹ھ میں پیش آیا تھا حضرت عمرؓ کے الفاظ سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میرے ایک انصاری دوست تھے، جب میں غیر حاضر ہوتا تو وہ مجھے روداد سناتے جب وہ غیر حاضر ہوتے تو میں ان کو خبریں پہنچاتا، اس زمانے میں ہم لوگ غسّان کے ایک بادشاہ سے بہت خوف زدہ تھے، جس کے متعلق یہ چرچا تھا کہ اس کا ارادہ ہم پر حملہ کرنے کا ہے، ہمارے دل میں ہر وقت اسی کا خیال رہتا تھا، اسی اثناء میں میرے انصاری دوست آئے، اور انھوں نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا اور

[ع] ابوسفیان نے آپؐ کے لئے ابن ابی کبشہ کا لفظ طنزاً استعمال کیا تھا، ابوکبشہ کے متعلق دو قول ہیں، ایک یہ کہ خزاعہ کا کوئی شخص تھا جس نے اپنے زمانہ میں بت پرستی چھوڑ دی تھی، دوسرے یہ کہ آپؐ کے اجداد مادری میں کوئی اس نام کا گذرا ہے (مجمع بحار الانوار)

کہنے لگے "کھولو! کھولو!" میں نے کہا کیا غسانی نے حملہ کر دیا؟[1]

اس وقت رومی سلطنت کا اقبال بام عروج پر تھا، اس کی فوجوں نے ہرقل کی قیادت میں ایرانی فوجوں کو تہس نہس کر دیا تھا، اور ایرانی مملکت میں اندر تک داخل ہو گئیں تھیں، چنانچہ اس زبردست اور غیر معمولی فتح کی خوشی میں اور اس کے شکرانہ کے طور پر ہرقل نے حمص سے ایلیاء تک ایک زبردست فاتح کی حیثیت سے شاہانہ جلوس میں سفر کیا،[2] یہ ہجرت کے ساتویں سال کا واقعہ ہے، ہرقل اس وقت اس صلیب کو اٹھائے ہوئے تھا، جو اس نے ایرانیوں سے حاصل کی تھی، سارا راستہ قالین غالیچوں اور فرش و فروش سے آراستہ تھا، ہر طرف گل پاشی ہو رہی تھی، اور وہ اس فرش پر چل رہا تھا، اس شاندار فتح پر دو سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ سے رومیوں کے مقابلے کے لئے روانہ ہوئے، اس غزوہ کے ذریعہ جس کا عربوں کے دل و دماغ پر گہرا نقش تھا، اللہ تعالیٰ نے شام پر حملہ کا راستہ ہموار کر دیا، جو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں فتح ہوا، لیکن اس کی بنیاد اسی غزوہ میں پڑ چکی تھی۔

یہ غزوہ کیسے پیش آیا، اس کے بارے میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ رومی عرب کی شمالی سرحدوں پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں، ابن سعد اور ان کے شیخ واقدی راوی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو نبطیوں سے یہ خبر ملی کہ ہرقل نے اپنے سپاہیوں کی ایک سال کی خوراک کا انتظام کر لیا ہے، اور ان کے ساتھ لخم، جذام، عاملہ اور غسان اور نیز عرب کے اور فاتح قبائل کو

---

[1] بخاری نے اس واقعہ کو سورۂ تحریم کی تفسیر میں اور مسلم نے کتاب الطلاق باب (بیان ان تخییرہ امرأۃ لا یکون طلاقا) نقل کیا ہے [2] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر باب (کتاب النبی صلے اللہ علیہ وسلم الی ہرقل یدعوہ الی الاسلام)

شامل کرلیا ہے، اوران کے دستے "بلقاء" تک پہونچ بھی چکے تھے[1]

اس روایت سے قطع نظر کرکے بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس غزوہ کا اصل مقصد پڑوسی حکومت کو خوف زدہ کرنا تھا جس سے مرکز اسلام اور اسلام کی بڑھتی ہوئی اور اُبھرتی ہوئی دعوت اور اس کی روز افزوں قوت وطاقت کو نقصان پہونچ جانے کا اندیشہ تھا، اس غزوہ کے ذریعہ اس حکومت کو یہ آگاہی دینی تھی کہ وہ مسلمانوں پر ان کی سرزمین کے اندر حملہ کرنے کی جرأت نہ کرے، اور ان کو لقمۂ تر یا مالِ مفت نہ سمجھے جس شخص کا یہ حال ہو وہ اتنی عظیم شہنشاہی پر حملہ نہیں کرسکتا، اور نہ اس کی سرحدوں میں داخل ہوکر اس کے لئے کوئی چیلنج یا خطرہ بن سکتا ہے، اس کی پشت پر وہی حکمت کارفرما تھی جس کا ذکر قرآن مجید نے غزوۂ تبوک کے سلسلہ میں کیا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا	مسلمانو! ان کافروں سے جنگ کرو
الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ	جو تمھارے آس پاس پھیلے ہوئے
وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً	ہیں، اور چاہیے کہ وہ جنگ میں تمھاری
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ	سختی محسوس کریں، اور جان رکھو کہ
(سورۂ توبہ-۱۲۳)	خدا پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

یہ مقصد اس غزوہ سے پورا ہوگیا، رومیوں نے اس کا جواب کسی جوابی حملہ اور پیش قدمی فوجی نقل وحرکت اور سرگرمی سے نہیں دیا، بلکہ انھوں نے اس کھلے ہوئے چیلنج کے مقابلہ میں ایک طرح کی پسپائی اور خاموشی اختیار کرلی اور اس نوزائیدہ طاقت کا جتنا اندازہ انھیں اس وقت ہوا اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

---

[1] الزرقانی علی المواہب ج ۳ ص۶۳-۶۴

دوسرا فائدہ جو اس جرأتمندانہ غزوہ (جس میں پورا خطرہ مول لیا گیا تھا) سے حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ وہ جزیرۃ العرب کے ان قبائل نیز ان فاتح اور با اقتدار قبائل (جو رومی شہنشاہ سے متعلق اور اس کے ماتحت تھے) کے دلوں پر مسلمانوں کا رعب وداب قائم ہوگیا، اور اس کے ذریعہ ان کو یہ موقع ملا کہ وہ دین اسلام کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کریں، اور یہ محسوس کریں کہ وہ کوئی پانی کا بلبلہ نہیں ہے، جو تھوڑی دیر کے لئے سطحِ آب پر ابھرتا ہے، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوجاتا ہے، اس کا مستقبل پورے طور پر روشن ہے، اور شاید ان قوموں کو اس کے ذریعہ اسلام میں داخلہ کا کوئی موقعہ مل سکے جو خود ان کی سرزمین اور ان کے وطن میں ظاہر ہوا ہے، ان لوگوں کے ذکر میں جو اس غزوہ میں نکلے تھے، قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ۔ (سورۂ توبہ ۔ ۱۲۰)	جو قدم بھی وہ دشمن کے خلاف راہ خدا میں اٹھاتے ہیں وہ کافروں کے لئے غیظ وغضب کا باعث اور جو نقصان بھی وہ کفار کو پہنچاتے ہیں وہ ان کے لئے عمل نیک ثابت ہوتا ہے۔

رومیوں کو غزوۂ موتہ ابھی تک اچھی طرح یاد تھا، جس میں ان کی پوری تسلّی وتشفّی نہیں ہوسکی تھی، اور جس میں ہر فریق نے بسلامت واپسی ہی کو غنیمت سمجھا تھا، اور اس کی وجہ سے بازنطینی سلطنت اور اس کی زبردست افواج کا جو رعب عربوں کے دل پر تھا وہ بہت کمزور ہوگیا۔

مختصر یہ کہ اس غزوہ کی سیرت نبوی اور دعوتِ اسلامی کی تاریخ میں خصوصی

اہمیت ہے اور اس سے ان مقاصد کی تکمیل ہوئی جو مسلمانوں اور عربوں کے حق میں بہت دور رس تھے، اور جن کا تاریخ اسلام کے تسلسل اور آئندہ پیش آنے والے واقعات پر گہرا اثر پڑا۔

غزوہ کا زمانہ اور وقت

یہ غزوہ رجب ۹ھ میں پیش آیا[1] سخت گرمی کے موسم میں جب کھجور مزیدار ہوگئے تھے، اور سایہ خوشگوار معلوم ہونے لگا تھا، آپؐ نے اس کے لئے بہت طویل سفر کا ارادہ فرمایا چونکہ بے آب وگیاہ میدانوں کو عبور کرنا تھا، اور سخت دشمن کا مقابلہ درپیش تھا، اس لئے

---

[1] غزوۂ تبوک کی اس تاریخ کا تعین شمسی حساب سے بہت دشوار ہے جس میں مدینہ سے تبوک کے لئے روانگی ہوئی بعض سیرت نگاروں نے ماہ نومبر کو رجب ۹ھ کے مطابق قرار دیا ہے، مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب کی "تجدید مفتاح التقویم" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ان میں علامہ شبلیؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، لیکن واقعہ کے داخلی شواہد اور حدیث صحیح کی تصریحات جو شیخین اور دوسرے اصحاب صحاح وسنن سے ثابت ہیں ان سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ غزوہ گرمیوں کے زمانے میں ہوا کعب بن مالک کی حدیث میں صاف آتا ہے "ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزاھا فی حر شدید حین طابت الثمار والظلال" اسی کو اس سلسلہ میں معیار و میزان بنانا چاہئے، اور وقت کی جو تحدید اس سے مطابقت نہ رکھتی ہو اسے ناقابلِ اعتبار سمجھنا چاہئے، موسیٰ بن عُقبہ نے ابن شہاب زہری سے جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں، "خزاں کی راتوں اور سخت گرمی میں جبکہ لوگ نخلستانوں میں رہنا پسند کرتے تھے (یہ غزوہ پیش آیا) اس سے زیادہ واضح منافقین کا وہ قول ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ براءۃ میں کیا ہے، اور پھر اس کا رد کیا ہے "وَقَالُوا لَا تَنفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَّوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ" (انھوں نے کہا کہ اس گرمی میں (گھر کا آرام چھوڑ کر) کوچ نہ کرو (اے پیغمبر تم کہو) دوزخ کی آگ کی گرمی تو اس سے کہیں زیادہ گرم ہوگی اگر وہ سمجھتے ہوں۔ التوبہ - ۸۱)

آپؐ نے مسلمانوں کو پہلے ہی آگاہ فرما دیا تھا کہ آپ کو کس رُخ پر جانا ہے[1] تاکہ وہ اس کے لئے اچھی طرح تیاری کر لیں، یہ زمانہ سخت عُسرت اور قحط سالی کا تھا۔

منافقین اس موقع پر مختلف بہانے اور عذر کر کے گھر بیٹھ رہے، ان کو طاقتور اور خطرناک دشمن کے خوف، سخت موسم، جہاد سے عدم دلچسپی اور دین حق میں شک و شبہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رفاقت و ہم رکابی سے باز رکھا، ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ	جو لوگ (غزوۂ تبوک) میں پیچھے رہ گئے
خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا	وہ پیغمبر (خدا کی مرضی) کے خلاف بیٹھے
اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ	رہنے سے خوش ہوئے اور اس بات کو
وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	ناپسند کیا کہ (خدا کی راہ) میں اپنے مال
وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ	اور جان سے جہاد کریں اور (اوروں سے
نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا	بھی) کہنے لگے کہ گرمی میں مت نکلنا
يَفْقَهُوْنَ ○	(ان سے) کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے
(سورۂ توبہ - ۸۱)	کہیں زیادہ گرم ہے کاش یہ (اس بات کو) سمجھتے۔

جہاد اور روانگیٔ لشکر میں صحابہؓ کا ذوق و شوق اور جذبۂ مسابقت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سفر کی بہت اہتمام سے تیاری فرمائی اور لوگوں کو تیاری کا حکم فرمایا، آپؐ نے اہلِ ثروت کو راہِ خدا میں خرچ کرنے کی ترغیب دی

[1] ماخوذ از حدیث کعب ابن مالک (صحیحین)

چنانچہ دولت مند طبقہ کے بہت سے افراد اس موقع پر سامنے آئے اور انھوں نے ایمان واحتساب کے جذبہ سے اس میں حصہ لیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس پورے لشکر کو جس کو "جیش العسرۃ" کہا جاتا ہے، سامان فراہم کرنے کی ذمہ داری لی اور ایک ہزار دینار اس پر خرچ کئے، ان کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، بہت سے صحابہ نے جو استطاعت نہ رکھتے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سواری کی درخواست کی آپ نے اس کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ان سے معذرت کر دی، اس محرومی کا ان کو اس درجہ قلق تھا کہ اللہ تعالےٰ نے ان سے اس فریضہ کو ساقط فرما دیا، اور ارشاد ہوا:۔

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ۔ (سورۂ توبہ۔۹۲)

اور نہ ان (بے سروسامان) لوگوں پر (الزام) ہے کہ تمہارے پاس آئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس پر تم کو سوار کروں تو وہ لوٹ گئے اور اس غم سے کہ ان کے پاس خرچ موجود نہ تھا ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے

کچھ مسلمان وہ تھے جن کو بغیر کسی شبہ یا تردد کے صرف عزم وارادہ کرنے میں دیر لگی اور وہ اس غزوہ میں شریک نہ ہوسکے۔

لشکرِ اسلام کی تبوک کی طرف روانگی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تیس ہزار (۳۰۰۰۰) مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے تبوک کے لئے

روانہ ہوئے اس سے پہلے کسی غزوہ میں اتنی بڑی تعداد شریک نہ تھی، آپؐ نے ثنیۃ الوداع میں لشکر کو پڑاؤ ڈالنے کی ہدایت کی اور محمد بن مسلمہ الانصاریؓ کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا، اہل بیت کے لئے حضرت علیؓ کو مقرر فرمایا، اور جب انھوں نے منافقین کی افواہوں اور چہ میگوئیوں کا آپ سے ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تم میرے لئے ایسے ہو جیسے موسیٰؑ کے ساتھ ہارون تھے، ہاں یہ بات ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا[۱]

آپؐ اس لشکر کے ساتھ "حجر" اور قوم ثمود کی سرزمین میں اترے اور صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ "یہ ان کی سرزمین ہے جن پر عذاب نازل ہوا ہے" آپؐ نے فرمایا کہ "جب ان لوگوں کے مکانات میں جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، داخل ہو تو روتے ہوئے داخل ہو اس ڈر سے کہ کہیں تم کو بھی وہ مصیبت نہ آئے جو ان پر آئی تھی[۲]، آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ "یہاں کا پانی نہ پینا، اور نہ نماز کے لئے اس پانی سے وضو کرنا، اگر آٹا تم نے اس پانی سے گوندھ لیا ہو تو اسے اونٹوں کو کھلا دو، اور خود اس میں سے ذرا سا بھی نہ کھاؤ"۔

جب لوگوں کو پانی کی بہت تنگی ہوئی تو انھوں نے آپؐ سے اس کی شکایت کی اور اپنی دشواری بیان کی آپؐ نے دعا فرمائی، اور اس دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے بادل بھیجا اور اس قدر بارش ہوئی کہ لوگ سیراب ہو گئے اور اپنی ضرورت کا پانی اکٹھا بھی کر لیا[۳]۔

رومیوں سے عربوں کا خوف

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تبوک تشریف لے جا رہے تھے تو کچھ منافقین،

---

[۱] صحیح بخاری باب (غزوۂ تبوک) [۲] زاد المعاد ج ۲ ص ۳-۴ وسیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۲۲ صحیحین میں بھی اسی کے ہم معنی روایات آئی ہیں۔ [۳] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۲۲

آپ کی طرف اشارہ کر کے ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ بنی الاصفر یعنی رومیوں کی جنگ اتنی ہی آسان ہے جتنی کہ اپنے ملک کے عرب قبائل سے؟ خدا کی قسم ہم دیکھ رہے ہیں کہ کل یہ سب رسیوں سے جکڑے پڑے ہوں گے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ایلہ کے حاکم میں صلح

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تبوک پہونچ گئے تو ایلہ کا حاکم یوحنّہ بن رویہ جو سرحدی علاقوں کے حکام میں سے تھا، آپؐ کی خدمت میں آیا اور آپؐ سے صلح کر لی اور جزیہ آپؐ کو پیش کر دیا "جرباء" اور "اذرح" کے لوگ بھی آئے اور آپؐ نے ان کو امان کی تحریر لکھ دی، جس میں حدود کی ذمہ داری، پانی اور بّری وبحری راستوں کی حفاظت اور فریقین کی سلامتی کی ضمانت دی گئی تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا اکرام بھی فرمایا۔[2]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدینہ طیبہ واپسی

اس موقع پر رومیوں کی پسپائی اور سرحد پار کر کے فوج کشی کا خیال ترک کر دینے کی اطلاع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پہونچی اور آپؐ نے بھی اس کو مناسب نہیں سمجھا کہ ان کے ملک میں گھس کر ان کا تعاقب کیا جائے اس غزوہ سے جس مقصد کا حصول پیش نظر تھا وہ حاصل ہو چکا تھا، البتہ اکیدر بن عبدالملک الکندی نصرانی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۲۴-۵۲۶ [2] ایضاً ص ۵۲۵-۵۲۶

نے جو دومۃ الجندل کا حاکم[1] اور رومی فوجوں کا پشت پناہ تھا، اس کی طرف سے حملہ کی ضرور اطلاع ملی آپؐ نے اس کی سرکوبی کے لئے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پانچ سو سواروں کے ساتھ روانہ فرمایا، حضرت خالدؓ نے اس کو گرفتار کرکے آپؐ کی خدمت میں بھیجا، آپؐ نے اس کا خون معاف کیا اور جزیہ پر اس سے مصالحت کرلی اور اس کو آزاد کردیا۔[2]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں کئی راتیں گزاریں پھر مدینہ طیبہ واپس تشریف لائے۔[3]

ایک غریب مسلمان کے جنازہ میں

عبداللہ ذوالبجادینؓ کی وفات تبوک میں ہوئی، یہ اسلام قبول کرنے کے لئے کوشاں تھے، لیکن ان کی قوم ان کو اس سے باز رکھتی تھی، اور ان کو طرح طرح سے ستایا جاتا تھا، آخرکار انھوں نے ان کو ایک موٹی کھردری چادر میں چھوڑدیا، اس کے سوا ان کے

---

[1] دومۃ الجندل ایک آباد گاؤں تھا، جہاں اعرابی خرید و فروخت کے لئے جایا کرتے تھے مرور زمانہ سے یہ مقام ویران اور غیر آباد ہوگیا تھا "اکیدر" نے آکر اس کو نئی رونق دی، اور زیتون کی کاشت وہاں شروع کی، چنانچہ اس کے بعد اعرابیوں نے وہاں آنا جانا پھر شروع کردیا، اس گاؤں کو ایک قدیم فصیل گھیرے ہوئے ہے، فصیل کے اندر ایک مستحکم قلعہ ہے جس کو شمال کے اعرابیوں میں خاصی شہرت حاصل ہے، اس کی وجہ سے اس مقام کو فوجی اہمیت بھی حاصل رہی، اس کے زیادہ تر باشندے قبیلۂ کلب سے متعلق ہیں، اکیدر اپنے آپ کو اس زمانہ کے دستور کے مطابق ملک یا بادشاہ کہلواتا تھا، اہل دومۃ اس زمانہ میں نصرانی مذہب پر تھے، (دیکھئے "تاریخ العرب قبل الاسلام" از ڈاکٹر جواد علی) [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۲۶ [3] ایضاً ص ۵۲۷

پاس کوئی ستر پوشی کا کپڑا نہ تھا، وہ بھاگ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچے جب آپؐ کے قریب ہوئے تو یہ چادر بھی پھٹ گئی، اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے انھوں نے ایک ٹکڑے سے لنگی کا کام لیا، اور دوسرے ٹکڑے کو اوڑھ لیا، اسی حالت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، اور اسی دن سے ان کا لقب "ذوالبجادین" پڑ گیا۔

جب تبوک میں ان کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما نے رات کی تاریکی میں ان کے جنازہ کی مشایعت کی ان میں سے کسی کے ہاتھ میں مشعل تھی جس کی روشنی میں یہ لوگ چل رہے تھے، قبر تیار تھی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خود بدولت قبر میں اترے حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ نے نعش کو قبر میں اتارا، آپؐ فرماتے اپنے بھائی کو اور نیچے میرے قریب کرو، دونوں نے ان کو نیچے کی طرف لٹکایا، جب آپؐ نے ان کو لحد میں لٹا دیا تو فرمایا "اللهم انى امسيت راضیاً عنه فارض عنه" (اے اللہ میں اس سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا) عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے تمنا کی کہ کاش کہ اس قبر میں میں ہوتا۔[1]

کعب بن مالک کا ابتلاء اور ان کی کامیابی و سرخروئی

جن لوگوں کی اس غزوہ میں شرکت نہ کر [illegible] کی وجہ کوئی شبہ یا وسوسہ نہیں تھا، شریک نہ ہو سکے، ان میں کعب بن مالکؓ، مرارة بن الربیعؓ اور ہلال ابن امیہؓ بھی تھے، یہ لوگ سابقین اولین میں سے ہیں، اسلام کے لئے انھوں نے بیش قیمت خدمات

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۲۷-۵۲۸

انجام دیے تھیں، او در راہ حق میں سخت تکلیفیں اٹھائیں تھیں، مرارۃ بن الربیعؓ اور ہلال بن امیہؓ جنگ بدر میں بھی شریک تھے، غزوات سے فرار یا پیچھے رہنا ان کی فطرت اور عادت سے دور تھا، اس کو حکمتِ الٰہی کے سوا کسی چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، یا اس سے مقصود ان کا امتحان، ان کے نفوس کا تزکیہ اور مسلمانوں کی تربیت تھا، یہ صرف سہل انگاری، ارادہ کی کمزوری، اور اسباب و وسائل پر ضرورت سے زیادہ اعتماد اور پوری سنجیدگی اور نشاط و سرگرمی کے ساتھ اس معاملہ پر غور نہ کرنے کا نتیجہ تھا، اور یہ وہ چیز ہے جس نے بہت سے مردانِ خدا کو جو ایمان اور خدا اور رسولؐ کی محبت میں دوسرے مسلمانوں سے کسی طرح کم تر نہ تھے، بارہا نقصان پہونچایا ہے، اور یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف اس جماعت کے تیسرے شخص کعب بن مالکؓ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

"میں روزانہ اس ارادہ سے نکلتا کہ میں سفر کا ضروری سامان لے لوں اور ان کے ساتھ روانہ ہو جاؤں، لیکن بغیر کچھ کئے واپس آجاتا، پھر میں اپنے دل میں کہتا کہ مجھے دِقت کیا ہے، جب چاہوں گا لے لوں گا (پیسے میرے پاس ہیں سامان بازار میں موجود ہے) میں اسی لیت و لعل میں رہا کہ کوچ کی گھڑی آگئی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمان روانہ ہو گئے اور میں نے ابھی تک کچھ سامان ہی نہیں کیا تھا، میں نے کہا چلو میں آپ کی روانگی کے ایک دو دن بعد ہی روانہ ہو جاؤں گا اور راستہ میں قافلہ میں شامل ہو جاؤں گا، ان سب کی روانگی کے بعد بھی میں سامان تیار کرنے کے لئے نکلا لیکن پھر بھی کچھ کئے بغیر واپس آگیا، دوسرے دن بھی یہی ہوا، مجھ پر ایسی سستی طاری رہی اور انھوں نے اپنے قدم تیز کر دیئے اور لڑائی کا معاملہ بہت آگے نکل گیا، میں نے اس کے بعد بھی ارادہ کیا کہ اب بھی مدینہ سے روانہ ہو کر ان کو پالوں کاش کہ میں نے ایسا ہی

کیا ہوتا لیکن اس کی بھی توفیق نہ ہوئی"[۱]

اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کے ایمان، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے محبت، اسلام سے وفاداری، اور مصیبت وراحت ہر حالت میں ثابت قدمی کا نازک امتحان لیا، وہ لوگوں کی عزت وتعظیم اور جفا وبے نیازی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی توجہ والتفات، اور اعراض وبے توجہی دونوں حالتوں میں ایسے مخلص وجاں نثار ثابت ہوئے جس کی نظیر مذہبی معاشروں اور جماعتوں کی تاریخ میں (جو ایمان وعقیدہ اور محبت وجذبات پر قائم ہوتی ہیں) ملنی مشکل ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس وقت سچ بولے اور جو کچھ حقیقت تھی بے کم وکاست بیان کر دی، جب لوگ باتیں بنا کر معافی حاصل کر رہے تھے، انھوں نے اس وقت خود اپنے خلاف گواہی دی، جب منافقین اپنے آپ کو اس سے ہر طرح بری قرار دے رہے تھے۔

وہ اپنی طویل، اور بلیغ ومؤثر روایت میں اپنا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"یہ سب پیچھے رہنے والے آپ کے پاس حاضر ہوئے اور قسمیں کھا کھا کر آپ سے اپنے لئے عذر بیان کرنے لگے، یہ کوئی اسّی سے اوپر افراد تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ نے ان کی ظاہری باتوں کو قبول فرمایا، ان سے بیعت لی اور ان کے لئے مغفرت طلب فرمائی، ان کے بھیدوں اور دلی رازوں کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا، میں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، سلام عرض کیا، جب میں نے آپ کو سلام کیا تو آپ نے خفگی کی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا، پھر فرمایا، آؤ، میں آگے بڑھا

---

[۱] صحیح بخاری کتاب المغازی۔

اور آپؐ کے بالکل سامنے بیٹھ گیا، آپؐ نے مجھ سے پوچھا تم کس وجہ سے پیچھے رہ گئے؟ کیا تم نے اپنی سواری نہیں خریدی تھی میں نے کہا جی ہاں بخدا ایسا ہی ہے، خدا کی قسم اگر میں آپؐ کے بجائے اس وقت اہل دنیا میں سے کسی شخص کے پاس ہوتا تو میں سمجھتا کہ میں کچھ عذر کر کے اس کی ناراضگی سے بچ جاؤں گا، میرے اندر بات کرنے اور اپنی بات ثابت کرنے کا سلیقہ بھی ہے لیکن بخدا مجھے یقین ہے کہ میں اگر آج جھوٹ بول کر آپؐ کو راضی کر لوں گا تو قریب ہے کہ اللہ تعالےٰ آپؐ کو مجھ سے ناراض کر دے اور اگر میں سچ بول کر آپؐ کو کسی قدر آزردہ کر دوں گا تو اس میں مجھے اللہ تعالےٰ کی طرف سے معافی کی امید ہے، خدا کی قسم میرے پاس کوئی عُذر نہیں ہے، اور خدا کی قسم جس وقت میں پیچھے رہ گیا تھا، اس سے زیادہ میں کبھی صحتمند اور فارغ البال نہ تھا۔"

بالآخر وہ ہولناک گھڑی آگئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ان سے بات کرنے کی ممانعت فرما دی، مسلمان تو سمع و طاعت کے پُتلے تھے، چنانچہ سب نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی، اور بالکل بدل گئے، حتیٰ کہ ان کی نگاہ میں زمین آسمان بھی بدل گئے، معلوم ہوتا تھا کہ یہ وہ زمین ہی نہیں ہے جو پہلے تھی، اس حال میں ان کی پچاس راتیں گذریں، جہاں تک مرارہ بن ربیعؓ اور ہلال بن امیہؓ کا تعلق ہے، وہ دونوں تھک ہار کے اپنے گھر بیٹھ رہے، اور روتے رہے، کعب بن مالکؓ ان سب سے زیادہ جوان اور طاقتور تھے، وہ باہر نکلتے تھے، مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، بازاروں میں آتے جاتے تھے، لیکن کوئی شخص ان سے گفتگو کرنے کا روادار نہ تھا۔

لیکن ان تمام باتوں نے محبت اور وفاداری کے اس رابطہ اور رشتہ پر کوئی اثر

نہیں ڈالا جو ان کے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان قائم تھا اس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وہ شفقت بھی کم نہ ہوسکی جو ان کے حال پر تھی بلکہ اس سرزنش اور تنبیہ نے ان کی اس محبت' دل کی تپش اور درد و سوز کو اور بڑھا دیا' وہ کہتے ہیں:

"میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتا اور آپ کو سلام کرتا اس وقت آپ نماز سے فراغت کے بعد اپنی مجلس میں تشریف فرما ہوتے میں اپنے دل میں سوچتا کہ آپؐ نے سلام کے جواب میں اپنے لب مبارک کو جنبش دی ہے یا نہیں؟ پھر میں آپؐ کے قریب نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا اور کنکھیوں سے آپؐ کو دیکھتا رہتا' جب میں نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو اس وقت آپ میری طرف التفات فرماتے' جب میں آپؐ کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ اعراض فرماتے"

غرض دنیا ان کے لئے بدل گئی اور اب ایک ایسے شخص نے بھی ان سے منہ پھیر لیا جس پر ان کو بڑا ناز و اعتماد تھا' وہ بیان کرتے ہیں:-

"لوگوں کی جفا سے میرے لئے یہ عرصہ بہت طویل اور شاق ہو گیا' آخر میں دیوار پھاند کر ابوقتادہ کے احاطہ میں پہونچا' وہ میرے چچازاد بھائی بھی تھے اور مجھے سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھے' میں نے ان کو سلام کیا تو خدا کی قسم انھوں نے سلام کا جواب تک نہ دیا' میں نے کہا ابوقتادہ! میں تم کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ مجھے اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت ہے' اس پر بھی وہ خاموش رہے' میں نے دوبارہ یہی بات کہی اور ان کو اللہ کا واسطہ دیا' وہ خاموش رہے' پھر اتنا کہا کہ "اللہ ورسولہ أعلم" اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں' اس پر میری آنکھوں سے

بے ساختہ آنسو بہنے لگے، میں اسی وقت مڑا اور دیوار پھاند کر واپس چلا گیا"[1]

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس کُلّی مقاطعہ کا اثر ان تینوں کی بیویوں تک پہنچا اور ان کو حکم ملا کہ وہ اپنی بیویوں کو علیٰحدہ کر دیں، چنانچہ انھوں نے اس کی تعمیل کی۔

عشق و وفا اور استقامت و ثابت قدمی کے اس امتحان کا سب سے نازک مرحلہ اس وقت آیا جب غسّان کے بادشاہ نے ان کے اس محبت و تعلق کو خریدنا چاہا، یہ خیال رہے کہ یہ وہ بادشاہ ہے جس کا مصاحب و ندیم بننا اور اس کی مجلس میں حاضر ہونا بڑا شرف سمجھا جاتا تھا، اور اس میں پوری رقابت چلتی تھی، اور جس کے عرب شعراء برسوں سے گیت گا رہے تھے[2]، بادشاہ کا قاصد ان کے پاس ایسے وقت پہونچا جب وہ سخت ذہنی و قلبی پریشانی، لوگوں کی بے تعلقی، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بے رخی کے شدید ابتلاء میں تھے، اس نے ان کو شاہ غسّان، کا خط دیا، جس کا مضمون یہ تھا:۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھارے ولی نعمت نے تمھارے ساتھ جفا کا معاملہ کیا ہے، اللہ نے تمھارے لئے ذِلّت اور ضائع ہونے کی جگہ مقدر نہیں کی ہے، تم ہمارے پاس آجاؤ ہم تمھارے ساتھ اچھا معاملہ کریں گے"!

اس خط سے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے دل میں غیرت و حمیّت کی ایک بجلی کوند گئی اور ان کی محبت اور جوش مارنے لگی، وہ ایک تنور کے پاس گئے اور خط اس میں پھینک دیا۔

جب ان تینوں صاحبِ ایمان ہستیوں کا امتحان مکمل ہوگیا، قرآن مجید نے ان کا

---

[1] حدیث کعب بن مالک رض صحیح بخاری [2] دیکھئے آل جفنہ کی منقبت میں حسّان بن ثابت رض کا مشہور قصیدہ جس کے دو شعر ہیں:۔

للہ در عصابۃ نادمتھم	یوماً بجلّق فی الزمان الاول
یسقون من ورد البریص علیھم	بردی یصفق بالرحیق السلسل

ذکر کرکے ان کو بقاء دوام عطا کی اور ان کے واقعہ نے مسلمانوں کے لئے ابد الآباد تک ایک سبق اور سامانِ عبرت و نصیحت فراہم کردیا، اور ان کی ایمانی قوت اور حسنِ اسلام کا پورا ثبوت مل گیا، اور باوجود اس کے کہ زمین اُن پر اپنی کشادگی کے باوصف تنگ ہوچکی تھی، بلکہ خود ان کے نفس ان کے لئے تنگ تھے، ان کے پیر جادۂ حق سے ایک لمحہ کے لئے نہ ہٹے تو اس وقت اللہ تعالے نے آسمانوں کے اوپر سے ان کی قبولیت کا اعلان فرمایا، اور صرف ان کی توبہ کا ذکر نہیں کیا کہ وہ کہیں اس سے تنہائی اور احساس کہتری محسوس نہ کریں، اور یہ بات ان کے لئے انگشت نمائی کا باعث نہ بنے بلکہ ان کی توبہ کی تمہید میں سید الانبیاء والمرسلین اور مہاجرین و انصار کی توبہ کا بھی ذکر کیا،[1] جو اس غزوہ میں پیش پیش تھے، اس کا مقصد ان کا اعزاز و اکرام، ان کی تسکینِ خاطر، لوگوں کی نگاہ میں ان کی قدر بڑھانا اور ان کی شان دوبالا کرنا تھا۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ	بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی اور
وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ	مہاجرین اور انصار پر جو باوجود اس کے
اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ	کہ ان میں سے بعضوں کے دل پھر جانے کو
بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ	تھے، مشکل کی گھڑی میں پیغمبر کے ساتھ
مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ	رہے پھر خدا نے ان پر مہربانی فرمائی
رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ	بے شک وہ ان پر نہایت شفقت
الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ	کرنے والا (اور) مہربان ہے، اور
عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ	ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی
وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ	کیا گیا تھا، یہاں تک کہ جب بھی

---

[1] جو ایک معروف و مسلّم حقیقت تھی، اور جس کی بظاہر (چنداں) ضرورت نہ تھی۔

وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

(سورۂ توبہ - ۱۱۷ - ۱۱۸)

باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی، اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہو گئیں اور انھوں نے جان لیا کہ خدا (کے ہاتھ) سے خود اس کے سوا کوئی پناہ نہیں پھر خدا نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں بیشک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

غزوات پر ایک نظر

غزوۂ تبوک کے ساتھ جو ہجرت کے نویں سال رجب میں پیش آیا غزوات نبوی (جن کی تعداد ستائیس[۱] ہے) نیز دوسرے سرایا اور چھاپوں (جن کی تعداد ساٹھ[۱] بتائی گئی ہے[۲]، اور کچھ میں قتال کی نوبت بالکل نہیں آئی) کا سلسلہ ختم ہوا۔

ان تمام غزوات و سرایا میں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بھیجے گئے جتنا خون بہایا گیا، جنگوں کی پوری تاریخ میں ہمیں اس سے کم کوئی مقدار نظر نہیں آتی ان تمام غزوات کے مقتولین کی تعداد ایک ہزار اٹھارہ[۱] سے زیادہ نہیں جس میں دونوں فریق قتال ہیں[۲]، لیکن اس قلیل تعداد نے انسانوں کو خون کی جس ارزانی سے اور بے عزتی و بے آبروئی سے بچایا اس کا مکمل جائزہ اور سروے مشکل بلکہ ناممکن ہے اس کے نتیجہ میں جزیرۃ العرب کے اطراف میں اس قدر امن و اطمینان کی فضا قائم ہو گئی کہ ایک مسافر خاتون حیرہ سے چلتی اور کعبہ کا طواف کر کے واپس جاتی

---

[۱] تحقیق ابن قیم (زاد المعاد) عراقی جنرل اور مشہور مصنف محمود شیت خطاب کی تحقیق میں ان غزوات کی تعداد جن کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قیادت فرمائی اٹھائیس[۲۸] ہے (تاریخ جیش النبی صلے اللہ علیہ وسلم)

[۲] مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے "رحمۃ للعالمین" میں یہی تعداد لکھی ہے جو گہرے مطالعہ اور ذمہ دارانہ تحقیق پر مبنی ہے

اہم اسلامی غزوات کے مقامات
غزوات کے مقامات - بڑے شہر
دجلہ
فرات
کوفہ
مؤتہ
دومتہ الجندل
تبوک
وادی القری
خیبر
ذات الرقاع
احزاب
احد
قینقاع
قرقرۃ الکدر
بواط
سویق
حمراء الاسد
صفوان
ابواء
حنین
طائف
مسقط
عمان
صنعاء
پیمانہ
میل
۲۰۰
(کارٹوگرافی از محمود اختر)

اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا ڈر نہ ہوتا[1]، ایک عورت قادسیہ سے اپنے اونٹ پر چلتی اور بیت اللہ کی زیارت کرتی اور اس کو کسی کا خوف نہ ہوتا[2]، اس سے پہلے یہ حالت تھی کہ پورے جزیرۃ العرب میں قتل و غارتگری، انتقامی کارروائیوں، خانہ جنگیوں اور معرکہ آرائیوں کا سلسلہ قائم تھا، اور بڑی بڑی حکومتوں کے کارواں بھی بڑے غیر معمولی پہرہ، حفاظتی بندوبست اور ماہر رہبروں کی مدد سے چلتے تھے۔

یہ غزوات قرآن مجید کے دو حکیمانہ اصولوں پر مبنی ہیں، ایک "اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ"[3] (فتنہ انگیزی قتل سے بڑھ کر ہے) دوسرے "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ"[4] (اے عقل والو! تمہارے لئے بدلہ اور قصاص ہی میں سامانِ زندگی ہے) ان کی وجہ سے نوعِ انسانی کا بڑا وقت بچا اور اصلاحِ حال اور خطرات کے سدِّباب کی ان طویل کوششوں اور مسلسل محنتوں کی ضرورت نہ پڑی جو اکثر بے نتیجہ رہی ہیں، اس کے علاوہ ان غزوات پر جن اخلاقی تعلیمات اور مشفقانہ و ہمدردانہ ہدایات کا سایہ اور پرتو تھا، اس نے ان کو انتقامی کارروائی اور غصہ کی آگ بجھانے کے بجائے تادیبی کارروائی اور ہدایت و فلاح کا سامان کرنے کا ذریعہ بنا دیا تھا، چنانچہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی لشکر کو روانہ فرماتے تو اس کو یہ ہدایت دیتے:۔

"میں تمھیں اللہ سے ڈرنے اور جو مسلمان تمہارے ساتھ ہیں، ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی نصیحت کرتا ہوں، اللہ کے نام پر قتال کرنا اور اللہ ہی کے راستہ میں اس سے قتال کرنا جس نے اللہ کے ساتھ کفر اختیار کیا، غدّاری نہ کرنا، مالِ غنیمت کی چوری نہ کرنا، کسی بچے، عورت اور از کار رفتہ بوڑھے یا کسی معبد میں بیٹھے ہوئے گوشہ گیر کو

[1] صحیح بخاری باب (علامات النبوۃ) [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ صا ۵۸۱
[3] سورۃ البقرۃ ۔ ۱۹۱ [4] سورۃ البقرۃ ۔ ۱۷۹

قتل نہ کرنا کسی کھجور کو ہاتھ نہ لگانا کسی درخت کو نہ کاٹنا کسی عمارت کو نہ گرانا"[۱]

جہاں تک اس جنگی کارروائی کی کامیابی اور سرعت کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دس سال کی مختصر مدت میں جزیرۃ العرب کا تقریباً ۲۷۴ میل مربع روزانہ اسلام کے زیرنگیں آتا گیا مسلمانوں کے جانی نقصان کو دیکھا جائے تو مہینہ پر ایک آدمی کا اوسط پڑتا ہے دس سال مکمل نہیں ہونے پائے تھے کہ دس لاکھ مربع میل اسلام کے زیر اقتدار آچکے تھے[۲]

اس کا موازنہ دو عالمی جنگوں (جس میں پہلی جنگ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء میں ہوئی تھی، دوسری ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی) سے کیجئے تو آپ کو اس فرق کا صحیح اندازہ ہوگا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے فاضل اور محقق مقالہ نگار نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلی عالمگیر جنگ کے مقتولین کی تعداد چونسٹھ لاکھ تھی[۳]، دوسری عالمگیر جنگ کے مقتولین کی تعداد ساڑھے تین کروڑ اور چھ کروڑ کے درمیان تھی[۴]

ان دونوں جنگوں نے جیسا کہ سب جانتے ہیں انسانیت کی کوئی خدمت انجام نہیں دی اور انسانی سوسائٹی کو ان سے تھوڑا یا بہت کسی درجہ میں فائدہ نہیں پہونچا۔

قرون وسطیٰ کی تحقیقاتی عدالتوں (INQUISITION) اور کلیسا کے ظلم و ستم اور مذہبی استبداد کا جو لوگ نشانہ بنے ان کی تعداد بھی ایک کروڑ بیس لاکھ تک پہونچتی ہے[۵]

۱۔ واقدی بروایت زید بن ارقم بسلسلہ غزوۂ موتہ ۲۔ ان معلومات میں جنرل محمد اکبر خاں کی کتاب "حدیث دفاع" سے فائدہ اٹھایا گیا ہے ۳۔ جلد ۱۹ ص ۹۶۶ ۴۔ ایضاً ص ۱۰۱۳ (ایڈیشن ۱۹۷۳ء)

۵۔ JOHN DEVENPORT, APOLOGY FOR MUHAMMAD AND QURAN

اسلام میں پہلا حج

حج ۹ھ میں فرض کیا گیا[1] اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنایا اور مسلمانوں کو حج کرانے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی۔ مشرکین بھی اپنے حج کے مقامات میں تھے[2] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ سے تین سو آدمیوں کا قافلہ حج کے لئے روانہ ہوا۔[3]

اس وقت سورۂ براۃ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی آپ نے[4] حضرت علیؓ کو بلا بھیجا اور ان سے فرمایا کہ سورۂ براۃ کی ابتدائی آیات اور ان کے احکام کو لے کر وہاں جائیں اور قربانی کے روز جب سب لوگ منیٰ میں جمع ہوں یہ اعلان کردیں کہ "جنت میں کوئی کافر نہیں داخل ہوگا، اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرسکتا، اور کوئی شخص برہنہ ہوکر طواف نہیں کرسکتا، اور اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کسی کا کوئی معاہدہ ہو تو طے شدہ میعاد تک اس کی پابندی کی جائے گی" حضرت علیؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی پر روانہ ہوئے اور راستہ میں حضرت ابوبکرؓ سے جا ملے، انھوں نے پوچھا کہ امیر ہو یا مامور؟ کہنے لگے مامور ہوں، پھر دونوں اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حج کے انتظامات میں مشغول ہوگئے، جب قربانی کا دن آیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہوکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم اور ہدایت کے مطابق ان سب باتوں کا اعلان کیا۔

---

[1] بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ حج ۶ھ میں فرض ہوا، شیخ محمد الخضری نے اپنی کتاب "تاریخ التشریع الاسلامی" میں اسی قول کو اختیار کیا ہے، دیکھیے صفحہ ۵۱ [2] ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۵۴۳

[3] زاد المعاد ج ۲ صفحہ ۲۴۴ [4] ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۵۴۳-۵۴۶

وفود کا سال

(سنہ ۹-۱۰ھ)

مدینہ میں وفود کی مسلسل آمد اور عرب کی زندگی پر اس کا اثر

پہلے اللہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے مکہ فتح فرمایا، پھر غزوۂ تبوک سے آپؐ مظفر و منصور واپس ہوئے اس سے قبل آپؐ دنیا کے سلاطین و امراء کے نام اپنے مکاتیب ارسال فرما چکے تھے، جن میں ان کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی، ان مکاتیب کا بعض بادشاہوں نے خوشدلی اور احترام و تعظیم کے ساتھ استقبال کیا، بعض نے نرمی اور معقولیت کے ساتھ اس کا جواب دے دیا، بعض لوگ تردد اور خوف کی حالت میں رہے، اور کچھ نے اس کو گستاخی کے ساتھ رد کر دیا، اور اس کے ساتھ اہانت اور تکبر کا معاملہ کیا، اور اس کی پاداش میں بلا کسی تاخیر کے اس کو اپنے ملک اور جان سے ہاتھ دھونا پڑا، یہ وہ واقعات تھے، جن کا چرچا سارے عرب میں تھا، اور ہر جگہ اس کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔

مکہ کی فتح سے (جو جزیرۃ العرب کا روحانی و اجتماعی پایۂ تخت تھا) سرداران قریش کے قبولِ اسلام اور دین حق کے سامنے مزاحمت و سرکشی کے سب سے بڑے قلعہ کے انہدام کا ان لوگوں پر گہرا اثر پڑا جو گومگو کی کیفیت میں تھے، یا اسلام کی ناکامی کا

خواب دیکھ رہے تھے، ان واقعات نے ان کے اور اسلام کے درمیان وہ قدیم رکاوٹ دور کردی اور ان کے اور قبول اسلام کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ بہت کم رہ گیا، مشہور محدث علامہ محمد طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ) اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مجمع بحار الانوار" میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ سال آمدِ وفود کا سال تھا، عرب قبائل نے اسلام کے ساتھ قریش کے معاملہ کا انتظار کیا تھا، اس لئے کہ وہی لوگ سب کے پیشوا تھے، اور بیت اللہ کے ذمہ دار تھے، جب انھوں نے اسلام کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا، مکہ فتح ہو گیا اور قبیلۂ ثقیف نے بھی اسلام قبول کر لیا تو انھوں نے محسوس کر لیا کہ اب ان کے اندر ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں، اس وقت ہر طرف سے وفود کی کثرت ہوئی اور لوگ گروہ در گروہ اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے"[1]

ان سب باتوں کا عربوں کے دل و دماغ پر (جو بہر حال انسان تھے) قدرتی طور پر اثر پڑا اور اس کی وجہ سے اسلام میں داخل ہونے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کی حاضری کا ایک دروازہ کھل گیا، اور تلاشِ حق میں مختلف وفود مرکزِ اسلام میں اس کثرت سے آنے لگے جس طرح کوئی موتی کی لڑی ٹوٹ جائے اور اس کے سارے دانے اسلام کی آغوش میں آ جائیں۔

یہ وفد اپنے اپنے علاقوں اور مرکزوں میں نئی روح سے سرشار ہو کر، ایمان کا نیا نشہ، دعوتِ اسلام کا نیا جذبہ، شرک و بت پرستی اور اس کے نشانات و علامات اور جاہلیت اور اس کے اثرات سے شدید نفرت لے کر واپس جاتے۔

---

[1] مجمع بحار الانوار ج ۵ صہ ۲۷۳

ان وفود میں بنی تمیم کا بھی وفد تھا جس میں ان کی قوم کے مشہور رؤساء و اشراف شامل تھے، ان کے خطیب و شاعر اور مسلمانوں کے خطیب و شاعر میں مقابلہ ہوا اور اس میں اسلام کی اور اسلام کے خطیب و شاعر کی برتری ظاہر ہوئی، اس کو ان کے رؤسا و اشراف نے تسلیم بھی کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو انعامات بھی دیئے اور اچھی طرح دیئے۔[1]

بنی عامر کا وفد بھی آیا، ضمام بن ثعلبہ بنی سعد بن بکر کی طرف سے نمائندہ بن کر آئے اور داعی و مبلغ بن کر اپنی قوم میں واپس ہوئے، پہلا مکالمہ جو وہاں پہونچ کر ان کی قوم سے ہوا وہ ان کا یہ جملہ تھا "برا ہو" لات "و" عزیٰ "کا، لوگوں نے کہا ارے کیا کہتے ہو ضمام! برص سے ڈرو، جذام سے ڈرو، جنون سے ڈرو، وہ کہنے لگے "تمہاری خرابی ہو، خدا کی قسم یہ دونوں نہ نقصان پہونچا سکتے ہیں نہ فائدہ، بے شک اللہ نے ایک رسول بھیجا ہے، اور ان پر ایک کتاب نازل کی ہے جس کے ذریعہ انھوں نے تم کو اس سے نجات دی جس میں تم لوگ ہو، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم اس کے بندہ اور اس کے رسول ہیں، میں ان کے پاس سے جو کچھ انھوں نے حکم دیا اور جس چیز سے منع کیا ہے وہی تمہارے لئے لے کر آیا ہوں" اس دن شام بھی نہیں ہوئی کہ ان کے محلہ میں کوئی مرد، عورت ایسا نہ تھا جو اسلام نہ لایا ہو۔[2]

بنی حنیفہ کا وفد آیا جس میں مسیلمہ کذاب بھی تھا، یہ اسلام لایا اور بعد میں

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۶۰-۵۶۸ [2] ایضاً ص ۵۷۴

مرتد ہوگیا اور خود نبوت کا دعویدار بن بیٹھا، اسی نے فتنۂ ارتداد برپا کیا اور اسی میں مارا گیا۔

وفد بنی طے میں نامور شہسوار زید الخیل بھی تھے جن کا نام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بدل کر "زید الخیر" کر دیا اور مومنین راسخین میں ان کا شمار ہوا۔

مشہور زمانہ سخی حاتم کے بیٹے عدی بن حاتم بھی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کے اخلاق کریمانہ اور تواضع دیکھ کر اسلام لے آئے اور یہ کہا کہ خدا کی قسم یہ کسی بادشاہ کا انداز نہیں۔

بنی زبید کا وفد بھی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وفد میں عرب کے نامور شہسوار عمرو بن معدیکرب بھی تھے، کندہ کے وفد میں اشعث بن قیس شامل تھے، ازد کا وفد بھی حاضر ہوا، سلاطین حمیر کا قاصد بھی پہونچا اور ان بادشاہوں کا خط آپؐ کی خدمت میں پیش کیا جس میں ان کے قبول اسلام کی اطلاع تھی۔

معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہما کو آپؐ نے اسلام کی دعوت دینے کے لئے یمن روانہ کیا، اور ان کو ہدایت کی کہ "یسّرا ولا تعسّرا وبشّرا ولا تنفّرا"[1] (دیکھو آسانی پیدا کرنا تنگی و سختی نہ کرنا خوشخبری دینا متنفر و بیزار نہ کرنا)

فروہ بن عمرو الجذامی نے ایک قاصد کے ذریعہ آپؐ کو اپنے قبول اسلام کی خبر بھیجی، یہ رومی سلطنت کی طرف سے "معان" اور اس کے اطراف میں جتنا شامی علاقہ ہے اس کا عامل یا گورنر تھا۔

نجران میں بنو الحارث بن کعب خالد بن الولید کے ہاتھ پر اسلام لائے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی "باب بعث معاذ و ابی موسیٰ الی الیمن"

حضرت خالد نے وہاں قیام کرکے ان کو اسلام کی تعلیم دی اس کے بعد خالد رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ بنو الحارث کا ایک وفد لے کر واپس آئے اور جب وہ لوگ اپنے علاقہ واپس گئے تو ان کی تعلیم کے لئے آپؐ نے عمرو بن حزم کو بھیجا کہ وہ سُنّت اور اسلام کے شعائر و آداب سے ان کو آگاہ کریں اور ان کے صدقات وغیرہ کا انتظام کریں، ہمدان کا وفد بھی خدمت میں حاضر ہوا۔[1]

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے "لات" بُت کو توڑنے کے لئے بھیجا، انھوں نے پہلے اُس بُت کو پاش پاش کیا، اس کے بعد بُت خانہ کی چار دیواری پر چڑھ گئے اور دوسرے لوگ جو ان کے ساتھ تھے، وہ بھی چڑھ گئے اور سب نے مل کر اس کے ایک ایک پتھر کو گرانا شروع کر دیا یہاں تک کہ وہ زمین کے بالکل برابر ہوگیا، اسی روز یہ وفد واپس بھی آگیا، اور آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا آپؐ نے اس کی تعریف کی۔[2]

عبد القیس کا وفد آیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو خوش آمدید کہا، اور ان برتنوں اور ظروف کو استعمال کرنے کی ان کو ممانعت فرمائی جن میں نشہ جلدی پیدا ہوتا ہے، یہ احتیاطاً آپؐ نے مفاسد کے سدِّ باب کے لئے ارشاد فرمایا، اس لئے کہ وہ لوگ اس کے بہت عادی تھے۔[3]

اشعریین اور اہلِ یمن کا وفد بڑے سُرور کے ساتھ یہ شعر پڑھتا ہوا آیا "غداً نلقی الأحبۃ محمداً وحزبہ" کل ہم محبوبوں سے ملیں گے،

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۵۷۵-۵۹۶ [2] سیرت ابن کثیر ج ۴ ص ۶۲-۶۳

[3] زاد المعاد ج ۲ ص ۲۸ صحیحین میں یہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے اصحاب سے"! آپ نے اس وفد کو دیکھ کر فرمایا" اتاکم أھل الیمن ھم أرق أفئدۃ وألینھم قلوبا الإیمان یمان والحکمۃ یمانیۃ"[1] تمہارے پاس اہل یمن آئے ہیں، جو بہت نرم و گداز دل والے ہیں، ایمان تو یمن کا حصہ ہے، حکمت تو یمن کی حکمت ہے۔

خالد بن الولیدؓ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کے ساتھ دعوتِ اسلام کے لئے اہلِ یمن کے پاس بھیجا، انھوں نے وہاں چھ ماہ گذارے، حضرت خالدؓ برابر ان کو اسلام کی دعوت دیتے اور وہ قبول نہ کرتے، پھر آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو وہاں بھیجا، انھوں نے ان کو آپ کا خط پڑھ کر سنایا اور پورا قبیلۂ ہمدان مسلمان ہو گیا، حضرت علیؓ نے آپ کو ان کے اسلام لانے کی اطلاع بھیجی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب ان کا خط پڑھا تو سجدہ میں گر پڑے، پھر سر مبارک اٹھایا اور فرمایا سلامتی ہو ہمدان پر، سلامتی ہو ہمدان پر[2]۔

مُزَینہ کا وفد چار سو آدمیوں کے ساتھ آیا، نجران کے عیسائیوں کا بھی ایک وفد جس میں ساٹھ سوار تھے، اس میں ان کے اشراف و سربرآوردہ لوگوں کی تعداد چوبیس تھی، اس میں ان کے بڑے پادری اور عالم ابوحارثہ بھی تھے، رومی بادشاہ ان کا بڑا اعزاز کرتے تھے، ان کی ہر طرح مالی مدد کرتے تھے، اور ان کے لئے گرجے تعمیر کرتے تھے، ان لوگوں کے بارے میں قرآن مجید میں بکثرت آیات نازل ہوئیں[3]۔

اہلِ نجران کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوب بھیجا اور ان کو اسلام کی دعوت دی، انھوں نے یہ مکتوب پڑھا تو ایک وفد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس

---

[1] صحیح بخاری باب "قدوم الاشعریین واہل الیمن" ایک روایت میں "الفقہ یمان" کا بھی اضافہ ہے یعنی دین کی سمجھ یمن کا حصہ ہے [2] زاد المعاد ج ۲ ص ۳۳ از صحیح بخاری [3] تفصیل کے لئے دیکھئے زاد المعاد ج ۲ ص ۳۵-۳۶

روانہ کیا، اور اس نے بہت سے سوالات آپؐ کے سامنے رکھے، ان کے سوالوں کے جواب میں سورۂ آلِ عمران کی بہت سی آیتیں نازل ہوئیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو مُباہلہ[1] کی دعوت بھی دی لیکن خوف کی وجہ سے شرحبیل اس پر تیار نہیں ہوا، دوسرے روز یہ لوگ پھر خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت آپؐ نے ان کو ایک تحریر دی، ان پر خراج لگایا اور ابو عُبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ یہ کہہ کر بھیجا کہ "ھٰذا أمین ھٰذہ الأمة" یہ اس اُمّت کے امین ہیں[2]۔

وفد تُجیب کی آمد سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت خوشی ہوئی، آپؐ نے ان کی بڑی عزت اور خاطر داری کی، انھوں نے آپؐ سے مختلف چیزوں کے بارے میں سوالات کئے، آپؐ نے یہ سارے جوابات ان کو لکھوا کر دے دیئے، پھر وہ آپؐ سے قرآن وسنّت کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھنے لگے، اس کی وجہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اُن سے خاص مناسبت پیدا ہو گئی، آپؐ نے حضرت بلالؓ کو ہدایت کی کہ ان کی اچھی طرح اہتمام سے ضیافت ومہمانداری کریں، یہ لوگ چند روز آپ کی صحبت میں رہے اور زیادہ قیام نہ کر سکے، ان سے پوچھا گیا کہ وہ کس وجہ سے اتنی جلدی کر رہے ہیں، کہنے لگے ہم اپنے لوگوں میں جا کر بتانا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہم نے کیسے کی، آپؐ سے ہماری کیا کیا باتیں ہوئیں، اور آپؐ نے کیا جواب دیا، اس کے بعد وہ لوگ واپس ہو گئے، پھر سنہ ھ کے حج میں "منیٰ" میں وہ آپؐ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوئے[3]۔

ان وفود میں بنی فزارہ، بنی اسد، بہراء اور عذرہ کے وفد بھی تھے، یہ سب لوگ اسلام لائے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو فتحِ شام کی بشارت دی، ان کو

---

[1] مُباہلہ کی حقیقت وتفصیل کے لئے آل عمران کی آیت ۶۱ کی تفسیر میں ملاحظہ ہو [2] ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۱ امام بخاری نے "قصہ اہل نجران" کے باب میں اس واقعہ کو مختصراً بیان کیا ہے [3] زاد المعاد ج ۲ صفحہ ۴۳

کاہن عورتوں کے پاس جانے اور ان سے قسمت کا حال پوچھنے سے منع فرمایا، جو قربانیاں وہ کرتے تھے، ان سے بھی انھیں منع کیا، اور فرمایا کہ صرف عیدالاضحیٰ کی قربانی ان کے لئے جائز ہے[1]، بلی، ذی مرّہ اور خولان کے وفد بھی حاضر خدمت ہوئے، ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خولان کے بُت[1] کے بارے میں جس کی وہ پرستش کرتے تھے، دریافت فرمایا، انھوں نے جواب دیا کہ آپ کو مبارک ہو آپ جو کچھ لے کر آئے ہیں اس سے اللہ تعالےٰ نے اس کو بدل دیا ہے، البتہ کچھ پرانے لوگ کچھ بڑی بوڑھی عورتیں اب بھی اس کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئی ہیں، جب ہم واپس جائیں گے تو انشاءاللہ اس بُت کو توڑ ڈالیں گے[2]، محارب اور غسّان اور غامد اور نخع کے وفود بھی آپ کے پاس حاضر ہوئے[3]۔

یہ وفود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دین سیکھتے، دینی معلومات اور دین کی سمجھ حاصل کرتے، مسائل معلوم کرتے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کا مشاہدہ کرتے اور آپ کے اصحاب کرامؓ کی صحبت و معیّت ان کو نصیب ہوتی، اکثر مسجد نبوی کے صحن میں ان کے لئے خیمہ لگا دیا جاتا، وہ وہاں رہتے، قرآن مجید سنتے، مسلمانوں کو نماز پڑھتا ہوا دیکھتے اور ان کے دل میں جو کچھ آتا وہ بڑی سادگی اور صفائی سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیتے اور آپ بڑی بلاغت اور حکمت کے ساتھ اس کا جواب عنایت فرماتے، اور قرآن مجید سے استشہاد کرتے، اس سے ان کا ایمان پختہ ہوتا اور قلبی اطمینان نصیب ہوتا۔

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۴۶-۴۷ [2] ایضاً ص ۴۷ [3] ایضاً ص ۴۷-۵۵

ایک جاہل بُت پرست اور نبیِّ ہادیؐ کا مکالمہ

کنانہ بن عبد یالیل اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان جو مکالمہ ہوا وہ یہاں پیش کیا جاتا ہے :۔

کنانہ :۔ جہاں تک زنا کا مسئلہ ہے ہم لوگ اکثر مجرّد اور غیر شادی شدہ رہتے ہیں[1] اس لئے یہ ہمارے لئے ضروری ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم :۔ وہ تم پر حرام ہے' اللہ تعالٰے کا ارشاد ہے " وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا (ترجمہ :۔ اور زنا کے پاس بھی نہ جانا کہ وہ بے حیائی اور بُری راہ ہے۔ سورۂ اسراء ۔ ۳۲)

کنانہ :۔ سود کے بارے میں جو آپؐ کہتے ہیں' تو ہمارا سارا مال سود ہی سود ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم :۔ اصل سرمایہ رأس المال لینے کا تمھیں حق ہے اللہ تعالٰے کا ارشاد ہے :۔ " يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ[2] "۔ (ترجمہ : مومنو! خدا سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو' جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو)

کنانہ : جہاں تک شراب کا تعلق ہے تو وہی تو ہماری زمین کا نچوڑ ہے اور ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم :۔ اللہ تعالٰے نے اسے حرام کیا ہے " يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ " (ترجمہ :۔ اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پاسے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔ المائدہ ۔ ۹۰)

---

[1] غالباً یہ لوگ تجارت کے سلسلہ میں کثرت سے سفر کرتے تھے۔ [2] سورۃ البقرہ ۔ ۲۶

کنانہ :۔ رَبّہ بُت کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم :۔ اس کو توڑ ڈالو۔

کنانہ اور اس کے ہمراہی :۔ اگر رَبّہ کو معلوم ہو جائے کہ آپ اس کو توڑ دینا چاہتے ہیں تو وہ اپنے سب پجاریوں کو ختم کردے، اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ابن عبد یالیل! تمھاری خرابی ہو، تم کس قدر جاہل ہو، رَبّہ ایک پتھر کے سوا کیا ہے؟

کنانہ اور اس کے ہمراہی :۔ ابن خطّاب! ہم تمھارے پاس نہیں آئے ہیں پھر اس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا آپ اس کو توڑ ڈالیں ہم اس کو کبھی نہیں توڑ سکتے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم :۔ میں کسی آدمی کو تمھارے ہاں بھیج دوں گا، جو تمھارے لئے یہ کام کردے گا۔

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو رخصت کی اجازت دی اور ان کا پورا اکرام کیا، انھوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ ہمارے لئے ہماری قوم کا کوئی امیر بنا دیجئے آپ نے عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر مقرر فرما دیا، یہ ان سب میں سب سے زیادہ نوعمر تھے لیکن علم دین سے ان کی دلچسپی آپ کے علم میں تھی، انھوں نے وہاں جانے سے قبل قرآن مجید کی کچھ سورتیں بھی یاد کرلی تھیں۔[1]

وفود کی آمد کا یہ سال عرب میں بُت پرستی اور بُت پرستوں کے استیصال کا سال تھا۔

زکوٰۃ و صدقات کی فرضیت

ہجرت کے پانچویں سال زکوٰۃ فرض ہوئی[2]، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اُمراء و عُمّال کو ان تمام علاقوں میں جہاں اسلام پہونچ چکا تھا، روانہ فرمایا۔

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۲۵ [2] حافظ ابن حجر کی تحقیق کے مطابق (فتح الباری)

حَجَّۃُ الوِدَاعْ

(ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ - فروری سنہ ۶۳۲ء)

حجۃ الوداع اور اس کے وقت کا انتخاب

جب مشیتِ الٰہی کی تکمیل ہوگئی، امت کے نفوس بت پرستی کی آلودگیوں اور جاہلیت کی عادتوں سے پاک اور ایمان کی روشنی سے منوّر ہوگئے اور ان کے دل کی سرد انگیٹھیوں میں شوق و محبت کی چنگاریاں پیدا ہوگئیں، بیت اللہ بھی بتوں اور بتوں کی گندگی سے پاک و صاف ہوگیا، مسلمانوں کے اندر (جن کو حجّ بیت اللہ کئے ہوئے بہت عرصہ ہوگیا تھا) حج کا نیا شوق پیدا ہوگیا، اور محبت اور عشق کا جام نہ صرف لبریز ہوا بلکہ چھلکنے لگا، جُدائی کی گھڑی بھی بہت قریب آگئی' اور حالات کا تقاضہ ہوا کہ امت کو وداع کہا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو (سنہ ۱۰ھ میں) حج کی اجازت عطا فرمائی، اسلام میں یہ آپ کا پہلا حج تھا۔

حجۃ الوداع کی دعوتی، تبلیغی اور تربیتی اہمیّت

آپ مدینہ سے اس غرض سے روانہ ہوئے کہ حجّ بیت اللہ کریں گے، مسلمانوں سے ملیں گے، ان کو دین کی تعلیم دیں گے اور مناسک حج سکھائیں گے، حق کی شہادت دیں گے

اپنا فرض ادا کریں گے، مسلمانوں کو آخری نصیحتیں اور وصیتیں کریں گے، ان سے عہد و پیمان لیں گے، جاہلیت کے آخری آثار و نشانات کو مٹائیں گے اور قدموں سے پامال کریں گے، یہ حج ہزار وعظ، اور ہزار درس و تعلیم کا قائم مقام تھا، یہ دراصل ایک چلتا پھرتا مدرسہ، ایک متحرک مسجد، اور ایک گشتی چھاؤنی تھی، جہاں ایک جاہل علم سے آراستہ ہوتا، غافل اپنی غفلت سے بیدار ہوتا، سست و کاہل چُست و چالاک اور کمزور طاقتور بنتا، ایک ابرِ رحمت سفر و قیام ہر حالت میں اور ہر وقت ان پر سایہ فگن رہتا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپؐ کی محبت و شفقت اور آپؐ کی تربیت اور نگرانی و رہنمائی کا ابرِ رحمت تھا۔

حجۃُ الوداع کا تاریخی ریکارڈ

صحابۂ کرام جیسے ثقہ اور عادل راویوں نے اس سفر کے نازک سے نازک گوشوں اور پہلوؤں اور اس کے چھوٹے چھوٹے واقعہ کا ایک ایسا ریکارڈ ہمارے لئے محفوظ کر دیا ہے جس کی مثال نہ سلاطین و امراء کے سفرناموں میں ملتی ہے نہ علما و مشائخ کی سرگذشتوں میں۔[1]

---

[1] مثلاً ان روایات میں یہاں تک موجود ہے کہ آپ نے احرام کے وقت کس قسم کی خوشبو استعمال کی، ہدی کا اشعار کیا (زخم لگایا) تو اس کا نشان کس جانب تھا، وکس مقام پر پچھنا لگایا، کس مقام پر آپ کو ایک شکار کئے ہوئے گورخر کا ہدیہ پیش کیا گیا، یہاں تک کہ منیٰ کی شب میں اس جمِ غفیر میں سانپ کے نکلنے، اور اس کے بچ کر نکل جانے کا واقعہ بھی مذکور ہے، آپ نے جن لوگوں کو اس سفر میں اپنے ساتھ سواری پر سوار کیا (باوجودیکہ ان کی تعداد اڑتیس ۳۸ تک پہونچتی ہے) ان سب کے (باقی ص۵۱۱ پر)

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت و سفر حجۃ الوداع کے راستے اور ان کے مقامات

حجۃ الوداع کا اجمالی جائزہ

ہم اس سفرِ حج کا خلاصہ[۱] یہاں پیش کرتے ہیں جس کو "حجۃ الوداع" "حجۃ البلاغ" اور "حجۃ التمام" کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے' اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ان سب کا جامع ہے' بلکہ اس سے بھی سوا ہے' آپ کے ساتھ اس سفر میں ایک لاکھ سے زیادہ صحابی شریک تھے[۲]۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حج کیسے کیا؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حج کا ارادہ فرمایا اور (ذی قعدہ سنہ ۱۰ھ میں) لوگوں کو اس کی اطلاع کردی کہ آپ حج کے لئے جانے والے ہیں' یہ سن کر لوگوں نے آپ کے ساتھ حج میں جانے کی تیاریاں شروع کردیں۔

اس کی خبر مدینہ کے اطراف میں بھی پہونچی اور وہاں سے لوگ جوق جوق مدینہ حاضر ہوئے' راستہ میں اتنی بڑی تعداد میں لوگ اس قافلہ میں شامل ہوتے گئے کہ

(باقی صفحہ ۵۱۰ کا) نام حتی کہ اس حجّام کا نام بھی مذکور ہے جس نے بال بنانے کی سعادت حاصل کی' موئے مبارک تقسیم کئے تو اس کی بھی تفصیل موجود ہے کہ داہنی طرف کے بال کن لوگوں کو عطا ہوئے اور بائیں جانب کے کن لوگوں کو تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حجۃ الوداع وجزء عمرات النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم" مؤلفہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ نیز مقدمہ کتاب از راقم سطور (طبع بیروت) [۱] ہم نے اس تلخیص میں علامہ ابن القیم کی نفیس کتاب "زاد المعاد" سے استفادہ کیا ہے جنھوں نے اس موضوع کا روایات تاریخ اور فقہ کی روشنی میں پورا استیعاب کیا ہے [۲] ان کی تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار سے ایک لاکھ تیس ہزار تک بتائی گئی ہے۔

ان کا شمار مشکل ہے، خلقت کا ایک ہجوم تھا جو آگے پیچھے دائیں بائیں حد نگاہ تک آپ کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھا، آپؐ مدینہ سے دن میں ظہر کے بعد ۲۵ ذی قعدہ کو سنیچر کے دن روانہ ہوئے، پہلے ظہر کی چار رکعتیں آپؐ نے ادا فرمائیں اس سے پہلے خطبہ دیا اور اس میں احرام کے واجبات وسنن بیان فرمائے۔

پھر تلبیہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے "لبیك اللهم لبیك، لبیك، لاشریك لك لبیك، إن الحمد والنعمة لك والملك لاشریك لك" مجمع ان الفاظ میں کبھی اختصار (کبھی فرط شوق سے حذف واضافہ کرتا) آپ اس پر کوئی نکیر نہ فرماتے تلبیہ کا سلسلہ آپؐ نے برابر جاری رکھا اور "عرج" میں پہونچ کر پڑاؤ کیا، آپ کی سواری اور حضرت ابوبکرؓ کی سواری ایک تھی۔

پھر آگے روانہ ہوئے اور "الأبواء" پہونچے، وہاں سے چل کر وادئ عسفان اور سرف میں پہونچے، پھر وہاں سے روانہ ہو کر "ذی طویٰ" میں منزل کی اور سنیچر کی رات وہاں گذاری، یہ ذی الحجہ کی چار تاریخ تھی، فجر کی نماز آپؐ نے یہیں ادا فرمائی اسی روز غسل بھی فرمایا، اور مکہ کی طرف روانہ ہوئے، مکہ میں آپؐ کا داخلہ دن میں بلندی کی طرف سے ہوا، وہاں سے چلتے ہوئے، آپ حرم شریف میں داخل ہوئے یہ چاشت کا وقت تھا، بیت اللہ پر نظر پڑتے ہی آپؐ نے فرمایا "اللهم زد بیتك هذا تشریفا وتعظیما وتکریما ومهابة" (اے اللہ اپنے اس گھر کی عزت وشرف تعظیم وتکریم، اور رعب وہیبت میں اور اضافہ فرما) دست مبارک بلند کرتے تکبیر کہتے اور ارشاد فرماتے "اللهم أنت السلام ومنك السلام حینا ربنا بالسلام" (اے اللہ آپ سلامتی ہیں، آپ ہی سے سلامتی کا وجود ہے، اے ہمارے رب ہم کو سلامتی

کے ساتھ زندہ رکھ۔)

جب حرم شریف میں آپ داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپؐ نے کعبہ کا رُخ کیا، حجرِ اسود کا سامنا ہوا تو آپؐ نے بغیر کسی مزاحمت کے اس کا بوسہ لیا پھر طواف کے لئے داہنی طرف رُخ کیا، بیت اللہ آپؐ کی بائیں طرف تھا، اس طواف کے پہلے تین[3] شوط میں آپؐ نے رمل کیا۔[1]

آپؐ تیز چل رہے تھے، قدموں کا فاصلہ مختصر ہوتا تھا، اپنی چادر آپؐ نے اپنے ایک شانہ پر ڈال لی تھی، دوسرا شانۂ مبارک کھلا ہوا تھا،[2] جب آپ حجرِ اسود کے سامنے گذرتے تو اس کی طرف اشارہ کرکے اپنی چھڑی سے استلام کرتے، جب طواف سے فراغت ہوئی تو مقام ابراہیم کے پیچھے تشریف لائے اور یہ آیت تلاوت فرمائی "وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى"[3] اس کے بعد یہاں دو رکعتیں پڑھیں نماز سے فارغ ہوکر پھر حجرِ اسود کے قریب تشریف لے گئے اور اس کا بوسہ لیا، پھر صفا کی طرف اس دروازے سے چلے جو آپ کے مقابل تھا، جب اس کے قریب آگئے تو فرمایا: "إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ ابدأ بما بدأ الله به" (صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کے شعائر اور نشانیوں میں سے ہیں، میں شروع کرتا ہوں اس سے جس سے اللہ نے شروع کیا۔)

پھر آپ اس پر چڑھے یہاں تک کہ بیت اللہ آپؐ کو نظر آنے لگا، پھر قبلہ کی طرف متوجہ ہوکر آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و کبریائی کا اعلان کیا۔

---

[1] رمل کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو مناسک و مسائلِ حج کی کتابیں۔ [2] جس کو اصطلاح میں اضطباع کہتے ہیں، تفصیل کے لئے مسائلِ حج کی کتابیں دیکھی جائیں۔ [3] سورۂ بقرہ ۱۲۵

لا إله الا الله وحده لاشريك	اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا
لهٗ له الملك وله الحمد وهو	ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کا
على كل شئ قدير لا إله إلا الله	سب ملک اور بادشاہی ہے اور اسی
وحده انجز وعده ونصر	کے لئے ساری حمد و تعریف ہے اور
عبده وهزم الأحزاب	وہ ہر چیز پر قادر ہے اللہ کے سوا کوئی
وحده۔	معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی
	شریک نہیں اس نے اپنا وعدہ پورا
	کیا، اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور تمام
	جماعتوں اور گروہوں کو تنہا شکست دی۔

مکہ میں آپؐ نے چار روز سنیچر، دوشنبہ، منگل، بدھ قیام فرمایا، جمعرات کے روز دن نکلتے ہی آپؐ تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ تشریف لے آئے، ظہر و عصر کی نمازیں یہیں ادا فرمائیں اور رات بھی یہیں بسر کی، یہ جمعہ کی رات تھی، جب آفتاب نکل آیا تو آپ عرفہ کی طرف روانہ ہوئے آپؐ نے دیکھا کہ نمرہ میں آپؐ کے لئے خیمہ لگایا جاچکا ہے، چنانچہ آپ اسی میں اترے، جب زوال کا وقت ہوگیا تو اپنی اونٹنی "قصواء" کو تیار کرنے کا حکم دیا، پھر وہاں سے روانہ ہوکر عرفہ کے میدان کے وسط میں آپؐ نے منزل کی، اور اپنی سواری ہی پر تشریف رکھتے ہوئے ایک مہتم بالشان خطبہ دیا، جس میں آپؐ نے اسلام کی بنیادوں کو واضح کیا اور شرک و جہالت کی بنیادیں منہدم کردیں، اس میں ان تمام حرام چیزوں کی آپؐ نے تحریم فرمائی جن کے حرام ہونے پر تمام مذاہب و اقوام متفق ہیں، اور وہ ہیں، ناحق خون کرنا، مال غصب کرنا

اور آبرو ریزی کرنا، جاہلیت کی تمام باتوں اور مروّجہ کاموں کو اپنے قدموں کے نیچے پامال کر دیا، جاہلیت کا سود کُل کا کُل آپؐ نے ختم فرما دیا، اور اس کو بالکل باطل قرار دیا، عورتوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تلقین کی اور ان کے جو حقوق ہیں نیز ان کے ذمہ جو حقوق ہیں، ان کی توضیح کی اور یہ بتایا کہ دستور کے مطابق خوراک اور لباس، نان نفقہ ان کا حق ہے۔

امت کو آپؐ نے کتاب اللہ کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ رہنے کی وصیت کی، اور ارشاد فرمایا کہ "جب تک وہ اس کے ساتھ اپنے کو اچھی طرح وابستہ رکھیں گے گمراہ نہ ہوں گے" آپؐ نے اُن کو آگاہ کیا کہ اُن سے کل قیامت کے دن آپؐ کے بارے میں سوال ہوگا، اور وہ اس کے جواب دہ ہوں گے، اس موقع پر آپؐ نے تمام حاضرین سے دریافت فرمایا کہ وہ آپؐ کے متعلق کیا کہیں گے اور کیا گواہی دیں گے، سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم گواہی دیں گے کہ آپؐ نے پیغامِ حق کما حقہٗ پہونچا دیا، اپنا فرض پورا کیا، اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا، یہ سن کر آپؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار اللہ تعالیٰ کو ان پر گواہ بنایا اور ان کو حکم دیا کہ جو یہاں موجود ہے، وہ غیر حاضر تک یہ بات پہونچا دے۔

جب آپؐ خطبہ پورا فرما چکے تو آپؐ نے بلالؓ کو اذان کا حکم دیا، انھوں نے اذان دی، پھر آپؐ نے ظہر کی نماز دو رکعت پڑھی، اسی طرح عصر کی بھی دو ہی رکعت پڑھی، یہ جمعہ کا روز تھا۔

نماز سے فارغ ہو کر آپ اپنی سواری پر تشریف لے گئے، اور موقف[۱] پر آئے، یہاں آکر

---

[۱] وقوف کی جگہ جہاں آپؐ نے دیر تک دعا فرمائی تھی وہ جگہ اب بھی عرفات میں معروف و متعین ہے

آپؐ اپنے اونٹ پر بیٹھ گئے، اور غروب آفتاب تک دعاء و مناجات اور مالک الملک کے حضور تضرع وابتہال اور اپنی عاجزی و بے چارگی کے اظہار میں مشغول رہے، دعا میں آپ اپنا دست مبارک سینے تک اٹھاتے تھے، جیسا کہ کوئی سائل اور مسکین نان شبینہ کا سوال کر رہا ہو، دعا یہ تھی:-

اللھم انك تسمع کلامی وتری	اے اللہ تو میری بات سنتا ہے اور میری
مکانی وتعلم سرّی وعلانیتی،	جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور
لا یخفی علیك شیٔ من أمری،	ظاہر کو جانتا ہے، تجھ سے میری کوئی
أنا البائس الفقیر المستغیث	بات چھپی نہیں رہ سکتی، میں مصیبت زدہ
المستجیر والوجل المشفق،	ہوں، محتاج ہوں فریادی ہوں،
المقرّ المعترف بذنوبی،	پناہ جو ہوں، پریشان ہوں ہراساں
أسألك مسألة المسکین	ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا
وابتھل الیك ابتھال	ہوں، اعتراف کرنے والا ہوں،
المذنب الذلیل، وأدعوك	تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے
دعاء الخائف الضریر، من	بیکس سوال کرتے ہیں، تیرے آگے
خضعت لك رقبته	گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار ذلیل و خوار
وفاضت لك عیناہ وذلّ	گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا
جسدہ ورغم أنفه لك،	ہوں جیسے خوف زدہ آفت رسیدہ
اللھم لا تجعلنی بدعائك	طلب کرتا ہو، اور جیسے وہ شخص طلب
رب شقیّا وکن لی رؤوفا رحیما	کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے

یا خیر المسئولین
ویا خیر المعطین۔

جھکی ہوا اور اس کے آنسو بہہ رہے
ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے
فروتنی کئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے
سامنے رگڑ رہا ہو اے رب تو مجھے اپنے
سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے
حق میں بڑا مہربان اور رحم کرنے والا
ہو جا اے سب مانگے جانے والوں سے
بہتر اور سب دینے والوں سے اچھے۔

اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"[1] جب آفتاب غروب ہو گیا تو آپؐ عرفہ سے روانہ ہو گئے اور اسامہؓ بن زید کو اپنے پیچھے بٹھایا، آپؐ متانت سکون و وقار کے ساتھ آگے چلے اونٹنی کی مہار آپؐ نے اس طرح سمیٹ لی تھی کہ قریب تھا کہ سر آپؐ کے کجاوہ سے لگ جائے، آپؐ کہتے جاتے تھے کہ لوگو! سکون اور اطمینان کے ساتھ چلو، راستہ بھر آپ تلبیہ کرتے جاتے، اور جب تک مزدلفہ نہ پہونچ گئے، یہ سلسلہ جاری رہا، وہاں پہونچتے ہی آپ نے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم فرمایا، اذان دی گئی، آپؐ کھڑے ہو گئے اور اونٹوں کو بٹھاتے اور سامان اتارنے سے پہلے مغرب کی نماز ادا فرمائی جب لوگوں نے سامان اتار لیا تو آپؐ نے عشا کی نماز بھی ادا فرمائی پھر آپؐ آرام فرمانے کے لئے لیٹ گئے اور فجر تک سوئے۔

---

[1] سورۂ مائدہ ۔ ۳

نماز فجر اول وقت ادا فرمائی، پھر سواری پر بیٹھے اور مشعر الحرام آئے اور قبلہ رُو ہو کر دعاء و تضرع، تکبیر و تہلیل اور ذکر میں مشغول ہو گئے، یہاں تک کہ خوب روشنی پھیل گئی، یہ طلوع آفتاب سے پہلے کی بات ہے، پھر آپ مزدلفہ سے روانہ ہوئے فضل بن عباس رضی اللہ عنہ سواری پر آپ کے پیچھے تھے، آپ برابر تلبیہ میں مشغول رہے، آپ نے ابن عباس کو حکم دیا کہ رمی جمار کے لئے سات کنکریاں چن لیں، جب آپ وادی محسّر کے وسط میں پہونچے تو آپ نے اونٹنی کو تیز کر دیا اور بہت عجلت فرمائی، اس لئے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں اصحاب فیل پر عذاب نازل ہوا تھا، یہاں تک کہ منیٰ پہونچے اور وہاں سے جمرۃ العقبہ تشریف لائے، اور سواری پر طلوع آفتاب کے بعد رمی کی اور تلبیہ موقوف کیا۔

پھر منیٰ واپسی ہوئی، یہاں پہونچ کر آپ نے ایک بلیغ خطبہ دیا جس میں آپ نے یوم النحر کی حرمت سے آگاہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس دن کی جو فضیلت ہے اس کو بیان کیا، دوسرے تمام شہروں پر مکہ کی افضلیت و برتری کا ذکر کیا اور جو کتاب اللہ کی روشنی میں ان کی قیادت کرے اس کی اطاعت و فرمانبرداری ان پر واجب قرار دی، پھر آپ نے حاضرین سے کہا کہ وہ اپنے مناسک و اعمالِ حج آپ سے معلوم کر لیں، آپ نے لوگوں کو یہ بھی تلقین فرمائی کہ دیکھو میرے بعد کافروں کی طرح نہ ہو جانا، جو ایک دوسرے کی گردن مارتے رہتے ہیں، آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ یہ سب باتیں دوسروں تک پہونچا دی جائیں، اس خطبہ میں آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔

اعبدوا ربکم وصلّوا خمسکم	اپنے رب کی عبادت کرو، پانچ وقت
وصوموا شہرکم واطیعوا اذا	کی نماز پڑھو، ایک مہینہ (رمضان)

أمر کم تدخلوا جنة ربکم۔ | کا روزہ رکھو اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو، اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اس وقت آپؐ نے لوگوں کے سامنے الوداعیہ کلمات بھی کہے اور اسی وجہ سے اس حج کا نام "حجۃ الوداع" پڑا۔

پھر آپ منیٰ میں "منحر" تشریف لے گئے، اور ترسٹھ[۶۳] اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح فرمائے جتنے اونٹ آپؐ نے ذبح کئے وہی تعداد آپؐ کی عمر شریف کے برسوں کی بھی ہے اتنی تعداد کے بعد آپؐ نے توقف کیا، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کہا کہ سو میں جتنے باقی ہیں، وہ پورے کریں، غرض جب آپؐ نے قربانی مکمل کر لی تو آپؐ نے حجام کو طلب فرمایا، اور حلق کروایا، اور اپنے موئے مبارک قریب کے لوگوں میں تقسیم فرما دیئے پھر سواری پر مکہ روانہ ہوئے، طوافِ افاضہ کیا جس کو طوافِ زیارت بھی کہتے ہیں، پھر بئر زمزم کے پاس تشریف لائے اور کھڑے ہو کر پانی نوش فرمایا، پھر اسی روز منیٰ واپسی ہوئی اور شب وہیں گذاری، دوسرے دن آپ زوال آفتاب کا انتظار کرتے رہے، جب زوال کا وقت ہو گیا تو آپ اپنی سواری سے اُتر کر رمی جمار کے لئے تشریف لے گئے جمرۂ اولیٰ سے آغاز فرمایا، اس کے بعد جمرۂ وسطیٰ اور جمرۂ عقبہ کے قریب جا کر رمی کی منیٰ میں آپؐ نے دو خطبے دیئے، ایک قربانی کے دن جس کا ذکر ابھی اوپر گذرا، دوسرا قربانی کے دوسرے روز۔

یہاں آپ نے توقف فرمایا، اور ایام تشریق کے تینوں دن کی رمی مکمل کی، پھر مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور سحر کے وقت طواف وداع کیا، اور لوگوں کو تیاری کا

حکم فرمایا، اور مدینہ روانہ ہو گئے۔[1]

جب آپؐ غدیر خم[2] پہونچے تو آپؐ نے ایک خطبہ دیا اور حضرت علیؓ کی فضیلت بیان فرمائی، اس موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

من کنت مولاہ فعلیٌّ مولاہ، اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ۔[3]	جس کو میں محبوب ہوں علی بھی اس کو محبوب ہونا چاہئے اے اللہ جو علی سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت رکھ اور جو ان سے عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت رکھ۔

جب آپ ذوالحلیفہ آئے تو رات یہیں بسر کی، سواد مدینہ پر آپ کی نظر پڑی تو آپؐ نے تین بار تکبیر کہی اور ارشاد فرمایا:۔

لا إله الا الله وحده لاشريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شئ قدير،	خدا بزرگ و برتر ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں بس اسی کی سلطنت ہے،

---

[1] یہ حصہ زاد المعاد سے اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے ج ۱ (ص ۱۸۰-۲۴۹) ان مباحث کو چھوڑ دیا گیا ہے، جن میں مصنف نے زیادہ توسع و تفصیل سے کام لیا ہے اسی طرح فقہاء و محدثین کے اختلافات بھی حذف کر دیئے گئے ہیں [2] غدیر خم مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے، جحفہ اور اس میں ۲ دو میل کا فاصلہ ہے۔

[3] بروایت امام احمد اور نسائی، اس خطبہ کے ارشاد فرمانے کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ لوگوں نے حضرت علیؓ کی آپؐ سے (بیجا) شکایت کی تھی اور ان کو آپ سے کبیدگی ہو گئی تھی، بعض ایسے لوگوں نے ان پر اعتراضات کئے تھے، جو یمن میں ان کے ساتھ تھے، اور حضرت علی کے اس رویہ سے جو انصاف پر مبنی تھا، ان کو یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ اس میں جانبداری سے کام لیا گیا ہے، ابن کثیر ج ۵ ص ۲۱۵، ۲۱۶

آئبون تائبون، عابدون	اسی کے لئے مدح وستائش ہے وہ
ساجدون، لربنا حامدون	ہر بات پر قادر ہے، لوٹے آرہے ہیں
صدق اللہ وعدہ ونصر	توبہ کرتے ہوئے، فرمانبردارانہ،
عبدہ وھزم الأحزاب	زمین پر پیشانی رکھ کر اپنے پروردگار
وحدہ۔[1]	کی مدح وستائش میں مشغول ہو کر،
	خدا نے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے
	بندہ کی نصرت کی اور تمام قبائل
	کو تنہا شکست دی۔

آپؐ مدینہ طیبہ میں دن کے وقت داخل ہوئے۔

حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خطبہ

یہاں پر ہم اس خطبہ کا پورا متن دے رہے ہیں، جو آپؐ نے عرفہ کے روز دیا تھا، اسی طرح ایام تشریق کے درمیان جو خطبہ آپؐ نے دیا تھا، اس کا بھی پورا متن یہاں پیش کیا جا رہا ہے، اس لئے کہ یہ دونوں عظیم الشان خطبے اپنے اندر حد درجہ سامانِ موعظت رکھتے ہیں، اور کثیر فوائد پر مشتمل ہیں۔

خُطبۂ عرفہ

ان دماءکم واموالکم	تمہارا خون اور تمہارا مال اسی طرح

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۲۴۹

حرام عليكم كحرمة يومكم هذا،
في شهركم هذا، في بلدكم هذا،
ألا! إن كل شئ من أمر
الجاهلية تحت قدمي
موضوع، ودماء الجاهلية
موضوعة، وإن أول دم
أضعه من دمائنا دم ابن
ربيعة بن الحارث كان
مسترضعا في بني سعد فقتلته
هذيل، وربا الجاهلية
موضوع، وأول ربا أضع
من ربانا ربا العباس بن
عبد المطلب، فإنه موضوع
كله، فاتقوا الله في النساء
فإنكم أخذتموهن بأمانة
الله، واستحللتم فروجهن
بكلمة الله، ولكم عليهن
أن لا يوطئن فرشكم أحدا
تكرهونه، فإن فعلن ذلك

حرام ہے جس طرح یہ دن اس
مہینہ میں اور اس شہر میں حرام
ہے، یہ بھی یاد رکھو کہ ہر جاہلی امر
باطل ہے، اور جاہلیت کے تمام
خون (یعنی انتقامی خون) باطل
کر دیئے گئے، اور سب سے پہلے میں
(اپنے خاندان کا خون) ابن
ربیعہ بن الحارث کا خون باطل
کر دیتا ہوں، جس نے بنی سعد میں
پرورش پائی اور اس کو ہذیل نے
قتل کر ڈالا، جاہلیت کے تمام
سود بھی باطل کر دیئے گئے اور
سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود
عباس بن عبدالمطلب کا سود
باطل کرتا ہوں، یہ سب کا سب
باطل ہے، عورتوں کے معاملہ میں
خدا سے ڈرو، تم نے ان کو اللہ
کی امانت کے طور پر حاصل کیا
ہے، اور ان کی شرمگاہوں کو

فاضربوھن ضربا غیر مبرح ولھن علیکم رزقھن وکسوتھن بالمعروف، وقد ترکت فیکم مالم تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ، کتاب اللّٰہ، وانتم تسئلون عنی، فما ذا أنتم قائلون؟ قالوا: نشھد انك قد بلّغت وادّیت ونصحت، فقال باصبعہ السبابۃ یرفعھا الی السماء وینکبھا الی الناس اللھم اشھد ثلاث مرات۔[1]

اللہ کی بات کے ساتھ حلال سمجھا ہے، اور تمھاری طرف سے ان پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تمھارے بستر پر کسی غیر کو (جس کا آنا تم کو گوارا نہیں ہے) نہ آنے دیں اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو ایسی مار مارو جو نمودار نہ ہو، اور ان کا حق تمھارے اوپر یہ ہے کہ ان کو معقول طریقہ پر ان کی خوراک اور پوشاک کا انتظام کرو، میں تم میں ایک چیز چھوڑ جاتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوگے وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ، تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تم کیا جواب دوگے؟ صحابہ نے عرض کی ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہونچا دیا، اپنا فرض

---

[1] مسلم، ابوداؤد وغیرہ بروایت حضرت جابر ابن عبد اللہؓ یہ روایت حضرت جعفر صادق حضرت محمد الباقر سے اور وہ حضرت جابر سے کرتے ہیں۔

ادا کر دیا، آپ نے شہادت کی
انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور
تین مرتبہ فرمایا: "اے خدا تو گواہ رہنا"۔

ایام تشریق کے وسط میں جو خطبہ آپ ﷺ نے دیا تھا، اس کا متن یہ ہے:۔

یا أیها الناس اهل تدرون	اے لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ یہ کون سا
فی ای شهر انتم وفی ای یوم	مہینہ اور کون دن ہے؟ اور تم کس
انتم، وفی ای بلد انتم؟	شہر میں ہو؟ لوگوں نے جواب دیا:
فقالوا: فی یوم حرام، وبلد	یہ دن بڑا باحرمت، اور یہ مہینہ
حرام، وشهر حرام، قال: فإن	بڑا قابلِ احترام ہے، اور یہ
دماءکم واموالکم وأعراضکم	شہر حرمت والا ہے تو آپ ﷺ نے
علیکم حرام کحرمة یومکم	فرمایا تمہارا خون، تمہارا مال اور
هذا فی شهرکم هذا وفی	تمہاری عزتیں اسی طرح قیامت
بلدکم هذا الی یوم تلقونه	تک حرام ہیں جس طرح یہ دن،
ثم قال: اسمعوا منی تعیشوا،	یہ مہینہ اور یہ شہر ہے، پھر
ألا لا تظلموا ألا لا تظلموا	فرمایا سنو مجھ سے وہ باتیں سنو
ألا لا تظلموا أنه لا یحل	جس سے تم صحیح زندگی گذار سکوگے
مال امرئ مسلم إلا بطیب	خبردار ظلم نہ کرنا، خبردار ظلم نہ کرنا،
نفس منه، ألا! وإن کل	خبردار ظلم نہ کرنا، کسی مسلمان شخص
دم ومال ومأثرة کانت	کے مال میں سے کچھ لینا جائز نہیں

فی الجاھلیۃ تحت قدمی	ہاں اگر وہ راضی ہوں تو کوئی حرج
ھذہٖ الی یوم القیامۃ،	نہیں) ہر خون، ہر مال، جو جاہلیت
وان اول دم یوضع دم	سے چلا آتا تھا تاقیامت وہ باطل
ربیعۃ[له] بن الحارث بن	ہے، اور سب سے پہلا خون جو باطل
عبد المطلب کان مسترضعا	کیا جاتا ہے، وہ ربیعہ بن الحارث
فی بنی لیث فقتلتہ ھذیل،	بن عبد المطلب کا خون، اس نے
ألا! وان کل ربا فی الجاھلیۃ	بنی لیث میں پرورش پائی تھی اور
موضوع وان اللہ عزوجل	ہذیل نے اس کو قتل کر دیا تھا،
قضی أن اول ربا یوضع	جاہلیت کے تمام سود بھی باطل
ربا العباس بن	کر دیئے گئے، اور اللہ تعالیٰ نے
عبد المطلب، لکم رؤوس	یہ فیصلہ فرما دیا کہ جو سب سے پہلا سود
اموالکم لا تظلمون ولا	باطل کیا جائے، وہ عباس بن
تظلمون، ألا! وإن الزمان	عبد المطلب کا سود ہے، تمہارا

[له] صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد وغیرہ میں ربیعہ کے بجائے ابن ربیعہ کے لفظ آئے ہیں، اور وہی مراد بھی ہیں، اس لئے کہ ربیعہ بن الحارث جو آپؐ کے رشتہ کے بھائی تھے، وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کی خلافت تک بقید حیات تھے، جن روایات میں دم ربیعۃ ابن الحارث کے الفاظ آئے ہیں، ان کی تاویل کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے حارث مقتول کے ولی الدم اور شرعاً و قانوناً اس کے مطالبہ کا استحقاق رکھتے تھے، اس لئے ان کا نام لیا گیا۔

(شرح صحیح مسلم للنووی ج ۸ ص۱۸۳)

قد استدار كهيئته
يوم خلق السمٰوٰت
والارض، ثم قرأ:
"إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ
عِنْدَ اللّٰهِ اِثْنَا عَشَرَ شَهْرًا
فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ
اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ
الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا
فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ" ألا!
لا ترجعوا بعدى كفّارًا
يضرب بعضكم رقاب
بعض، ألا إن الشيطان
قد أيس أن يعبده
المصلّون، ولكنه فى
التحريش بينكم،
واتقوا الله فى النساء
فانهن عندكم عوان
لا يملكن لأنفسهن شيئًا،

راس المال تمہارے لئے محفوظ
ہے اس میں نہ تم کسی پر ظلم کروگے
نہ تمہارے اوپر ظلم کیا جائے گا
ابتدا میں خدا نے جب آسمان
وزمین کو پیدا کیا تھا زمانہ پھر پھرا کر
آج اسی نقطہ پر آگیا پھر آپ نے
یہ آیت تلاوت فرمائی "خدا کے
نزدیک مہینے گنتی میں (بارہ ہیں
یعنی) اس روز (سے) کہ اس نے
آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، کتاب
خدا میں (برس کے) بارہ مہینے
(لکھے ہوئے) ہیں ان میں سے
چار مہینے ادب کے ہیں یہی دین
(کا) سیدھا راستہ ہے تو ان
(مہینوں) میں (قتال ناحق سے)
اپنے آپ پر ظلم نہ کرنا" ہاں! میرے
بعد کافر ہی نہ ہوجانا کہ خود
ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو،
اور ہاں! شیطان بھی اس سے

وان لهن عليكم حقا،
ولكم عليهن حقا أن
لا يوطئن فرشكم أحدا
غيركم، ولا يأذن
فى بيوتكم لأحد تكرهونه،
فان خفتم نشوزهن
فعظوهن واهجروهن
فى المضاجع واضربوهن
ضربا غير مبرح ولهن
رزقهن وكسوتهن بالمعروف
وانما اخذتموهن بأمانة
الله، واستحللتم فروجهن
بكلمة الله عزوجل،
ألا ومن كانت عنده
امانة فليؤدها الى من
ائتمنه عليها وبسط
يديه، وقال ألا! هل
بلغت؟ ألا! هل بلغت،
ثم قال! ليبلغ الشاهد

مایوس ہو چکا ہے کہ نماز پڑھنے
والے اس کی پرستش کریں لیکن
وہ تمہارے درمیان رخنہ اندازی
کرے گا، عورتوں کے معاملہ میں
خدا سے ڈرو، کیونکہ وہ تمہاری
دست نگر ہیں، وہ اپنے لئے خود
کوئی اختیار نہیں رکھتیں، اور
ان کا تم پر حق ہے، اور تمہارا
ان پر کہ وہ تمہارے علاوہ تمہارے
بستر پر کسی کو آنے نہ دیں اور نہ
ایسے شخص کو تمہارے گھر آنے دیں
جسے تم ناپسند کرتے ہو اور اگر تم ان کی
نافرمانی سے خوف محسوس کرو تو
انھیں نصیحت کرو، اور ان کو
ان کی خوابگاہوں میں چھوڑ دو
اور ہلکی مار مارو اور انھیں کھانے
کپڑے کا حق معلوم طریقے پر حاصل
ہے تم نے انھیں خدا کی امانت کے
طور پر حاصل کیا ہے اور ان کے ناموس کو

الغائب، فانه رب مُبَلَّغ اسعد من سامع۔[1]

اللہ کے نام سے حلال کیا ہے آگاہ ہو جاؤ جس کے پاس کوئی امانت ہو وہ صاحبِ امانت کو واپس کر دے، اتنا فرمانے کے بعد آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور فرمایا کہ کیا میں نے پیغام پہنچا دیا کیا میں نے پیغام پہنچا دیا؟ پھر فرمایا جو حاضر ہیں وہ غیر حاضر لوگوں تک یہ بات پہنچا دیں کیونکہ بہت سے غیر حاضر سننے والوں سے زیادہ خوش بخت ہوتے ہیں۔

---

[1] رواہ الامام احمد عن ابی حرۃ الرقاشی عن عمہ۔

وفات

(ربیع الاوّل ۱۱ھ)

تبلیغ دعوت اور اجرائے شریعت کا نقطۂ عروج اور وصال حق کی تیاری

جب دین نقطۂ عروج اور منتہائے کمال کو پہونچ گیا، اور یہ آیت نازل ہوگئی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ	(اور) آج ہم نے تمہارے لئے
وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ	تمہارا دین کامل کردیا، اور اپنی
وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ	نعمتیں تم پر پوری کردیں اور تمہارے
دِیْنًا۔ (سورۂ مائدہ۔۳)	لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پیغام ہدایت لوگوں کو پہونچا دیا، امانتِ الٰہی بے کم وکاست پہونچادی، اور راہِ حق میں قربانی اور جانفشانی کا حق ادا کردیا، اور ایک ایسی امت تیار کردی جو نبوت کی ذمہ داریوں کو (منصب نبوت پر فائز ہوئے بغیر) انجام دے سکتی تھی، اور اس کو اس دعوت کا علمبردار، اور اس دین کو تحریف سے محفوظ رکھنے کا ذمہ دار بنایا گیا تھا، اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ	(مومنو) جتنی امتیں (یعنی قومیں)
لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	لوگوں میں پیدا ہوئیں، تم ان سب سے

وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ (سورۂ آل عمران۔۱۱۰)	بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی (جو اس دین کی اساس اور ایمان و یقین کا سرچشمہ اور منبع ہے) حفاظت اور بقا کی ذمہ داری بھی لے لی اور فرمایا:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (سورۂ حجر۔۹)	بے شک یہ (کتاب) نصیحت ہمیں نے اُتاری ہے اور ہمیں اس کے نگہبان ہیں۔

دوسری طرف اس نے اس دین کی طرف لوگوں کے رجوعِ عام اور بڑی بڑی جماعتوں اور قبیلوں کے قبول اسلام سے اپنے نبی کی آنکھیں ٹھنڈی کیں، اور پورے عالم میں اس کے فروغ اور اشاعت کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور صاف نظر آنے لگا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ دین دنیا کے سارے مذاہب پر غالب آجائے گا، سورۂ نصر میں اللہ تعالیٰ نے اس کا اشارہ بھی فرمادیا ہے:۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ○ (سورۂ نصر۔۱۔۳)	جب اللہ کی مدد آپہونچی اور فتح (حاصل ہوگئی) اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ غول کے غول خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔

قرآن مجید کا دور اور اعتکاف میں اضافہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف میں اس قدر اضافہ فرمادیا کہ ہر سال آپؐ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے لیکن جس سال آپؐ کی وفات ہوئی، آپؐ نے بیس روز کا اعتکاف فرمایا۔[1]

حضرت جبرئیلؑ رمضان کی ہر شب میں آپؐ سے آکر ملتے اور آپؐ ان کے ساتھ قرآن مجید کا دور فرماتے تھے، لیکن اس سال آپؐ نے فرمایا کہ اس مرتبہ وہ ایک کے بجائے دوبار آئے ہیں، اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ میرا وقت قریب آگیا ہے۔[2]

اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو لقاء رب اور وصالِ حق کی اجازت عطا فرمائی، جن سے زیادہ اس کی ملاقات کا شوق واشتیاق اور کسی کو نہیں ہوسکتا تھا، اللہ تعالیٰ کو بھی اس لقاء کا اشتیاق تھا، اور آپؐ کو بھی اس کا غایت درجہ شوق اور آرزو تھی۔

اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کو جن سے بڑھ کر آپؐ کا چاہنے والا روئے زمین پر کوئی اور نہ تھا، آپؐ کی خبر وفات سننے اور اس صدمۂ عظیم کو برداشت کرنے کے لئے جس سے کوئی چارہ نہ تھا، پہلے سے تیار کر دیا تھا، اس سے پہلے غزوۂ اُحد میں ان کو آپؐ کی شہادت کی اچانک خبر ملی تھی، پھر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شیطان کی سازش اور پھیلائی ہوئی افواہ تھی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی حیات طیبہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاعتکاف "باب الاعتکاف فی العشر الاوسط من رمضان"۔

[2] صحیح بخاری کتاب المناقب "باب علامات النبوۃ"

اور صحبت سے فائدہ اٹھانے کا ایک موقع عطا فرمایا ہے اگرچہ یہ حادثہ بہر حال کسی نہ کسی روز پیش آنے والا ہے چنانچہ اللہ کا ارشاد ہوا کہ :۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْــًٔا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ۔

(سورۂ آل عمران۔۱۴۴)

اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) تو صرف (خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو گذرے ہیں بھلا اگر ان کی وفات ہو جائے یا شہید کر دیئے جائیں تو تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (یعنی مرتد ہو جاؤ گے) اور جو اُلٹے پھر جائے گا تو خدا کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا اور خدا شکر گذاروں کو (بڑا) ثواب دے گا۔

یہ اولین مسلمان جن کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بہترین تربیت فرمائی تھی اور ان کے دلوں کو اللہ تعالے کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا، اور دنیا کے دور دراز گوشوں اور دُور افتادہ قوموں تک اسلام کا پیغام پہونچانے کے عظیم اور مقدس کام میں ان کو مشغول کر دیا تھا، اس بات کا پورا یقین رکھتے تھے کہ آپ کسی نہ کسی دن اس عالم فانی کو چھوڑ کر ان سے جدا ہو جائیں گے، اور اپنی اس طویل محنت و قربانی کا بہترین ثمرہ اور جزاء حاصل کرنے کے لئے اپنے رب کے حضور حاضر ہو جائیں گے، جب "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ" کی آیت نازل ہوئی تو صحابۂ کرامؓ نے سمجھ لیا کہ یہ آیت جدائی کی گھڑی کا پیش خیمہ اور اعلان ہے اس لئے کہ نبوت کا کام پایۂ تکمیل تک

پہونچ چکا ہے، اور خدا کی نصرت اور فتح آچکی ہے[1]۔

جس وقت آیت "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" نازل ہوئی تو اس وقت بہت سے جلیل القدر صحابہؓ نے محسوس کیا کہ آپؐ کی وفات کا وقت قریب ہے[2]۔

لقاءِ مولیٰ کا شوق اور دنیا کو وداع

حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد رسول اللہ علیہ وسلم سے ایسی باتیں ظاہر ہوئیں جن سے اشارہ ملتا تھا کہ آپؐ کی وفات کے دن قریب ہیں[3]، اور آپ اس سفر کے لئے تیار اور "الرفیق الاعلیٰ" سے ملنے کے مشتاق ہیں، آپؐ نے اُحد کے شہداء کے لئے آٹھ سال کے بعد اس طرح دعا کی کہ جیسے آپ عنقریب اپنے اصحاب کرامؓ سے جدا ہونے والے ہیں، جیسے کوئی زندوں اور مردوں کو رخصت کرنے والا کرتا ہے۔

پھر آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا میں تمھارے آگے جانے والا ہوں اور تم پر گواہ ہوں، اب تم سے ملاقات حوض (کوثر) پر ہوگی میں اپنے کو اس مقام پر کھڑا ہوا دیکھ رہا ہوں، مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئی ہیں، مجھے یہ ڈر نہیں کہ تم میرے بعد شرک کرنے لگو گے، مگر میں اس سے ڈرتا ہوں کہ تم حصولِ دنیا میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگو اور جیسے گذشتہ قومیں ہلاک ہوئی تھیں تم بھی ہلاک ہو جاؤ[4]۔

---

[1] ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جہاں تک میں جانتا ہوں اس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات مراد ہے امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ جب "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ" نازل ہوئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھے (اس سورہ میں) اپنی وفات کی خبر دی گئی ہے (دیکھئے تفسیر ابن کثیر) [2] دیکھئے ابن کثیر ج ۴ ص ۲۴ [3] صحیح مسلم میں جابر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت آئی ہے کہ آپ نے جمرۃ العقبہ کے قریب حج کر کے ہم لوگوں سے فرمایا مجھ سے مناسک حج سیکھ لو اس لئے کہ شاید اس سال کے بعد مجھے حج کا موقع نہ ملے [4] متفق علیہ

علالت کا آغاز

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو شکایت ماہ صفر کے آخر میں پیدا ہوئی[1]، اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ آپ نصف شب کو "جنت البقیع" تشریف لے گئے اور اہلِ قبور کے لئے دعائے مغفرت کی، پھر اپنے گھر تشریف لے آئے، جب صبح ہوئی تو اسی روز سے علالت شروع ہو گئی[2]۔

اُمّ المومنین حضرت عائشہ رض روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بقیع سے واپس آئے تو آپ نے مجھے اس حالت میں پایا کہ میرے سر میں سخت درد تھا میں کہہ رہی تھی کہ میرے سر میں کتنی تکلیف ہے، آپ نے فرمایا نہیں میرے سر میں کتنا درد ہے، عائشہ رض میرے سر میں کتنی تکلیف ہے[3]، علالت میں ترقی ہوئی، اس وقت آپ میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے، آپ نے تمام ازواج مطہرات کو طلب فرمایا، اوران سے اجازت چاہی کہ آپ بیماری کا زمانہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہاں گذاریں انھوں نے اس کو بخوشی منظور کیا، آپ گھر کے دو افراد کے سہارے جن میں ایک فضل بن عباس رض اور دوسرے حضرت علی رض تھے، وہاں سے تشریف لے چلے، سر مبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی، آپ کے قدم زمین پر گھسٹتے تھے، اسی طرح آپ حضرت عائشہ رض کے گھر تشریف لائے[4]

حضرت عائشہ رض بیان کرتی ہیں کہ آپ اس مرض میں جس میں آپ کی وفات ہوئی،

---

[1] احادیث کے تتبع اور قول راجح کی بنیاد پر یہی معلوم ہوتا ہے اور اغلب ہے کہ یہ دوشنبہ کا دن تھا۔ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۴۲ و ابن کثیر ج ۴ ص ۲۲۳ [3] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۴۳

[4] صحیح بخاری (باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ)

یہ فرماتے تھے کہ عائشہؓ! میں اس کھانے کی تکلیف اب تک محسوس کرتا ہوں جو میں نے خیبر میں کھایا تھا، اِس وقت اس زہر[1] سے میری رگ (ابہر[2]) کٹ رہی ہے۔

آخری لشکر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کا امیر بنا کر شام بھیجا اور ان کو حکم دیا کہ ان کے گھوڑے "بلقا" اور داروم[3] کی سرزمین تک ضرور جائیں جو ارض فلسطین کا حصہ ہے۔

اس لشکر میں آپؐ نے مہاجرین وانصار کے چیدہ اور برگزیدہ اصحاب کو شامل فرمایا جن میں سب سے نمایاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، آپؐ نے ان کو سخت بیماری کی حالت میں وہاں پہونچنے کا حکم دیا، اس وقت اسامہ کا لشکر "جرُف" میں خیمہ انداز تھا[4]، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے اسامہؓ کے لشکر کی پیش قدمی ملتوی نہیں کی بلکہ اس پر پورا پورا عمل کیا۔

جیشِ اسامہ سے آپؐ کی دلچسپی واہتمام

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ لوگ جیش اسامہ کے معاملہ میں کسی قدر

---

[1] صحیح بخاری معلقاً (باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ) حافظ بیہقی نے حاکم سے اور انھوں نے زہری سے بھی اس کو روایت کیا ہے، دیکھئے ابن کثیر ج ۴ ص ۴۴۹، [2] ابہر اس رگ کو کہتے ہیں جو پیٹھ سے نکل کر دل سے مل جاتی ہے، وہ اگر کٹ جائے تو آدمی مر جاتا ہے۔ [3] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۴۲، [4] ابن کثیر ج ۴ ص ۴۴۱

سستی سے کام لے رہے ہیں، اس سے پہلے لوگوں نے اسی طرح کی باتیں کی تھیں کہ ایک نوعمر لڑکے کو جلیل القدر صحابہ، مہاجرین و انصار کا امیر بنا دیا گیا ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسی درد کی حالت میں سر پر پٹی باندھے ہوئے باہر تشریف لائے اور منبر پر بیٹھ گئے، پہلے اللہ تعالیٰ کی وہ حمد و ثنا بیان کی جو اس کی شان کے لائق ہے، پھر فرمایا کہ لوگو! اسامہ کے لشکر کو روانہ کرو، اگر آج تم ان کی امارت کے بارے میں چہ میگوئی کرتے ہو تو کل تم نے ان کے والد کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا، بے شک وہ امارت کے لائق اور اس کے مستحق ہیں جیسے ان کے والد اس کے مستحق تھے[1] اتنا فرما کر آپؐ منبر سے نیچے اتر گئے اور لوگ تیزی کے ساتھ تیاریوں میں مشغول ہو گئے ادھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی علالت پہلے سے بہت بڑھ گئی، دوسری طرف اسامہ اس لشکر کو لے کر روانہ ہو گئے، اور مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر "جرف" میں اپنا پڑاؤ ڈالا تاکہ باقی لوگ جو آنا چاہتے ہیں، وہ سب یہاں مجتمع ہو جائیں، اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طبیعت سخت علیل تھی اور اسامہ اور ان کے سب ساتھی وہاں رکے ہوئے تھے کہ دیکھئے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔[1]

آپؐ نے اسی مرض میں مسلمانوں کو وصیت کی کہ وہ اس لشکر کو اسی طرح روانہ کریں جیسے آپؐ ان کو روانہ فرمایا کرتے تھے، اور "جزیرۃ العرب" میں دو مذہب باقی نہ چھوڑیں، اور آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ مشرکین کو یہاں سے نکال دیا جائے۔[2]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۵۰ نیز صحیح البخاری کتاب المغازی باب "غزوہ زید بن حارثہ" اس میں اتنا اضافہ ہے کہ اگر تم آج ان کی امارت پر طعن کرتے ہو تو اس سے پہلے تم نے ان کے والد کی امارت پر طعن کیا تھا، اور خدا کی قسم وہ امارت کے مستحق تھے، اور مجھے محبوب تھے، اور ان کے بعد یہ میرے بہت محبوب لوگوں میں ہیں۔ [2] دیکھئے صحیح بخاری باب (مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم و وفاتہ)

مسلمانوں کے لئے دعا اور ذاتی سربلندی کے شوق اور تکبر سے دور رہنے کی آگاہی

علالت کے دوران کچھ صحابۂ کرام حضرت عائشہؓ کے گھر میں جمع ہوئے آپؐ نے ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور ان کے لئے ہدایت، نصرت اور توفیق کی دعا فرمائی پھر آپؐ نے فرمایا میں تم کو اللہ تعالےٰ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں، اور اللہ تعالےٰ کو اپنے بعد تمہارا نگراں بناتا ہوں، میں اس کی طرف سے تم کو کھلا ہوا ڈرانے والا اور آگاہی دینے والا ہوں، دیکھنا اللہ کی بستیوں اور اس کے بندوں میں تکبر اور برتری کو اختیار نہ کرنا، اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے میرے لئے اور تمہارے لئے پہلے ہی فرما دیا ہے:-

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا	وہ (جو) آخرت کا گھر (ہے) ہم نے
لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا	اُسے اُن لوگوں کے لئے (تیار) کر رکھا
فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ	ہے جو ملک میں برتری اور فساد کا
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝	ارادہ نہیں کرتے اور انجام (نیک)
(سورۂ قصص ـ ۸۳)	تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔

پھر آپؐ نے یہ آیت بھی تلاوت فرمائی:-

اَلَيْسَ فِىْ جَهَنَّمَ مَثْوًى	کیا غرور کرنے والوں کا ٹھکانہ
لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ[۱] (سورۂ زمر ـ ۶۰)	دوزخ میں نہیں ہے؟

دنیا سے بے تعلقی اور مال کے بچ جانے سے کراہت

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے اپنے مرض وفات

---

[۱] بیہقی (السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج ۴ ص ۵۰۲)

میں ایک مرتبہ دریافت فرمایا عائشہؓ! اُس سونے کو کیا کیا؟ وہ پانچ سے سات یا نو کے درمیان اشرفیاں لائیں آپؐ ان کو لے کر اپنے ہاتھ سے الٹتے پلٹتے اور فرماتے میں ان کے ساتھ خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا،[1] جاؤ ان سب کو راہ خدا میں خیرات کردو۔"[2]

نماز کا اہتمام اور حضرت ابو بکرؓ کی امامت

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تکلیف میں اضافہ ہوا اور طبیعت زیادہ بھاری ہوگئی تو آپؐ نے اسی حالت میں دریافت فرمایا کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ ہم نے جواب دیا کہ نہیں یارسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سب لوگ آپؐ کا انتظار کر رہے ہیں، آپؐ نے فرمایا میرے لئے لگن میں پانی رکھ دو، لوگوں نے تعمیل کی آپؐ نے غسل فرمایا، پھر آپؐ نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن آپؐ پر غشی طاری ہوگئی، جب آپؐ کو ہوش آیا تو فرمایا کہ کیا سب نے نماز پڑھ لی، لوگوں نے جواب دیا نہیں یارسول اللہؐ! سب لوگ آپؐ کے منتظر ہیں، تمام لوگ اس وقت مسجد نبوی میں خاموش بیٹھے ہوئے نماز عشاء کے منتظر تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو پیغام کہلوایا کہ وہ نماز پڑھائیں، حضرت ابوبکرؓ بہت رقیق القلب شخص تھے انھوں نے کہا عمرؓ! تم نماز پڑھاؤ، انھوں نے کہا آپ اس کے مجھ سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ اُن دنوں حضرت ابوبکرؓ ہی نماز پڑھاتے رہے۔

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کچھ افاقہ اور طبیعت میں ہلکا پن محسوس فرمایا

---

[1] حدیث کے اصل الفاظ ہیں "ماظن محمد باللہ عزوجل لو لقیہ وھذہ عندہ" جس کا لفظی ترجمہ ہوا، محمدؐ کا اللہ کے ساتھ کیا گمان ہوگا جب اُس سے ملاقات ہوگی، اس حالت میں کہ یہ اشرفیاں اس وقت اِس کے پاس ہیں [2] مسند امام احمد ج ۶ ص ۴۹

اور دو[1] آدمیوں کے سہارے سے جن میں ایک عباس رضی اللہ عنہ اور دوسرے علی کرم اللہ وجہہ تھے ظہر کی نماز کے لئے باہر تشریف لائے، جب حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ کو دیکھا تو وہ پیچھے ہٹنے لگے آپؐ نے اشارہ سے ان کو ہدایت کی کہ وہ پیچھے نہ ہٹیں اور ان دونوں حضرات سے آپؐ نے فرمایا کہ وہ آپؐ کو ابوبکرؓ کے پہلو میں بٹھادیں حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے رہے اور آپؐ نے بیٹھ کر نماز ادا فرمائی"۔

ام الفضل بنت الحارث روایت کرتی ہیں کہ "میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز میں سورۂ "والمرسلات" پڑھتے سنا، اس کے بعد آپؐ کو کسی نماز کی امامت کی نوبت نہ آئی، یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو اپنے پاس بلالیا"[1]۔

خطبۃ الوداع

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان ایام میں منبر پر بیٹھ کر جو کلمات ارشاد فرمائے[2] اور اس حالت میں فرمائے کہ آپؐ کے سر مبارک پر کپڑا بندھا ہوا تھا، اس میں ایک موقع پر آپؐ نے یہ بھی فرمایا "إن عبدا من عباد الله خيره الله بين الدنيا وبين ما عنده فاختار ما عند الله" (اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو اللہ تعالےٰ نے دنیا اور اللہ کے پاس جو چیز ہے کسی ایک چیز کے اختیار کرنے کا اختیار دیا تو اس نے جو کچھ اللہ کے پاس ہے اُسے اختیار کیا) حضرت ابوبکرؓ ان الفاظ کے معانی سمجھ گئے اور انھوں نے محسوس کیا کہ یہ دراصل آپؐ نے اپنے لئے کہا ہے، یہ خیال کر کے وہ رو پڑے اور کہا "نہیں، ہماری جانیں اور اولاد سب آپؐ پر فدا ہیں"۔

---

[1] صحیح بخاری (باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ) [2] احادیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری خطبہ تھا

آپؐ نے فرمایا "ابوبکرؓ ٹھہرو، جلدی نہ کرو، بلاشبہ کوئی شخص ایسا نہیں جس نے اپنی جان اور مال سے مجھ پر اتنا احسان کیا ہے جتنا ابوبکرؓ نے کیا ہے اور اگر میں لوگوں میں کسی کو اپنا خلیل (خاص دوست و محبوب) بناتا تو ابوبکرؓ کو اپنا خلیل بناتا لیکن اسلام کا تعلق اور اسلام سے محبت سب سے افضل ہے[1]"

آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ "مسجد کا ہر دریچہ[2] جس سے میرا سامنا ہوتا ہے بند کردو، صرف خوخۂ ابوبکرؓ کو باقی چھوڑ دو[3]"

انصار کے ساتھ حسنِ سلوک کی وصیّت

حضرت ابوبکرؓ و حضرت عباس رضی اللہ عنہما ایک بار انصار کی ایک محفل سے گذرے، انھوں نے دیکھا کہ وہ لوگ رو رہے ہیں، انھوں نے پوچھا کہ تم لوگ کیوں رو رہے ہو؟ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور مجلس ہمیں یاد آرہی ہے، رسول اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع پہونچی تو آپ باہر تشریف لائے، آپؐ نے سرِ مبارک کو اپنی چادر کے حاشیے سے لپیٹ لیا تھا، آپ منبر پر جلوہ افروز ہوئے[4]، اس دن کے بعد پھر آپؐ کو منبر پر جانے کا موقع نہیں آیا، پھر آپؐ نے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلاۃ "باب الخوخۃ والممر فی الصلاۃ" [2] یہاں پر خوخہ کا لفظ آیا ہے جو چھوٹے دروازے کو کہتے ہیں [3] صحیح بخاری کتاب الصلاۃ "باب الخوخۃ والممر فی الصلاۃ"

[4] قول راجح یہی ہے کہ یہ آپ کا وہی آخری خطبہ ہے، جو جمعرات کے روز ظہر کی نماز کے بعد آپؐ نے دیا تھا، اس لئے کہ حدیث کے راوی جو انس بن مالکؓ ہیں کہتے ہیں "آپؐ منبر پر چڑھے اور اس دن کے بعد پھر آپؐ کو منبر پر جانے کا موقع نہیں آیا، پھر آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جو اس کی شان کے لائق ہے"

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جو اس کی شانِ عالی کے لائق ہے، اس کے بعد ارشاد ہوا:
"میں تم کو انصار کے ساتھ (حسنِ سلوک کی) وصیت کرتا ہوں، وہ جسم و جان کی طرح ہیں؛ اور میرے معتمد اور رازدار ہیں، ان پر جو ذمہ داری تھی، اس کو انھوں نے پورا کیا، ان کا جو دوسروں پر حق ہے، وہ باقی ہے اس لئے ان کے اچھے اور صالح لوگوں کی بات قبول کرنا اور ان میں سے جو لوگ قصوروار ہوں، ان سے درگذر کرنا۔"[1]

مسلمانوں کی صف بستہ جماعت پر آپ کی آخری نگاہ

حضرت ابوبکرؓ بدستور نماز پڑھاتے رہے، دوشنبہ کے دن وہ لوگ نماز فجر میں صفیں باندھے کھڑے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرۂ مبارک کا پردہ اٹھایا، اور کچھ دیر آپ یہ منظر دیکھتے رہے کہ مسلمان اپنے رب کے حضور کس طرح حاضر ہیں، آپ کی دعوت اور جہاد و سعی کیا رنگ لائی ہے، اور یہ امت کس طرح تیار ہوئی ہے، جو نماز سے اس درجہ تعلق رکھتی ہے، اور اپنے نبی کی موجودگی اور غیر موجودگی دونوں حالتوں میں اسی جوش و نشاط اور سرور و شوق کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں دست بستہ حاضر ہے، یہ خوشگوار منظر اور اس کامیابی کو دیکھ کر جو آپ سے پہلے کسی نبی یا داعی کو نصیب نہیں ہوئی تھی، آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں، اور آپ کو اس کا اطمینان ہوا کہ اس دین اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اس امت کا تعلق دائمی اور پائدار ہے جو آپ کی وفات کے بعد بھی ختم نہ ہوگا، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس وقت آپ کو اس بات

---

[1] صحیح بخاری، فضائل اصحاب النبی صلے اللہ علیہ وسلم "باب قول النبی صلے اللہ علیہ وسلم اقبلوا من محسنهم وتجاوزوا عن مسیئهم"

کس درجہ مسرّت ہوئی ہوگی، یہ منظر دیکھ کر روئے انور فرطِ مسرّت سے دمکنے لگا، صحابہ کرامؓ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بیان فرماتے ہیں کہ:۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حجرۂ عائشہؓ کا پردہ کھولا اور کھڑے ہوئے ہمیں برابر دیکھتے رہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپؐ کا روئے مبارک ورقِ مصحف ہے پھر آپ مسکرائے اور ہنس پڑے، ہمیں یہ خیال ہوا کہ کہیں ہم لوگ بھی خوشی کی وجہ سے آزمائش میں نہ پڑجائیں اور بے قابو ہوجائیں، ہمیں یہ بھی گمان ہوا کہ شاید آپؐ نماز کے لئے باہر تشریف لانے والے ہیں، آپؐ نے اشارہ فرمایا کہ نماز پوری کرو، اس کے بعد آپؐ نے پردہ گرادیا، اور اسی دن آپؐ کی وفات ہوئی[1]"۔

قبروں کی پرستش اور ان کو عبادت گاہ و سجدہ بنانے کی مذمّت و ممانعت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری الفاظ یہ تھے "قاتل اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد، لا یبقین دینان علی ارض العرب[2]"، (اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ کو تباہ کرے، انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا، سرزمین عرب میں بیک وقت دو مذہب نہ رہیں۔)

حضرت عائشہ و حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم روایت کرتے ہیں کہ جب رحلت کا وقت قریب آیا تو ایک سیاہ دھاری دار چادر آپ پر پڑی ہوئی تھی آپؐ اس کو کبھی چہرۂ مبارک پر ڈال لیتے، جب تکلیف ہونے لگتی تو اس کو ہٹا دیتے، اسی حال میں آپؐ نے ارشاد فرمایا "یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو

---

[1] صحیح بخاری (باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہٗ) [2] بروایت مؤطا امام مالک ابن کثیر ج ۴ ص ۲۲۷

عبادت گاہیں بنا لیا" آپؐ مسلمانوں کو اس سے خبردار فرما رہے تھے"!

آخری وصیّت

وفات کے قریب آپ کی زیادہ تر وصیّت یہ تھی "الصلاۃ وما ملکت ایمانکم" (دیکھو نماز کا خیال رکھنا اور اپنے ماتحتوں اور غلاموں کا) یہ آپ برابر فرماتے رہے، یہاں تک کہ زبان سے ان الفاظ کا ادا کرنا مشکل ہو گیا اور معلوم ہوا کہ آپ سینۂ مبارک سے ان الفاظ کو ادا کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔[1]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ "آپؐ نے اس موقع پر نماز اور زکوٰۃ اور ماتحتوں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیّت فرمائی"۔[2]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ "میں آپؐ پر معوّذتین پڑھ کر دم کرنے لگی، کہ آپؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور فرمایا "فی الرفیق الاعلیٰ. فی الرفیق الاعلیٰ" (سب سے اعلیٰ رفیق کے پاس، سب سے اعلیٰ رفیق کے پاس۔)

اسی وقت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ داخل ہوئے، ان کے ہاتھ میں (پیلو کی) تر و تازہ شاخ تھی، آپؐ نے اس کو ایک نظر دیکھا، میں نے خیال کیا کہ شاید آپؐ کو اس کی ضرورت ہے، چنانچہ میں نے وہ ان سے لے کر پتّے وغیرہ جھاڑ کر مسواک تیار کی اور آپ کو پیش کی، آپؐ نے اس سے بہت اچھے طریقہ سے مسواک کی، جیسے آپؐ کبھی فرمایا کرتے تھے، پھر مجھے واپس کرنے لگے لیکن وہ آپؐ کے ہاتھ سے چھوٹ گئی"۔[3]

---

[1] بیہقی و احمد (ابن کثیر السیرۃ النبویہ ج ۴ ص ۴۷۳) [2] امام احمد (ابن کثیر ج ۴ ص ۴۷۳)

[3] سیرت ابن کثیر ج ۴ ص ۴۷۴ نیز صحیح بخاری (باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم و وفاتہ)

فرماتی ہیں کہ "آپؐ کے سامنے پانی کا کٹورہ تھا، آپ اپنے ہاتھ پانی کے اندر ڈالتے اور چہرہ پر پھیر لیتے اور اس کے بعد فرماتے "لا الہ الا اللہ ان للموت لسکرات" (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں بے شک سکرات موت برحق ہے) پھر آپؐ نے بائیں انگلی اوپر اٹھائی، اور فرمانے لگے "فی الرفیق الاعلیٰ... فی الرفیق الاعلیٰ" (سب سے اعلیٰ و برتر رفیق کے پاس) یہاں تک کہ روح مبارک نے عالمِ بالا کا رخ کیا، اور آپؐ کا ہاتھ پانی میں ایک طرف جھک گیا۔[1]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس وقت جدائی کی گھڑی قریب آئی تو اس وقت آپؐ کا سر میری ران پر تھا، ایک گھڑی کے لئے آپؐ پر غشی طاری ہوئی، پھر آپؐ کو ہوش آگیا، اور آپؐ نے گھر کی چھت کی طرف اپنی نظر اٹھائی اور فرمایا "اللھم الرفیق الاعلیٰ" (بے شک سب سے اعلیٰ اور برتر رفیق کے پاس) یہ وہ آخری الفاظ تھے جو رحلت کے وقت آپؐ کی زبان مبارک سے نکلے!

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دنیا سے کس حال میں تشریف لے گئے!

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا تو اس وقت پورا جزیرۃ العرب آپؐ کے زیر نگیں تھا، دنیا کے سلاطین و امراء پر آپؐ کا جلال و رعب تھا، آپؐ کے اصحاب کرام آپؐ پر اپنی جان و اولاد اور مال و متاع سب نثار کرنے پر تیار رہتے تھے، اس سب کے باوجود آپؐ دنیا سے اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپؐ نے ایک دینار یا درہم ایک غلام یا لونڈی اور کوئی چیز بھی اپنے پیچھے نہیں چھوڑی، صرف آپؐ کا ایک سفید خچر تھا، آپؐ کے ہتھیار تھے، اور ایک قطعۂ زمین جس کو آپؐ نے صدقہ کر دیا تھا۔[2]

---

[1] صحیح بخاری "باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ" [2] ایضاً

آپؐ کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس[30] صاع جَو پر رہن رکھی ہوئی تھی[1] اور آپؐ کے پاس کوئی چیز نہ تھی کہ آپؐ اسے دے کر زرہ کو چھڑا سکتے یہاں تک کہ آپؐ دنیا سے تشریف لے گئے[2]۔

آپؐ نے اپنے مرض وفات میں چالیس[40] غلاموں کو آزاد فرمایا، آپؐ کے پاس سات[7] یا چھ[6] دینار تھے، حضرت عائشہؓ کو حکم ہوا کہ ان کو بھی صدقہ کر دیں[3]۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ میرے گھر میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کو کوئی جاندار کھا سکتا، البتہ ذرا سا جَو میری الماری پر رکھا ہوا تھا، میں نے اسی میں سے کچھ کھایا، وہ بہت دن چلا یہاں تک کہ میں نے ایک دن اس کی ناپ تول کی، بس اسی کے بعد وہ ختم ہو گیا[4]"۔

آپؐ کی وفات دوشنبہ کے روز ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ ہجری کو زوال کے بعد ہوئی[5]، اس وقت عمر شریف تریسٹھ[63] سال تھی[6]، یہ مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ تاریک اور وحشت ناک دن، سب سے بڑا صدمہ اور ابتلاء، اور پوری انسانیت کا سب سے بڑا سانحہ تھا، جس طرح آپؐ کی ولادت باسعادت کا دن انسانیت کا سب سے مبارک روشن اور تابناک دن تھا، حضرت انسؓ وابو سعید خدری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ "جس دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تھے تو مدینہ کی ہر چیز آپؐ کی آمد سے روشن اور منور ہو گئی تھی، جس دن آپ کی وفات ہوئی اس دن اس کی ہر چیز تاریک ہو گئی"، ام ایمنؓ بھی رو رہی تھیں، لوگوں نے سبب پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ بے شک مجھے معلوم تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے

---

[1] ایضاً [2] بیہقی ص۵۶۳ [3] السیرۃ الحلبیہ ج ۳ ص۳۸۱، [4] متفق علیہ (البخاری کتاب الرقاق باب فضل الفقر) ومسلم کتاب الزہد [5] بعض روایات میں ضحٰی اور ضحوہ آتا ہے جو چاشت کا وقت ہے (الاستیعاب ج ۱ ص۴۲) [6] قول راجح کی بنیاد پر۔

تشریف لے جائیں گے، لیکن میں اس بات پر رو رہی ہوں کہ وحی کا سلسلہ ہم سے ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا۔"[1]

صحابۂ کرامؓ نے آپؐ کی وفات کی خبر کس طرح سنی؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر صحابۂ کرامؓ پر بجلی بن کر گری، اس کی وجہ ان کا وہ عاشقانہ تعلق تھا جس کی نظیر نہیں، وہ آپؐ کے سایۂ شفقت میں اس طرح رہنے کے عادی ہو گئے تھے جس طرح بچے ماں باپ کے آغوش محبت میں رہتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ، اس لحاظ سے ان پر جتنا بھی اثر پڑتا کم تھا، اللہ تعالے کا ارشاد ہے:۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ	(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر
اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ	آئے ہیں تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم
حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ	ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت
رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○	خواہشمند ہیں (اور) مومنوں پر نہایت
(سورۂ توبہ۔ ۱۲۸)	شفقت کرنے والے (اور) مہربان ہیں۔

ان میں سے ہر شخص سمجھتا تھا کہ وہ آپؐ کی نگاہِ لطف و کرم میں سب سے زیادہ محبوب اور مورد الطاف و کرم ہے بعض صحابہ کو اس پر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ واقعہ پیش آیا، ان میں پیش پیش حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، انھوں نے ایسے شخص پر جو یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی بہت نکیر کی وہ مسجد نبوی میں آئے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور کہا کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات اس وقت تک نہ ہو گی جب تک اللہ تعالے منافقوں کو ختم نہ کر دے گا۔"[2]

---

[1] السیرۃ النبویہ از ابن کثیر ج ۴ ص ۵۴۴-۵۴۶ [2] سیرت ابن کثیر ج ۴ ص ۵۴۴-۵۴۶

حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ کن اور جرأت مندانہ قدم

ان حالات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی نیابت و خلافت اور عزیمت و حکمت کے موقف کے لئے تیار کیا تھا) جیسے عالی حوصلہ اور عزم و ہمّت کے پہاڑ کی ضرورت تھی، جو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرے، ابوبکر صدیقؓ کو (جو مقام سنح (مضافات مدینہ) میں تھے) اطلاع ہوئی تو اسی وقت تشریف لائے، (بخاری ص۶۴۰) اور مسجد نبوی کے دروازے پر ایک لمحہ کے لئے رُکے اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے خطاب کر رہے تھے، پھر وہ کسی طرف ملتفت ہوئے بغیر سیدھے حضرت عائشہؓ کے گھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قریب پہونچے آپ پر ایک چادر پڑی ہوئی تھی، انھوں نے ذراسی چادر سرکائی اور جھک کر روئے مبارک کا بوسہ لیا اور کہا میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! موت کا مزہ جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لئے مقدّر کر دیا تھا، آپؐ نے چکھ لیا، اب آپؐ کو کبھی بھی موت کی تکلیف نہ ہوگی، اس کے بعد انھوں نے چادر سے آپؐ کے روئے مبارک کو اسی طرح چھپا دیا، اس کے بعد مسجد نبوی میں آئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سلسلۂ کلام اس وقت تک جاری تھا، انھوں نے کہا عمر! ذرا ٹھہرو، لیکن جوشِ کلام میں انھوں نے ان کی بات نہیں سنی، جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ وہ خاموش نہیں ہو رہے ہیں تو مجمع کی طرف متوجہ ہو کر انھوں نے اپنی بات شروع کی، لوگوں نے جب ان کو خطاب کرتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے حضرت عمرؓ کی طرف سے رُخ پھیر کر ان کی بات سننی شروع کردی حضرت ابوبکرؓ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد کہا:-

"لوگو! اگر کوئی محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کرتا تھا تو (اس کو معلوم

ہو جائے کہ) بلاشبہ ان کی وفات ہو گئی، اور اگر اللہ تعالے کی عبادت کرتا تھا تو (اطمینان رکھے کہ) اللہ تعالے زندہ ہے، اس کے لئے موت نہیں ہے، پھر انھوں نے یہ آیت تلاوت کی:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ	اور محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو صرف
مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ	(خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے
مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى	پیغمبر ہو گذرے ہیں بھلا اگر ان کی وفات
اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ	ہو جائے یا شہید کر دیئے جائیں تو تم
عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ	اُلٹے پاؤں پھر جاؤ (یعنی مرتد ہو جاؤ)
شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ	اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا تو خدا
(سورۂ آل عمران ۔ ۱۴۴)	کا کچھ نقصان نہیں کر سکے گا اور
	خدا شکر گذاروں کو (بڑا) ثواب دیگا۔

جو لوگ اس موقع پر حاضر تھے، اور یہ منظر دیکھ رہے تھے، ان کا بیان ہے کہ "خدا کی قسم جب حضرت ابو بکرؓ نے یہ آیت تلاوت کی تو ایسا محسوس ہوا کہ یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے، اور حضرت ابو بکرؓ نے ان کے منہ کی بات کہدی" حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جب ابو بکرؓ کو آیت تلاوت کرتے سنا تو حیرت زدہ ہو کر بے ساختہ زمین پر گر گیا، میرے پیروں کی طاقت ختم ہو چکی تھی اس وقت گویا مجھے یہ علم ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا ہے۔[1]

حضرت ابو بکرؓ کی بیعتِ خلافت

اس کے بعد تمام مسلمانوں نے سقیفۂ بنو ساعدہ میں حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر خلافت کی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۵۵-۶۵۶ صحیح بخاری "باب مرض النبی صلے اللہ علیہ وسلم ووفاتہ" میں پوری تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔

بیعت کی اس عجلت کا مقصد یہ تھا کہ شیطان کو ان کے دلوں میں پھوٹ ڈالنے اور ان کے اندر رخنہ پیدا کرنے کا موقع نہ ملے اور نفسانی خواہشات سر نہ اٹھا سکیں اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم اپنے آخری سفر پر اس حال میں روانہ ہوں کہ مسلمان ایک رشتہ میں منسلک اور پوری طرح متحد و ہم رنگ و ہم آہنگ ہوں' ان کا امیر موجود ہو اور ان کے سارے معاملات کی دیکھ بھال کر رہا ہو حتیٰ کہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین اور تدفین کا کام بھی امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کے ہاتھوں انجام پائے۔

مسلمانوں نے اپنے رسولؐ کو کس طرح الوداع کہا؟

اس کے بعد لوگ پُر سکون ہو گئے اور تحیّر اور صدمہ کا اثر بدلی کی طرح چھٹ گیا اور وہ ان کاموں اور ان فرائض کی تکمیل میں مشغول ہو گئے جو آپؐ نے ان کو تعلیم فرمائے تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے غسل اور تکفین کا کام آپؐ کے اہل بیت نے انجام دیا' اس سے فراغت کے بعد آپؐ کے جنازۂ مبارک کو گھر ہی میں رکھ دیا گیا' اس موقع پر حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جس نبی کا بھی انتقال ہوا اس کو اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں اس کا انتقال ہوا تھا' چنانچہ آپؐ کا بسترِ مبارک جس پر آپؐ کی وفات ہوئی تھی' اٹھا دیا گیا' اور ٹھیک اس کے نیچے قبر کھودی گئی' ابو طلحہ انصاریؓ نے یہ کام انجام دیا۔

اس کے بعد لوگوں نے جماعتوں کی شکل میں حاضر ہونا شروع کیا' ایک جماعت آتی اور نماز جنازہ ادا کرتی اس کے بعد دوسری جماعت آکر نماز پڑھتی' پہلے مرد داخل ہوتے رہے' اس کے بعد عورتوں کو داخلہ کی اجازت دی گئی' عورتوں کے بعد بچوں کو

اجازت ہوئی اور انھوں نے بھی آپ کی نماز جنازہ پڑھی لوگوں نے کسی کو ان نمازوں کا امام نہیں بنایا۔[1]
یہ واقعہ سہ شنبہ کے دن کا ہے۔[2]

یہ مدینہ کا ایک غمگین دن تھا، جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فجر کی اذان دی تو حضور کو یاد کر کے بے ساختہ رونے لگے اور ان کی ہچکیاں بندھ گئیں اس منظر سے مسلمان جو پہلے ہی سے غمزدہ تھے، اور گہرے رنج و غم میں ڈوب گئے، ان کے کان اس اذان کو اس حال میں سنتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان تشریف فرما تھے ــــ آج صورت بالکل مختلف تھی۔[3]

ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا کہتی تھیں کہ یہ کتنی سخت مصیبت تھی، جب ہم کو یہ مصیبت یاد آتی ہے تو ہر مصیبت اس کی وجہ سے ہیچ اور آسان معلوم ہوتی ہے۔[4]
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے متعلق ارشاد فرمایا تھا، اے لوگو! تم میں سے (یا اہلِ ایمان میں سے) کسی کو بھی کوئی مصیبت پہونچے تو وہ اس مصیبت کے لئے جو اس کو دوسرے کے انتقال سے پیش آرہی ہے، اس مصیبت سے تسلی حاصل کرے جو میری وفات سے اس کو پیش آئی ہے، اس لئے کہ میری اُمت میں کسی شخص کو میری وفات کے صدمہ سے بڑھ کر کوئی مصیبت پیش نہ آئے گی۔[4]

جب تدفین سے لوگ فارغ ہو گئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔

یا أنس أطابت أنفسكم أن تحثوا	انس! کیا تمہارے دلوں نے یہ گوارا
على رسول الله صلى الله عليه وسلم التراب[5]	کر لیا کہ جسد مبارک پر مٹی ڈالو۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۶۳ [2] طبقات ابن سعد (السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج ۴ ص ۵۱۷)

[3] السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج ۴ ص ۵۳۸-۵۳۹ [4] الضلاج ۴ ص ۵۴۹ از ابن ماجہ۔

[5] صحیح بخاری (باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ)

ازواجِ مطہراتؓ و اولادِ اطہار

ازواجِ مطہراتؓ

آپؐ کی ازواجِ مطہرات میں سب سے پہلا نام حضرت خدیجہ بنت خُویلد رضی اللہ عنہ کا ہے، یہ آپؐ کی نبوت سے قبل جب ان کی عمر چالیس سال تھی آپؐ کی زوجیت میں آئیں، حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی نبوت کے بعد پیش آنے والی مشکلات میں آپؐ کی پوری مدد کی اور جہاد و قربانی میں آپؐ کی رفاقت و شرکت فرمائی، اور اپنی ہمدردی و محبت اور اپنے مال و دولت ہر طریقہ سے آپؐ کی تسلی و تسکین کا سامان فراہم کیا، ان کی وفات ہجرت سے تین سال قبل ہوئی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد (سیدنا ابراہیمؓ کو چھوڑ کر) حضرت خدیجہؓ سے ہے آپؐ تعریف اور احسان شناسی کے ساتھ ان کا ہمیشہ ذکر فرماتے رہے، کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی بکری ذبح کی جاتی تو آپؐ اس کے مختلف حصّے علیحدہ کرکے حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کے پاس بھجواتے[1]۔

ان کی وفات کے کچھ دن بعد سودہؓ بنت زمعہ کو آپؐ کی رفیقۂ حیات بننے کا شرف حاصل ہوا، اس کے بعد آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا جو آپؐ کی بہت عزیز و محبوب بیوی تھیں، اُمت کی خواتین میں فقہ و علم دین میں کوئی ان کا ہم پایہ

---

[1] متفق علیہ، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہراتؓ میں سے کسی پر اتنا رشک نہیں آیا، جتنا خدیجہؓ پر، حالانکہ میں نے ان کو دیکھا بھی نہیں۔

نہ تھا، اکابر صحابہ مختلف مسائل میں ان سے رجوع فرماتے تھے، اور ان کا فتویٰ اور رائے چاہتے تھے، اس کے بعد آپؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا، اس کے بعد زینب بنت خزیمہ سے شادی ہوئی جو شادی کے دو۲ ماہ بعد وفات پاگئیں، پھر اُم سلمہ رضی اللہ عنہا آپؐ کی زوجیت میں آئیں، ان کی وفات ازواج مطہرات میں سب کے بعد ہوئی، پھر آپؐ نے زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے شادی کی یہ آپؐ کی پھوپھی اُمیمہ کی صاحبزادی تھیں، اس کے بعد آپؐ نے جُوَیریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا سے شادی کی جو قبیلۂ بنو المصطلق سے تعلق رکھتی تھیں، پھر ابوسفیانؓ کی صاحبزادی اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا سے اور اس کے بعد قبیلۂ بنی النضیر کے سردار حُیّ بن اخطب کی صاحبزادی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی، حُیّ بن اخطب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون بن عمران علیہ السلام کی اولاد میں تھے، اس کے بعد میمونہؓ بنت الحارث الہلالیہ سے شادی ہوئی، ازواجِ مُطہرات میں سب سے آخر میں انھیں کو یہ شرف حاصل ہوا۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آپؐ کی ازواج مطہرات میں سے نو۹ موجود تھیں، حضرت خدیجہؓ اور زینب بنت خزیمہ کا آپؐ کی حیات مبارکہ ہی میں انتقال ہو گیا تھا، یہ سب حضرت عائشہؓ کو مستثنیٰ کر کے شادی شدہ تھیں[1]۔

آپؐ کی وفات کے وقت آپؐ کی دو۲ باندیاں موجود تھیں، ایک ماریہؓ بنت شمعون جو مصر کے قبطی خاندان کی فرد تھیں جن کو مصر کے حاکم مقوقس نے آپؐ کی

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۲۶-۲۹ تلخیص کے ساتھ۔

خدمت میں پیش کیا تھا، اور جو آپؐ کے صاحبزادے سیدنا ابراہیمؓ کی والدہ تھیں، دوسری قبیلۂ بنی النضیر کی خاتون ریحانہ بنت زید[1] تھیں، اسلام قبول کرنے کے بعد آپؐ نے ان کو آزاد فرما دیا، اور پھر ان کو اپنی زوجیت میں قبول کیا[2]۔

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی وفات کے بعد ان ازواج مطہرات سے شادی مسلمانوں پر حرام قرار دے دی، اس لئے کہ وہ اُمّہات المومنین کا درجہ رکھتی تھیں، اس تعلق (زوجیت کے ساتھ) اس مقدس اور نازک رشتہ کی پوری حفاظت و رعایت نہیں ہو سکتی تھی، جو اُمت کو اپنے نبی سے (دائمی طور پر) ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا	اور تم کو یہ شایاں نہیں کہ پیغمبرِ
رَسُولَ اللّٰهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا	خدا کو تکلیف دو اور نہ یہ کہ ان کی
أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهٖ أَبَدًا	بیویوں سے کبھی ان کے بعد
إِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ	نکاح کرو، بے شک یہ خدا
عَظِيمًا ٥ (احزاب۔۵۳)	کے نزدیک بڑے گناہ کا کام

ہے۔

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

علماء کا اس بات پر کُلّی اتفاق ہے کہ آپؐ کی وفات کے بعد کسی دوسرے کے لئے آپؐ کی ازواج مطہرات سے نکاح کرنا حرام ہے، اس لئے کہ دنیا و آخرت دونوں جگہ وہ آپؐ کی بیبیاں اور اہلِ ایمان کی مائیں ہیں[3]۔

---

[1] ایک روایت یہ ہے کہ وہ بنی قریظہ میں سے تھیں [2] ابن کثیر ج ۴ ص ۶۰۴-۶۰۵

[3] ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۳ (دار الاندلس)

تعدّدِ ازدواج پر ایک نظر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کا ایک حصہ تجرّد میں گذارا، یہ پچیس ۲۵ سال کی وہ مدت ہے، جو نوجوانی کا خاص زمانہ ہوتا ہے، آپؐ کامل الفطرت انسانی و عربی جوانمردی اور جسمانی صحت کا بہترین و اعلیٰ پیکر تھے، بادیۂ عرب میں آپؐ کی پرورش ہوئی تھی، تہذیب و تمدّن کے امراض اور عیوب سے اللہ تعالےٰ نے آپؐ کی حفاظت فرمائی تھی، شہسواری اور مردانگی کی اعلیٰ صفات سے آپؐ کو حصّۂ وافر ملا تھا جن کی عربوں کی نگاہ میں بڑی اہمیّت تھی، اور جن کو علم النفس اور اخلاقیات کے ماہرین بھی تسلیم کرتے ہیں۔

آپؐ کے بدترین دشمنوں کو بھی اس زمانہ میں (جو نبوت سے قبل آپؐ کا بہت اہم اور نازک دور تھا) آپؐ پر حرف گیری اور انگشت نمائی کا کوئی موقع نہ ملا نہ آپؐ کی نبوت کے بعد آج تک کسی نے اس سلسلہ میں آپؐ پر نکتہ چینی کی، آپؐ طہارت و عفّت، پاکیزگیٔ قلب و نظر، معصومیت و طہارت کی اعلیٰ مثال تھے، اور ہر اس کمزوری سے بہت دور تھے، جو آپؐ کے شایانِ شان نہ تھی۔

پچیس ۲۵ سال کی اس عمر میں آپؐ نے سب سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا جو بیوہ تھیں، چالیس ۴۰ سال کی ان کی عمر تھی، اس سے قبل ان کی دو ۲ شادیاں ہو چکی تھیں، صاحبِ اولاد تھیں، پھر مشہور قول کے مطابق آپؐ کے اور ان کے سن میں پندرہ ۱۵ سال کا فرق تھا ـــــ اس کے بعد دوسری شادی آپؐ نے حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے اس وقت کی جبکہ آپؐ کی عمر مبارک پچاس ۵۰ سال سے زیادہ

ہو چکی تھی، ان کے شوہر کا حبشہ میں ایک مہاجر مسلمان کی حیثیت سے انتقال ہوگیا تھا، آپؐ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی دوشیزہ اور غیر شادی شدہ خاتون سے نکاح نہیں فرمایا، اس کے علاوہ جتنی شادیاں آپؐ نے فرمائیں، اس میں دین اور دعوت دین کی کوئی مصلحت، فراخ قلبی و عالی ظرفی، مکارمِ اخلاق، مسلمانوں کا کوئی مفادِ عام، یا کسی بڑے اجتماعی خطرہ اور مفسدہ کا سدِ باب آپؐ کے پیش نظر تھا۔ رشتوں اور ازدواجی قرابتوں کی عربوں کی قبائلی اور سماجی زندگی میں جس قدر اہمیت ہے، اتنی کسی اور سوسائٹی اور سماج میں نہیں ہے، اس لئے یہ شادیاں اور نئی قرابتیں، اسلامی دعوت اور اسلام کے مثالی معاشرہ کی تاریخ، خون بہانے سے حفاظت اور عربی قبائل کے ضرر سے بچاؤ کا ایک بڑا ذریعہ تھیں۔

مزید یہ کہ ان ازواج مطہرات کے ساتھ آپؐ کی زندگی کوئی عیش و آرام مرفہ الحالی یا لذتِ کام و دہن کی زندگی نہ تھی، جو تعدد ازدواج میں بہت سے لوگوں کے پیش نظر رہتا ہے، وہ اس درجہ زہد و تقشف اور ایثار و قناعت کی زندگی تھی، جس کی استطاعت قدیم اور جدید دور کے بڑے سے بڑے حوصلہ مند اور اولوالعزم افراد اور نامور زہاد میں بھی نہیں ہے، اس کی کچھ جھلکیاں اور نمونے اخلاق و شمائل کے حصے میں پیش کئے جائیں گے تاہم ایک انصاف پسند شخص کے لئے قرآن مجید کی یہی ایک آیت کافی ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ	اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ
إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا	اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی
وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ	زینت و آرائش کی خواستگار ہو تو آؤ

وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ○	میں تمھیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح
وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	سے رخصت کر دوں اور اگر تم
وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ	خدا اور اس کے پیغمبر اور عاقبت
اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ	کے گھر (یعنی بہشت) کی طلب گار
اَجْرًا عَظِيْمًا ○	ہو تو تم میں جو نیکو کاری کرنے والی
(سورۂ احزاب - ۲۸-۲۹)	ہیں، ان کے لئے خدا نے اجرِ عظیم
	تیار کر رکھا ہے۔

اس عالی مقصد، پاکیزہ جذبہ، پاک وصاف ذہن اور عمیق وحکیمانہ تربیت کا اثر یہ تھا کہ ان سب ازواجِ مطہرات نے بغیر کسی ہچکچاہٹ اور ادنیٰ درجہ کے تردّد کے اللہ اور اس کے رسول، اور دارِ آخرت کو ترجیح دی، مثال اور نمونہ کے طور پر حضرت عائشہؓ کا وہ جواب کافی ہے، جو اس سلسلہ میں انھوں نے دیا" آپؐ نے یہ آیت ان کے سامنے تلاوت کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ دیکھو جلدی نہ کرنا اپنے والدین سے مشورہ ضرور کر لینا، انھوں نے جواب دیا، بھلا اس معاملہ میں بھی والدین سے مشورہ کی ضرورت ہے؟ مجھے تو اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کا گھر مطلوب ہے[۱] وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سب بیویوں نے ایسا ہی کیا۔[۲]

تعدّد ازدواج اور اس کے نفسیاتی، اقتصادی اور اجتماعی اثرات اور تقاضوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دعوت کی عظیم ذمہ داری، جُہد و مجاہدہ کی زندگی، اور مسلمانوں کے اہم ترین امور سے ایک لمحہ کے لئے غافل نہیں کیا، بلکہ اس سے آپؐ کی

ـ۱ صحیح بخاری بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا ـ۲ صحیح بخاری ابن ابی حاتم واحمد۔

سرگرمی واولوالعزمی اور قوت ونشاط میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔ ازواج مطہرات تبلیغِ اسلام اور تعلیم دین کے مقصد عظیم میں آپؐ کی معاون ومددگار تھیں، وہ غزوات میں آپؐ کے ہمراہ رہتی تھیں، زخمیوں کا علاج معالجہ اور مریضوں کی تیمارداری کرتی تھیں، آپؐ کی گھریلو اور معاشرتی زندگی کا ایک تہائی حصہ اور اس کے علاوہ اور بہت سے احکام وتعلیمات ازواج مطہرات ہی کی رہینِ منت ہیں، اور مسلمانوں نے ان کو باقاعدہ ان سے سیکھا، یاد کیا، اور دوسروں کو بتایا اور سکھایا ہے[1]۔

اس سلسلہ میں صرف حضرت عائشہؓ کا نام لے لینا کافی ہے، جن کے متعلق فن علم الرجال اور طبقات کے امام ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے اپنی مشہور کتاب "تذکرۃ الحفّاظ" میں لکھا ہے کہ:۔

"وہ فقہائے صحابہ میں بھی سب سے ممتاز تھیں، فقہائے صحابہ مسائل میں ان سے رجوع کرتے تھے، قبیصہ بنت ذویبؓ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ مسائل سے سب سے زیادہ واقف تھیں، اکابر صحابہ ان سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے، ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی حدیث کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تو عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کرتے اور ان کے پاس اس کا علم ضرور ہوتا"

---

[1] تعدّد ازدواج اور اس کی حکمتوں اور مصلحتوں اور اس کے متعلقہ حالات اور تقاضوں پر مولانا قاضی محمد سلیمان منصورپوریؒ نے اپنی نفیس کتاب "رحمۃ للعالمین" کی دوسری جلد میں بہت اچھی روشنی ڈالی ہے (دیکھئے صفحہ ۱۴۱-۱۴۴) مصر کے مشہور فاضل عباس محمود العقاد نے اپنی کتاب "عبقریۃ محمد" میں "تعدّد ازدواج" اور "اسباب تعدّد زوجاتہ" کے عنوان کے تحت اچھا کلام کیا ہے۔

حسّان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے قرآن مجید، حلال وحرام، فرائض واحکام، اشعار، تاریخ عرب اور انساب سے ان سے زیادہ کسی کو واقف نہیں پایا۔[1]"

جہاں تک مکارم اخلاق، عالی ہمتی، جود وسخا، ہمدردی وغمخواری اور شفقت ودلداری کا تعلق ہے، اس کے متعلق جتنا بھی کہا جائے کم ہی ہوگا، اس سلسلہ میں وہ روایت کافی ہوگی، جو ہشام نے اپنے والد سے نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضؓ کو ایک لاکھ درہم بھیجے بخدا ایک مہینہ بھی نہیں گذرا تھا کہ حضرت عائشہ رضؓ اہل حاجت پر اس کو تقسیم کرکے فارغ ہوگئیں، ان کی باندی نے کہا کہ اگر آپ اس میں ایک درہم کا گوشت خرید لیتیں تو اچھا تھا، کہنے لگیں کہ تم نے اس وقت یاد نہ دلا دیا[2]؟ اس وقت حضرت عائشہ رضؓ روزہ سے تھیں۔[3]

اس مسئلہ نے مغرب کے بہت سے اہلِ فکر اور مستشرقین کے ذہن ودماغ کو اُلجھا رکھا ہے، اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انھوں نے ممالک عرب میں اور اسلامی شریعت میں ازدواجی زندگی کے مخصوص نظام کو مغربی تصوّرات اور حالات وعادات اور رسم ورواج کا پابند بنانا چاہا ہے، انھوں نے مغرب کے پیمانوں کو (جو ایک خاص تہذیب اور سوسائٹی کی پیداوار ہیں) اس صورت حال پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے، جو فطرت سلیم اور عربی ماحول کے عین مطابق تھی، اور جس کے پیچھے مختلف اخلاقی اور سماجی مصالح کارفرما تھے، اور جس کی خدا کی طرف سے اجازت بھی تھی،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷-۲۸ شائع کردہ دار احیاء التراث العربی۔ [2] ایضاً ص ۲۸

[3] ایضاً۔ اضافہ از روایت ام ذرہ۔

یہ دراصل مغربی طرزِ فکر اور مغربی مصنفین کی کتابوں کا ایک بہت کمزور پہلو ہے کہ وہ پہلے مغرب کو میزان قرار دیتے ہیں، پھر ہر اس چیز کے خلاف جو اس کے خلاف ہو، بے رحمی سے فیصلے صادر کرتے ہیں، وہ خود ایک مسئلہ کھڑا کرتے ہیں، جس کی کوئی جڑ بنیاد نہیں ہوتی پھر اس کو حل کرنے کے درپے ہوتے ہیں، یہ ان کے قومی تکبر اور مغرب کے دل پسند افکار و تصوّرات کی حد سے بڑھی ہوئی تقدیس کا نتیجہ ہے۔

انگریز مصنّف مسٹر بوڈلے (R. V. C. BODLEY) نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے مسئلہ میں اس مغربی احساس اور طرزِ فکر پر بہت جرأت و انصاف سے تنقید کی ہے، وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ازدواجی زندگی کو نہ تو مغرب کے پیمانہ سے جانچنے کی ضرورت ہے، اور نہ ان رسوم و قوانین کے نقطۂ نظر سے جنھیں عیسائیت نے جنم دیا ہے، یہ لوگ نہ مغربی تھے نہ عیسائی، بلکہ وہ ایک ایسے ملک میں اور ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، جبکہ ان کے اپنے ضابطۂ اخلاق کا ہی چلن تھا، اس کے باوجود امریکہ اور یورپ کے ضابطۂ اخلاق کو عربوں کے ضابطۂ اخلاق سے بہتر سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے مغرب کے پاس مشرق کو دینے کے لئے بہت کچھ ہے، لیکن اپنے طریقۂ زندگی کو بہتر اور اپنے ضابطۂ اخلاق کو اعلیٰ ثابت کرنے کے لئے تو انھیں ابھی بہت چھان بین کرنے کی ضرورت ہے، لہٰذا انھیں دوسروں کے مذہب و تمدن پر نکتہ چینی کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔"[۱]

---

[۱] R. V. C. BODLEY :—THE MESSENGER. THE LIFE OF MOHAMMAD. (LONDON, 1946) P. P. 202-203

اس کے علاوہ تعددِ ازدواج کی وہ قباحت جو آج مغرب میں ایک بدیہی حقیقت بن گئی ہے، اور اہلِ مغرب نے اس کو آنکھ بند کرکے تسلیم کرلیا ہے، کوئی ایسی قباحت نہیں جو صدیوں اور نسلوں تک قائم رہے، یہ نہ طے شدہ علمی اصولوں پر قائم ہے، نہ انسان کی فطرتِ سلیم کے مطابق ہے، یہ دراصل ایک خیالی اور جذباتی قباحت ہے، جو پُرجوش اور طاقتور پروپیگنڈہ اور تشہیر کے بل پر قائم ہے، اور اس کا پورا امکان ہے کہ زمانہ کی رفتار اور اقتصادی، سماجی اور تربیتی رجحانات اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ نہ صرف اس کا زور کم ہو جائے بلکہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

ایک مغربی مصنّف (ALWIN TOFFLER) نے اپنی نئی کتاب (FUTURE SHOCK) میں جس نے مغرب کے علمی حلقوں میں ایک ہلچل مچادی ہے، اس ذہنی و سماجی تبدیلی کی طرف اشارے بھی کئے ہیں، جس کا مستقبل قریب میں امکان ہے۔[1]

آپؐ کی اولاد و احفاد

حضرت خدیجہ رضؓ سے آپؐ کے ایک صاحبزادے القاسم پیدا ہوئے، ان ہی کے نام پر آپؐ کی کنیت تھی، ان کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا، اس کے بعد بالترتیب حضرت زینب رضؓ، حضرت رقیہ رضؓ، حضرت ام کلثوم رضؓ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں، صاحبزادوں میں، حضرت عبداللہ رضؓ، حضرت طیّب اور حضرت طاہر رضؓ کے بارے میں اختلاف ہے، بعض لوگوں نے ان کو تین شمار کیا ہے، لیکن علامہ ابن القیم کی تحقیق یہ ہے کہ طیّب و طاہر عبداللہ کے لقب تھے،

---

[1] ALWIN TOFFLER, FUTURE SHOCK, BANTAM BOOKS INC, NEW YORK. 1970

یہ سب اولاد حضرت خدیجہؓ سے تھی[1]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپؐ کی سب سے زیادہ محبوب صاحبزادی تھیں، آپؐ نے ان ہی کے لئے ارشاد فرمایا تھا کہ "وہ جنّت میں عورتوں کی سردار ہوں گی،[2] آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ "فاطمہ میرے جسم کا ایک حصّہ ہے جس بات سے اُسے تکلیف ہوتی ہے، اس سے مجھے ہوتی ہے[3]" اہلِ بیت میں سب سے پہلے آپؓ ہی اس دنیا سے رخصت ہوئیں اور آپؐ سے جا ملیں۔

ماریہ قبطیہؓ سے آپؐ کے ایک صاحبزادے ابراہیمؓ ہوئے، ان کی وفات بھی بچپن میں اس وقت ہوئی جب وہ اپنے پالنے میں تھے، ان کی وفات پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ فرمائے:۔

تدمع العین ویحزن القلب	آنکھیں اشک بار ہیں اور دل
ولا نقول ما یسخط الرب	رنجور لیکن ہم کوئی ایسی بات نہیں کہتے
وانا بک یا ابراھیم لمحزونون[4]	جو رب کو ناراض کرنے والی ہو، اے
	ابراہیمؓ! ہم تم پر غمزدہ ہیں۔

ان کے انتقال پر سورج گرہن ہوگیا تو صحابہ نے عرض کیا کہ ابراہیمؓ کے انتقال کی وجہ سے سورج گرہن ہوگیا ہے، آپؐ نے اس موقع پر صحابہ کو جمع کرکے ان سے خطاب فرمایا، اور کہا کہ سورج اور چاند اللہ عزوجل کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، جن کو کسی کی موت سے گرہن نہیں ہوتا۔[5]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۲۵-۲۶ [2] جامع الترمذی ج ۲ ص ۲۲۱ [3] متفق علیہ۔
[4] صحیح مسلم بروایت اسماء بنت یزید بن السکن تفصیل کے ساتھ [5] صحیح مسلم کتاب الکسوف۔

غالیانہ خوش عقیدگی اور شخصیت پرستی کا استیصال

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس اہتمام کے ساتھ صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے ان سے خطاب فرمایا! اور اس کی وضاحت فرمائی کہ سورج اور چاند کے گرہن اور کائنات کی کسی تبدیلی کو کسی کی موت و حیات سے کوئی تعلق نہیں، خواہ اس کا کچھ رتبہ ہو اور اس کو کسی بڑی سے بڑی محبوب شخصیت سے نسبت ہو، یہ عمل وہم پرستی بلکہ غالیانہ خوش عقیدگی، اور شخصیت پرستی کی جڑ کاٹتا ہے، دنیا کا کوئی داعی، کوئی پیشوا، کسی تحریک کا علمبردار، کسی انسانی جماعت کا قائد ہوتا تو کم سے کم درجہ یہ تھا کہ اگر اس خیال کی تردید نہ کرتا تو خاموش رہتا کہ یہ بات ہماری تحریک کے مفاد میں جاتی ہے، میں نے تو کہلوائی بھی نہیں، خود بخود لوگوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ سورج گرہن پیغمبر خدا کے فرزند عزیز کے انتقال پر ہوا ہے، اس کی تردید کچھ ضروری نہیں ہے۔

یہی فرق ہے پیغمبر اور غیر پیغمبر میں کہ سیاسی ذہن رکھنے والے جن واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں (خواہ وہ واقعات غیر اختیاری طریقہ پر پیش آئے ہوں) پیغمبر عقیدہ کا فساد اور دین کا نقصان گوارہ نہیں کرتا، وہ ان سے فائدہ اٹھانا حرام اور منصب نبوت کے منافی سمجھتا ہے، اس موقعہ پر اگر آپ خاموشی اختیار فرماتے تو اس سے دنیا میں کوئی عظیم فساد برپا ہونے والا نہیں تھا، لیکن اس سے عقیدۂ توحید پر اثر پڑتا، اور شخصیت پرستی اور تصرف الکائنات کے امکان کا دروازہ کھل جاتا اور یہ ذہنِ انسانی کا وہ انحراف تھا، جو بہت خطرناک ہے، اور ایک نبی برحق کے لیئے اس کا علاج اور سدّباب ضروری تھا۔

حضرت زینبؓ کے جو حضرت خدیجہؓ کے بھانجے ابوالعاص بن ربیع کی زوجیت میں تھیں، ایک صاحبزادے ہوئے جن کا نام علی تھا، اور ایک صاحبزادی جن کا نام امامہ تھا۔ حضرت رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے ہوئی اور ان سے ایک لڑکے عبداللہ ہوئے، حضرت رقیہؓ کا انتقال اس وقت ہوا جب آپؐ بدر میں تھے، اور حضرت عثمانؓ ان کی تیمارداری میں مشغول تھے، ان کے بعد انھوں نے ان کی بہن ام کلثومؓ سے شادی کی، اسی لئے ان کا لقب "ذوالنورین" پڑ گیا۔ ان کی وفات بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات ہی میں ہوئی۔

حضرت فاطمہ کی شادی ابوطالب کے صاحبزادے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ابن عم حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہوئی، ان کے ایک صاحبزادے حسنؓ جن کے نام پر ان کی کُنیت تھی، اور دوسرے صاحبزادے حسینؓ تھے، جن کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "وہ اس دنیا میں میرے دو پھول ہیں[1] ان دونوں کے بارے میں آپؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "یہ دونوں اہلِ جنت میں نوجوانوں کے سردار ہوں گے"[2]

اللہ تعالے نے ان دونوں کی اولاد میں خوب برکت عطا فرمائی، اور اسلام اور مسلمانوں کو ان سے عظیم الشان فائدہ پہونچا، ان میں بڑے بڑے سردار اور قائد، اور علم و دین اور جہاد اور زہد و تقوی کے امام پیدا ہوئے، اور انھوں نے تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں بڑے نازک وقتوں میں مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیا اور علم جہاد بلند کیا، حضرت فاطمہؓ کی حضرت علیؓ سے دو صاحبزادیاں زینبؓ اور

---

[1] صحیح بخاری کتاب المناقب باب مناقب الحسن والحسین [2] ترمذی ج ۲ ص ۲۱۱

ام کلثوم بھی تھیں، زینبؓ کی شادی ان کے ابن عم عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب سے ہوئی، جن کا عرب کے چند سخی ترین افراد میں شمار تھا، ان سے علی اور عون دو صاحبزادے پیدا ہوئے، ام کلثوم کی شادی حضرت عمرؓ بن الخطاب سے ہوئی اور ان سے ایک صاحبزادے زید ہوئے۔[1]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سب اولاد کا آپ کی حیات ہی میں انتقال ہوا، سوائے حضرت فاطمہؓ کے جن کا انتقال آپؐ کی وفات کے چھ ماہ بعد ہوا۔[2]

---

[1] ماخوذ از سیرت ابن کثیر ج ۴ ص ۵۸۱-۵۸۲ و دیگر مراجع [2] زاد المعاد از علامہ ابن القیم ج ۱ ص ۲۶

اخلاق وشمائل

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ اوصاف کریمہ اور حلیۂ مبارک

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ اوصاف کریمہ اور خصائل شریفہ کا ذکر ہند بن ابی ہالہ رضؓ نے (جو ام المومنین حضرت خدیجہ رضؓ کے فرزند اور حضرت حسن رضؓ و حسین رضؓ کے ماموں ہیں) بہت جامع اور بلیغ انداز میں کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں :۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہر وقت آخرت کی فکر میں اور امور آخرت کی سوچ میں رہتے اس کا ایک تسلسل قائم تھا کسی وقت آپؐ کو چین نہیں ہوتا تھا، اکثر طویل سکوت اختیار فرماتے، بلا ضرورت کلام نہ فرماتے گفتگو کا آغاز فرماتے تو دہن مبارک سے اچھی طرح الفاظ ادا فرماتے[1] اور اسی طرح اختتام فرماتے آپؐ کی گفتگو اور بیان بہت صاف، واضح، اور دو ٹوک ہوتا، نہ اس میں غیر ضروری طوالت ہوتی نہ زیادہ اختصار، آپؐ نرم مزاج و نرم گفتار تھے، درشت خو اور بے مروّت نہ تھے نہ کسی کی اہانت کرتے تھے، اور نہ اپنے لئے اہانت پسند کرتے تھے[2]، نعمت کی بڑی قدر کرتے اور اس کو بہت زیادہ

---

[1] یعنی متکبروں کی طرح بے توجہی و بے نیازی کے ساتھ ادھ کٹے الفاظ استعمال نہ کرتے [2] یہاں "المہین" کا لفظ آیا ہے جو میم پر ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے اگر مُہین مراد لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ کسی کی اہانت آپؐ نہ فرماتے تھے، اور اگر مَہین ہو تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ آپؐ اپنے لئے ذلت اور پستی پسند نہ فرماتے تھے، مطلب یہ ہے کہ نہ درشت خو تھے، نہ کمزور طبیعت کے مالک تھے کہ ہر چیز گوارا فرما لیتے بلکہ ہیبت و رعب اور جلال و وقار کے مختلف پہلوؤں کے جامع تھے۔

جانتے، خواہ کتنی ہی قلیل ہو (کہ آسانی سے نظر بھی نہ آئے) اور اس کی برائی نہ فرماتے کھانے پینے کی چیزوں کی برائی کرتے نہ تعریف، دنیا اور دنیا سے متعلق جو بھی چیز ہوتی، اس پر آپؐ کو کبھی غصہ نہ آتا، لیکن جب خدا کے کسی حق کو پامال کیا جاتا تو اس وقت آپؐ کے جلال کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہ سکتی تھی، یہاں تک کہ آپؐ اس کا بدلہ لے لیتے، آپؐ کو اپنی ذات کے لئے نہ غصہ آتا نہ اس کے لئے انتقام لیتے، جب اشارہ فرماتے تو پورے ہاتھ کے ساتھ اشارہ فرماتے، جب کسی امر پر تعجب فرماتے تو اس کو پلٹ دیتے گفتگو کرتے وقت داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ملاتے، غصہ اور ناگواری کی بات ہوتی تو روئے انور اس طرف سے بالکل پھیر لیتے، اور اعراض فرمالیتے، خوش ہوتے تو نظریں جھکا لیتے، آپؐ کا ہنسنا زیادہ تر تبسم تھا جس سے صرف آپؐ کے دندان مبارک جو بارش کے اولوں کی طرح پاک و شفاف تھے، ظاہر ہوتے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ جو فرد خاندان تھے، اور جن کو علم و واقفیت کے بہترین ذرائع اور مواقع حاصل تھے، اور جن کی نظر نفسیات انسانی اور اخلاق کی باریکیوں پر بہت گہری تھی، قریب ترین اشخاص میں سے تھے، اور اسی کے ساتھ وصف و بیان اور منظر کشی میں بھی آپ کو سب سے زیادہ قدرت تھی، آپؐ کے "خلق عظیم" کے متعلق یہ کہتے ہیں:۔

"آپؐ طبعاً بد کلامی اور بے حیائی و بے شرمی سے دور تھے، اور تکلفاً بھی ایسی کوئی بات آپؐ سے سرزد نہیں ہوتی تھی، بازاروں میں آپؐ کبھی آواز بلند نہ فرماتے، برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے، بلکہ عفو و درگذر کا معاملہ فرماتے، آپؐ نے کسی پر کبھی دست درازی نہ فرمائی، سوائے اس کے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا موقع ہو، کسی خادم یا عورت پر آپؐ نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا، میں نے آپؐ کو کسی ظلم و زیادتی کا انتقام لیتے ہوئے بھی

نہیں دیکھا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی نہ ہو اور اس کی حرمت و ناموس پر آنچ نہ آئے، ہاں اگر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو پامال کیا جاتا، اور اس کے ناموس پر حرف آتا تو آپؐ اس کے لئے ہر شخص سے زیادہ غصہ ہوتے، دو چیزیں سامنے ہوتیں تو ہمیشہ آسان چیز کا آپؐ انتخاب فرماتے، جب اپنے دولت خانہ پر تشریف لاتے تو عام انسانوں کی طرح نظر آتے، اپنے کپڑوں کو صاف کرتے، بکری کا دودھ دوہتے، اور اپنی سب ضرورتیں خود انجام دیتے۔

اپنی زبان مبارک محفوظ رکھتے، اور صرف اسی چیز کے لئے کھولتے جس سے آپؐ کو کچھ سروکار ہوتا، لوگوں کی دلداری فرماتے، اور ان کو متنفر نہ کرتے، کسی قوم و برادری کا معزز شخص آتا تو اس کے ساتھ اکرام و اعزاز کا معاملہ فرماتے اور اس کو اچھے اور اعلیٰ عہدہ پر مقرر کرتے، لوگوں کے بارے میں محتاط تبصرہ کرتے، بغیر اس کے کہ اپنی بشاشت اور اخلاق سے ان کو محروم فرمائیں، اپنے اصحابؓ کے حالات میں برابر خبر رکھتے، لوگوں سے لوگوں کے معاملات کے بارے میں دریافت کرتے رہتے۔

اچھی بات کی اچھائی بیان کرتے اور اس کو قوت پہونچاتے، بری بات کی برائی کرتے اور اس کو کمزور کرتے، آپ کا معاملہ معتدل اور یکساں تھا، اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا تھا، آپ کسی بات سے غفلت نہ فرماتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں دوسرے لوگ بھی غافل ہونے لگیں اور اکتا جائیں، ہر حال اور ہر موقع کے لئے آپؐ کے پاس اس حال کے مطابق ضروری سامان تھا، نہ حق کے معاملہ میں کوتاہی فرماتے نہ حد سے آگے بڑھتے، آپؐ کے قریب جو لوگ رہتے تھے، وہ سب سے اچھے اور منتخب ہوتے تھے، آپؐ کی نگاہ میں سب سے زیادہ افضل وہ تھا،

جس کی خیر خواہی اور اخلاق عام ہو، سب سے زیادہ قدر و منزلت اس کی تھی، جو غمخواری و ہمدردی اور دوسروں کی مدد اور معاونت میں سب سے آگے ہو، خدا کا ذکر کرتے ہوئے کھڑے ہوتے اور خدا کا ذکر کرتے ہوئے بیٹھتے، جب کہیں تشریف لے جاتے تو جہاں مجلس ختم ہوتی اسی جگہ تشریف رکھتے، اور اس کا حکم بھی فرماتے اپنے حاضرین مجلس اور ہمنشینوں میں ہر شخص کو (اپنی توجہ اور التفات میں) پورا حصہ دیتے آپ کا شریک مجلس یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر آپؐ کی نگاہ میں کوئی اور نہیں ہے، اگر کوئی شخص آپ کو کسی غرض سے بٹھا لیتا یا کسی ضرورت میں آپؐ سے گفتگو کرتا تو نہایت صبر و سکون سے اس کی پوری بات سنتے یہاں تک کہ وہ خود ہی اپنی بات کر کے رخصت ہوتا، اگر کوئی شخص آپؐ سے کچھ سوال کرتا اور کچھ مدد چاہتا تو بلا اس کی ضرورت پوری کئے واپس نہ فرماتے، یا کم از کم نرم و شیریں لہجہ میں جواب دیتے، آپؐ کا حسن اخلاق تمام لوگوں کے لئے وسیع اور عام تھا، اور آپؐ ان کے حق میں باپ ہو گئے تھے، تمام لوگ حق کے معاملہ میں آپ کی نظر میں برابر تھے، آپ کی مجلس علم و معرفت، حیاء و شرم اور صبر اور امانت داری کی مجلس تھی، نہ اس میں آوازیں بلند ہوتی تھیں، نہ کسی کے عیوب بیان کئے جاتے تھے، نہ کسی کی عزت و ناموس پر حملہ ہوتا نہ کمزوریوں کی تشہیر کی جاتی تھی، سب ایک دوسرے کے مساوی تھے، اور صرف تقویٰ کے لحاظ سے ان کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی تھی، اس میں لوگ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کے ساتھ رحمدلی و شفقت کا معاملہ کرتے تھے، حاجتمند کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، مسافر اور نو وارد کی حفاظت کرتے اور اس کا خیال رکھتے تھے۔!

حضرت علی مزید فرماتے ہیں:۔

آپؐ ہمہ وقت کشادہ رُو اور انبساط و بشاشت کے ساتھ رہتے تھے' بہت نرم اخلاق اور نرم پہلو[1] تھے' نہ سخت طبیعت کے تھے' نہ سخت بات کہنے کے عادی' نہ چلّا کر بولنے والے' نہ عامیانہ اور مبتذل بات کرنے والے' نہ کسی کو عیب لگانے والے نہ تنگ دل بخیل' جو بات آپؐ کو پسند نہ ہوتی اس سے تغافل فرماتے (یعنی اس کو نظرانداز کر دیتے اور گرفت نہ فرماتے) اور صراحتاً اس سے مایوس بھی نہ فرماتے اور اس کا جواب بھی نہ دیتے' تین باتوں سے آپؐ نے اپنے آپؐ کو بالکل بچا رکھا تھا' ایک جھگڑا' دوسرے تکبر' اور تیسرے غیر ضروری اور لایعنی کام' لوگوں کو بھی تین باتوں سے آپؐ نے بچا رکھا تھا' نہ کسی کی بُرائی کرتے تھے' نہ اس کو عیب لگاتے تھے' اور نہ اس کی کمزوریوں اور پوشیدہ باتوں کے پیچھے پڑتے تھے، صرف وہ کلام فرماتے تھے' جس پر ثواب کی امید ہوتی تھی' جب گفتگو کرتے تھے' تو شرکاءِ مجلس ادب سے اس طرح سر جھکا لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان سب کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں[2]' جب آپؐ خاموش ہوتے تب یہ لوگ بات کرتے' آپؐ کے سامنے کبھی نزاع نہ کرتے' اگر آپ کی مجلس میں کوئی شخص گفتگو کرتا تو بقیہ سب لوگ خاموشی سے سنتے یہاں تک کہ وہ اپنی بات ختم کر لیتا' آپؐ کے سامنے ہر شخص کی گفتگو کا وہی درجہ ہوتا جو اُن کے پہلے آدمی کا ہوتا (کہ پورے اطمینان سے اپنی بات کہنے کا موقع ملتا' اور اسی قدر دانی اور اطمینان کے ساتھ اُسے سُنا جاتا)

---

[1] یعنی جلد مہربان ہو جانے والے بہت لطف و کرم والے' اور بہت آسانی سے درگذر کرنے والے تھے' یہ بھی آتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کسی سے نزاع نہیں فرماتے تھے' ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد سکون و وقار اور خشوع و خضوع ہے [2] یعنی بے حس و حرکت کہ کہیں جنبش سے چڑیاں نہ اڑ جائیں۔

جس بات سے سب لوگ ہنستے اس پر آپؐ بھی ہنستے، جس سے سب تعجب کا اظہار کرتے آپ بھی تعجب فرماتے، مسافر اور پردیسی کی بے تمیزی اور ہر طرح کے سوال کو صبر و تحمل کے ساتھ سنتے؛ یہاں تک کہ آپؐ کے اصحاب کرامؓ ایسے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے (تاکہ آپؐ پر کوئی بار نہ ہو) آپ فرماتے تھے کہ "تم کسی حاجتمند کو پاؤ تو اس کی مدد کرو" آپ مدح و تعریف اسی شخص کی قبول فرماتے جو حد اعتدال میں رہتا، کسی کی گفتگو کے دوران کلام نہ فرماتے اور اس کی بات کبھی نہ کاٹتے، ہاں اگر وہ حد سے بڑھنے لگتا تو اس کو منع فرما دیتے یا مجلس سے اٹھ کر اس کی بات قطع فرما دیتے۔

آپؐ سب سے زیادہ فراخ دل، کشادہ قلب، راست گفتار، نرم طبیعت اور معاشرت و معاملات میں نہایت درجہ کریم تھے، جو پہلی بار آپ کو دیکھتا وہ مرعوب ہو جاتا، آپ کی صحبت میں رہتا اور جان پہچان حاصل ہوتی تو آپؐ کا فریفتہ اور دلدادہ ہو جاتا، آپؐ کا ذکر خیر کرنے والا کہتا ہے کہ نہ آپؐ سے قبل میں نے آپؐ جیسا کوئی شخص دیکھا نہ آپؐ کے بعد، صلی اللہ علی نبینا وسلم۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) کو لباس جمال و کمال سے آراستہ فرمایا تھا، اور آپؐ کو محبت و دلکشی اور رعب و ہیبت کا حسین و جمیل پیکر بنایا تھا، ہند بن ابی ہالہؓ بیان کرتے ہیں:۔

"آپ بہت خوددار و باوقار اور شان و شوکت کے حامل تھے، اور دوسروں کی نگاہ میں بھی نہایت پُرشکوہ، آپ کا روئے انور چودھویں رات کے چاند کی طرح دمکتا تھا"[2]

---

[1] اقتباس از شمائل ترمذی [2] سیدنا حسن بروایت ہند بن ابی ہالہ (شمائل ترمذی)

براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں :۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میانہ قد تھے، میں نے آپؐ کو ایک مرتبہ سرخ قبا میں دیکھا، اس سے اچھی کوئی چیز میں نے کبھی نہیں دیکھی"[1] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "آپؐ میانہ قد تھے، طول کی طرف کسی قدر مائل، رنگ نہایت گورا، ریش مبارک کے بال سیاہ، دہانہ نہایت متناسب اور حسین، آنکھوں کی پلکیں دراز، چوڑے شانے" آخر میں کہتے ہیں کہ "میں نے آپؐ جیسا آپؐ کے پہلے یا آپؐ کے بعد کبھی نہیں دیکھا"[2]

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ "میں نے حریر و دیباج کو بھی آپؐ کے دست مبارک سے زیادہ نرم نہیں پایا، نہ آپ کی خوشبو سے بڑھ کر کوئی خوشبو سونگھی"[3]

تعلق مع اللہ

باوجود اس کے کہ اللہ تعالے نے آپ کو اپنی رسالت محبوبیت اور حسن انتخاب سے نوازا تھا، اور آپؐ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرما دیئے تھے، آپؐ عبادت میں سب سے زیادہ کوشاں اور اس کے سب سے زیادہ شائق اور مشتاق تھے۔

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز (نفل) میں اتنی دیر تک کھڑے رہے کہ آپؐ کے قدم مبارک پر ورم آ گیا، عرض کیا گیا کہ آپؐ کے تو اگلے پچھلے گناہوں کی معافی ہو چکی ہے، یہ سن کر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں خدا کا شکر گذار بندہ نہ بنوں"[4]

---

[1] متفق علیہ [2] الادب المفرد للبخاری باب (اذا التفت التفت جمیعاً) [3] متفق علیہ (البخاری فی کتاب المناقب در باب صفۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم فی کتاب الفضائل) [4] اس روایت کو امام بخاری نے سورۃ الفتح کی تفسیر میں اور مسلم، ترمذی اور نسائی نے "باب احیاء اللیل" میں نقل کیا ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی ایک آیت میں پوری رات گذار دی"[1] حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رات کو نماز کے لئے کھڑے ہوئے اور ایک آیت میں صبح کر دی" وہ آیت یہ تھی:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ	اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے
وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ	وہ تیرے بندے ہیں اور اگر معاف
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (المائدہ-۱۱۸)[2]	فرما دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ یہ بھی روایت فرماتی ہیں کہ "آپؐ جب روزے رکھتے تو اس کی کثرت دیکھ کر ہم لوگ کہتے کہ اب شاید آپؐ ہمیشہ روزہ ہی سے رہیں گے، جب روزہ سے نہ ہوتے تو ہم سوچتے کہ شاید اب آپؐ روزہ نہ رکھیں گے"[3]

حضرت انسؓ راوی ہیں "اگر کوئی آپؐ کو قیامِ لیل میں مشغول دیکھنا چاہتا تو دیکھ سکتا تھا، اور اسی طرح نیند کی حالت میں دیکھنا چاہتا تو بھی دیکھ سکتا تھا"[4]

عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ "میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے دیکھا کہ آپؐ نماز میں مصروف ہیں اور گریہ کی وجہ سے آپؐ کے سینۂ مبارک سے ایسی آواز نکل رہی ہے، جیسے دیگچی اُبل رہی ہو"[5]

آپؐ کو نماز کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ ہوتی تھی، اور معلوم ہوتا تھا کہ نماز کے بعد بھی آپؐ نماز کے مشتاق اور منتظر ہیں، آپؐ ارشاد فرماتے تھے "جعل قرۃ عینی

---

[1] ترمذی [2] نسائی نے اس کو "باب ترديد الآية" میں اور ابن ماجہ نے "باب ماجاء فی القراۃ بالليل" میں درج کیا ہے [3] یہ سب نفلی روزوں کے متعلق ہے [4] صحیح بخاری باب (قیام النبی صلے اللہ علیہ وسلم ونومہ۔ کتاب التہجد) [5] شمائل ترمذی۔

فی الصلاۃ۔" (میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔[۱])

صحابہ کرامؓ کا بیان ہے کہ "جب کوئی پریشانی کی بات درپیش ہوتی تو آپؐ بے ساختہ نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے۔[۲]"

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ "جب کبھی رات کو تیز ہوائیں چلتیں تو آپؐ مسجد میں پناہ لیتے یہاں تک کہ ہوا تھم جاتی، اگر فلک میں کوئی تغیر مثلاً سورج گرہن یا چاند گرہن رونما ہوتا تو آپؐ نماز کی طرف رجوع فرماتے اور اس سے پناہ حاصل کرتے یہاں تک کہ گرہن ختم ہو جاتا اور مطلع صاف ہو جاتا[۳]" آپؐ نماز کے ہر وقت مشتاق رہتے، اور اس کے بغیر آپ کو اطمینان و سکون حاصل نہ ہوتا، اور جب تک نماز پڑھ نہ لیتے آپؐ کی بے کلی اور بے چینی برقرار رہتی، کبھی آپ اپنے مؤذّن بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرماتے "بلالؓ نماز کا اہتمام کرو، اور ہمارے سکون کا سامان کرو[۴]۔"

آپؐ کی نگاہ میں متاعِ دنیا کی حیثیت اور اس سے آپؐ کی بے رغبتی

جہاں تک درہم و دینار اور دنیا کے مال و متاع کا تعلق ہے، الفاظ کا بڑے سے بڑا ذخیرہ اور اعلیٰ درجہ کی قادر الکلامی بھی آپؐ کی نگاہ میں اس کی صحیح حیثیت کو پوری طرح بیان نہیں کر سکتی، اس لئے کہ آپؐ کے ایمانی اور ربانی مدرسہ کے بوریہ نشین، اور عرب و عجم میں ان کے شاگردوں کے شاگرد اور خوشہ چیں بھی درہم و دینار کو خزف ریزوں اور ٹھیکروں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے، اور ان کی زاہدانہ زندگی

۱ے نسائی (کتاب عشرۃ النساء۔ باب حب النساء) ۲ے ابوداؤد ۳ے طبرانی
۴ے ابوداؤد (کتاب الادب باب۔ فی صلاۃ العتمۃ)

متاع دنیا کی بے وقعتی دوسروں پر اپنا مال خرچ کرنے کا شوق اور ان کو اپنے اوپر ترجیح دینے کا ذوق، قدر کفاف پر قناعت، اور شان بے نیازی و استغناء کے جو واقعات تاریخی طور پر ثابت ہیں، ان سے عقل انسانی حیران ہو جاتی ہے[1]، جب آپؐ کے غلاموں کے غلاموں کا یہ حال ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود دولت صلے اللہ علیہ وسلم جو ان سب کے امام و رہنما اور ہر خیر و صلاح اور فضیلت و تقویٰ میں ان کے مُربّی اور مُعلّم تھے، ان کا حال اس معاملے میں کیا ہوگا؟

اس لئے اس سلسلے میں ہم صرف اُن چند روایات کا ذکر کرتے ہیں جو صحابۂ کرام کی زبان سے ہم تک پہونچی ہیں، اس لئے کہ واقعات سے بڑھ کر کوئی چیز مؤثر نہیں، اور ان سے زیادہ صحیح اور بلیغ ترجمانی کسی عبارت آرائی سے نہیں ہو سکتی۔

آپ کا ماثور و مشہور قول جس پر آپ حرف بحرف عامل تھے، اور جو آپؐ کی پوری زندگی کا مرکزی نقطہ اور محور کہا جا سکتا ہے، یہ ہے:۔

اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ۔	اے اللہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

آپؐ فرمایا کرتے تھے:۔

مالی وللدنیا وما انا والدنیا الا کراکب استظل تحت شجرۃ ثم راح وترکھا۔[2]	مجھے دنیا سے کیا سروکار، میرا دنیا سے واسطہ اتنا ہی ہے جیسے کوئی مسافر راہ میں تھوڑی دیر کے لئے

---

[1] اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لئے عبد اللہ بن المبارک کی "کتاب الزہد" ابن الجوزی کی "صفۃ الصفوۃ" اور ابی نعیم کی "حلیۃ الاولیاء" کا مطالعہ مفید ہوگا [2] مسند ابی داؤد الطیالسی۔

کسی درخت کے سایہ میں دم لے لے

پھر اپنی راہ لے اور اس کو چھوڑ کر

چلدے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو ایک مرتبہ چٹائی پر اس حالت میں لیٹے ہوئے دیکھا کہ آپ کے پہلو میں اس کے نشانات پڑ گئے تھے، یہ منظر دیکھ کر ان کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، آپ نے دریافت فرمایا "کیا بات ہے؟" انھوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! آپ اللہ کی مخلوق میں سب سے برگزیدہ ہیں، اور عیش کسریٰ اور قیصر کر رہے ہیں! یہ سن کر آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا، اور آپ نے فرمایا "ابن الخطاب! کیا تمھیں کچھ شک ہے" پھر آپ نے ارشاد فرمایا "یہ وہ لوگ ہیں جن کو دنیا کی زندگی کے سارے مزے یہیں دیدیئے گئے ہیں"[1]

آپ وہ طرز معیشت یا وہ معیار زندگی نہ صرف اپنے لئے ناپسند فرماتے تھے بلکہ اپنے اہلِ بیت کے لئے بھی اس کے روادار نہ تھے، چنانچہ آپ کی دعا تھی "اللھم اجعل رزق آل محمد قوتا" (اے اللہ آل محمد کا رزق بقدر ضرورت ہو[2]) حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ راوی ہیں "قسم اس کی جس کے قبضے میں ابوہریرہ کی جان ہے، اللہ کے نبی اور ان کے اہل بیت کبھی متواتر تین[3] دن گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کر نہ کھا سکے، یہاں تک کہ اس دنیا سے پردہ فرمالیا"[4]

اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں "ہم اہلِ بیت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک چاند گزر کر دوسرا چاند نظر آجاتا اور ہمارے گھر میں چولہا نہ جلتا،

---

[1] حدیث کا پورا متن صحیحین میں ملاحظہ فرمائیں [2] متفق علیہ صحیح بخاری (کتاب الرقاق) صحیح مسلم (کتاب الزہد) [3] بخاری و احمد بروایت احمد، صحیح مسلم، کتاب الزہد۔

صرف کھجور اور پانی پر ہماری گذر بسر ہوتی تھی۔[1]

آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی، اور آپؐ کے پاس اتنا نہ تھا کہ آپؐ اس کو چھڑا سکتے، یہاں تک کہ اسی حال میں آپ کی وفات ہوگئی۔[2]

آپؐ نے حجۃ الوداع اس حال میں کیا کہ حدِ نگاہ تک مسلمان نظر آرہے تھے، پورا جزیرۃ العرب آپؐ کی زیرِ نگیں تھا، اور کیفیت یہ تھی کہ آپؐ ایک نہایت خستہ حال کجاوہ پر تھے، آپ پر صرف ایک چادر پڑی ہوئی تھی جس کی مالیت چار درہم سے زیادہ نہ تھی، اس وقت آپؐ نے فرمایا "اے اللہ اس کو ایسا حج بنا جس میں کوئی ریا اور شہرت طلبی نہ ہو۔"[3]

حضرت ابوذرؓ سے آپؐ نے ایک موقع پر فرمایا "مجھے یہ گوارا نہیں کہ میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور تین دن گذر جائیں اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی رہے سوائے اس کے کہ کسی دینی کام کے لئے میں اس میں سے کچھ بچا رکھوں، ورنہ اللہ کے بندوں میں میں اس کو اِس طرح اور اِس طرح دائیں بائیں اور پیچھے لٹا دوں۔"[4]

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کا سوال کیا گیا ہو اور آپؐ نے اس کے جواب میں نہیں کہا ہو۔[5] ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فیاضی اور داد و دہش میں تیز ہوا سے زیادہ تیز رفتار تھے۔[6]

---

[1] متفق علیہ [2] ترمذی [3] شمائل ترمذی بروایت انسؓ [4] متفق علیہ، یہ الفاظ بخاری کے ہیں "کتاب الرقاق باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما أحب أن لی أحدا ذهبًا" [5] بخاری کتاب الادب (باب حسن الخلق) [6] حدیث کا پورا سیاق صحیحین میں ملاحظہ کریں۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ "ایک شخص نے آپؐ سے کچھ سوال کیا تو آپؐ نے اس کو بکریوں، بھیڑوں کا پورا گلہ عطا فرمایا جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا، وہ یہ سب بکریاں لے کر اپنی قوم میں واپس آگیا اور کہنے لگا لوگو! اسلام لے آؤ! محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اس طرح دے دلا رہے ہیں کہ جیسے ان کو فقر و فاقہ کا ڈر ہی نہ ہو" ایک مرتبہ آپؐ کی خدمت میں نوے ہزار درہم پیش کیے گئے، یہ رقم ایک چٹائی پر ڈالدی گئی اور آپؐ نے کھڑے ہو کر اس کو تقسیم کرنا شروع کیا، اور کسی سائل کو بھی آپؐ نے واپس نہ فرمایا، یہاں تک کہ سارا ڈھیر ختم ہو گیا۔"

خلق خدا کے ساتھ

لیکن اس ذوقِ عبادت، دنیا اور سامان دنیا سے بے تعلقی، کمالِ زہد اللہ تعالے کی طرف رجوعِ کامل اور اس کے حضور آہ و زاری اور دعا و مناجات سے آپؐ کی خندہ جبینی حُسنِ اخلاق شفقت و ملاطفت دلداری و دلنوازی اور ہر شخص کو اس کا جائز حق دینے اور اس کے مرتبہ و حیثیت کے مطابق سلوک کرنے میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ ان کو اس طرح جمع کرنا کسی دوسرے شخص کے لئے ناممکن ہے آپؐ فرماتے تھے :۔

لو تعلمون ما أعلم لضحکتم قلیلا و لبکیتم کثیرا۔[1]	جو میں جانتا ہوں وہ اگر تم جان لیتے تو بہت کم ہنستے اور بہت زیادہ روتے۔

آپؐ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ فراخ دل، نرم طبیعت اور خاندانی لحاظ سے

---

[1] صحیحین۔

سب سے زیادہ محترم تھے، اپنے اصحاب کرامؓ سے الگ تھلگ نہ رہتے تھے، بلکہ ان سے پورا میل جول رکھتے تھے، ان سے باتیں کرتے، ان کے بچوں کے ساتھ خوش طبعی وخوش مذاقی کے ساتھ پیش آتے، ان بچوں کو اپنی گود میں بٹھاتے، غلام اور آزاد، باندی مسکین، اور فقیر سب کی دعوت قبول فرماتے، بیماروں کی عیادت فرماتے، خواہ وہ شہر کے آخری سرے پر ہوں، عذر خواہ کا عذر قبول فرماتے، آپؐ کو کبھی صحابۂ کرام کی مجلس میں پیر پھیلائے ہوئے نہیں دیکھا گیا تاکہ اس کی وجہ سے کسی کو تنگی و دشواری نہ ہو۔[1]

عبداللہ بن الحارثؓ روایت کرتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خندہ رُو اور متبسم کسی کو نہیں دیکھا"[2] جابر بن سمرۃؓ راوی ہیں کہ "مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں سو بار سے زیادہ بیٹھنے کا اتفاق ہوا میں نے دیکھا کہ آپؐ کے اصحاب کرامؓ ایک دوسرے سے اشعار سن رہے ہیں، اور سنا رہے ہیں، اور جاہلیت کی بعض باتوں اور واقعات کا تذکرہ بھی کر رہے ہیں، اور آپ ساکت ہیں، یا کبھی کوئی ہنسی کی بات ہوتی تو ان کے ساتھ آپؐ بھی تبسم فرماتے ہیں"۔

شرید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے اُمیّہ بن الصّلت کے اشعار سننے کی فرمائش کی، چنانچہ میں نے آپؐ کو اس کے اشعار سنائے"۔[3]

آپؐ نہایت درجہ نرم دل، محبت کرنے والے اور لطف وعنایت کے پیکر تھے، انسانی جذبات اور لطیف احساسات آپؐ کی سیرت میں بہترین اور حسین ترین شکل میں جلوہ گر تھے، انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرماتے، میرے دونوں بیٹوں (حسن

---

[1] روایت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (روایت ابو نُعیم: الحلیۃ) [2] شمائل ترمذی ص۳ [3] الادب المفرد للبخاری ص۱۲۷

وحسین رضی اللہ عنہما) کو بلاؤ وہ دوڑے ہوئے آتے تو آپ ان دونوں سے منہ ملاتے اور ان کو اپنے سینہ سے لگا لیتے[۱]" آپ نے ایک مرتبہ اپنے نواسہ حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو بلایا وہ دوڑتے ہوئے آئے، اور آپ کی گود میں گر پڑے، پھر آپ کی ریش مبارک میں اپنی انگلیاں ڈالنے لگے، اس کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا دہن مبارک کھولدیا، اور وہ اپنا منہ آپ کے دہن مبارک میں ڈالنے لگے"[۲]

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ" زید بن حارثہؓ (جو آپ کے غلام تھے) مدینہ آئے تو اس وقت آپ گھر پر تشریف فرما تھے، وہ گھر پر آئے اور دروازہ پر دستک دی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے، آپ اس وقت پورے کپڑوں میں ملبوس نہ تھے، چادر جسم مبارک سے گری جا رہی تھی، ان کو دیکھ کر آپ نے معانقہ فرمایا اور بوسہ لیا"[۳]

اسامہ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں کہ" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی نے آپ کو یہ پیغام کہلوایا کہ میرے بچہ کا دمِ واپسیں ہے آپ اس وقت یہاں تشریف لے آئیں، آپ نے ان کو سلام کہلوایا اور فرمایا کہ اللہ ہی کے لئے ہے، جو اس نے لیا، اور اسی کے لئے ہے، جو اس نے عطا کیا، ہر چیز اس کے یہاں نامزد اور مقرر ہے، پس چاہیئے کہ صبر سے کام لیں، اور اجر و ثواب کی نیت اور امید رکھیں، انھوں نے آپ کو قسم دلائی کہ آپ ضرور تشریف لائیں، آپ کھڑے ہوئے اور ہم سب آپ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے، جب آپ وہاں بیٹھے تو بچہ گود میں آپ کے پاس لایا گیا،

---

[۱] بروایت ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب الحسنؓ والحسینؓ [۲] الادب المفرد للبخاری ص ۱۷۳ [۳] ترمذی۔

آپؐ نے اس کو اپنے آغوش مبارک میں لے لیا، اس وقت اس کی سانس اکھڑ چکی تھی یہ منظر دیکھ کر آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، سعدؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہ رحم ہے، جو اللہ تعالےٰ اپنے بندوں میں سے جس کے دل میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے، اور بے شک اللہ تعالےٰ اپنے رحم دل بندوں ہی پر رحم فرماتا ہے[۱]۔

جب بدر کے قیدیوں کے ساتھ حضرت عباسؓ کی مشکیں کسی گئیں، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی کراہ سنی تو آپؐ کو نیند نہیں آئی جب انصار کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے ان کی مشکیں کھول دیں، انصار کی یہ رحم دلی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکی کہ حضرت عباسؓ اور دیگر قیدیوں میں فرق رکھا جائے، انصار نے یہ دیکھ کر کہ حضرت عباسؓ کی مشکیں کھولنے سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے تھے، یہ خواہش کی کہ ان کا فدیہ بھی چھوڑ دیا جائے، ان کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور زیادہ خوش ہوں لیکن آپؐ نے اس بات کو قبول نہ فرمایا[۲]۔

ایک اعرابی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "کیا آپؐ لوگ اپنے بچوں کو پیار کرتے ہیں، ہم تو ان کو پیار نہیں کرتے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالےٰ نے تمھارے دل سے رحم نکال لیا ہو تو میں تمھارے لئے کیا کر سکتا ہوں[۳]۔"

آپؐ بچوں پر بہت شفیق تھے، اور ان سے بہت نرمی اور محبت کا معاملہ فرماتے تھے، حضرت انسؓ راوی ہیں کہ "آپؐ کا گزر کچھ بچوں پر ہوا، جو کھیل رہے تھے، آپؐ نے ان کو سلام کیا[۴]۔"

---

[۱] صحیح بخاری کتاب المرضیٰ باب عیادۃ الصبیان نیز کتاب الجنائز باب قول النبی صلے اللہ علیہ وسلم "یعذب المیت ببکاء أھلہ"۔ [۲] فتح الباری ج ۸ ص ۳۲۲ (مصری ایڈیشن) [۳] بروایت عائشہؓ صحیح بخاری (کتاب الادب باب رحمۃ الولد) [۴] صحیح بخاری (کتاب الاستیذان)

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم میں گھلے ملے رہتے تھے، میرے ایک چھوٹے بھائی سے آپؐ فرماتے ابو عمیر، نغیر[1] کیا ہوا؟"[2]

مسلمانوں پر آپؐ بے حد شفیق اور مہربان تھے اور ان کے احوال کی بہت رعایت فرماتے تھے، انسانی طبائع میں اکتاہٹ اور وقتی طور پر پست ہمتی یا تعطل پیدا ہوتا رہتا ہے اس کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ علیہ وسلم ہم کو جو وعظ و نصیحت فرماتے تھے، وہ وقفوں کے ساتھ ہوتی تھی اس خیال سے کہ کہیں ہمارے اندر اکتاہٹ نہ پیدا ہونے لگے، نماز سے اس قدر تعلق اور شیفتگی کے باوجود آپؐ اگر کسی بچہ کا رونا سن لیتے تو نماز مختصر فرما دیتے آپؐ نے خود یہ ارشاد فرمایا کہ میں نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ طویل نماز پڑھوں کہ کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اس خیال سے نماز مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں کو دشواری اور تکلیف نہ ہو"[3]

عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ "ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! خدا کی قسم میں (اپنے محلہ کی) صبح کی نماز میں محض اس لئے نہیں پہونچتا کہ فلاں صاحب بہت طویل نماز پڑھاتے ہیں، اس کے بعد جو وعظ آپؐ نے فرمایا اس سے زیادہ غصہ کی حالت میں میں نے کسی اور وعظ میں آپؐ کو نہیں دیکھا، آپؐ نے فرمایا "تم میں وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو متنفر کرتے ہیں، تم میں سے جو نماز پڑھائے اس کو چاہیے کہ مختصر پڑھے، اس لئے کہ نمازیوں میں کمزور بھی ہوتے ہیں، بوڑھے اور ضرورت والے بھی۔"[4]

---

[1] چھوٹی چڑیا جس سے بچے اکثر کھیلتے ہیں۔ [2] الادب المفرد ص۲ [3] صحیح بخاری کتاب الصلاۃ (باب من اخف الصلاۃ) [4] صحیح بخاری کتاب الصلاۃ (باب تخفیف الامام القراءۃ)

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی آسکتا ہے کہ انجشہ جو عورتوں کے قافلہ کے حدی خواں تھے، بہت خوش آواز شخص تھے، ان کی خوش آوازی کی وجہ سے اونٹ بہت تیز رفتاری کے ساتھ بڑھنے لگتے تھے، عورتوں کو اس سے زحمت ہوتی تھی، یہ دیکھ کر آپؐ نے انجشہ سے فرمایا "انجشہ، ذرا آہستہ! اس تیز رفتاری سے آبگینوں (کمزور و نازک ہستیوں) کو تکلیف نہ پہونچ جائے"[۱]

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے سینے کو کینہ سے اور کسی کا برا چاہنے سے ہر طرح پاک کر دیا تھا، آپؐ فرماتے تھے کہ "تم میں سے کوئی شخص مجھ سے کسی دوسرے کی شکایت نہ کرے اس لئے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے سامنے اس حالت میں آؤں کہ میرا دل بالکل صاف ہو"[۲]

آپؐ مسلمانوں کے حق میں شفیق باپ کی طرح تھے، اور سارے مسلمان آپؐ کے سامنے اس طرح تھے جیسے وہ سب آپؐ کے اہل و عیال میں شامل ہوں، اور ان سب کی ذمہ داری آپؐ پر ہو، آپؐ کو ان پر اس درجہ شفقت اور ان سے اس درجہ تعلق تھا، جیسے ماں کو اپنے گود کے بچے سے ہوتی ہے، مسلمانوں کے پاس مال و دولت اور ان کے رزق میں جو فراخی اللہ تعالیٰ نے فرمائی تھی، اس سے تو آپؐ کو کوئی سروکار نہ تھا، لیکن ان کے قرضوں اور ان کو زیر بار کرنے والی چیزوں کو ہلکا کرنا، آپؐ نے اپنے ذمہ لے لیا تھا، آپؐ فرماتے تھے "جس نے ترکہ میں مال چھوڑا وہ اس کے وارثوں کا ہے، کچھ قرضہ وغیرہ باقی ہے تو وہ ہمارے ذمہ"[۳] ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "کوئی مومن ایسا نہیں جس کا مجھ سے زیادہ دنیا و آخرت میں کوئی ولی ہو، اگر چاہو تو یہ آیت پڑھو:۔

---

[۱] الادب المفرد ص۱۸۵ نیز صحیح بخاری و صحیح مسلم [۲] کتاب الشفاء ص۵۵ بروایت ابو داؤد
[۳] صحیح بخاری کتاب الاستقراض، باب (الصلاۃ علی من ترک دینا)

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ (الاحزاب۔۶) نبی مسلمانوں کے لئے ان کی جانوں سے زیادہ دوست اور شفیق ہیں۔

اس لئے جس مسلمان کا انتقال ہو اور وہ کچھ مال چھوڑے تو وہ اس کے عصبہ، قریبی رشتہ داروں کا حق ہے، وہ جو بھی ہوں، اگر اس کے ذمہ کچھ قرض اور زمین جائیداد رہ جائے تو میرے پاس آئے، اس کا والی اور ذمہ دار میں ہوں[1]۔"

اعتدالِ فطرت اور سلامتِ ذوق

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور اعلیٰ درجہ کی طبعی و خلقی موزونیت سے نوازا تھا، وہ آنے والی صدیوں، اور موجودہ و آئندہ نسلوں کے لئے معراجِ کمال ہے، اور اس کو ہم اعتدالِ فطرت، سلامتِ ذوق، لطافتِ شعور، توازن و جامعیت اور افراط و تفریط سے پرہیز سے تعبیر کرسکتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب دو کاموں میں کسی ایک کو ترجیح دینی ہوتی تو ہمیشہ اس کو اختیار فرماتے جو زیادہ سہل ہوتا بشرطیکہ اس میں گناہ کا شائبہ نہ ہو، اگر اس میں گناہ ہوتا تو آپؐ اس سے سب سے زیادہ دور ہوتے[2]۔"

آپؐ تکلفات، ضرورت سے زیادہ زہد و تقشّف اور نفس کے جائز حقوق سے رُوگردانی سے بہت دور تھے، حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "دین آسان ہے، اور جو بھی دین سے زور آزمائی کرے گا، دین اس پر غالب آئے گا، اس لئے میانہ روی اور اعتدال کے ساتھ چلو، قریب کے پہلوؤں کی رعایت کرو، اور انبساط رکھو

---

[1] ایضاً [2] صحیح مسلم (باب مباعدتہ صلے اللہ علیہ وسلم للآثام)

اور صبح و شام اور کسی قدر تاریکی شب کی عبادت سے تقویت حاصل کرو"۔[1]

آپؐ نے یہ بھی فرمایا "ٹھیرو، اتنا ہی کرو جتنا کرنے کی تمہارے اندر طاقت ہو، اس لئے کہ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ تو نہیں تھکے گا تم ہی تھک جاؤ گے" ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو کون سا دین سب سے زیادہ محبوب ہے آپؐ نے فرمایا "الحنیفیۃ السمحۃ" (سہولت و خلوص والا دین ابراہیمؑ)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مبالغہ و سختی سے کام لینے والے اور بال کی کھال نکالنے والے ہلاک ہو گئے"۔[2]

آپؐ نے اپنے بعض صحابیوں کو جب کسی جگہ تعلیم اور وعظ و نصیحت کے لئے بھیجا تو ان سے فرمایا کہ "آسانی پیدا کرنا تنگی نہ کرنا، بشارت دینا اور متنفر نہ کرنا" عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ راوی ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اپنی نعمت کا نشان اپنے بندہ پر دیکھے"۔[3]

اپنے گھر میں اہل و عیال کے ساتھ

آپؐ اپنے گھر میں عام انسانوں کی طرح رہتے تھے، اور جیسا کہ خود حضرت عائشہؓ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب "الدین یسر" [2] الادب المفرد ص۱۸۱ (طبع المطبعۃ السلفیہ)

[2] صحیح مسلم، یعنی دین کے معاملات میں ایچ پیچ کرنے والے اور اس میں تشدد اور مبالغہ کرنے والے۔

[3] ترمذی نے یہ حدیث ابواب الآداب میں بیان کی ہے، باب (ان اللہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ) یعنی اللہ نے اس کو جن نعمتوں سے نوازا ہے اس کی زندگی سے اس کا اظہار ہو، آسودہ حال آدمی خستہ حال آدمی کی طرح رہے تو گویا وہ خدا کے احسان کی ناشکری کرتا ہے اور اپنے فقر کا بلا ضرورت اعلان کرتا ہے۔

نے بیان فرمایا ہے "آپؐ اپنے کپڑوں کو بھی صاف فرماتے تھے، بکری کا دودھ بھی خود دوہ لیتے تھے، اور اپنا کام خود انجام دیتے تھے" آگے بیان فرماتی ہیں کہ "اپنے کپڑوں میں پیوند لگا لیتے تھے، جوتا گانٹھ لیتے تھے، اور اس طرح کے اور کام کرتے تھے" حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ آپؐ اپنے گھر میں کس طرح رہتے تھے، انھوں نے جواب دیا کہ "آپؐ گھر کے کام کاج میں رہتے تھے، جب نماز کا وقت آتا تو نماز کے لئے باہر چلے جاتے۔"[1]

ایک روایت میں ہے کہ "آپؐ اپنی جوتی ٹانک لیتے تھے، کپڑا اسی لیتے تھے، جیسا تم میں سے کوئی اپنے گھر میں کرتا ہے۔"[2]

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ "آپؐ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ نرم اور سب سے زیادہ کریم تھے، اور ہنستے مسکراتے رہتے تھے۔"[3]

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں "میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے اہل و عیال پر شفیق و رحیم ہو۔"[4] حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم میں سب سے زیادہ بہتر وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے لئے سب سے بہتر ہو اور میں اپنے اہل و عیال کے معاملے میں تم سب سے زیادہ بہتر ہوں۔"[5]

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی کھانے میں کبھی عیب نہیں نکالا، اگر خواہش ہوئی تو تناول فرمایا، ناپسند ہوا تو چھوڑ دیا۔"[6]

۱؎ صحیح بخاری کتاب الصلاۃ، باب (من کان فی حاجۃ أہلہ) نیز بروایت احمد و عبدالرزاق۔

۲؎ مصنف عبدالرزاق حدیث نمبر ۲۰۴۹۲ ج ۱۱ ص ۲۶۶ ۳؎ ابن عساکر ۴؎ مسند احمد بروایت انسؓ و صحیح مسلم

۵؎ ابن ماجہ (باب حسن معاشرۃ النساء) ۶؎ متفق علیہ صحیح بخاری کتاب الاطعمۃ (باب ما عاب النبی صلے اللہ علیہ وسلم طعاماً) نیز صحیح مسلم

خطرات اور آزمائشوں میں سب سے آگے اور انعام و اکرام میں سب سے پیچھے

اپنے اہلِ بیتؓ اہل و عیال اور قرابتداروں کے ساتھ آپ کا مستقل معاملہ اور اُصول یہ تھا کہ جو آپؐ سے جس قدر قریب ہوتا، آپ خطرات اور آزمائشوں میں اس کو اسی قدر آگے رکھتے، اور انعام و اکرام اور مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت اسی قدر پیچھے رکھتے، جب عُتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عُتبہ نے (جو عرب کے نامی گرامی بہادروں اور جنگ آزماؤں میں تھے) بدر میں قریش کو للکارا اور مبارزطلبی کی تو آپؐ نے حمزہ، علیؓ اور عُبیدہ کو آواز دی اور ان کے مقابلہ پر بھیجا حالانکہ آپؐ مکہ کے ان شہسواروں کی حیثیت و اہمیت سے خوب واقف تھے، مہاجرین میں متعدد ایسے بہادر اور جری شہسوار موجود تھے، جو ان سے دو دو ہاتھ کر سکتے تھے، بنی ہاشم کے یہ تینوں افراد وہ تھے، جو خون اور رشتہ میں آپؐ سے سب سے قریب تھے، اور آپؐ کو سب سے زیادہ عزیز و محبوب بھی تھے، لیکن آپؐ نے ان کو اس خطرہ سے بچانے کے لئے دوسرے حضرات کو خطرہ میں نہیں ڈالا، اور انھیں کو مقابلہ کے لئے بھیجا، اللہ تعالیٰ کا کرنا کہ اس نے ان کو اپنے دشمنوں پر غالب فرما دیا، اور فتح عطا فرمائی حضرت حمزہؓ و حضرت علی رضی اللہ عنہما مظفر و منصور اور صحیح سالم واپس آئے، عُبَیدہ رضی اللہ عنہ کو زخمی حالت میں لایا گیا۔

آپؐ نے جب سود کو حرام اور جاہلیت کے خون کو کالعدم قرار دیا تو اس کی ابتدا اپنے عمِ محترم عباسؓ بن عبد المطلب اور اپنے بھتیجے (ربیعہ بن الحارثؓ بن عبد المطلب کے فرزند) سے فرمائی، حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:۔

زمانۂ جاہلیت کا سود آج سے ختم اور کالعدم ہے، اور پہلا سود جو میں ختم کرتا ہوں وہ ہمارے ہاں کا عباس بن عبد المطلب کا سود ہے، زمانۂ جاہلیت کا خون بھی کالعدم ہے اور وہ ہمارے ہی یہاں کا ربیعہ بن الحارث کے فرزند کا خون ہے"![1]

راحت و آرام اور انعام و اکرام کے موقع پر آپؐ عام سلاطین و حکمرانوں یا سیاسی رہنماؤں کی روش اور عادت کے خلاف ان حضرات کو ہمیشہ پیچھے رکھتے تھے، اور ان پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ فاطمہؓ کو چکی پیسنے میں مشقت ہوتی تھی، اسی زمانہ میں ان کو یہ خبر ملی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ باندیاں آئی ہیں، وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس کی خواستگار ہوئیں کہ ان کو بھی ان میں سے خدمت و مدد کے لئے کوئی باندی عطا ہو جائے، لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس وقت دولت خانہ پر تشریف نہیں رکھتے تھے، انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس بات کا ذکر کیا، حضرت عائشہؓ نے آپؐ سے اس کا تذکرہ کیا، چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے اس وقت ہم سونے کے لئے لیٹ چکے تھے، آپؐ کو دیکھ کر ہم کھڑے ہونے لگے، آپؐ نے فرمایا رکے رہو، یہاں تک کہ آپؐ کے قدم مبارک کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینہ میں محسوس کی، آپؐ نے ارشاد فرمایا، کیا میں تم کو اس سے بہتر بات نہ بتاؤں جس کا تم نے سوال کیا تھا، جب تم سونے کے لئے لیٹو تو ۳۴ بار اللہ اکبر کہو، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۳ بار سبحان اللہ کہو، یہ تمہارے لئے اس سے بہتر ہے جس کا سوال تم دونوں نے مجھ سے کیا تھا![2]

---

[1] صحیح مسلم کتاب الحج باب حجۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم، داؤد بروایت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ اس بچہ کا نام بعض روایات میں ایاس آیا ہے۔ [2] صحیح بخاری کتاب الجہاد، باب الدلیل ان الخمس لنوائب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔

ایک دوسری روایت میں اسی واقعہ کے ساتھ یہ بھی آتا ہے کہ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ "خدا کی قسم اس حالت میں کہ اہلِ صُفّہ کے پیٹ بھوک سے پیٹھ سے لگ گئے ہیں، میں تمھیں کچھ نہیں دے سکتا، میرے پاس ان پر خرچ کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے ان کو فروخت کرکے میں ان کی آمدنی ان پر خرچ کروں گا۔"[۱]

لطافتِ شعور اور جذبات کی بلندی و پاکیزگی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں نبوت اور دعوتِ حق کے کارِ عظیم انسانیت کے درد و سوز اور اُن مسلسل فکروں اور گرانباریوں کے ساتھ جن کا تحمّل پہاڑوں کے لئے بھی آسان نہ تھا، لطیف انسانی احساسات اور پاکیزہ و بلند جذبات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ ریز تھے، اس غیر معمولی قوتِ ارادی، غیر متزلزل رائے و مسلک کے ساتھ جو انبیاءؑ کا شیوہ اور امتیازی خصوصیت ہوتی ہے، اور جو دعوتِ الی اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے راستے اور اس کے احکام کی تعمیل میں کسی چیز کو کوئی وزن نہیں دیتی اور کسی بات کو خاطر میں نہیں لاتی، آپؐ نے اپنے ان وفادار رفقاء کو اپنی زندگی کے آخری ایام تک فراموش نہیں کیا، جنھوں نے آپؐ کی دعوت پر لبّیک کہا تھا، اور راہِ حق میں اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا، اور اُحد کے معرکہ میں شہادت پاکر حیات جاوید حاصل کی تھی، آپؐ ان کا برابر ذکر فرماتے رہے، ان کے لئے دعائیں کرتے رہے، اور ان کے ہاں تشریف لے جاتے رہے۔

یہ محبت و وفا انسانی جسموں سے تجاوز کرکے ان بے جان پتھروں، پہاڑوں

---

[۱] بروایت احمد (فتح الباری ج ۷ ص ۲۳-۲۴)

اور وادیوں تک میں سرایت کر گئی۔ جہاں عشق و وفا اور قربانی و جاں نثاری کے یہ مناظر چشم فلک نے دیکھے تھے اور جن کو ان کی جائے قیام بننے کا شرف حاصل ہوا تھا، انس بن مالکؓ بیان فرماتے ہیں کہ آپؐ نے اُحد کو دیکھ کر ارشاد فرمایا "هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ"[1] (یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں) ابی حمیدؓ راوی ہیں کہ "ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک سے واپس آئے، جب مدینہ قریب آیا تو آپؐ نے فرمایا "هٰذه طابة، وهذا جبل يحبنا ونحبه" (یہ طابہ (مدینہ طیبہ) ہے، اور یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے، اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں)[2]

عُقبہؓ کا بیان ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک روز اہلِ اُحد کے پاس تشریف لے گئے، اور ان کے لئے دعاء مغفرت کی[3]" جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ "میں نے دیکھا کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے اصحاب احد کا ذکر کیا گیا، تو آپؐ نے فرمایا خدا کی قسم، میری خواہش تھی کہ میں بھی شہداء اُحد کے ساتھ پہاڑ کے دامن میں رہ جاتا، آپؐ نے اپنے چاہنے والے چچا اور رضاعی بھائی کی شہادت کا صدمہ (جنھوں نے آپؐ کی محبت و حمیّت اور اسلام کی نُصرت و حمایت میں جان دی اور ان کی نعش کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو کسی کے ساتھ نہ ہوا تھا) انبیاء اولوالعزم کے صبر کے ساتھ برداشت کیا، لیکن جب آپؐ اُحد سے واپس ہوتے ہوئے مدینہ تشریف لائے، اور بنی عبد الاشہل کے گھر کے سامنے آپؐ گذرے، اور ان کے شہداء پر رونے کی آواز آپؐ کے کانوں میں آئی تو اس واقعہ نے آپؐ کے لطیف انسانی احساسات کو چھیڑ دیا، اور آپؐ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں آپؐ نے فرمایا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی (باب اُحد یحبنا) [2] صحیح بخاری کتاب المغازی واقعۂ تبوک [3] ایضاً

"لکن حمزة لا بواکی له"[1] (لیکن حمزہؓ کے لیے رونے والیاں نہیں ہیں)

تاہم یہ شریفانہ و اعلیٰ انسانی احساسات و جذبات، نبوت اور دعوتِ اسلامی کی عظیم ذمہ داریوں اور حدود الٰہیہ کی رعایت و حفاظت پر کبھی اثر انداز نہیں ہوئے سیرت نگار اور مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ "جب سعد بن معاذ اور اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہما بنی عبد الاشہل کے گھر واپس آئے تو انھوں نے اپنے گھر کی عورتوں کو حکم دیا کہ تیار ہو کر جائیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا ماتم کریں، ان خواتین نے ایسا ہی کیا جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ان کو مسجد نبوی کے دروازے پر روتا ہوا پایا، آپؐ نے فرمایا، اللہ تم پر رحم فرمائے واپس جاؤ، تمھارے یہاں آنے ہی سے غمخواری کا سامان ہو گیا" ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ "آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ سب کیا ہے؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ انصار نے اپنی عورتوں کو کس مقصد سے یہاں بھیجا ہے، آپؐ نے خدا کے حضور مغفرت طلب کی، اچھے الفاظ سے ان کو خطاب کیا، اور فرمایا: میرا مطلب یہ نہیں تھا، میں میّت پر رونا پسند نہیں کرتا، پھر آپؐ نے اس سے منع فرمایا"[2]

اس سے نازک موقع اسد اللہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کے ساتھ پیش آیا، جب مسلمانوں نے مکہ کو فتح کر لیا تو دنیا ان کی نظر میں تاریک ہو گئی اور راستے مسدود نظر آئے، اُن کے لئے قدرتی طور پر مشکلات پیدا ہو گئیں انھوں نے شام و یمن اور بعض دوسرے مقامات پر جانے کا ارادہ کیا، ان سے لوگوں نے کہا بھلے آدمی! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرتے جو آپؐ کے

---

[1] ابن کثیر ج ۳ ص ۹۵ امام احمد نے اس کو ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے ابن کثیر کا قول ہے کہ ہذا علیٰ شرط مسلم
[2] ابن کثیر ج ۳ ص ۹۶

دین میں داخل ہو جائے، ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ مسلمان ہونے کے بعد جب وہ پہلی بار حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کا اسلام قبول فرمایا اور کوئی ایسی بات نہیں فرمائی جس سے ان کے دل میں خوف پیدا ہو، حضرت حمزہؓ کے قتل کا واقعہ آپؐ نے ان سے سنا، جب وہ سب کہہ چکے تو آپؐ کے اندر وہ لطیف انسانی احساس اور کیفیت ضرور پیدا ہوئی لیکن یہ خاص کیفیت اور جذبہ آپؐ کے منصبِ نبوت کے مزاج اور احساسِ ذمہ داری پر غالب نہیں آنے پایا کہ آپؐ ان کے اسلام کو قبول نہ فرماتے یا غصہ میں ان کو قتل کروا دیتے، آپؐ نے اس کے علاوہ کچھ نہ فرمایا "بندۂ خدا میرے سامنے نہ آنا، میں یہ چاہتا ہوں کہ میری نظر تم پر نہ پڑے" وحشی کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں برابر آپؐ کے سامنے آنے سے کترا تا رہا کہ کہیں آپؐ مجھے دیکھ نہ لیں، یہاں تک کہ ان کا وقت موعود آگیا![1]

بخاری میں ہے کہ "آپؐ کی نظر جب مجھ پر پڑی تو آپؐ نے فرمایا کیا تم وحشی ہو؟ میں نے عرض کیا، ہاں! فرمایا، کیا تمہیں نے حمزہ کو شہید کیا تھا؟ میں نے کہا آپ کو جو اطلاع پہونچی ہے، وہ درست ہے آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ میرے سامنے نہ آیا کرو۔"[2]

ان فطری و انسانی احساسات و کیفیات اور اعلیٰ و لطیف جذبات کی جھلک ہمیں وہاں بھی نظر آتی ہے، جب آپؐ ایک مٹی ہوئی پرانی قبر پر تشریف لے گئے،

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۷۲، صحیح بخاری میں یہ واقعہ کتاب المغازی باب قتل حمزہ رضی اللہ عنہ میں بیان کیا گیا ہے۔ [2] صحیح بخاری، باب قتل حمزہؓ۔

اس وقت آپ پر رقت طاری ہوئی اور آپ رو دیئے، پھر آپ نے فرمایا "یہ آمنہ کی قبر ہے" یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کی وفات پر طویل عرصہ گذر چکا تھا۔[1]

کرم گستری اور تحمل و بردباری

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکارمِ اخلاق نوازش و کرم گستری اور تواضع میں ساری انسانیت کے امام و مقتدا و پیشوا تھے، اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔[2] — بے شک آپ بہت عظیم اخلاق کے حامل ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا:۔

أدّبني ربي فأحسن تأديبي۔ — میری تربیت اللہ تعالےٰ نے فرمائی ہے اور بہترین فرمائی ہے۔

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ان اللہ بعثنی لتمام مکارم الأخلاق وکمال محاسن الأفعال۔[3] — اللہ تعالےٰ نے مجھے مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی تکمیل کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ سے آپ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا، انھوں نے کہا:۔

کان خلقہ القرآن۔[4] — آپ اخلاق میں قرآن کا مجسم نمونہ تھے۔

---

[1] بیہقی بروایت سفیان ثوری (دیکھئے ابن کثیر ج ا ص۲۳۶) [2] القلم ۴ [3] شرح السنۃ ومشکاۃ المصابیح ص۵۱۴ [4] صحیح مسلم بروایت عائشہ رضؓ

عفو و درگذر، تحمل و بردباری، کشادہ قلبی اور قوتِ برداشت میں آپؐ کا جو مقام تھا، وہاں تک اہلِ ذہانت کی ذہانت اور شعراء کے خیال و تصوّر کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی، اگر ان واقعات کو اس مخصوص طریقہ سے بیان نہ کیا گیا ہوتا جو شک و شبہ سے بالاتر ہے تو لوگوں کے ذہن آج اس کو قبول نہ کرتے، لیکن یہ روایات اس قدر صحیح اور مسلسل اسناد اور ایک ثقہ و عادل راوی سے دوسرے ثقہ و عادل راوی تک اس انضباط و ارتباط کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، اور ان میں اس درجہ تواتر پایا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ معتبر ترین تاریخی دستاویزات سے کہیں زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔

اس موقع پر ہم اس سلسلہ کے چند واقعات بیان کریں گے:۔

آپؐ کی نوازش و کرم اور بڑے سے بڑے دشمن کے ساتھ دلداری اور احسان کا ایک نمونہ وہ تھا، جب منافقین کے سردار عبداللہ بن اُبیؓ بن سلول کو قبر میں اتارا گیا، آپؐ وہاں تشریف لائے، حکم دیا کہ اس کو قبر سے نکالا جائے، اس کے بعد آپؐ نے اس کو اپنے گھٹنوں پر رکھا اور اپنا لعاب دہن اس پر ڈالا اور اپنی قمیصِ مبارک اس کو پہنائی[۲]۔

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہا تھا، آپؐ اس وقت نجران کی چادر زیبِ تن کئے ہوئے تھے جس کے کنارے موٹے تھے، راستہ میں ایک اعرابی آپؐ کو ملا اور آپؐ کی چادر مبارک پکڑ کر زور سے کھینچی، میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ آپؐ کی گردن پر اس کے کھینچنے کی وجہ سے نشان

۱؎ ۹ھ میں تبوک سے واپسی پر ماہ ذی قعدہ میں اس کی موت واقع ہوئی۔ الزرقانی ج ۳ ص ۱۱۲-۱۱۳ ۲؎ صحیح بخاری کتاب الجنائز تلخیص کے ساتھ۔

پڑ گئے ہیں، پھر اس اعرابی نے کہا، یا محمد! اللہ کا جو مال آپ کے پاس ہے وہ مجھے دینے کا حکم دیجئے، آپ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور ہنسے، پھر ہدایت کی کہ اس کو دیا جائے"۔[۱]

زید بن سعنہ (قبول اسلام سے قبل) آپ کے پاس آیا اور قرض کا مطالبہ کیا جو آپ نے اس سے لیا تھا، پھر اس کے بعد اس نے کپڑا پکڑ کر آپ کے شانہ مبارک سے زور سے کھینچا اور اپنی مٹھی میں کپڑے کو لے لیا اور سخت الفاظ میں بات کی پھر کہا کہ تم عبدالمطلب کی اولاد! بڑے ٹال مٹول کرنے والے ہو، حضرت عمرؓ نے اس کو جھڑکا اور سخت لہجہ میں بات کی لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ کا رویہ مسکراہٹ کا رہا، آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا، عمر! ہم اور یہ شخص تمہاری طرف سے دوسرے رویہ کے مستحق تھے، مجھے تم قرض جلد ادا کرنے کا مشورہ دیتے اور اس کو نرم طریقہ سے تقاضہ کرنے کو کہتے! پھر آپ نے فرمایا کہ اس کی مدت ادائیگی میں ابھی تین دن باقی ہیں، بہرحال آپ نے حضرت عمرؓ کو اس کے قرض کی ادائیگی کا حکم دیا اور بیس صاع اس کو مزید دینے کو فرمایا کہ یہ اس کا معاوضہ ہے جو حضرت عمرؓ نے اس کو خوف زدہ کر دیا تھا، اور یہی بات اس کے اسلام کا باعث بن گئی![۲]

حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں کہ "ایک بار مکہ سے اسی مسلح آدمی "جبل تنعیم" سے اچانک وارد ہوئے، اور دھوکہ میں رکھ کر آپ کو گزند پہونچانا چاہا، آپ نے ان سب کو قیدی بنا لیا، اور ان کو زندہ رہنے دیا"۔[۳]

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب "کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعطی المؤلفۃ قلوبہم" نیز مسند امام احمد ج ۳ ص ۱۵۳ الفاظ کے تھوڑے اختلاف کے ساتھ [۲] بروایت بیہقی (تفصیل کے ساتھ) و روایت احمد ج ۳ ص ۱۵۳ الفاظ کے کسی قدر اختلاف کے ساتھ [۳] صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر باب قول اللہ "وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ"۔

بجابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ "ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نجد کی طرف لشکر کشی کی راستہ میں دوپہر کا وقت ہوا اور آرام کی ضرورت محسوس ہوئی اس علاقہ میں کثرت سے جھاڑیاں تھیں، آپ ببول کے ایک درخت کے سایہ میں استراحت فرمانے لگے اور اپنی تلوار درخت پر لٹکا دی، اور لوگ بھی منتشر ہو کر مختلف درختوں کے نیچے پناہ گیر ہو گئے، یہ کیفیت تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں آواز دی، ہم حاضر خدمت ہوئے تو دیکھا کہ ایک اعرابی آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے آپ نے فرمایا کہ میں سو رہا تھا کہ یہ شخص آیا اور میری تلوار کھینچ لی، میں بیدار ہوا تو یہ تلوار کھینچے ہوئے میرے سر پر کھڑا تھا، اس نے کہا تمھیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ میں نے کہا اللہ! اس نے تلوار نیام میں کرلی[1] اس کے بعد بیٹھ گیا، اور یہ ہے وہ شخص جو تمھارے سامنے بیٹھا ہوا ہے" راوی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو کوئی سزا نہ دی۔[2]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حلم و بردباری کا یہ حال تھا کہ تمام صحابۂ کرام کا حلم بھی مل کر آپ کے برابر نہ تھا، حالانکہ سب صحابۂ کرام حلم و سکینت کے حامل تھے، آپ کی حیثیت ان تمام معاملات میں سب کے لئے ایک شفیق استاد، اور رحم دل و مہربان مصلح و مربّی کی تھی، اس کا ایک نمونہ ہمیں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں نظر آتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ایک اعرابی نے مسجد میں

---

[1] اس موقعہ پر لفظ شامہ آیا ہے جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اس نے تلوار نیام میں کرلی اور اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اس نے تلوار کھینچی اور اس کو دیکھا (ملاحظہ ہو مجمع بحار الانوار)

[2] صحیح بخاری کتاب المغازی باب (غزوۃ بنی المصطلق)

پیشاب کر دیا، لوگ یہ دیکھ کر اس پر دوڑ پڑے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو چھوڑ دو اور جہاں اس نے پیشاب کر دیا ہے، اس پر ایک ڈول پانی یا کچھ پانی کے ڈول بہادو، اور خیال رکھو کہ تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، تنگی و دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں"[1]

معاویہ بن الحکمؓ راوی ہیں کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتا تھا کہ ایک شخص کو چھینک آئی میں نے کہا "یرحمك الله" لوگ یہ سن کر مجھے گھورنے لگے، میں نے کہا تمھاری ماں تم پر روئے آخر کیا ہوا ہے کہ تم لوگ مجھے اس طرح تیز نگاہوں سے گھور رہے ہو، یہ سن کر لوگ اپنی رانوں پر ہاتھ مارنے لگے، جب میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے خاموش کرنا چاہتے ہیں تو میں چپ ہو گیا، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، میں نے نہ آپؐ سے پہلے آپؐ کی طرح کوئی مربّی اور معلّم دیکھا اور نہ آپؐ کے بعد، خدا کی قسم نہ آپؐ نے مجھے ڈانٹا نہ مارا نہ برا بھلا کہا بس یہ فرمایا کہ نماز میں عام انسانی گفتگو مناسب نہیں ہوتی، نماز صرف تسبیح، تکبیر اور تلاوت قرآن کے لئے ہے"[2]

انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بہت رحم دل تھے، آپؐ کے پاس کوئی ضرورت مند آتا تو آپؐ اس سے وعدہ ضرور کرتے اور اگر کچھ ہوتا تو اسی وقت اس کی حاجت پوری فرماتے، ایک بار نماز کھڑی ہو چکی تھی کہ ایک اعرابی آگے بڑھا اور آپ کا کپڑا پکڑ کر کہنے لگا کہ میری ایک معمولی سی ضرورت باقی رہ گئی ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں بھول نہ جاؤں، آپؐ اس کے ساتھ تشریف لے گئے،

---

[1] صحیح بخاری (کتاب الوضو) [2] مسلم باب تحریم الکلام فی الصلاۃ۔

جب اس نے اپنا کام کرلیا تو آپؐ واپس تشریف لائے اور نماز ادا فرمائی"۔

آپ کے تحمّل، قوتِ برداشت، کشادگیِ قلب اور صبر و عزیمت کے واقعات میں آپؐ کے خادم حضرت انسؓ کی وہ شہادت ہے، جو انھوں نے اس سلسلہ میں دی ہے اس وقت وہ بہت کم سن تھے، انھوں نے کہا کہ "میں نے نبیؐ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی دسؔ سال خدمت کی آپؐ نے کبھی ہوں بھی نہیں کہا، اور نہ یہ فرمایا کہ فلاں کام تم نے کیوں کیا اور فلاں کام تم نے کیوں نہ کیا"؟[1]

سُعاد ابن عمر کہتے ہیں کہ "میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور میرے کپڑے پر زعفران سے ملی ہوئی خوشبو کا نشان تھا، آپؐ نے دیکھا تو فرمایا "ورس ورس[2]" پھینکو پھینکو، اور میرے پیٹ پر ایک چھڑی ماری جس سے مجھے تکلیف ہوئی میں نے کہا یا رسول اللہؐ میرا قصاص کا حق ہو گیا ہے تو آنحضرتؐ صلے اللہ علیہ وسلم نے شکم مبارک سے کپڑا ہٹا دیا اور فرمایا قصاص لے لو"[3]۔

آپؐ کی تواضع

تواضع آپؐ کے اندر انتہا درجہ کی تھی، اور آپؐ کسی چیز میں نمایاں اور ممتاز ہونا پسند نہیں فرماتے تھے، اور نہ آپؐ اس کو اچھا سمجھتے تھے کہ لوگ آپؐ کے لئے کھڑے ہوں اور آپؐ کی مدح و توصیف میں مبالغہ سے کام لیں جیسے گذشتہ اُمتوں نے اپنے انبیاءؑ کے ساتھ کیا تھا یا آپؐ کو عبدیت اور رسالت کے درجہ سے بلند کریں حضرت انسؓ

---

[1] مسلم کتاب الفضائل باب حسن خلقہ صلے اللہ علیہ وسلم [2] ایک زرد بوٹی جس سے کپڑا رنگا جاتا ہے [3] کتاب الشفاء، یہ انھوں نے محبت میں کہا تھا قصاص لینے کے لئے نہیں۔

فرماتے ہیں کہ "ہم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہ تھا، لیکن ہم آپؐ کو دیکھتے اور اس خیال سے کھڑے نہیں ہوتے تھے کہ آپؐ اس کو پسند نہیں فرماتے۔"[1]

آپؐ سے عرض کیا گیا کہ "یاخیر البریّة" (اے مخلوق میں سب سے افضل) آپؐ نے فرمایا "ذاك ابراهيم عليه السلام" (یہ ابراہیم علیہ السلام کا مقام ہے)۔[2]

حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میری اس طرح آگے بڑھ کر تعریف و توصیف نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریمؑ کے ساتھ کیا تھا، میں تو صرف ایک بندہ ہوں، تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔"[3]

عبداللہ بن ابی اوفیٰ روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس میں کوئی تکلّف اور عار نہ ہوتا تھا کہ آپؐ کسی غلام یا کسی بیوہ کے ہمراہ چلیں یہاں تک کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔"[4]

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ "مدینہ کی لونڈیوں اور باندیوں میں سے کوئی آپؐ کا ہاتھ پکڑ لیتی اور جو کچھ کہنا ہوتا کہتی اور جتنی دور چاہتی لے جاتی۔"[5]

"عدی بن حاتم الطائی جب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کو اپنے گھر بلایا، باندی نے تکیہ ٹیک لگانے کے لئے پیش کیا، آپؐ نے اس کو اپنے اور عدی کے درمیان رکھدیا اور خود زمین پر بیٹھ گئے، عدی کہتے ہیں کہ اس سے

---

[1] ترمذی (باب ماجاء فی کراهية قيام الرجل للرجل) و بروایت مسند احمد ج ۳ ص ۱۳۲
[2] مسلم کتاب الفضائل باب: من فضل ابراہیم علیہ السلام [3] بخاری کتاب الانبیاء [4] بیہقی (باب تواضع رسول اللہؐ) [5] مسند احمد ج ۳ ص ۱۹۸-۲۱۵ و جمع الفوائد ج ۲ کتاب المناقب باب صفاتہ و اخلاقہ صلے اللہ علیہ وسلم

میں سمجھ گیا کہ آپ بادشاہ نہیں ہیں![1]

حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیمار کی عیادت فرماتے تھے، جنازہ میں شریک ہوتے تھے، گدھے پر بھی سواری فرماتے تھے اور غلام کی دعوت قبول فرماتے تھے!"[2]

جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کمزور کے خیال سے اپنی رفتار سست فرما دیتے تھے، اور اس کے لئے دعا فرماتے تھے!"[3]

انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو کی روٹی اور ایسے سالن پر جس کا مزہ بدل چلا ہو، مدعو ہوتے تو بھی آپؐ قبول فرماتے!"[4]

ان ہی سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں بندہ ہوں، بندہ کی طرح کھاتا ہوں، اور بندہ کی طرح بیٹھتا ہوں!"[5]

عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میرے یہاں تشریف لائے، میں نے چمڑے کا تکیہ جس میں چھال بھری ہوئی تھی آپؐ کو پیش کیا آپؐ زمین پر بیٹھ گئے اور تکیہ کو میرے اور اپنے درمیان رکھ دیا!"[6]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خود گھر کی صفائی فرما لیتے، اونٹ کو باندھ لیتے، اور اپنے جانور کو چارہ بھی دیتے اپنے خدمت گار کے ساتھ کھانا تناول فرماتے اور آٹا گوندھنے میں اس کا ہاتھ بٹاتے، اور بازار سے سودا بھی لے آتے![7]

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۳ [2] شمائل ترمذی (باب تواضع النبی صلے اللہ علیہ وسلم) [3] الترغیب والترہیب للمنذری [4] شمائل ترمذی باب تواضع النبی صلے اللہ علیہ وسلم و مسند احمد ج ۳ ص ۲۱۱-۲۸۹ [5] الشفاء ص ۱۰۱ [6] الادب المفرد ص ۱۷۲ [7] کتاب الشفاء ص ۱۰۱ بروایت بخاری

شجاعت، دلاوری اور شرم وحیا

آپؐ کی سیرت میں شجاعت و دلاوری اور شرم وحیا (جس کو بہت سے لوگ متضاد سمجھتے ہیں) کی یکساں نمود تھی، جہاں تک آپؐ کی حیا کا تعلق ہے، ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "آپؐ پردہ نشین کنواری لڑکی سے زیادہ حیادار تھے، جب آپؐ کو کوئی چیز ناگوار ہوتی تھی تو اس کا اثر آپؐ کے چہرۂ مبارک سے ظاہر ہو جاتا تھا[1]" شرم وحیا کی وجہ سے کسی کے رُوبرُو ایسی بات نہ کہہ سکتے تھے، جو اس کو ناگوار ہو، چنانچہ یہ کام کسی اور کے حوالے فرماتے، حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک شخص تھا، جس کے کپڑوں پر زردی کا اثر غالب تھا، چونکہ آپؐ کسی کے رُوبرُو ایسی بات کہنا پسند نہیں فرماتے تھے، جو اس کو ناگوار ہو اس لئے جب وہ کھڑا ہو گیا تو آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ اچھا تھا اگر تم اس سے یہ کہتے کہ وہ زرد رنگ کا استعمال چھوڑ دے[2]"۔

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ "جب آپؐ کو کسی کے متعلق کسی بُرائی کی اطلاع ملتی تو آپؐ اس کا نام لے کر یہ نہ فرماتے کہ اس نے ایسا کیوں کیا، آپؐ یوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا کہتے ہیں یا ایسا کرتے ہیں، آپؐ اس کی مخالفت تو فرماتے لیکن کام کرنے والے کا نام ظاہر نہ فرماتے[3]"۔

جہاں تک شجاعت و دلاوری کا تعلق ہے تو اس کے لئے شیر خدا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی شہادت کافی ہے، وہ کہتے ہیں کہ "جب زور کا رن پڑتا تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ آنکھیں حلقوں سے باہر آجائیں گی تو اس وقت ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو

---

[1] صحیح بخاری کتاب المناقب باب صفۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم۔ [2] شمائل ترمذی باب خلق النبی صلے اللہ علیہ وسلم [3] سنن ابی داؤد باب حسن العشرۃ۔

آپ کی پناہ لینے کے لئے ڈھونڈتے' اور یہ دیکھتے تھے کہ دشمن سے آپ سے زیادہ کوئی قریب نہیں ہے' غزوۂ بدر میں ہمارا یہی حال تھا ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پناہ لے رہے تھے' اور آپ دشمن سے ہم سب سے زیادہ قریب تھے۔[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ حسین وجمیل' سب سے زیادہ سخی وفیّاض اور سب سے زیادہ شجاع وبہادر تھے' ایک رات اہلِ مدینہ خوف زدہ ہوگئے' اور جدھر سے آواز آئی تھی' اُدھر لوگوں نے رُخ کیا' راستے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لاتے ہوئے ملے' آپ آواز سن کر ان سب سے پہلے وہاں تشریف لے گئے تھے' آپ فرماتے جاتے تھے کہ ڈرو نہیں' ڈرو نہیں آپ اس وقت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے پر سوار تھے جس پر زین بھی نہ تھا' تلوار آپ کے شانے سے لٹک رہی تھی' آپ نے گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے اس کو "سمندر" کی طرح رواں اور تیز رفتار پایا۔[2]

غزوۂ اُحد اور غزوۂ حُنین میں جب بڑے بڑے بہادر اور جگرِدار تتر بتر ہوگئے تھے' اور میدان خالی تھا' اس وقت بھی آپ اپنے خچر پر اسی سکون اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے مقام پر موجود تھے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی' آپ یہ رجز بھی پڑھتے جاتے تھے

انا النبیُّ لا کَذِب ــــــــ انا ابنُ عبد المُطّلِب

میں نبی ہوں یہ کوئی جھوٹ بات نہیں ہے ــــــــ میں عبد المطلب کا فرزند ہوں

شفقت ومحبّت ورحمتِ عامّہ

اس شجاعت وبہادری کے ساتھ آپ بے حد نرم دل تھے' آپ کی آنکھیں بہت جلد نم

---

[1] الشفاء ص ۸۹ [2] الادب المفرد ص ۴۶ بروایت صحیحین۔

اور انکسار ہوجائیں، کمزور لوگوں اور بے زبان جانوروں تک کے ساتھ آپ نرمی کا حکم فرماتے تھے،
شداد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے ہر چیز کے ساتھ
اچھا معاملہ کرنے اور نرم برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے، اس لئے اگر قتل بھی کرو تو اچھی طرح کرو، ذبح کرو تو
اچھی طرح کرو، تم میں سے جو ذبح کرنا چاہے، وہ اپنی چھری پہلے تیز کرے اور اپنے ذبیحہ کو آرام دے"[1]
ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ایک شخص نے ایک بکری زمین میں ذبح کرنے
کے لئے لٹائی، اس کے بعد چھری تیز کرنا شروع کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر
فرمایا کیا تم اس کو دو بار مارنا چاہتے ہو، اس کو لٹانے سے پہلے تم نے چھری تیز کیوں نہ کرلی"[2]
آپؐ نے صحابۂ کرام کو جانوروں کو چارہ پانی دینے کی ہدایت فرمائی اور ان کو پریشان
کرنے اور ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادنے کی ممانعت کی، اور جانوروں کی تکلیف دور کرنے او
ان کو آرام پہونچانے کو باعثِ اجر و ثواب اور تقربُ الی اللہ کا ذریعہ قرار دیا، اور اس کے
فضائل بیان فرمائے حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ "ایک شخص کہیں سفر پر تھا، راستہ میں اس کو
سخت پیاس لگی، سامنے ایک کنواں نظر پڑا وہ اس میں اتر گیا جب باہر آیا تو دیکھا
کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے کیچڑ چاٹ رہا ہے، اس نے اپنے دل میں کہا کہ پیاس
سے جو میرا حال ہو رہا تھا، یہی اس کا بھی ہے، وہ پھر کنویں میں اترا اپنے چمڑے کے
موزے پانی سے بھرے، پھر اپنے دانتوں سے ان کو دبایا اور اوپر آکر کتے کو پلایا،
اللہ تعالےٰ نے اس کے اس عمل کو قبول فرمایا، اور اس کی مغفرت فرمادی، لوگوں نے
عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ بہائم اور جانوروں کے معاملہ میں بھی اجر ہے؟ آپؐ نے فرمایا،

---

[1] مسلم باب الامر باحسان الذبح (کتاب الذبح) [2] طبرانی اور حاکم کا قول ہے کہ
یہ حدیث بخاری کی شرط پر صحیح ہے۔

ہر اس مخلوق میں جو تر و تازہ جگر رکھتی ہے، اجر ہے"۔[1]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ ایک عورت کو صرف اس بات پر عذاب دیا گیا کہ اس نے اپنی بلی کو کھانا پانی نہیں دیا اور نہ اس کو چھوڑا کہ وہ حشرات الارض ہی سے اپنا پیٹ بھرلے"۔[2]

سُہَیل بن عَمرو (اور ایک روایت میں ہے سُہَیل بن الرّبیع بن عَمرو) روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک ایسے اونٹ پر ہوا جس کی پیٹھ لاغری کی وجہ سے اس کے پیٹ سے لگ گئی تھی، آپؐ نے فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں اللہ سے خوف کرو، ان پر سواری کرو تو اچھی طرح، ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت استعمال کرو تو اس حالت میں کہ وہ اچھی حالت میں ہوں"۔[3]

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک انصاری کے احاطہ میں داخل ہوئے اس میں ایک اونٹ تھا، اس نے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو وہ بلبلانے لگا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کے قریب تشریف لائے اور اس کے کوہان اور کنپٹیوں پر اپنا دست مبارک پھیرا، اس سے اس کو سکون ہو گیا،

---

[1] صحیح بخاری کتاب المساقاۃ، باب فضل سقی الماء، و صحیح مسلم، باب فضل سقی البہائم۔

[2] امام نووی بروایت مسلم [3] ابوداؤد باب "مایؤمر بہ من القیام علی الدواب"۔

پھر آپؐ نے پوچھا کہ اس اونٹ کا مالک کون ہے؟ ایک انصاری نوجوان آیا، اور اس نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ میرا ہے، آپؐ نے فرمایا کیا تم اس جانور کے معاملے میں جس کا مالک اللہ تعالےٰ نے تم کو بنایا ہے، اللہ سے نہیں ڈرتے، وہ مجھ سے شکایت کر رہا تھا کہ تم اس کو تکلیف دیتے ہو اور ہر وقت کام میں لگائے رکھتے ہو[1]۔"

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم کسی سرسبز جگہ جاؤ تو اونٹوں کو زمین پر ان کے حق سے محروم نہ کرو اور اگر خشک زمین میں جاؤ تو وہاں تیز چلو، رات کو پڑاؤ ڈالنا ہو تو راستہ پر نہ ڈالو اس لئے کہ وہاں جانوروں کی آمد و رفت رہتی ہے، اور کیڑے مکوڑے وہاں پناہ لیتے ہیں[2]۔"

ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ "ہم لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے، کہ آپؐ ایک ضرورت کے لئے وہاں سے تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے گئے، اس درمیان ہم نے ایک چھوٹی چڑیا دیکھی اس کے ساتھ دو بچے تھے، ہم نے دونوں بچے لے لئے، وہ یہ دیکھ کر اپنے پروں کو پھڑپھڑانے لگی، آپؐ تشریف لائے اور پوچھا کس نے اس کے بچے چھین کر اس کو تکلیف پہونچائی ہے، پھر آپؐ نے حکم دیا کہ اس کو بچے واپس کرو، یہاں ہم نے چونٹیوں کی ایک آبادی دیکھی اور اس کو جلا دیا، آپؐ نے فرمایا اس کو کس نے جلایا ہے، ہم نے عرض کیا کہ ہم لوگوں نے، آپؐ نے فرمایا کہ آگ سے عذاب دینے کا حق صرف آگ کے رب کو ہے[3]۔"

---

[1] ایضاً۔ [2] مسلم باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب کراہیۃ حرق العدو بالنار۔

خادم، نوکر اور مزدور کے ساتھ جو اور انسانوں کی طرح انسان ہیں، اور جن کا اپنے مالک اور آقا پر احسان ہے، آپؐ نے حسن سلوک کی جو تعلیم دی ہے، وہ اس کے علاوہ ہے، جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو تم کھاتے ہو وہی ان کو کھلاؤ، جو تم پہنتے ہو وہی ان کو پہناؤ، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو عذاب میں مبتلا نہ کرو[1] جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ماتحت کیا ہے، تمہارے بھائی، تمہارے خادم اور مددگار ہیں، جس کا بھائی اس کا ماتحت ہو، اس کو چاہئے کہ جو خود کھاتا ہے وہی اس کو کھلائے، جو خود پہنتا ہے وہی اس کو پہنائے، ان کے سپرد ایسا کام نہ کرو جو ان کی طاقت سے باہر ہو، اگر ایسا کرنا ہی پڑے تو پھر ان کا ہاتھ بٹاؤ[2]"۔

عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "ایک اعرابی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھا کہ میں اپنے نوکر کو ایک دن میں کتنی مرتبہ معاف کروں، آپؐ نے فرمایا ستر مرتبہ[3]" وہی بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو[4]"۔

کامل، عالمگیر اور لازوال نمونہ

اس فصل کا اختتام حضرت الاستاد مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب "خطبات مدراس" کے ایک اقتباس وانتخاب پر کیا جا رہا ہے جس میں سید صاحب نے

---

[1] بخاری الادب المفرد ص ۳۸ [2] بخاری والبوداؤد [3] ترمذی والبوداؤد۔
[4] ابن ماجہ ابواب الرہون (باب اجر الأجراء)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کامل، عالمگیر اور لافانی نقش حیات، آپ کی جامعیت و کاملیت اور تمام طبقات انسانی نیز ہر ماحول، ہر زمانہ، ہر پیشہ اور ہر مشغلہ، غرض ہر قسم کے حالات اور ہر سطح و معیار کے لئے آپ کی کامل و جامع رہنمائی اور اُسوۂ حسنہ کی نہایت مؤثر اور بلیغ انداز میں تشریح کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفۂ انسانی اور ہر حالتِ انسانی کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، اگر تم دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو، اگر تم غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر تم بادشاہ ہو تو سلطانِ عرب کا حال پڑھو، اگر تم رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو، اگر تم فاتح ہو تو بدر و حُنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکۂ احد سے عبرت حاصل کرو، اگر تم استاد اور معلّم ہو تو صُفّہ کے درسگاہ کے مُعلّم قُدّس کو دیکھو، اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ، اگر تم واعظ و ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تم تنہائی اور بےکسی کے عالم میں حق کے مُنادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار و مددگار نبی کا اُسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہے، اگر تم حق کی نُصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور اپنے مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فتح مکہ کا نظارہ کرو، اگر تم اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا

نظم و نسق درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں
کے مالک کے کاروبار اور نظم و نسق کو دیکھو، اگر یتیم ہو تو عبداللہ اور آمنہ
کے جگر گوشہ کو نہ بھولو، اگر بچے ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے کو دیکھو، اگر تم
جوان ہو تو مکہ کے ایک چرواہے کی سیرت پڑھو، اگر تم سفری کاروبار
میں ہو تو بصریٰ کے کاروان سالار کی مثالیں ڈھونڈو، اگر تم عدالت
کے قاضی ہو اور پنچایتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نورِ آفتاب سے
پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجرِ اسود کو کعبہ کے ایک گوشہ
میں کھڑا کر رہا ہے، مدینہ کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو
دیکھو جس کی نظرِ انصاف میں شاہ و گدا اور امیر و غریب سب برابر
تھے، اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہ اور عائشہ کے مقدس شوہر کی
حیاتِ پاک کا مطالعہ کرو، اگر تم اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے باپؐ
اور حسنؓ و حسینؓ کے نانا کا حال پوچھو، غرض تم جو کچھ بھی ہو اور کسی حال
میں بھی ہو تمھاری زندگی کے لئے نمونہ تمھاری سیرت کی درستگی و اصلاح
کے لئے سامان تمھارے ظلمت خانے کے لئے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی
کا نور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت
اور ہمہ دم مل سکتا ہے اس لئے طبقات انسانی کے ہر طالب علم اور
نور ایمانی کے ہر متلاشی کے لئے صرف محمد رسول اللہؐ کی سیرت ہدایت
کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے جس کی نگاہ کے سامنے محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے اس کے سامنے نوحؑ و ابراہیمؑ،

ایوبؑ و یونسؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰ علیہم السلام سب کی سیرتیں موجود ہیں گویا تمام دوسرے انبیاء کرام کی سیرتیں، ایک ہی جنس کی اشیاء کی دوکانیں ہیں، اور محمد رسول اللہؐ کی سیرت، اخلاق و اعمال کی دنیا کا سب سے بڑا بازار ہے، جہاں ہر جنس کے خریدار اور ہر شئے کے طلب گار کے لئے بہترین سامان موجود ہے![1]

---

[1] خطبات مدراس ص ۹۶-۹۸

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ[1]

چھٹی صدی مسیحی میں عالمگیر پیمانہ پر یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ پوری نوع انسانی خودکشی پر آمادہ نہیں کمربستہ ہے، جیسے خودکشی کرنے کی اس نے قسم کھائی ہے، ساری دنیا میں خودکشی کی تیاری ہو رہی ہے، اللہ تعالےٰ نے قرآن شریف میں اس منظر اور صورتِ حال کی جو تصویر کھینچی ہے، اس سے بہتر کوئی بڑے سے بڑا مصوّر، ادیب و مؤرخ تصویر نہیں کھینچ سکتا، وہ فرماتا ہے:۔

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ	اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو
اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ	جب تم ایک دوسرے کے دشمن
بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ	تھے تو اس نے تمھارے دلوں میں
بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا ۚ وَكُنۡتُمۡ	اُلفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی
عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ	سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے
فَاَنۡقَذَكُمۡ مِّنۡهَا ۔ (آل عمران ۱۰۳)	گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو
	خدا نے تم کو اس سے بچا لیا۔

---

[1] جلسۂ سیرت کی ایک تقریر کا آخری حصہ جس میں بعثت محمدی کے احسانات اور نبوت محمدی کے ان عطیوں کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے تاریخ انسانی میں انقلاب برپا کر دیا اور نوع انسانی کی قسمت بدل دی، اس کتاب کا اختتام اسی مضمون پر کیا جا رہا ہے۔ (الأنبیاء ۱۰۷)

ہمارے مؤرخوں اور سیرت نگاروں سے جاہلیت کی تصویر پورے طور پر نہ کھنچ سکی، وہ نہ صرف قابلِ معافی بلکہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ادب اور زبان کا ذخیرہ ساتھ نہیں دیتا، واقعہ اور صورتِ حال اتنی سنگین، اتنی نازک، اتنی مہیب اور اتنی پیچیدہ اور دقیق تھی کہ موئے قلم سے اس کی تصویر اور زبان و ادب کی بڑی سے بڑی قدرت و صلاحیت سے اس کی تعبیر ممکن نہیں، کوئی مؤرخ اس کا حق کیسے ادا کر سکتا ہے، دورِ جاہلیت جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی کیا وہ ایک یا دو قوموں کے انحطاط یا اخلاقی بگاڑ کا مسئلہ تھا، خالی بُت پرستی کا مسئلہ تھا، اخلاقی جرائم و ذمائم کا مسئلہ تھا، شراب نوشی، قمار بازی، عیش پرستی، ہوس رانی، حقوق کی پامالی، ظلم و استبداد، معاشی استحصال، جابر و ظالم حکومتوں ظالمانہ نظاموں اور غیر منصفانہ قوانین کا مسئلہ تھا؟ کیا مسئلہ یہ تھا کہ کسی ملک میں باپ اپنی نوزائیدہ بچی کو زندہ درگور کر رہا تھا؟ مسئلہ یہ تھا کہ انسان انسانیت کو خاک میں ملا رہا تھا، مسئلہ یہ نہیں تھا کہ عرب کے کچھ سنگ دل اور قسیّ القلب لوگ اپنی معصوم بچیوں کو جھوٹی شرم، اور خیالی ننگ و عار سے بچنے کے لئے ایک خود ساختہ تخیل اور ایک ظالمانہ روایت کی بناء پر اپنے ہاتھوں زمین میں زندہ دفن کر دینا چاہتے تھے، مسئلہ یہ تھا کہ مادرِ گیتی اپنی پوری نسل کو زندہ دفن کرنا چاہتی تھی، وہ دور ختم ہو چکا اب اس کو کیسے لا کر سامنے کھڑا کر دیا جائے، وہ دور جن لوگوں نے دیکھا تھا، وہی اس کی حقیقت کو سمجھتے اور جانتے تھے۔

مسئلہ کسی ایک ملک و قوم کا بھی نہیں تھا، نہ کسی ایک مغالطہ اور فریب کا تھا، مسئلہ انسانیت کی قسمت کا تھا، مسئلہ نوعِ انسانی کے مستقبل کا تھا، اگر کوئی مصور

ایسی تصویر پیش کرے جس میں دکھایا گیا ہو کہ نوع انسانی کی نمایندگی ایک انسان کر رہا ہے، ایک حسین و جمیل پیکر، ایک فربہ و توانا جسم، جو خدا کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے، جس سے آدم کا نام زندہ اور اس کا سلسلہ قائم ہے، جو محسودِ ملائکہ ہے، اور مقصودِ آفرینش جس کے سر پر خدا نے خلافت کا تاج رکھا ہے، اور جس کی وجہ سے یہ کرۂ ارضی ایک خرابہ اور ویرانہ نہیں ایک آباد اور گلزار جگہ ہے، اس انسان کے سامنے آگ کا ایک سمندر ہے، ایک نہایت مہیب خندق ہے، جس کی کوئی تھاہ نہیں، وہ انسان اس میں چھلانگ لگانے کے لئے تیار کھڑا ہے، اس کے پاؤں اٹھ چکے ہیں، اور وہ مائل بہ پرواز ہے، ایسا نظر آرہا ہے کہ چند لمحوں میں وہ اس کی اندھیریوں میں غائب ہو جائے گا، اگر اس دور کی ایسی تصویر کھینچی جائے تو کسی حد تک اس صورتِ حال کا اندازہ ہو سکتا ہے، جو بعثت کے وقت پائی جاتی تھی، اور اسی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے کہ :۔

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ (آل عمران۔ ۱۰۳)	اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے خدا نے تم کو اس سے بچا لیا۔

اور اسی بات کو نبوت نے ایک تمثیل میں بیان کیا ہے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میری اس دعوت و ہدایت کی مثال جس کے ساتھ مجھے دنیا میں بھیجا گیا ہے، ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی، جب اس کی روشنی گرد و پیش میں پھیلی تو وہ پروانے اور کیڑے جو آگ پر گرا کرتے ہیں، ہر طرف سے امنڈ کر اس میں کودنے لگے، اسی طرح سے تم آگ میں گرنا اور کودنا چاہتے ہو، اور میں تمھاری

کمر پکڑ پکڑ کر تم کو اس سے بچاتا اور علیحدہ کرتا ہوں"[1]

حقیقتاً اصل مسئلہ یہی تھا کہ انسانیت کی کشتی کو سلامتی کے ساتھ پار لگایا جائے،
جب انسان اپنے صحیح "موڈ" میں آجائے گا جب زندگی میں اعتدال اور توازن
پیدا ہوجائے گا تو ان سب تعمیری، فلاحی، علمی، ادبی اور ترقیاتی کوششوں اور
منصوبوں کا دور آئے گا جن کی صلاحیت مختلف انسانوں اور انسانیت کے
بہی خواہوں میں پائی جاتی ہے، حقیقتاً ساری دنیا پیغمبروں کی احسان مند ہے کہ
انھوں نے نوع انسانی کو ان خطرات سے بچالیا جو اس کے سر پر ننگی تلوار کی طرح
لٹک رہے تھے، دنیا کا کوئی علمی تعمیری، اصلاحی کام، کوئی فلسفہ، کوئی دبستانِ فکر،
ان کے احسان سے سبکدوش نہیں، سچ پوچھئے تو موجودہ دنیا اپنی بقا اور ترقی اور
زندگی کے استحقاق میں پیغمبروں ہی کی رہینِ منّت ہے، انسانوں نے زبانِ حال
سے کئی مرتبہ یہ اعلان کیا کہ اب ان کی افادیت ختم ہوگئی اور اب وہ دنیا کے لئے
اور اپنے لئے کوئی نافعیت، برکت و رحمت اور کوئی پیغام اور دعوت نہیں رکھتے،
انھوں نے اپنے خلاف خدا کی عدالت میں خود نالش کی اور گواہی دی، ان کی مسل
تیار تھی، اور وہ اپنے کو بڑی سے بڑی سزا بلکہ سزائے موت کا مستحق ثابت کر چکے تھے۔

جب تمدن اپنے حدود سے تجاوز کر جاتا ہے، جب وہ اخلاقیات کو یکسر
فراموش کر دیتا ہے، جب انسان اپنی سفلی خواہشات اور نفس کے حیوانی تقاضوں
کی تکمیل کے سوا ہر مقصد اور ہر حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے، جب اس کے پہلو
میں انسان کے دل کے بجائے بھیڑیے اور چیتے کا دل پیدا ہو جاتا ہے، جب اس کے

---

[1] صحیح بخاری (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۸)

جسم میں ایک فرضی معدہ اور ایک لامحدود نفسِ امّارہ جنم لیتا ہے جب دنیا پر جنون کا دورہ پڑتا ہے تو قدرتِ خداوندی اس کو سزا دینے یا اس کے جنون کے نشہ کو اتارنے کے لئے نئے نئے نشتر اور نئے نئے جرّاح پیدا کرتی ہے ۔

کرتی ہے ملوکیّت اندازِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

آپ ملوکیت کے لفظ کو تمدّن سے بدل دیجئے کہ تمدّن کا بگاڑ اور تمدّنی جنون ملوکیت کے جنون سے زیادہ خطرناک اور زیادہ وسیع ہوتا ہے، ایک کمزور سا مریض اگر پاگل ہو جاتا ہے تو محلہ کی نیند حرام کر دیتا ہے، اور سارا محلہ عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے، آپ تصوّر کیجئے کہ جب نوع انسانی پاگل ہو جائے اور جب تمدّن کا قوام بگڑ جائے، جب انسانیت کا مزاج خراب ہو جائے تو اس کا کیا علاج ہے؟

جاہلیت میں تمدّن صرف بگڑا ہی نہیں تھا متعفّن ہو گیا تھا، اس میں کیڑے پڑ گئے تھے، انسان نوع انسانی کا شکاری بن گیا تھا، اس کو کسی انسان کی جانکنی، کسی زخمی کی تڑپ اور کسی مصیبت زدہ کی کراہ میں وہ مزا آنے لگا تھا، جو جام و سُبُو میں، اور دنیا کے لذیذ سے لذیذ کھانے اور خوش نما منظر میں نہیں آتا تھا، آپ روما کی تاریخ پڑھیں جس کی فتوحات نظم و نسق اور قانون سازی اور تہذیب کے دنیا میں ڈنکے بجے، یورپین مؤرخ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اہل روما کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ فرحت افزا اور مست کر دینے والا نظارہ وہ ہوتا تھا جب باہم شمشیر زنی یا خونخوار جانوروں کی لڑائی میں ہزیمت خوردہ اور مجروح شمشیر زن GLADIATOR جانکنی کی تکلیف میں مبتلا ہوتا، اور موت کے کرب میں آخری ہچکی لیتا،

اس وقت روما کے خوش باش اور زندہ دل تماشائی اس خوش کن منظر کو دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑتے اور پولیس کو بھی ان کو کنٹرول میں رکھنا ممکن نہ ہوتا۔[1]

رومی عہد کی بیانی جس میں انسان کو جانوروں سے لڑنے پر مجبور کیا جاتا تھا، انسانی شقاوت و سنگدلی کی بدترین مثال پیش کرتی ہے۔ لیکن یہ صرف اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ "تاریخ اخلاق یورپ" کے مصنف "لیکی" ان کھیلوں کی ہردلعزیزی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"بیانی کی یہ مقبولیت و دل فریبی اس لحاظ سے مطلق حیرت انگیز نہیں کہ دلکشی کے جتنے مناظر اس میں آ کر مجتمع ہو گئے تھے، اتنے کسی دوسرے ملعبہ میں نہ تھے، لق و دق اکھاڑہ، امراء و اعیان، دولت کی زرق برق پوشاکیں، تماشائیوں کا انبوہ کثیر ان کے ذوق و شوق کا اثر متعدی، اتنے بڑے مجمع میں ایک متوقع سکون و خاموشی، اسی ہزار زبانوں سے ایک بارگی صدائے تحسین بلند ہوتی اس کی آواز سے شہر کیا معنی مضافات شہر تک گونج اٹھتے جنگ کا گھڑی گھڑی رنگ بدلتے رہنا، عدیم المثال جرأت و بے جگری کا اظہار، ان میں سے ہر شے تخیل کو متاثر کرنے کے لئے کافی ہے اور ان کی مجموعی طاقت قدرتی طور پر بہت قوی ہے۔

ان ظالمانہ تفریحات کو روکنے کے لئے احکام جاری کئے گئے، لیکن یہ سیلاب اتنا پُرزور تھا کہ کوئی بند اسے روک نہیں سکتا تھا"۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو لیکی کی کتاب "تاریخ اخلاق یورپ" (HISTORY OF EUROPEAN MORALS, BY LECKY)

[2] ایضاً صفحہ ۲۳ (ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی)

پس جاہلیت کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ پوری زندگی کی چول اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی، بلکہ ٹوٹ گئی تھی، انسان، انسان نہیں رہا تھا، انسانیت کا مقدمہ اپنے آخری مرحلہ میں خدا کی عدالت میں پیش تھا، انسان اپنے خلاف گواہی دے چکا تھا، اس حالت میں خدا نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، اور ارشاد ہوا:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (الانبیاء ۔ ۱۰۷)

اور (اے محمدؐ) ہم نے تم کو تمام جہاں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ دور بلکہ قیامت تک پورا دور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت، دعوت اور مساعی جمیلہ کے حساب میں ہے، آپؐ کا پہلا کام یہ تھا کہ آپؐ نے اس تلوار کو جو نوع انسانی کے سر پر لٹک رہی تھی، اور کوئی گھڑی تھی کہ اس کے سر پر گر کر اس کا کام تمام کر دے، اس تلوار کو ہٹا لیا، اور اس کو وہ تحفے عطا کئے، جنھوں نے اس کو نئی زندگی، نیا حوصلہ، نئی طاقت، نئی عزت اور نئی منزلِ سفر عطا کی اور ان کی برکت سے انسانیت تہذیب و تمدن، علم و فن، روحانیت و اخلاص اور تعمیرِ انسانیت کا ایک نیا دور شروع ہوا، ہم یہاں پر آپ کے ان چند عطیوں کا ذکر کرتے ہیں، جنھوں نے نوع انسانی کی ہدایت و اصلاح اور انسانیت کی تعمیر و ترقی میں بنیادی اور قائدانہ کردار ادا کیا اور جن کی بدولت ایک نئی دنیا وجود میں آئی۔

آپؐ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ آپؐ نے دنیا کو عقیدۂ توحید کی نعمت عطا فرمائی اس سے زیادہ انقلاب انگیز، حیات بخش، عہد آفریں اور معجز نما عقیدہ دنیا کو نہ پہلے کبھی ملا ہے، اور نہ قیامت تک کبھی مل سکتا ہے، یہ انسان جس کو

شاعری، فلسفہ، اور سیاست میں بڑے بڑے دعوے ہیں، اور جس نے قوموں، ملکوں کو بارہا غلام بنایا، عناصر اربعہ پر اپنی حکومت چلائی، پتھر میں پھول کھلائے اور پہاڑوں کا جگر کاٹ کر دریا بہائے اور جس نے کبھی کبھی خدائی کا بھی دعویٰ کیا، یہ اپنے سے کہیں زیادہ مجبور و ذلیل، بے حس و حرکت، بے جان و مردہ اور بعض اوقات خود اپنی ساختہ پرداختہ چیزوں کے سامنے جھکتا تھا، ان سے ڈرتا اور ان کی خوشامد کرتا تھا، یہ پہاڑوں، دریاؤں، درختوں، جانوروں، ارواح و شیاطین اور مظاہر قدرت ہی کے سامنے نہیں، بلکہ کیڑوں، مکوڑوں تک کے سامنے سجدہ ریز ہوتا تھا، اور اس کی پوری زندگی انھیں سے خوف و امید اور انھیں خطرات میں بسر ہوتی تھی، جس کا نتیجہ بُزدلی، ذہنی انتشار، وہم پرستی اور بے اعتمادی تھا، آپؐ نے اس کو ایسے خالص، بے آمیز سہل الفہم، حیات بخش عقیدۂ توحید کی تعلیم دی جس سے وہ خدا کے سوا جو خالق کائنات ہے، ہر ایک سے آزاد، نڈر اور بے فکر ہو گیا، اس میں ایک نئی قوت، نیا حوصلہ، نئی شجاعت اور نئی وحدت پیدا ہوئی، اس نے صرف خدا کو کارساز حقیقی، حاجت روائے مطلق، اور نافع و ضار (نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا) سمجھنا شروع کیا، اس نئی دریافت اور بازیافت سے اس کی دنیا بدل گئی، وہ ہر قسم کی غلامی و عبودیت اور ہر طرح کے بے جا خوف و رجا اور ہر طرح کے تشتّت و انتشار سے محفوظ ہو گیا، اس کو کثرت میں وحدت نظر آنے لگی، وہ اپنے کو ساری مخلوقات سے افضل، ساری دنیا کا سردار و منتظم اور صرف خدا کا محکوم اور فرمانبردار سمجھنے لگا، اس کا لازمی نتیجہ انسانی عظمت و شرف کا قیام تھا، جس سے پوری دنیا محروم ہو چکی تھی۔

بعثت محمدیؐ کے بعد ہر طرف سے اس عقیدۂ توحید کی (جس سے زیادہ مظلوم و مجہول

کوئی عقیدہ نہ تھا) صدائے بازگشت آنے لگی، دنیا کے سارے فلسفوں اور افکار و خیالات
پر اس کا کم و بیش اثر پڑا، وہ بڑے بڑے مذاہب جن کے رگ و ریشہ میں شرک اور تعدد آلہہ
(متعدد خداؤں اور معبودوں) کا عقیدہ رچ بس گیا تھا کسی نہ کسی کے بیں یہ اعلان
کرنے پر مجبور ہوئے کہ خدا ایک ہے، وہ اپنے مشرکانہ عقیدوں کی تاویل پر مجبور ہوئے،
اور ان کی ایسی فلسفیانہ تشریح کرنے لگے جس سے ان پر شرک و بدعت پرستی کا
الزام نہ آئے، اور وہ اسلامی عقیدۂ توحید سے کچھ نہ کچھ ملتا ہوا نظر آئے، ان کو
شرک کا اقرار کرنے میں شرم اور جھجک محسوس ہونے لگی اور سارے مشرکانہ نظام،
فکر و اعتقاد، احساس کمتری INFERIORITY COMPLEX میں مبتلا ہوئے اس محسن اعظم
کا احسان اعظم یہ ہے کہ اس نے توحید کی نعمت دنیا کو عطا کی۔

آپ کا دوسرا انقلاب آفریں اور عظیم احسان وحدتِ انسانی کا وہ تصوّر ہے،
جو آپ نے دنیا کو عطا کیا، انسان قوموں اور برادیوں، ذات جاتی اور اعلیٰ ادنیٰ طبقوں
میں بٹا ہوا تھا، اور ان کے درمیان انسانوں اور جانوروں، آقاؤں اور غلاموں
اور عبد و معبود کا سا فرق تھا، وحدت و مساوات کا کوئی تصوّر نہ تھا، آپ نے صدیوں
کے بعد پہلی مرتبہ یہ انقلاب انگیز اور حیرت خیز اعلان فرمایا۔

ایہا الناس إنّ ربّکم واحدٌ	لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے اور
وان اباکم واحدٌ کلکم لآدم	تمہارا باپ بھی ایک ہے تم سب اولادِ
وآدم من تراب، ان اکرمکم	آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے، اللہ
عند اللّٰہ اتقاکم، ولیس لعربی	کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز
علی عجمی فضل الا بالتقویٰ۔	وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ

(کنز العمال)

پاک باز ہے کسی عربی کو عجمی پر فضیلت
نہیں، مگر تقویٰ کی بنا پر۔

یہ وہ الفاظ ہیں، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کے عظیم مجمع میں فرمائے تھے، ان میں دو وحدتوں کا اعلان کیا گیا ہے، اور یہی وہ دو فطری مستحکم اور دائمی بنیادیں ہیں، جن پر نسل انسانی کی حقیقی وحدت کا قصر تعمیر کیا جا سکتا ہے، اور جس کے سایے کے نیچے انسان کو امن و سکون حاصل ہو سکتا ہے، اور وہ اشتراکِ عمل اور تعاون کے اصول پر انسانیت کی تعمیر نو کا کام انجام دے سکتا ہے یہ دو وحدتیں کیا ہیں؟ ایک نوعِ انسانی کے خالق و صانع کی وحدت، اور ایک نسل انسانی کے بانی اور مورث کی وحدت، اس طرح ہر انسان دوسرے انسان سے دوہرا رشتہ رکھتا ہے، ایک روحانی اور حقیقی طور پر، وہ یہ کہ سب انسانوں اور جہانوں کا رب ایک ہے، دوسرا جسمانی اور ثانوی طور پر، وہ یہ کہ سب انسان ایک باپ کی اولاد ہیں[1]، دوسرے الفاظ میں توحیدِ "رب" اور توحیدِ "اب" کی تعلیم دی جس کو مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے "الرب واحد والاب واحد" رب (پروردگار) بھی ایک ہے، اور اب (والد بزرگوار) بھی ایک۔

جس وقت یہ اعلان کیا گیا تھا، اس وقت دنیا اس کے سننے کے حال (موڈ) میں نہ تھی، یہ اعلان اس وقت کی دنیا میں ایک زلزلہ سے کم نہ تھا بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں، جو تدریجی طور پر قابلِ برداشت ہو جاتی ہیں، بجلی کا یہی حال ہے کہ اس کو پردوں میں رکھ کر چھو لیتے ہیں، لیکن بجلی کی عریاں لہر کو اگر کوئی چھو لے تو جسم میں

۱؎ اس نکتہ کی تشریح میں جو تقریر میں اجمالاً آیا تھا، مقرر کی تصنیف "ارکانِ اربعہ" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اس کا کرنٹ دوڑ جاتا، اور اس کا کام تمام کر دیتا ہے آج علم و فہم اور فکر انسانی کے ارتقاء کی ان منزلوں نے جو اسلام کی دعوت، اسلامی معاشرہ کے قیام مصلحین اور داعیانِ اسلام کی کوششوں سے طے ہوئیں، اس انقلاب انگیز اور زلزلہ فگن اعلان کو روزمرہ کی حقیقت بنا دیا ہے، اقوامِ متحدہ کے اسٹیج سے لے کر جس نے حقوقِ انسانی کا منشور (HUMAN RIGHTS CHARTER) شائع کیا، ہر جمہوریہ اور ہر ادارہ کی طرف سے انسانی حقوق اور مساواتِ انسانی کا اعلان کیا جا رہا ہے، اور کوئی اس کو سن کر متعجب نہیں ہوتا، لیکن ایک زمانہ تھا، جب مختلف قوموں اور خاندانوں کے مافوق البشر ہونے کا عقیدہ قائم تھا، اور بہت سی نسلوں اور خاندانوں کا نسب نامہ خدا سے اور سورج چاند سے ملایا جا رہا تھا، قرآن شریف نے یہودیوں اور عیسائیوں کا قول نقل کیا ہے کہ ہم خدا کی لاڈلی اور چہیتی اولاد کی طرح ہیں "وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ" فراعنۂ مصر اپنے کو سورج دیوتا کا اوتار کہتے تھے، ہندوستان میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان موجود تھے، شاہانِ ایران کو جن کا لقب کسریٰ (خسرو) ہوا کرتا تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے، اہلِ ایران انھیں اسی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا اعتقاد تھا کہ ان پیدائشی بادشاہوں کے خمیر میں کوئی مقدس آسمانی چیز شامل ہے، کیانی سلسلہ کے آخری ایرانی شہنشاہ یزدگرد کا نام بتاتا ہے کہ وہ اور ایرانی ان کو خدا کا کس درجہ مقرب اور ہم نشین سمجھتے تھے۔

چینی اپنے شہنشاہ کو آسمان کا بیٹا تصور کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان نر اور زمین مادہ ہے، ان دونوں کے اتصال سے کائنات کی تخلیق عمل میں

آئی ہے، اور شہنشاہ (ختا اول) اس جوڑے کا پلونٹھا بیٹا ہے[1]، عرب اپنے سوا ساری دنیا کو گونگا اور بے زبان (عجم) کہتے تھے، ان کا سب سے ممتاز قبیلہ قریش، عام عربوں سے بھی اپنے کو بالا و برتر سمجھتا تھا، اور اسی احساس برتری میں حج کے ایسے عمومی اجتماع میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھتا تھا[2]۔

قرآن نے اس فضا اور اس ماحول میں اعلان کیا:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۱۳)	لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو، خدا کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

اور قرآن کی ایک ایسی سورہ میں جو قرآن کا دیباچہ (فاتحہ) اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی سورہ ہے کہا گیا ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝	سب تعریف اللہ کی ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

آپ کی رحمۃ للعالمینی کا تیسرا مظہر، اور نوع انسانی پر تیسرا احسان عظیم احترام انسانیت اور انسان کی قدر و قیمت کا وہ اسلامی تصور ہے جو آپ کا عطیہ اور اسلام کا تحفہ ہے، اسلام کا ظہور جس زمانہ میں ہوا اس زمانہ میں انسان سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں تھا، انسانی وجود بالکل بے قیمت اور بے حقیقت ہو کر رہ گیا تھا، بعض اوقات پالتو جانور

---

1. ملاحظہ ہو تاریخ چین از جیمس کار کرن۔ 2. ملاحظہ ہو کتب حدیث و سیرت۔

بعض "مقدس" حیوانات بعض درخت جن کے ساتھ بعض عقائد و روایات وابستہ ہو گئی تھیں، انسان سے کہیں زیادہ قیمتی، لائق احترام اور قابل حفاظت تھے، ان کے لئے بے تکلف انسانوں کی جانیں لی جا سکتی تھیں، اور انسانوں کے خون اور گوشت کے چڑھاوے چڑھائے جا سکتے تھے آج بھی بعض بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک میں اس کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں، محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کے دل و دماغ پر یہ نقش بٹھا دیا کہ انسان اس کائنات کا سب سے زیادہ قیمتی قابلِ احترام، لائقِ محبت اور مستحقِ حفاظت وجود ہے، آپ نے انسان کا پایہ اتنا بلند کیا کہ اس سے اوپر صرف خالقِ کائنات کی ہستی رہ جاتی ہے، قرآن نے اعلان کیا کہ وہ خلیفۃ اللہ (خدا کا نائب) ہے ساری دنیا اور یہ سارا کارخانۂ عالم، اسی کے لئے پیدا کیا گیا ہے:۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ (البقرہ-۲۹)	وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو اس زمین پر ہے۔

وہ اشرف المخلوقات اور اس بزم عالم کا صدر نشین ہے:۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا۔ (الاسراء-۷۰)	اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔

اس سے زیادہ اس کی عزت افزائی اور اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہو سکتا ہے کہ صاف کہہ دیا گیا کہ انسان خدا کا کنبہ ہیں، اور خدا کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور اس کو آرام پہنچائے "الخلق

عیال اللہ فاحبّ الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ"[1]

انسانیت کی بلندی اور خدا سے اس کے قرب و اختصاص کا اظہار اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے، جو ایک حدیث قدسی میں کیا گیا ہے' فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا،" اے فرزند آدم میں بیمار ہوا تو مجھے دیکھنے نہیں آیا، بندہ کہے گا، پروردگار! میں تیری عیادت کیا کر سکتا ہوں تو تو رب العالمین ہے؟ ارشاد ہوگا کیا تجھے معلوم نہیں ہوا میرا فلاں بندہ بیمار پڑ گیا تھا تو اس کی عیادت کو نہیں گیا۔ تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر ارشاد ہوگا اے فرزند آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں دیا، بندہ عرض کرے گا، پروردگار! میں تجھے کیسے کھانا کھلا سکتا ہوں تو تو رب العالمین ہے' ارشاد ہوگا کیا تجھے اس کا علم نہیں ہوا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اسے نہیں کھلایا کیا تجھے اس کی خبر نہ تھی کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا، اے فرزند آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا، بندہ عرض کرے گا، اے رب! میں تجھے کیسے پانی پلا سکتا ہوں تو تو رب العالمین ہے' ارشاد ہوگا، تجھ سے میرے فلاں بندہ نے پانی طلب کیا تھا تو نے اسے پانی نہیں دیا، تجھے اس کا پتہ نہیں چلا کہ اگر تو اس کو پانی پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا"[2] ایک سراپا توحید مذہب میں کیا انسانیت کی بلندی' اور انسان کی رفعت و محبوبیت کا اس سے بڑھ کر اعتراف و اعلان پایا جا سکتا ہے' اور کیا دنیا کے کسی مذہب و فلسفہ میں انسان کو یہ مقام دیا گیا ہے؟ آپؐ نے خدا کی رحمت و شفقت کے لئے انسانوں پر رحم و شفقت کو شرط اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ بتایا اور فرمایا:

الراحمون یرحمھم الرحمٰن	رحم کرنے والوں پر رحمٰن کی رحمت ہوتی
ارحموا من فی الارض یرحمکم	ہے اگر تم اہلِ زمین پر رحم کھاؤ گے تو وہ

---

[1] مشکوٰۃ بروایت بیہقی۔ [2] صحیح مسلم۔

من فی السماء۔[1] جو آسمان پر ہے وہ تم پر رحمت نازل کریگا۔

آپ غور کیجیے کہ وحدتِ انسانی کا نقش دلوں پر بٹھانے اور احترام انسانیت کا یقین دلوں میں پیدا کرنے کے لئے جب یہ سعی بلیغ نہیں کی گئی تھی اس وقت انسان کا کیا حال رہا ہوگا ایک انسان کی ادنیٰ خواہش کی قیمت ہزاروں انسانوں سے زیادہ تھی، بادشاہ اٹھتے تھے اور ملکوں کے ملکوں کا صفایا کر دیتے تھے، سکندر اٹھا اور جیسے کوئی کبڈی کھیلتا ہے، ہندوستان تک چلا آیا اور قوموں اور تہذیبوں کے چراغ گل کر دیئے، سیزر اٹھا اور انسانوں کا اس طرح شکار کھیلنا شروع کیا جیسے جنگلی جانوروں کا شکار کھیلا جاتا ہے، ہمارے زمانہ میں بھی دو دو عالمگیر جنگیں برپا ہوئیں جنھوں نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور یہ صرف قومی تکبر سیاسی انانیت، اقتدار کی ہوس یا تجارتی منڈیوں پر قبضہ کرنے کے جذبہ کا نتیجہ تھا اقبال نے سچ کہا ہے

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

چوتھا انقلابی کارنامہ یہ ہے کہ بعثتِ محمدی کے وقت نوعِ انسانی کے اکثر افراد پر فطرتِ انسانی سے بدگمانی اور خدا کی رحمت سے مایوسی کی ایک عام فضا چھائی ہوئی تھی اس ذہنی کیفیت کے پیدا کرنے میں ایشیا کے بعض قدیم مذاہب اور مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کی تبدیل شدہ عیسائیت نے یکساں کردار ادا کیا تھا ہندوستان کے قدیم مذاہب نے تناسخ "آواگون" کے فلسفہ کے ذریعہ جس میں انسان کے ارادہ و اختیار کو مطلق دخل نہیں ہے اور جس کی رو سے ہر انسان کو اپنے پچھلے جنم کے اعمال اور غلطیوں کی سزا بھگتنی ضروری ہے اور عیسائیت نے انسان پیدائشی گنہ گار

---

[1] ابوداؤد، حالی نے اس حدیث کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ؎

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر — خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

ہونے اور اس کے لئے حضرت مسیح کے کفّارہ بننے کی ضرورت کے عقیدہ کے نتیجہ میں اس وقت کے متمدن دنیا کے لاکھوں کروڑوں افراد کو جو ان مذاہب کے پیرو تھے، اپنی ذات سے بدگمانی اور اپنے مستقبل اور خدا کی رحمت سے مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پوری طاقت و صفائی سے اعلان کیا کہ انسان کی فطرت ایک سادہ تختی کے مانند ہے جس پر پہلے سے کوئی تحریر لکھی نہیں ہے، اس پر بہتر سے بہتر تحریر لکھی جا سکتی ہے، انسان اپنی زندگی کا خود آغاز کرتا ہے، اور اپنے اچھے یا برے عمل سے اپنی دنیا و عاقبت بناتا یا بگاڑتا ہے، وہ کسی دوسرے کے عمل کا ذمّہ دار یا جواب دہ نہیں ہے، قرآن مجید نے بار بار اعلان کیا کہ آخرت میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا، اور یہ کہ اس کے حصہ میں اسی کی کوشش اور اس کے نتائج آنے والے ہیں، انسان کی کوشش کا نتیجہ ضرور ظاہر ہوگا، اور اس کو اس کا بھرپور بدلہ ملے گا۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ○	یہ کہ کوئی شخص دوسرے (کے گناہ) کا
وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ○	بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو
وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ○	وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے
ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ○	اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی،
(النجم ۳۸-۴۱)	پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

اس اعلان سے انسان کا اپنی فطرت، اور اپنی فطری صلاحیتوں پر وہ اعتماد بحال ہو گیا جو بالکل متزلزل ہو گیا تھا، وہ نئے عزم و یقین اور نئے جوش و ولولہ کے ساتھ اپنی اور انسانیت کی تقدیر چمکانے اور اپنی قسمت اور قوت آزمانے کے لئے سرگرم سفر ہو گیا۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے گناہوں، لغزشوں اور غلطیوں کو ایک عارضی حالت قرار دیا جس میں انسان کبھی کبھی اپنی نادانی، کوتاہ نظری اور نفس و شیطان کی ترغیب سے مبتلا ہو جاتا ہے

صلاحیت، خیر پسندی اور اعترافِ قصور و ندامت اس کی فطرت کا اصل تقاضہ اور انسانیت کا جوہر ہے، اپنی غلطی کا اعتراف کرنا، اس پر نادم ہونا، خدا کے سامنے رو دھو کر اپنے اس قصور کو معاف کرالینا، اور آئندہ اس غلطی کے نہ کرنے کا عزم کرنا انسان کی شرافت اور آدم کی میراث ہے، آپ نے دنیا کے مایوس و دل شکستہ اور گناہوں کے دلدل میں گلے گلے ڈوبے ہوئے انسانوں پر توبہ کا ایسا دروازہ کھولا اور اس کی اس زور و شور سے تبلیغ فرمائی کہ آپ کو اس شعبہ کا دوبارہ زندہ کرنے والا کہنا صحیح ہوگا، اسی بنا پر آپ کے ناموں میں ایک نام "نبی التوبۃ" (توبہ کا پیغمبر اور پیغامبر) بھی ہے آپ نے توبہ کو ایک مجبوری کی بات اور تلافی مافات کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ آپ نے اس کے ایسے فضائل بیان کئے اور اس کا مرتبہ اتنا بلند کیا کہ وہ اعلیٰ درجہ کی عبادت اور خدا کے قرب اور اس کی محبوبیت کا ایسا ذریعہ بن گیا کہ اس پر بڑے بڑے معصوم صفت اور ناکردہ گناہ عابدوں اور زاہدوں کو رشک آنے لگا۔

قرآن مجید نے اس طرح رحمت کی وسعت پر گنہگار کے توبہ کر سکنے اور بڑے سے بڑے گناہ سے پاک و صاف ہو جانے کے امکان کو اس دلکش اور دلنواز انداز میں بیان کیا اور گنہگار بندوں اور نفس و شیطان کے زخم خوردہ انسانوں کو اس طرح خدا کے دامنِ رحمت میں پناہ لینے کی منادی کی، اور اس کے دریائے رحمت کے جوش و تلاطم کو اس انداز میں بیان کیا کہ محسوس ہونے لگا کہ وہ مطلوب سے زیادہ طالب اور ان گنہگار بندوں کے حق میں نہ صرف حلیم و رحیم اور فیاض و کریم ہے، بلکہ (اگر یہ کہنا صحیح ہو) ان کا منتظر و مشتاق اور ان کا سچا قدر داں ہے، قرآن مجید کے ان الفاظ کو پڑھئے اور اس لطف و شفقت کا اندازہ کیجئے جو اس کے لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا	کہہ دیجئے اے میرے وہ بندو جنھوں نے
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ	اپنے حق میں زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے
رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ	مایوس نہ ہو بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہ

يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط اِنَّهٗ	معاف کر دیتا ہے بیشک وہ بڑا بخشنے
هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ (الزمر۔۵۳)	والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔

ایک دوسری آیت میں گنہگار اور خطا کار انسانوں کے تذکرے اور سیاق وسباق میں نہیں، بلکہ بلند ہمت، نیکو سیرت اور جنّتی انسانوں کے سلسلہ اور سیاق وسباق میں گناہوں سے توبہ کرنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ	اور اپنے پروردگار کی بخشش اور
رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ	بہشت کی طرف لپکو جس کا عرض آسمان
وَالْاَرْضُ لا اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ o	اور زمین کے برابر ہے اور جو (خدا سے
الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ	ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے، جو
وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ	آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا کی
الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط	راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ o وَالَّذِيْنَ	روکتے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں،
اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا	اور خدا نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے
اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا	اور وہ کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق
لِذُنُوْبِهِمْ قف وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ	میں کوئی اور برائی کر بیٹھتے ہیں تو خدا کو
اِلَّا اللّٰهُ قف وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى	یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی بخشش
مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ o	مانگتے ہیں اور خدا کے سوا گناہ بخش بھی
اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ	کون سکتا ہے؟ اور جان بوجھ کر اپنے افعال
مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِىْ	پر اڑے نہیں رہتے ایسے لوگوں کا صلہ پروردگا

مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ	کی طرف سے بخشش اور باغ ہیں جن کے نیچے
فِيۡهَا ؕ وَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ ؕ	نہریں بہہ رہی ہیں (اور) وہ اس میں
(آل عمران ۱۳۳،۱۳۶)	ہمیشہ بستے رہیں گے اور (اچھے) کام
	کرنے والوں کا بدلہ بہت اچھا ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر باعمل اور نیک سیرت بندوں کے مختلف طبقوں کا ذکر کرتے ہوئے، اس نورانی فہرست کا افتتاح عابدوں زاہدوں کے بجائے "تائبوں" سے فرمایا گیا، قرآن مجید کی اس سورہ کی جس کا نام ہی سورہ توبہ ہے، آیت ہے:۔

اَلتَّآئِبُوۡنَ الۡعٰبِدُوۡنَ الۡحٰمِدُوۡنَ	توبہ کرنے والے عبادت کرنے والے حمد کرنے والے
السَّآئِحُوۡنَ الرّٰكِعُوۡنَ السّٰجِدُوۡنَ	بے تعلق رہنے والے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے
الۡاٰمِرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَالنَّاهُوۡنَ	والے نیک کاموں کا امر کرنے والے اور بری باتوں سے
عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَالۡحٰفِظُوۡنَ	منع کرنے والے خدا کی حدود کی حفاظت کرنے
لِحُدُوۡدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ‏ ○	والے (یہی مومن لوگ ہیں) اور (اے پیغمبرؐ)
(التوبہ۔۱۱۲)	مومنوں کو (بہشت کی) خوشخبری سنادو۔

اس اعزاز اور اظہارِ اعتماد کی ایک روشن مثال یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی زبان سے ان تین صحابیوں[1] کی توبہ کی قبولیت کا اعلان کیا گیا جو غزوۂ تبوک کے نازک اور اہم موقع پر (جس میں شرکت نہایت ضروری تھی) بغیر کسی معقول عذر کے مدینہ میں رہ کر سخت کوتاہی کے مرتکب ہوئے تھے، تو ان کا ذکر کرنے سے پہلے خود پیغمبرؐ اور ان مہاجرین و انصار کا ذکر کیا گیا جن سے اس موقع پر کسی کوتاہی کا صدور نہیں ہوا تھا، تاکہ ان تینؓ پیچھے رہ جانے والوں کو اپنی تنہائی اور پسماندگی کا

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتب سیرت، اور کتب تفسیر و حدیث، واقعہ غزوۂ تبوک۔

احساس نہ ہو اور وہ احساسِ کہتری اور انگشت نمائی کے ہر داغ سے بری ہو جائیں اور ان پر اور قیامت تک قرآن مجید کے پڑھنے والوں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ ان کی اصل جگہ اور اصل گروہ بھی صادقین اولین اور مہاجرین و انصار کے صفِ اوّل کے لوگ ہیں توبہ کی قبولیت، تائب کی مقبولیت اور نفسیاتی طور پر دلنوازی اور چارہ سازی کی اس سے زیادہ لطیف اور دقیق مثال ادیان و مذاہب اور علم الاخلاق اور علم النفس کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے اسی سورۂ توبہ میں ارشاد ہوا ہے:۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ	بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین
وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ	وانصار پر جو باوجود اس کے کہ ان میں سے بعض
الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ	کے دل پھر جانے کو تھے مشکل کی گھڑی میں
قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ	پیغمبر کے ساتھ رہے پھر خدا نے ان پر مہربانی
اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ وَّعَلَى	فرمائی بے شک وہ ان پر نہایت شفقت کرنے
الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓى	والا (اور) مہربان ہے اور تینوں پر بھی جن کا
اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا	معاملہ ملتوی کیا گیا تھا، یہاں تک کہ جب
رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ	زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی
وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ	اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہو گئیں
اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ	اور انھوں نے جان لیا کہ خدا (کے ہاتھ) سے
لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ	خود اس کے سوا کوئی پناہ نہیں پھر خدا نے
الرَّحِيْمُ ۝	ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں بے شک
(التوبہ - ۱۱۷ - ۱۱۸)	خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اس کے علاوہ ایک اصول کے طور پر اس کا اعلان کیا کہ رحمتِ الٰہی ہر چیز پر حاوی

اور غضب و جلال پر غالب ہے' قرآن مجید میں ہے:۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ۔ (الاعراف ۱۵۶)	میری رحمت ہر چیز پر حاوی اور محیط ہے۔

اور حدیث قدسی میں ہے:۔

انّ رحمتی سبقت غضبی (حدیث)	میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

پھر اس نے مایوسی کو بھی کفر کا، اور جہالت و گمراہی کا مرادف قرار دیا ہے' قرآن مجید میں ایک جگہ ایک پیغمبر برحق (حضرت یعقوبؑ) کی زبان سے کہلوایا گیا ہے:۔

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا	اللہ کی رحمت سے وہی لوگ مایوس ہو سکتے ہیں
الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (یوسف ۸۷)	جو خدا کے منکر اور اس کی ذات و صفات سے نا آشنا ہیں۔

دوسری جگہ ایک دوسرے جلیل القدر پیغمبر (حضرت ابراہیمؑ) کا قول نقل کیا گیا ہے۔

وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ	اپنے رب کی رحمت سے گمراہوں کے سوا
اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ○ (الحجر ۵۶)	کون مایوس ہو سکتا ہے؟

اس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے توبہ کی فضیلت و ترغیب اور خدا کی رحمت کی وسعت و شمولیت کا اعلان و تبلیغ کر کے یاس و قنوط کی ماری ہوئی اور غضب و جلال کے اعلانات و تفصیلات سے (جن میں یہودی علماء اور شارحین کتب مقدسہ اور قرون وسطیٰ کے غالی اور فطرت دشمن عیسائی زاہدوں' اور پادریوں نے اہم کردار ادا کیا تھا) ڈری اور سہمی ہوئی انسانیت کو نئی زندگی کا پیغام دیا، اس کے تن مردہ اور دل افسردہ میں نئی روح پھونکی' اس کے زخموں پر مرہم رکھا، اور اس کو خاک مذلت سے اٹھا کر عزت و شرف خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے بام عروج پر پہونچا دیا۔

نبوت محمدی کا پانچواں عظیم اور ناقابل فراموش احسان اور ایک گراں قدر تحفہ'

دین و دنیا کی وحدت کا تصور اور یہ انقلاب انگیز تلقین ہے کہ یہ کوئی حقیقی اختلاف نہیں محض اصطلاح کا اختلاف ہے، اور قدیم درسی زبان میں "نزاعِ لفظی" ہے، انسان کے اعمال و اخلاق اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کا اصل انحصار، انسان کی ذہنی کیفیت عمل کے محرکات اور اس کے مقصد پر ہے، جس کو اسلام کے دین و شریعت کی زبان میں "نیت" کے ایک مفرد و سادہ لیکن نہایت بلیغ و عمیق لفظ میں ادا کیا گیا ہے، اس کے نزدیک نہ کوئی چیز "دنیا" ہے، اور نہ کوئی چیز "دین" اس کے نزدیک خدا کی رضا کی طلب، اخلاص اور اس کے حکم کی تعمیل کے جذبہ و ارادہ سے بڑے سے بڑا دنیاوی عمل یہاں تک کہ حکومت، جنگ، دنیاوی نعمتوں سے تمتع، نفس کے تقاضوں کی تکمیل، حصول معاش کی جد و جہد، جائز تفریح طبع کا سامان، ازدواجی و عائلی زندگی سب اعلیٰ درجہ کی عبادت، تقرب الی اللہ کا ذریعہ، اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب و لایت تک پہونچنے کا وسیلہ، اور خالص دین بن جاتی ہے، اس کے برخلاف بڑی سے بڑی عبادت، اور دینی کام جو رضاء الٰہی کے مقصد اور اطاعت کے جذبہ سے خالی ہو (حتیٰ کہ فرض عبادتیں، ہجرت و جہاد، قربانی و سرفروشی اور ذکر و تسبیح) خالص دنیا اور ایسا عمل شمار ہو گا جس پر کوئی ثواب اور اجر نہیں ہے۔

قدیم مذاہب نے زندگی کو دو خانوں میں (دین و دنیا) میں تقسیم اور دنیا کو دو کیمپوں، اہلِ دین اور اہلِ دنیا میں بانٹ دیا تھا، جو نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے جدا تھے، اور ان کے درمیان ایک موٹی سرحدی لکیر اور ایک وسیع خلیج حائل تھی، بلکہ یہ دونوں خانے ایک دوسرے سے متصادم اور یہ دونوں کیمپ باہم متحارب تھے، ان کے نزدیک دین و دنیا میں کھلا تضاد اور شدید رقابت تھی جس کی ان میں سے کسی ایک سے رسم و راہ پیدا کرنی ہو، اس کو دوسرے سے قطع تعلق اور اعلانِ جنگ کرنا ضروری تھا، کوئی انسان ایک وقت میں ان دونوں کشتیوں پر سوار نہیں ہو سکتا تھا، معاشی جد و جہد، غفلت و خدا فراموشی کے بغیر، حکومت و سلطنت دینی و اخلاقی تعلیمات کو نظر انداز کئے اور خوفِ خدا سے

خالی ہوئے بغیر، اور دیندار بننا تارک الدنیا ہوئے بغیر متصوّر ہی نہیں تھا، ظاہر ہے کہ انسان عام طور پر سہولت پسند اور لذّت پرست واقع ہوا ہے، دین کا ایسا تصوّر جس میں دنیا کی کسی جائز تمتّع، ترقی اور سربلندی، طاقت و حکومت کے حصول کی گنجائش نہ ہو انسانوں کی اکثریت کے لئے قابلِ قبول اور قابلِ برداشت نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے متمدن، ذہین، صاحبِ صلاحیت اور باعمل انسانوں کی بڑی تعداد نے اپنے لئے "دین" کے بجائے "دنیا" کا انتخاب کیا، اور اس نے اس پر اپنے کو مطمئن و راضی کرلیا، وہ ہر قسم کی دینی ترقی سے مایوس ہو کر دنیا کے حصول و راس کی ترقی میں مشغول ہو گئی، دین و دنیا کے اس تضاد کو ایک مذہبی اور مسلّم حقیقت سمجھ کر انسانوں کے مختلف طبقوں اور انسانی اداروں نے عام طور پر مذہب کو خیرباد کہا، سیاست و ریاست نے مذہب کے نمائندہ کلیسا سے بغاوت کی اور اپنے کو اس کی ہر پابندی سے آزاد کرلیا، انسان "فیلِ بے زنجیر" اور معاشرہ "شترِ بے مہار" ہو کر رہ گیا، دین و دنیا کی اس دوئی اور اہلِ دین اور اہلِ دنیا کی اس رقابت نے نہ صرف یہ کہ مذہب و اخلاق کے اثر کو محدود و کمزور اور انسانی زندگی اور انسانی معاشرہ کو اس کی برکت و رحمت سے محروم کردیا، بلکہ اس الحاد و لادینیت کا دروازہ کھولا جس کا سب سے پہلے یورپ شکار ہوا، پھر دنیا کی دوسری قومیں جو یورپ کے فکری، علمی یا سیاسی اقتدار کے زیرِ اثر آئیں اس سے کم و بیش متاثر ہوئیں، موجودہ دنیا کی صورتِ حال جس میں مذہب و اخلاق کا زوال، اور نفس پرستی (اپنے وسیع معنی میں) اپنے آخری نقطہ پر پہونچ گئی ہے اسی دین و دنیا کی تفریق کا نتیجہ ہے۔

محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ عظیم ترین معجزہ اور انسانیت کے لئے عظیم ترین تحفہ اور آپؐ کی رحمۃ للعالمینی کا مظہر ہے کہ آپؐ کامل طور پر رسول و حدت ہیں اور بیک وقت "بشیر و نذیر" ہیں آپؐ نے دین و دنیا کے تضاد کے نظریہ کو ختم کر کے پوری زندگی کو عبادت میں اور پورے روئے زمین کو ایک وسیع عبادت گاہ میں تبدیل کردیا، دنیا کے انسانوں کو متحارب کیمپوں سے

نکال کر حسنِ عمل، خدمتِ خلق اور حصولِ رضاء الٰہی کے ایک ہی محاذ پر کھڑا کر دیا، یہاں لباس دنیا میں درویش، قباء شاہی میں فقیر و زاہد، سیف و تسبیح کے جامع، رات کے عبادت گذار اور دن کے شہسوار نظر آئیں گے، اور ان کو اس میں کسی قسم کا تضاد محسوس نہیں ہوگا۔

چھٹا انقلاب یہ ہے کہ بعثتِ محمدی سے پہلے انسان اپنی منزلِ مقصود سے بے خبر تھا، اس کو یاد نہیں رہا تھا کہ اس کو کہاں جانا ہے؟ اس کی صلاحیتوں کا اصل میدان اور اس کی کوششوں کا اصل نشانہ کیا ہے؟ انسان نے کچھ موہوم منزلیں اور اپنی کوششوں کے لئے کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے بنا لئے تھے، ان میں انسانوں کی ذہانت اور قوتِ عمل صرف ہو رہی تھی، کامیاب اور بڑا انسان بننے کا مطلب صرف یہ تھا کہ میں دولت مند بن جاؤں، طاقتور اور حاکم بن جاؤں، وسیع سے وسیع رقبۂ زمین اور کثیر سے کثیر انسانی نفوس پر میری حکمرانی اور فرماں روائی قائم ہو جائے، لاکھوں آدمی ایسے تھے جن کا پروازِ تخیل، نقش و نگار، رنگ و آہنگ، لذت و ذائقہ اور بلبل و طاؤس یا چوپایہ و حیوان کی تقلید سے بلند نہیں ہوتا تھا، ہزاروں انسان ایسے تھے جن کی ساری ذہانت اپنے زمانہ کے دولت مندوں اور طاقت وروں اور سرکار دربار کی خدمت و خوشامد یا بے مقصد ادب و شاعری سے دل خوش کرنے میں صرف ہو رہی تھی، محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نسل انسانی کے سامنے اس کی حقیقی منزل لا کر کھڑی کر دی، آپ نے یہ بات دل پر نقش کر دی کہ خالقِ کائنات کی صحیح معرفت، اس کی ذات و صفات اور اس کی قدرت و حکمت کا صحیح علم، ملکوت السماوات والارض کی وسعت و عظمت اور لامحدودیت کی دریافت ایمان و یقین کا حصول خدا کی محبت و محبوبیت، اس کو راضی کرنا اور اس سے

راضی ہوجانا، اس کثرت میں وحدت کی تلاش اور یافت انسان کی حقیقی سعادت اور کمالِ آدمیت ہے، اپنی باطنی قوتوں کو ترقی دینا، ایمان ویقین کی دولت سے مالا مال ہونا انسانوں کی خدمت اور ایثار وقربانی کے ذریعہ خدا کی خوشنودی کا حاصل کرنا، اور کمال وترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک پہنچ جانا، جہاں فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے انسان کی کوششوں کا حقیقی میدان ہے۔

آپؐ کی بعثت کے بعد دنیا کی رُت بدل گئی، انسانوں کے مزاج بدل گئے، دلوں میں خدا کی محبت کا شعلہ بھڑکا، خدا طلبی کا ذوق عام ہوا، انسانوں کو ایک نئی دُھن (خدا کو راضی کرنے اور خدا کی مخلوق کو خدا سے ملانے اور اس کو نفع پہنچانے کی) لگ گئی جس طرح بہار یا برسات کے موسم میں زمین میں روئیدگی سوکھی ٹہنیوں اور پتیوں میں شادابی اور ہریالی پیدا ہوجاتی ہے، نئی نئی کونپلیں نکلنے لگتی ہیں، اور در ودیوار پر سبزہ اگنے لگتا ہے، اسی طرح بعثتِ محمدی کے بعد قلوب میں نئی حرارت دماغوں میں نیا جذبہ اور سروں میں نیا سودا سما گیا، کروڑوں انسان اپنی حقیقی منزلِ مقصود کی تلاش اور اس پر پہنچنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے، ہر ملک اور قوم میں طبیعتوں میں یہی نشہ اور ہر طبقہ میں اس میدان میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا یہی جذبہ موجزن نظر آتا ہے، عرب وعجم، مصر وشام، ترکستان اور ایران، عراق وخراسان، شمالی افریقہ اور اسپین اور بالآخر ہمارا ملک ہندوستان اور جزائر شرق الہند سب اسی صہبائے محبت کے متوالے اور اسی مقصد کے دیوانے نظر آتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انسانیت صدیوں کی نیند سوتے سوتے بیدار ہوئی، آپ تاریخ وتذکرے کی کتابیں پڑھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خدا طلبی اور خدا شناسی کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا شہر شہر قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں بڑی تعداد میں ایسے خدا مست، عالی ہمت، عارف کامل، داعی حق اور خادم خلق، انسان دوست ایثار پیشہ انسان نظر آتے ہیں، جن پر فرشتے بھی رشک کریں، انھوں نے

دلوں کی سرد انگیٹھیاں گرما دیں عشق الٰہی کا شعلہ بھڑکا دیا، علوم و فنون کے دریا بہا دیئے علم و معرفت کی محبت کی جوت جگا دی اور جہالت و وحشت، ظلم و عداوت سے نفرت پیدا کردی، مساوات کا سبق پڑھایا، دکھوں کے مارے اور سماج کے ستائے ہوئے انسانوں کو گلے لگایا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارش کے قطروں کی طرح ہر حصۂ زمین پر ان کا نزول ہوا ہے اور ان کا شمار ناممکن ہے۔

آپ ان کی کثرت (کمیّت) کے علاوہ ان کی کیفیت کو دیکھئے ان کی ذہنی پرواز ان کی روح کی لطافت اور ذکاوت اور ان کے ذوق سلیم کے واقعات پڑھئے انسانوں کے لئے کس طرح ان کا دل روتا، اور ان کے غم میں گھلنا کس طرح ان کی روح سلگتی تھی، انسانوں کو مصیبت سے نجات دینے کے لئے وہ کس طرح اپنے کو خطرہ میں ڈالتے اور اپنی اولاد اور متعلقین کو آزمائش میں مبتلا کرتے تھے، ان کے حاکموں کو اپنی ذمہ داری کا کس قدر احساس اور محکوموں میں اطاعت و تعاون کا کس قدر جذبہ تھا، ان کے ذوقِ عبادت، ان کی قوت دعا، ان کے زہد و فقر، جذبۂ خدمت اور مکارمِ اخلاق کے واقعات پڑھئے نفس کے ساتھ ان کا انصاف اپنا احتساب، کمزوروں پر شفقت، دوست پروری دشمن نوازی، ہمدردیِ خلائق کے نمونے دیکھئے بعض اوقات شاعروں اور ادیبوں کی قوت متخیلہ بھی ان بلندیوں تک نہیں پہنچتی، جہاں وہ اپنے جسم و عمل کے ساتھ پہنچے اگر تاریخ کی مستند اور متواتر شہادت نہ ہوتی تو یہ واقعات قصے کہانیاں اور افسانے معلوم ہوتے۔

یہ انقلاب عظیم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عظیم معجزہ اور آپ کی "رحمۃ للعالمین" کا کرشمہ ہے۔

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔
(الانبیاء - ۱۰۷)

INDEX

اشاریہ

(انڈکس "نبیٔ رحمتؐ")

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

اقوام و قبائل، طبقات اور ملّتیں

کتابیات

ر ز

س

ش

ص

مَقَامَاتُ

مُتفرِّقات

مساجد و عبادت گاہیں:

درس گاہیں، ادارے اور مطابع:

جنگیں سریے اور غزوات:

اسلحے اور متعلقات جنگ:

وفود قبائل عرب برائے قبول اسلام:

مذاہب و ادیان، عقائد و فلسفے:

اسلامی، مذہبی واصطلاحی الفاظ:

بت وبت خانے:

منصب و عہدے:

اشیاء خورد و اجناس پیڑ پودے وباغات:

حیوانات:

سلطنتیں اور عہد:

معدنی اشیاء و پیداوار:

سکّے، اوزان، پیمانے اور ظروف:

معاشرے، سوسائٹی اور تہذیب و شعائر:

زیورات، اشیاء زینت و دیگر سامانِ استعمال:

پیشے، صنعت وحرفت اور معاملات:

زبان:

نامہ ہائے مبارک:

فتوحات وصلحنامے و عہدنامے:

بعض اہم اور تاریخ ساز واقعات:

دیگر متفرقات:

فہرست نقشہ جات "نبی رحمتؐ"